امریکہ چلیں

حصہ اول

علی سفیان آفاقی

مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ چوک انار کلی لاہور

کولمبس کے امریکا دریافت کرنے کے لگ بھگ پانچ سو سال بعد ہم نے دوبارہ امریکا دریافت کرلیا

فرق یہ تھا کہ کولمبس صاحب کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ انہوں نے امریکا دریافت فرمایا ہے۔ وہ اسے انڈیا سمجھ رہے تھے اور کافی عرصے تک یہی سمجھتے رہے۔ شاید اسی لیے انہوں نے وہاں کے آبائی باشندوں کو انڈین کا خطاب دیا۔ بعد میں یہ لوگ ریڈ انڈین کہلائے۔ جب یورپ کے چور ڈاکو، قاتل اور لٹیرے اپنے ملکوں سے بھاگ بھاگ کر اس سرزمین میں پہنچے تو انہوں نے وہاں کے اصلی باشندوں کو مار پیٹ کر بھگا دیا اور وہ غریب جنگلوں اور ویرانوں میں جنگلیوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے باہر سے آنے والے سرخ و سفید چہروں والے حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت ہاتھ پیر مارے۔ ان پر چڑھائیاں کیں، ان کے گھر جلا دئے، گھوڑے بھگا کر لے گئے، مختصر یہ کہ وہ سب کچھ کیا جو وہ اپنے گھربار اور وطن کو بچانے کے لیے کرسکتے تھے مگر ان بے چاروں کے پاس تیر کمان اور بھالوں اور خنجروں کے سوا کوئی اور ہتھیار نہیں تھا جب کہ یوروپین حملہ آور بندوقوں، پستولوں اور توپوں تک سے مسلح تھے۔ ظاہر ہے کہ توپ اور تلوار کا بھلا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ریڈ انڈین مرتے کھپتے رہے اور گورے چٹے غیر ملکی ان کی بہترین زمینوں، تازہ دم مویشیوں اور خوب صورت عورتوں پر قابض ہو گئے۔ مختصر الفاظ میں یہ ہے امریکا کی تاریخ۔

اگر مزید تحقیق کی ضرورت ہو تو امریکی فلمیں دیکھ لیجئے جن میں ریڈ انڈین لوگوں کو وحشی، جنگلی درندے بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور گورے امریکی مظلوم اور بے بس دکھائے جاتے ہیں۔ ان فلموں میں ریڈ انڈینز کا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ سروں پر لمبے لمبے

پر باندھ کر، چہروں اور جسموں پر رنگین نقش و نگار بنا کر، تیر کمان اور بھالوں سے مسلح ہو کر جنگلی جانوروں کی طرح گھوڑوں پر سوار ہو کر گوروں کی آبادیوں پر ہاؤ ہو کرتے ہوئے حملہ کریں اور مکھیوں کی طرح ان کی گولیوں کا نشانہ بن جائیں جب زیادہ تعداد ہلاک ہو جائے تو اسی طرح "ہو ہو" کا شور مچاتے ہوئے گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگ جائیں۔ یہ فلمیں ہی امریکی تاریخ کا صحیح نمونہ پیش کرتی ہیں۔

مگر یہ پانچ سو سال پرانی بات ہے۔ شکر ہے کہ ہم نے جب امریکا دریافت کیا تو وہاں کے حالات کافی بدل گئے تھے۔ ہمیں وہاں ریڈ انڈینوں سے واسطہ نہیں پڑا۔ ہمیں وہاں زندگی بسر کرنے کے لیے نہ تو گولی چلانی پڑی، نہ تیر کھانے پڑے اور نہ ہی گھوڑے دوڑانے کی ضرورت پیش آئی۔ دنیا آخر ترقی کرتی ہی رہتی ہے۔ اگر امریکا نے بھی ترقی کر لی تو کون سی حیرانی کی بات ہے۔ کولمبس صاحب تو پتا نہیں کون کون سے ساحلوں اور بندرگاہوں میں ٹکریں کھاتے ہوئے امریکا پہنچے ہوں گے۔ ہم کو یہ دقت بھی پیش نہیں آئی۔ بس ہوائی جہاز میں سوار ہوئے اور آرام سے سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، فلمیں دیکھتے اور گانے سنتے ہوئے امریکا جا پہنچے۔ پھر ہمیں کولمبس صاحب پر ایک اور برتری بھی حاصل ہے۔ وہ حضرت جب امریکا پہنچے تو کافی عرصے تک انھیں یہ پتا ہی نہیں چلا کہ وہ جہاں لنگر انداز ہوئے ہیں وہ امریکا ہے مگر ہمیں تو پہلے ہی سے علم تھا کہ ہم نے جہاں ہوائی جہاز سے باہر قدم رکھا ہے وہ امریکی سرزمین ہے۔ انکساری کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم خواہ مخواہ اپنی خوبیاں خود اپنی زبان سے بیان نہ کریں مگر احوال واقعی کا بیان بھی ایک ضروری چیز ہے اس لیے یہ روداد بیان کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔ افسوس اس بات کا بھی ہے کہ کولمبس صاحب کی تو ساری دنیا میں پانچ سودیں سالگرہ منائی جا رہی ہے اور ہماری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اہل دانش کی بے قدری کا یہ کوئی پہلا اور انوکھا واقعہ تو نہیں ہے۔ بقول شاعر

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

کولمبس صاحب کے زمانے میں کچھ اور طور طریقے تھے۔ پہلے تو خدا جانے کہاں کہاں سے لکڑی لوہا لا کر بحری جہاز تیار کیے جاتے تھے پھر ان کے لیے ملاحوں کا عملہ تلاش کیا جاتا تھا۔ طوفانوں سے مقابلہ کرنے کے لیے ضروری اہتمام کیا جاتا تھا۔ ماؤں سے دودھ بخشوایا

جاتا تھا اور بیویوں سے کہا سنا معاف کرایا جاتا تھا بلکہ یہ اجازت نامہ بھی دے دیا جاتا تھا کہ اگر اتنے عرصے تک لوٹ کر آنا نصیب نہ ہو تو تم بڑے شوق سے دوسری شادی رچا لینا پھر امام ضامن باندھے جاتے تھے۔ بزرگوں سے دعا درود کرایا جاتا تھا اس کے بعد کہیں خدا خدا کر کے سفر پر روانہ ہونے کی نوبت آتی تھی۔ یہ بھی اللہ کی کرم نوازی ہے کہ ہمیں یہ سب کچھ نہیں کرنا پڑا۔ بس یہ ہوا کہ ٹریول ایجنٹ سے کہہ کر ایئر ٹکٹ خریدا۔ سیٹیں بک کرائیں، اسٹیٹ بینک سے اجازت نامہ حاصل کر کے زرمبادلہ حاصل کیا اور وقت مقررہ پر ہوائی جہاز پر سوار ہو گئے۔ سوچتے ہیں تو کچھ ندامت بھی ہوتی ہے کہ کہاں وہ شورا شوری اور کہاں یہ بے نمکی لیکن اگر سفر آسان ہی ہو گیا ہے تو اس میں ہمارا بھلا کیا قصور ہے؟ اللہ اپنے نیک بندوں کو طرح طرح سے نوازتا ہے۔ اس کی ذات بے نیاز ہے۔

پہلے تو یہ وضاحت کر دیں کہ آج کے زمانے میں بھی امریکا جانا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ ہزار مشکلوں کی ایک مشکل تو "ویزا" ہے۔ پرانے زمانے کے قصے کہانیوں میں شہزادی کو کسی سے جان چھڑانی ہوتی تھی تو وہ گل بکاؤلی یا اسی قسم کی کوئی چیز حاصل کرنے کی فرمائش کر دیا کرتی تھی یا پھر بادشاہ سلامت یہ شرط لگا دیتے تھے کہ فلاں دیو سے جا کر مقابلہ کرو وغیرہ وغیرہ۔ آج کے مقابلے میں وہ تمام شرطیں بائیں ہاتھ کا کرتب نظر آتی ہیں۔ پرانے زمانے کے شہزادوں اور طلب گاروں کے تمام مصائب ایک طرف اور آج کے سیاحوں کے لیے ویزا کا حصول ایک طرف۔ شیریں نے فرہاد کو بہت مشکل کام بتایا تو یہ کہ پہاڑوں میں نہر کھودنے کی فرمائش کر دی۔ اس اللہ کے بندے نے جیسے تیسے وہ نہر بھی کھود دی لیکن اگر شیریں اس سے امریکا کا ویزا لانے کی فرمائش کر دیتی تو ذرا غور فرمایئے کہ غریب فرہاد کا کیا حال ہوتا۔ وہ تو امریکی ویزا آفس میں بیٹھا بیٹھا ہی ڈھانچہ بن چکا ہوتا۔ دوسری مشکلات بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ امریکی ویزا اور لاٹری کا ان دنوں ایک ہی جیسا حال ہے۔ دونوں چیزیں قسمت والوں کو ہی ملتی ہیں۔

ہم اگر یہ بتائیں کہ ہمیں امریکا جانے کا کبھی شوق نہیں تھا تو شاید بہت کم لوگ ہماری بات پر یقین کریں گے۔ یورپ تو ہم کئی بار گئے تھے اور سچ پوچھئے تو یورپ ہمارے جی کو ایسا بھایا کہ پھر کسی اور ملک کی طرف رخ کرنے کا خیال ہی دل میں نہ آیا حالانکہ اس زمانے میں بھی لوگ "امریکا امریکہ" پکارا کرتے تھے۔ یہ تو ہمیں بعد میں پتا چلا کہ ساری دنیا کے

مقابلے میں امریکا سب سے سستا تھا اور پھر لطف یہ کہ پیسہ کمانے کے لیے بہترین ملک سمجھا جاتا تھا۔ عرب شیخوں کی دولت مندی کے واقعات تو بہت بعد کی بات ہے۔ سب سے پہلے تو امریکی لکھ پتیوں کے قصے سننے میں آیا کرتے تھے۔ امریکا کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہاں ہر تیسرا آدمی لکھ پتی ہے اور کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کس وقت کوئی صاحب اپنے باغ میں پودا لگانے کے لیے کھدائی کرتے ہوئے تیل دریافت کرلیں۔ یہ داستانیں بھی عام تھیں کہ امریکا میں سونے کی کانیں ہیں اور راستہ چلتے لوگ ان کانوں میں سے حسب مقدور سونا سمیٹ کر اپنے بیگ میں بھر لیتے ہیں۔ امریکا اپنی بلند عمارتوں کے لیے بھی بہت مشہور تھا۔ دنیا کی سب سے اونچی عمارت سب سے پہلے امریکا میں ہی تعمیر ہوئی تھی اور اسکول کے بچوں سے امتحان میں یہ سوال دریافت کیا جاتا تھا کہ دنیا کی بلند ترین عمارت کہاں ہے؟

جواب ملتا' یہ امریکا میں ہے۔ اس کا نام ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ ہے۔

پھر تصویروں اور فلموں میں امریکا کی فلک بوس عمارتیں' ہوش اڑانے والے پل' انتہائی چوڑی چکلی سڑکیں اور بہت لمبی لمبی کاریں دیکھیں تو پتا چلا کہ اس میدان میں بھی کوئی امریکا کا حریف نہیں ہے۔ ہالی ووڈ کی فلمیں اور ان میں کام کرنے والی ہیروئنیں تو خیر کوہ قاف کی پریاں ہی سمجھی جاتی تھیں بلکہ لوگ کہا کرتے تھے کہ کوہ قاف بھی ہالی ووڈ کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں ہے جہاں حسین ترین لڑکیاں کیڑے مکوڑوں کی مانند پھرتی ہیں۔ ان سب خوبیوں اور ترغیبات کے باوجود ہمارے دل میں کبھی امریکا جانے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی۔ خدا جانے کسی نے ہم پر جادو کر دیا تھا یا کوئی تعویذ گھول کر پلا دیا تھا کہ امریکا جانے کا خیال تک ہمارے دل میں نہیں آیا یا شاید ہمارے نصیب میں امریکا کا آب و دانہ نہیں تھا۔

کہتے ہیں خیر جو کچھ بھی سبب تھا۔ خلاصہ یہ کہ ہم نے کبھی امریکا جانے کا قصد نہیں کیا۔ کہ قدرت ہر کام کے لیے بہانے بنا دیتی ہے چنانچہ ہمارے امریکا جانے کا بہانہ ہمارے دوست نعیم بخاری بن گئے۔ ہوا یہ کہ نعیم بخاری نے اپنے نئے گھر میں چند قریبی دوستوں کو ڈنر کی دعوت دی۔ ان میں ایک ہم بھی تھے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس سے پہلے نعیم بخاری نے ہمیں کبھی دعوت پر نہیں بلایا تھا اور نہ ہی اس کے بعد یہ اعزاز حاصل ہوا۔ ان کے ساتھ گپ شپ اور ہنسی مذاق میں اچھا وقت گزر جاتا ہے اس لیے ہم نے فوراً

دعوت قبول کرلی۔ اس رات ہم ایک اور مشترکہ دوست ریاض گل کے ہمراہ نعیم بخاری کے نئے اور خوبصورتی سے سجے ہوئے گھر میں پہنچ گئے۔ اس زمانے میں موصوف گھر ہی میں رہتے تھے کیونکہ شادی شدہ تھے اور ان کے گھر پر واقعی گھر ہی کا گمان گزرتا تھا۔ مرزا غالب والا گھر نہیں جس کے بارے میں انہوں نے فرمایا تھا کہ:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

بلکہ یہ ایک خوش سلیقہ بیگم یعنی طاہرہ سید کے باذوق ہونے کا زندہ ثبوت تھا جو میزبان کے طور پر سب کی آؤ بھگت کرنے میں مصروف تھیں۔ اس دعوت میں بہت کم لوگ شریک تھے۔ سب کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا گیا۔ بیشتر اصحاب کو ہم پہلے ہی جانتے تھے مگر ایک صاحب ہمارے لیے بالکل نئے تھے۔ ان کا نام ریمنڈ پیپر تھا۔ ریاض گل نے بتایا کہ ریمنڈ پیپر لاہور میں ویزا آفیسر ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو اس کی باچھیں کھل جاتیں اور وہ فوراً ریمنڈ پیپر صاحب سے تعلقات استوار کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا مگر ہم رسمی اور اخلاقی گفتگو ہی تک محدود رہے اور اس کے بعد دوسرے دوستوں سے گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ ریاض گل حسب معمول ہم پر ہوٹنگ کرنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے پہلے تو ریمنڈ پیپر صاحب کو یہ باور کرایا کہ ہم پاکستان کی فلم انڈسٹری کے "ڈان وان" ہیں اور کوئی ہیروئن ایسی نہیں ہے جس سے ہماری دانت کاٹی دوستی نہ ہو پھر انہوں نے ہمارے فرضی اور من گھڑت رومانی واقعات سنانے شروع کر دیے جس کو سن کر سب بہت لطف اندوز ہوئے۔ آخر میں انہوں نے مسٹر ریمنڈ کو مطلع کیا کہ یہ صاحب دنیا کے بہت سے ملکوں کی خاک چھان چکے ہیں مگر آج تک امریکا نہیں گئے۔ اتنی دیر میں ایک نیا جوڑا اندر داخل ہوا اور ریاض گل اور نعیم بخاری ہمیں چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

کچھ دیر بعد جب سب لوگ ڈنر ٹیبل پر کھانا کھانے میں مصروف تھے تو مسٹر ریمنڈ پیپر ٹہلتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور مسکراتے ہوئے دریافت کیا کہ آخر ہمیں امریکا سے اتنی نفرت کیوں ہے؟

"نفرت؟" ہم نے انہیں حیران ہو کر دیکھا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" ایسی تو کوئی

بات نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ ہم کیمونسٹ وغیرہ ہیں۔"

وہ ہنسنے لگے "تو پھر آپ کبھی امریکا کیوں نہیں گئے؟"

"بس یوں ہی' خیال ہی نہیں آیا۔"

وہ ہمیں کافی دیر تک امریکا کی خوبیاں گنواتے رہے اور پھر کہا "میری مانئے تو ایک بار امریکا ضرور جائیے آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔"

امریکا جانے کا ارادہ ہم نے اس کے چند ماہ بعد کیا۔ ان دنوں پاکستان کی فلمی صنعت پر اچانک برا وقت آن پڑا تھا ہم نے سوچا کیوں نہ امریکا جاکر وہاں فلمیں یا ٹیلی ویژن فلمیں بنانے کے بارے میں جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ ایک روز ویزا کی درخواست لے کر ویزا آفس پہنچ گئے۔ امریکا کا ویزا لینا اس وقت بھی کافی مشکل ہوا کرتا تھا مگر وہ حالت نہیں تھی جو کہ آج دیکھنے میں آرہی ہے۔ اب تو امریکا کا ویزا اور "گل بکاؤلی" کا حصول قریب قریب یکساں ہوگیا ہے۔ درخواست داخل کرنے کے بعد ہم اور لمبی انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ہماری باری آئی تو دیکھا کہ ایک چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے ریمنڈ پیپر صاحب کھڑے ہمارے پاسپورٹ کا جائزہ لے رہے ہیں۔ انہوں نے نظر اٹھا کر بھی ہماری طرف نہیں دیکھا اور سوالات کی بوچھاڑ کردی:

"امریکا کیوں جا رہے ہیں؟ کس سلسلے میں جا رہے ہیں؟ کب تک رہیں گے؟ وہاں رشتے دار ہیں یا نہیں؟ پہلے کبھی امریکا جانے کے لیے ویزا کی درخواست دی ہے؟ امریکا جاکر کیا کریں گے؟ بیوی بچوں کو ہمراہ کیوں لے جا رہے ہیں؟" وغیرہ وغیرہ"

ہم ان کے سوالات سے پریشان ہوگئے۔ آخر اپنی طرف متوجہ کرانے کے لیے ہمیں کہنا پڑا کہ مسٹر ریمنڈ شاید آپ ہمیں پہچانے نہیں؟

اب انہوں نے گردن اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے مسکرا کر کہا "آپ کو وہ ڈنر یاد نہیں رہا جس میں آپ سے ہماری ملاقات ہوئی تھی اور آپ نے ہمیں کم از کم ایک بار ضرور امریکا جانے کا مشورہ دیا تھا؟"

ریمنڈ کے چہرے پر اچانک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بولے "شیور شیور" پھر انہوں نے پاسپورٹ پر ہمارا نام پڑھا اور ہنس کر کہنے لگے "معافی چاہتا ہوں۔ میں آپ کا اتنا بڑا اور مشکل نام بھول گیا تھا۔ اچھا یہ بتائیے کہ آپ کب جانا چاہتے ہیں؟"

ہم نے کہا "بس اگلے ہفتے۔"

کہنے لگے "آپ ڈھائی بجے آکر اپنا ویزا لے جائیے گا۔"

ہم نے کہا "اور بیوی بچوں کا؟"

بولے "ظاہر ہے سب کا۔"

ہم شکریہ ادا کرکے چلے آئے۔ دو گھنٹے بعد دوبارہ پہنچے تو ہمارا پانچ سال کا ویزہ تیار تھا۔ انہوں نے بذات خود پاسپورٹ ہمارے سپرد کیا اور پھر کہا "دیکھئے ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ امریکا سے واپس آکر مجھے اپنے تاثرات ضرور بتائیں گے!"

اتنی معمولی شرط کو پورا کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس لیے ہم نے فوراً ان سے وعدہ کرلیا۔

امریکا تو ہمیں جانا تھا مگر ہم جہاں کہیں بھی جاتے تھے براستہ لندن جایا کرتے تھے۔ وہاں ہمارے دوست بھی تھے' عزیز رشتے دار بھی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لندن ہمیں بہت اچھا لگتا تھا۔ لندن کے لیے ویزا لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہم اتنی بار لندن جا چکے تھے کہ جب بھی ہیتھ روائرپورٹ پر پہنچے۔ امیگریشن والے ہمارے موٹے تازے پاسپورٹوں پر لاتعداد مہریں دیکھ کر چپکے سے چھ مہینے کا ویزا ٹھونک دیتے تھے۔ اس لیے لندن کے لیے ویزے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

ایک دوست نے مشورہ دیا کہ "اس بار آپ ائر فرانس سے سفر کیوں نہیں کرتے!"

"اس کا فائدہ؟"

"فائدہ یہ ہے کہ آپ آتے اور جاتے ہوئے پیرس میں بھی قیام کر سکتے ہیں۔"

پیرس کا ذکر سن کر دل بے چین ہو گیا۔ اس شہر کو ہم پہلے بھی دو تین بار دیکھ چکے تھے مگر دل نہیں بھرا تھا۔ سوچا اس شہر کو ایک بار پھر دیکھ لیں تو کیا مضائقہ ہے مگر فرانس کے لیے ویزا لینا ضروری تھا اور وہ اسلام آباد سے دستیاب ہوتا تھا۔ ٹکٹ ہم نے خرید لیے تھے۔ امریکی ویزا حاصل کر لیا تھا۔ اس لیے اگلے ہی روز اسلام آباد روانہ ہو گئے۔ فرانس کا سفارت خانہ بہت پر فضا مقام پر تھا۔ موسم بھی رنگین تھا مگر جب اندر قدم رکھا تو پتا چلا کہ راہ میں کچھ سخت مقام بھی آتے ہیں۔ عمارت کے بیرونی لان پر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو بہت خلوص اور نیاز مندی سے ملے اور بتایا کہ میں آجکل یہاں افسر اطلاعات ہوں۔ آپ ویزا کی رسموں سے آزاد ہو کر میرے ساتھ کافی ضرور پیجیے گا۔ یہ ایک نوجوان پاکستانی صحافی تھے۔ ہم انہیں بھول گئے تھے مگر ان کا خلوص اور تپاک دیکھ کر یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ معاف کرنا بھائی ہم آپ کو پہچانے نہیں۔

ویزا آفس میں کافی لوگ موجود تھے۔ ایک اداکارہ نوین تاجک سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ماڈلنگ کا کورس کرنے کی غرض سے پیرس جا رہی ہیں مگر ویزا حاصل کرنا کارے دارد ہے۔ ان کا خدشہ بھی درست ثابت ہوا کیونکہ جب ہم ایک پاکستانی اہلکار کے سامنے اپنی درخواست لے کر پیش ہوئے تو انہوں نے بڑی بے اعتنائی بلکہ بے زاری سے ہم پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر پیشانی پر سلوٹیں ڈال کر ہماری درخواست کو دیکھا۔ پاسپورٹ کو کھول کر دیکھنے کی انہوں نے زحمت ہی گوارا نہیں فرمائی' بولے "آپ نیویارک جانا چاہتے ہیں مگر آپ کے ٹکٹوں پر بکنگ کی کنفرمیشن صرف لندن تک کی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

ہم نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم چار پانچ دن پیرس میں رہنے کے بعد لندن جائیں گے اور پھر وہاں سے امریکا جانے کا پروگرام بنائیں گے۔"

"لیکن اگر آپ امریکا گئے ہی نہیں تو؟"

خاصا نامعقول سوال تھا مگر ہم نے بڑی معقولیت سے جواب دیا "اگر امریکا نہیں گئے تو نہیں جائیں گے۔ یہ ہماری مرضی پر ہے۔ آپ کو ہمارے امریکا جانے یا نہ جانے سے کیا غرض ہے۔ ہم تو آپ کے پاس فرانس کا ویزا لینے آئے ہیں۔"

ان کی پیشانی کی سلوٹیں کچھ زیادہ گہری ہو گئیں۔ فرمایا "جناب ایسے کام نہیں چلے گا۔ یہ ہمارے ضوابط کے خلاف ہے اور پھر آپ نے واپسی کے لیے بھی کوئی بکنگ نہیں کرائی ہے۔"

ہم نے کہا "ہم وہاں تفریح کے لیے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک جی چاہے گا وہاں رہیں گے۔ جب آنے کا ارادہ ہوا تو واپسی کی بکنگ کرا لیں گے۔"

"سوری" وہ منہ بنا کر بولے "جب تک آپ لاہور سے نیویارک اور واپس لاہور تک کی تمام بکنگ نہیں کرائیں گے' آپ کو ویزا نہیں مل سکتا۔"

یہ تمام گفتگو اردو میں ہو رہی تھی کیونکہ یہ صاحب خالص پاکستانی تھے۔

ہم نے پوچھا "آپ کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

بولے "اس کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں ہے مگر ویسے مجھے شہناز کہتے ہیں۔"

ہمیں غصہ تو بہت آیا کیونکہ ان میں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آ رہی تھی جس پر وہ ناز

کرتے۔

ہم نے دریافت کیا "تو کیا آپ ہمیں ویزا فارم بھی نہیں دیں گے؟"

بولے "جی نہیں"

ہم نے اپنے پاسپورٹ ان کے ہاتھ سے چھین لیے۔ وہ حیران ہو کر دیکھنے لگے۔

ہم نے کہا "مسٹر شہناز ہمیں پیرس جا کر کوئی نوکری نہیں کرنی ہے۔ صرف سیر کی غرض سے جا رہے تھے۔ وہاں جاتے تو کچھ ڈالر بھی خرچ کر دیتے لیکن ہمیں پیرس جانے کی کوئی ایسی حسرت بھی نہیں ہے کہ نہ گئے تو جان پر بن جائے گی لیکن ہم آپ سے یہ ضرور پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ہی ملک میں آپ کو ہم پاکستانیوں کی توہین کرنے کا کیا حق ہے؟"

"توہین؟" وہ حیران ہو گئے "وہ کیسے؟"

"یہ توہین نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ نے ہمارے پاسپورٹ کو کھول کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں فرمائی اور ہمیں ویزا فارم پر کرنے کے لیے دینے سے انکار کر دیا۔"

بولے "یہ میرا حق ہے!"

ہم نے کہا "آپ کا حق یہ ہے کہ ہمارے ویزا فارم کو دیکھنے کے بعد اسے مسترد کر دیں مگر آپ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ آپ سرے سے ویزا فارم دینے سے ہی انکار کر دیں لیکن اس میں آپ کا کوئی قصور بھی نہیں ہے۔ آپ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی نمک خوار معلوم ہوتے ہیں۔ جن کو انگریزی میں کہتے ہیں۔ شاہ سے زیادہ وفادار۔"

ہم نے اپنے پاسپورٹ تو ان کے ہاتھ سے چھین ہی لیے تھے۔ بعد میں ان کے سامنے رکھے ہوئے ائر ٹکٹ بھی اٹھا لیے اور غصے میں بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے۔ کمرے سے باہر نکلے تو برآمدے میں پھر اسی مداح سے ملاقات ہو گئی۔

"ارے آپ ادھر کہاں جا رہے ہیں؟"

"جہنم میں!" ہم نے غصے سے کہا۔

وہ بے چارہ پریشان ہو گیا۔ پوچھنے لگا "کیا بات ہو گئی۔ آپ اتنے ناراض کیوں ہیں؟"
اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم واقعی بہت ناراض تھے۔ ہم نے کہا "ایک وفادار پاکستانی سے مل کر آ رہے ہیں۔"

کتنا نویاک دیکھا؟"

"ابھی تو دیکھنا شروع بھی نہیں کیا۔"

بولے "نویاک ایک نہیں ہے۔ کئی ہیں، کچھ تو زمین کے اوپر ہیں اور کچھ زمین کے اندر۔ امیروں کا نویاک الگ ہے، غریبوں کا علیحدہ ہے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور ایک نویاک زمین کے اندر بھی ہے۔"

"زمین کے اندر!" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں، زمین کے اندر۔ اندر اور باہر کے نویاک میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ موقع ملے تو اندر والا نویاک بھی ضرور دیکھنا۔ یہ کئی چہروں والا شہر ہے۔" انہوں نے جیب سے کچھ رقم نکال کر میز پر رکھی اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے "بائی!"

ہم انہیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

"مجھے تو کوئی روحانی شخص معلوم ہوتا ہے۔ زمین کے اندر کا حال بھی جانتا ہے" بٹ صاحب نے کہا۔

اسی شام ہم براڈوے پہنچ گئے۔ براڈوے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ نامی گرامی فن کار اس جگہ کے تھیٹروں میں اداکاری کرنا فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ بڑے بڑے ڈرامے اور عظیم فلمیں یہاں نمائش کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ یہ شوبزنس کا گڑھ ہے۔ دراصل ٹائمز اسکوائر بھی ان ہی خصوصیات کا حامل ہے جہاں تھرڈ ایونیو پر عالی شان اور خوب صورت سنیما گھر موجود ہیں۔ سنیما دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن میں نئی اور تازہ ترین فلمیں دکھائی جاتی ہیں اور دوسرے وہ جہاں پرانی مشہور کلاسیکی فلمیں چلتی ہیں۔ سنیما گھروں کے سامنے لمبی لمبی قطاریں نظر آتی ہیں۔ جو پل بھر میں غائب بھی ہو جاتی ہیں۔ ان قطاروں میں کھڑے ہو کر آس پاس کی رونق دیکھنا بھی ایک تفریح ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر آپ بے شمار لوگوں کو گزرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ ہر رنگ اور نسل کے لوگ، نئے نئے فیشن، حسن و جمال کے چلتے پھرتے پیکر، خوشبوؤں کی مہکار، یہ نیویارک کی نائٹ لائف کا ایک رنگین اور دلچسپ حصہ ہے۔ جیسے ہی سورج غروب ہوتا ہے اور بجلی کے قمقمے روشن ہوتے ہیں۔ نیویارک کی فتنہ سامانی انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی ہے اور رنگوں اور روشنیوں کا ایک نیا شہر وجود میں آ جاتا ہے۔ ٹائمز اسکوائر اور براڈوے پر بے حد ہجوم ہوتا ہے۔ یہیں جیب

کترے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں' ان کی نظر کرم خاص طور پر سیاحوں پر ہوتی ہے جو اپنی وارفتگی اور بے خبری میں ان کے لیے بہترین شکار ثابت ہوتے ہیں۔

فٹ پاتھ پر گزرتے ہوئے اچانک ہمیں کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہاں پہلے ہی ایک ہاتھ موجود تھا۔ ہم نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ پلٹ کر دیکھا تو ہمارے عقب میں ایک خوش پوش نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ نظریں ملیں تو وہ مسکرایا اور اچانک ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگ اٹھا۔ تعاقب کرنا لاحاصل بھی تھا اور غیر ضروری بھی کیونکہ ہماری جیب میں کاغذ کے چند اشتہاروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ان علاقوں میں نیون لائٹس اور روشنیوں کا اہتمام دیکھنے کے قابل ہے۔ سینما گھروں اور تھیٹر ہالوں کے سامنے تو رنگ و نور کی بہار ہوتی ہے۔ انہیں نظر فریب تصاویر سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ کہیں میوزیکل کی نمائش ہو رہی ہے تو کسی جگہ ایکشن فلم کا منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ آس پاس کے فٹ پاتھوں اور ریستورانوں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ عورتیں اور مرد ہنستے بولتے' کھاتے پیتے اور خطوط لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ٹائمز اسکوائر میں سیکس شاپس کی بھی کمی نہیں ہے جن میں سیکس شو بھی دکھائے جاتے ہیں۔ ان دکانوں کے سامنے سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ ویسے تو اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچوں کے لیے اس قسم کے مقامات ممنوع ہیں مگر اس ہجوم میں نوجوان بچے' بوڑھے سبھی نظر آجاتے ہیں۔

کافی دیر تک ہم فٹ پاتھوں پر دھکے کھاتے پھرے۔

آخر بٹ صاحب نے کہا ”اگر کچھ اور کھانا چاہتے ہیں تو بتائیں' کسی ریستوران میں چلتے ہیں۔“

کہنے لگے ”کوئی شو بھی تو دیکھنا چاہیے۔“

خان صاحب بولے ”بھائی میوزیکل شو تو آپ کے سر پر سے گزر جائیں گے۔ دوسری فلمیں آپ کسی اور شہر میں بھی دیکھ سکتے ہیں البتہ اگر کسی نائٹ کلب میں جانے کا ارادہ تو وہ بھی بتا دیں مگر آپ کو معلوم ہے کہ وہاں شراب پینی پلانی پڑے گی۔“

”لاحول ولا قوۃ“ بٹ صاحب نے بے اختیار نعرہ لگایا۔ نیویارک پہنچنے کے بعد ان زبان سے نکلنے والا یہ پہلا لاحول ولا قوۃ تھا۔

خان صاحب نے مشورہ دیا ”دیکھیں۔ موسم بھی اچھا ہے۔ ہجوم بھی بہت اچھا ہے

یہاں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ اور جو بھی ہمارے پاس سے گزرتا ہے ہمیں دھکے لگاتا ہوا گزرتا ہے۔ اتنے بہت سے خوب صورت اور خوشبودار دھکے کھانے کا موقع زندگی میں بار بار نہیں ملتا۔ میرے خیال میں تو یہی پروگرام بہتر ہے۔ اگلے بلاک تک چلتے ہیں۔ سو ڈیڑھ سو خوب صورت دھکے اور مل جائیں گے۔“

طے پایا کہ آج رات صرف دھکے کھانے پر ہی اکتفا کیا جائے۔ دوسرے دن کوئی اور پروگرام بنایا جائے۔ جیبوں اور نقدی کی جانب سے ہمیں کوئی فکر نہیں تھی کہ جیب میں کچھ نہ تھا سوائے چند ڈالرز کے۔ جان کا خطرہ بھی نہیں تھا کیونکہ ہم نیویارک کے بارونق ترین علاقے میں تھے۔ مزید دو ڈھائی گھنٹے تک دھکوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا کیونکہ رات کافی گزر چکی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ واپسی کس طرح ہو؟ سچی بات یہ ہے کہ ہم سب ہی نیویارک کے بارے میں داستانیں سن سن کر سہم گئے تھے اور پھر احتیاط بھی لازم ہوتی ہے اس لیے اس موضوع پر غور و خوض شروع ہو گیا۔ ظاہر ہے انڈر گراؤنڈ موثر ترین اور بہترین ٹرانسپورٹ تھی مگر بٹ صاحب اس کے حق میں نہ تھے۔

”میں انڈر گراؤنڈ سے نہیں جاؤں گا' بہت خطرہ ہے۔“

”بھائی۔ لاکھوں مسافر اس میں سفر کرتے ہیں۔ خطرے کی کیا بات ہے؟“

”ٹرین سے باہر نکلنے کے بعد بہت لمبا سفر سنسان سرنگوں میں کرنا پڑتا ہے۔ وہاں بھیک مانگنے والے بھی ہوتے ہیں اور لوٹنے والے بھی' سنا ہے کہ جیب سے کچھ نہ نکلے تو بھی مار دیتے ہیں۔“

خان صاحب نے شرم دلائی ”یار بٹ جی۔ کچھ تو شرم کرو۔ اتنے لمبے چوڑے اور تگڑے بندے ہو اور چوہے کی طرح ڈرتے ہو' خدا کا خوف کرنا چاہیے۔“

”بھائی۔ میں پردیس میں کسی کالے یا گورے کے ہاتھوں حرام موت نہیں مرنا چاہتا۔ انسان مرے تو کسی بلند مقصد کے لیے مرے۔“

”مثال کے طور پر کشمیر میں لڑتے ہوئے شہید ہو جائے“ ہم نے کہا۔

”واقعی۔ یہ تو بڑی سعادت ہو گی۔ ویسے بھی بے خبری میں نہتے مرجانا کون سی عقل مندی ہے۔“

بس کے ذریعے سفر کرنا خان صاحب کو پسند نہ تھا ”یار کون بس اسٹاپ تلاش کرے۔

پھر یہ معلوم کرے کہ ہمارے ہوٹل کے لیے کون سے نمبر کی بس جاتی ہے۔ ساری رات پوچھ گچھ میں ہی گزر جائے گی۔ مجھے تو بڑی سخت نیند آ رہی ہے۔"

اب لے دے کے ایک ہی ذریعہ باقی رہ گیا تھا اور وہ تھی ٹیکسی۔

"ٹیکسی والا تو بہت کرایہ لے گا" خان صاحب نے اعتراض کیا۔

"جان ہے تو جہان ہے' ڈالر تو ہاتھ کا میل ہے" ہم نے شاہانہ انداز میں اعلان کر دیا اور خان صاحب نے فوراً ہاتھ اٹھا کر ٹیکسی کو ٹھہرنے کا اشارہ کر دیا۔ نیویارک میں ٹیکسی کا ملنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ دن ہو یا رات' ہر وقت ٹیکسی دستیاب ہو جاتی ہے۔ اگر کسی دور دراز علاقے میں ہیں تو فون کے ذریعے ٹیکسی بلائی جا سکتی ہے۔

پیلے رنگ کی ایک بڑی سی ٹیکسی ہمارے سامنے آ کر رک گئی۔

"لو۔ یہ تو کام ہی بن گیا۔ ڈرائیور بھی پاکستانی ہے" یہ کہہ کر خان صاحب ٹیکسی کا اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں طفیلیوں نے پچھلی سیٹ پر جگہ سنبھالی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہم پاکستانیوں کو دیکھ کر کسی دلچسپی یا جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا' سوالیہ نگاہوں سے خان صاحب کی جانب دیکھنے لگا۔

خان صاحب نے ہوٹل کا نام اور پتا بتا دیا۔ اور ٹیکسی چل پڑی۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر خان صاحب اردو میں گویا ہوئے "بھائی صاحب۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا جو ہم میں سے کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ بٹ صاحب نے ہمارے کان میں سرگوشی کی "کافی بدمزاج اور بداخلاق لگتا ہے۔"

ہم نے بھی ان کے کان میں کہا "اگر وہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا تو بلاوجہ بات کرنے کی ضرورت کیا ہے۔"

مگر خان صاحب تک ہماری کانا پھوسی کی آواز نہیں پہنچی تھی۔ وہ بدستور تعلقات استوار کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ایک بار پھر اس سے مخاطب ہو کر بولے "آپ نیویارک میں کب سے رہتے ہیں؟"

جواب میں ٹیکسی ڈرائیور نے جو کچھ کہا وہ ہم سب کے سروں پر سے گزر گیا مگر اتنا پتا چل گیا کہ وہ اردو یا انگریزی نہیں بول رہا تھا۔

ہم نے پوچھا "یو پاکستانی؟"

اس نے انکار میں سر ہلا دیا "نو۔ آئی اسپینش۔"

"لو۔ یہ تو ہسپانوی نکلا۔ شاید انگریزی نہیں جانتا" بٹ صاحب نے خیال آرائی کی۔

خان صاحب بولے "یار۔ ہوش کے ناخن لو۔ نیویارک شہر میں ٹیکسی چلا رہا ہے۔ انگریزی تو لازمی جانتا ہو گا۔"

مگر بٹ صاحب کا خیال درست نکلا۔ ٹیکسی ڈرائیور "یس' نو اور سر" کے سوا انگریزی کا چوتھا لفظ تک نہیں جانتا تھا۔ رنگت' ناک نقشے اور انداز سے وہ پاکستانی ہی نظر آ رہا تھا۔

"کمال ہے۔ بالکل پاکستانی لگ رہا ہے۔"

"یہ ہمیں ضرور چکر دے گا۔ ٹیکسی کا بہت لمبا بل بنائے گا۔"

"صبر کرو۔ اب کیا ہو سکتا ہے" ہم نے تسلی دینے کے لیے کہا مگر دل میں ڈر رہے تھے کہ کم بخت خدا جانے کتنی کھال اتارے گا؟

"اس سے تو اچھا تھا کہ سب وے سے چلے جاتے" یہ خان صاحب تھے۔

"بس میں بھی کوئی حرج نہیں تھا" بٹ صاحب نے رائے ظاہر کی۔

ہم چپ بیٹھے رہے۔ ایسے موقعوں پر چپ رہنا سب سے زیادہ عقلمندی کی بات ہے۔ کچھ دیر بعد ٹیکسی نے ایک دائرے میں چکر کاٹا اور ڈرائیور نے ایک جگہ لے جا کر ٹیکسی روک دی۔ دیکھا تو سامنے ہمارے ہوٹل کا سائن جگمگا رہا تھا بل بھی معقول ہی تھا۔ ہم اپنے شکوک و شبہات پر آپ ہی آپ نادم سے ہو گئے۔

خان صاحب نے بل ادا کرنے کے لیے ہم لوگوں سے بھی چندہ طلب کیا کیونکہ زیادہ رقم ان کے پاس نہیں تھی۔ رقم گننے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے خان صاحب کو سر سے پیر تک دیکھا اور پھر پوچھا "یو' پاکستانی؟"

"یس!"

"حشیش۔ میری جو آنا؟" ٹیکسی والے نے دانت نکال کر کہا اور ہاتھ سے مانگنے کا اشارہ کیا۔

"لعنت ہے تم پر" خان صاحب نے غصے سے کہا اور ٹیکسی سے باہر نکل کر کھڑے ہو گئے۔ پاکستانیوں کا یہ امیج بدقسمتی سے سارے یورپ اور امریکا میں بہت پرانا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

استقبالیہ پر کوئی موجود نہ تھا مگر ہمارے وہاں پہنچتے ہی کاؤنٹر کے پیچھے سے اچانک ایک سر نمودار ہوا اور اس کے بعد باقی جسم بھی سامنے آگیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر گورے صاحب تھے۔ ان کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی مگر اس کے باوجود انہوں نے مسکرا کر ہمیں "ہائی" کیا اور ہمارے کمروں کی چابیاں نکال کر ہمارے حوالے کر دیں۔ اس کے بعد وہ پھر میز کے پیچھے غروب ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

دوسرے دن آنکھ کھلتے ہی خان صاحب اور بٹ صاحب دونوں نے مشترکہ وارننگ دے دی کہ چاہے کچھ ہو جائے' آج آزادی کا مجسمہ ضرور دیکھیں گے۔ آزادی کا مجسمہ کوئی چھوٹی سی چیز تو ہے نہیں کہ جسے تلاش کرنا پڑے۔ بحری جہاز سے نیویارک آنے والوں کو وہ سب سے پہلے خوش آمدید کہتا ہے' یا کہتی ہے۔ کیونکہ یہ ایک خاتون کا مجسمہ ہے۔ نیویارک والے عام طور پر "دی لیڈی" کہہ کر اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب پناہ گزینوں نے امریکا کا رخ کیا تو سب سے پہلے انہیں نیویارک کا ساحل نظر آیا۔ یادگار کے طور پر بعد میں اس جگہ ایک مجسمہ استادہ کر دیا گیا۔ اب یہ نئے آنے والوں کے لیے امید اور خوش حالی کی علامت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مجسّمے تک جانے کے لیے بے شمار طریقے اور ان گنت راستے ہوں گے مگر ہم جیسے پردیسیوں کے لیے وہاں تک پہنچنا خاصا مشکل تھا لیکن ان دونوں حضرات کی فرمائش پوری کرنا بھی لازم تھا چنانچہ فیصلہ کیا کہ سیر کا آغاز ہی مجسّمے کا دیدار کرنے سے کیا جائے۔ ناشتا کرنے کے لیے ہم ہوٹل کے ڈائننگ روم میں ہی پہنچ گئے اور خان صاحب اس بات پر بہت پچھتائے کہ ڈائننگ کا رخ انہوں نے پہلے کیوں نہیں کیا تھا۔ یہاں ناشتے کا انداز "بوفے" کا تھا۔ یعنی انواع و اقسام کی اشیاء لمبی سی میزوں پر سجی ہوئی تھیں۔ چائے کافی کے جگ بھی موجود تھے۔ آپ جو چاہیں اور جتنا چاہیں نوش جان فرمائیں۔ ناشتے میں کھانے کی اشیاء کی بہت سی اقسام تھیں' یہی معاملہ ناشتا کرنے والوں کا بھی تھا۔ چونکہ بیشتر تعداد سیاحوں کی تھی اس لیے خان صاحب کے حسب منشاء قریب قریب سبھی سفید فام تھے اور انہیں دیکھ کر یورپ کی یادیں تازہ ہو جاتی تھیں۔ خان صاحب اور بٹ صاحب نے سیریل سے اپنے ناشتے کا آغاز کیا اور جب ناشتا ختم کیا تو یورک

کے سوا کوئی ڈش ایسی نہیں تھی جو انہوں نے کھائی یا چکھی نہ ہو۔ انتہا تو یہ ہے کہ جملہ اقسام کے مشروبات سے بھی لطف اندوز ہوئے۔ یعنی چائے، کافی، اوولٹین، جوس، ہاٹ چاکلیٹ سبھی کے ساتھ انصاف کیا۔ بعض لوگ خوش خوراک ہوتے ہیں لیکن علی الصباح ناشتے کے وقت خوش خوراکی کا مظاہرہ کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم سے تو کبھی دوسرا ٹوسٹ بھی ٹھیک سے نہیں کھایا گیا۔ تازہ پھل البتہ شوق سے کھا لیتے ہیں۔ یورپ کے لوگ ناشتے کے ساتھ پورا انصاف کرتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ دن میں لنچ نہیں کھاتے۔ ناشتا اور اس کے بعد رات کا کھانا ہی ان کے لیے کھانے کے دو مناسب اوقات ہیں۔

مرد تو مرد، خواتین بھی ناشتے کے وقت ہمیں بے احتیاطی کی مرتکب نظر آئیں۔ خان صاحب بار بار میز پر جا کر کچھ نہ کچھ لے کر آجاتے تھے۔ ایک خاتون نے جب خان صاحب کو چھٹی مرتبہ سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تو سمجھیں کہ شاید ان کے ساتھ بہت بڑی فیملی آئی ہوئی ہے اور وہ ان سب کو سروس فراہم کر رہے ہیں مگر جب انہوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ جو بھی ہے وہ محض خان صاحب کے پیٹ کا ایندھن بن رہا ہے۔ یہ ایک پختہ عمر کی صاحبہ تھیں۔ ان کے ہمراہ دو نوجوان لڑکیاں اور ایک بہت بوڑھے سے بزرگ بھی تھے جو کھانے کے معاملے میں جوانوں سے بڑھ کر تھے۔ کافی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد بڑے میاں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک نقشہ نکالا۔ اور اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ تینوں خواتین بھی آس پاس سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔ وہ لوگ آپس میں کچھ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔

خان صاحب نے انہیں دیکھا تو کہا "دیکھا آپ نے، یہ ہے سیاحت اور سیرو تفریح کا مہذب طریقہ۔ نقشہ دیکھنے کے بعد انسان کو کسی کی محتاجی نہیں رہتی۔"

ہم نے کہا "تو پھر آپ نے یہ مہذب طریقہ کیوں نہیں اپنایا؟"

ہنس کر بولے "اس لیے کہ بات چیت کے لیے کوئی بہانہ بھی رکھنا ضروری ہے"

یہ کہہ کر وہ جب اپنے لیے اوولٹین کا مگ بھرنے تشریف لے گئے تو راستے میں ان لوگوں کی میز کے پاس رکے اور کہا "معاف کیجئے۔ آپ انگریزی جانتے ہیں؟"

"کیوں نہیں؟" بڑے میاں نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ یہ نقشہ کچھ دیر کے لیے ہمیں بھی دیکھنے کو دے دیں۔"

ان سب نے حیران ہو کر خان صاحب کو دیکھا "کیوں نہیں مگر یہ نقشہ تو آپ خود بھی استقبالیہ سے لے سکتے ہیں۔"

بولے "نقشے کی بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو سب وے یا بسوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ ہم مجسمہ آزادی دیکھنے کے لیے کس طرح جا سکتے ہیں؟"

بڑے میاں تو گھور کر رہ گئے مگر خواتین نے خان صاحب کو کچھ دلچسپی سے دیکھا۔ شاید انہیں اس سے پہلے زندگی میں ایسی فرمائش سے واسطہ نہ پڑا ہوگا۔ بڑے صاحب نے اپنی اہمیت کا احساس کرتے ہی کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر سر سے پیر تک جائزہ لینے کے بعد کہا "بیٹھ جاؤ!"

خان صاحب ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"ینگ مین۔ پوچھ سکتا ہوں کہ تم کہاں رہتے ہو؟" بڑے میاں نے دریافت کیا۔

"جی میں پاکستان میں رہتا ہوں" خان صاحب نے جواب دیا "فی الحال اسی ہوٹل میں ہوں۔"

"تعجب ہے۔ کیا تمہارے ملک میں سب وے اور بسیں نہیں ہیں؟"

"جی بسیں تو ہیں مگر سب وے نہیں ہے اور ہماری بسیں بھی بہت آسان ہوتی ہیں۔"

"آسان! کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہمیں پتا ہوتا ہے کہ کون سی بس کس جگہ پر جا رہی ہے۔"

نوجوان لڑکی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "گرینڈ پا۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"اوکے اوکے" انہوں نے لڑکی کو جھڑک دیا پھر خان صاحب سے مخاطب ہوئے "دیکھو نوجوان۔ مجسمہ آزادی کا راستہ تو میں تمہیں بتا دوں گا مگر نیویارک جیسے شہر میں باقی جگہوں پر تم خود اپنی ذمے داری پر جانا۔ اگر گم ہو گئے تو تم جانو گے، اوکے۔"

"اوکے سر" خان صاحب نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

"اب ذرا غور سے سنو۔ مین ہٹن کے جنوبی علاقے میں بیٹری پارک واقع ہے۔ یہ

کافی مشہور جگہ ہے۔ تم جب سب وے کے اندر جاؤ تو کسی بھی ٹام' ڈک یا ہیری سے پوچھ سکتے ہو کہ بیٹری پارک کون سی ٹرین جائے گی۔ بس ٹکٹ لے کر اس میں بیٹھ جانا اور بیٹری پارک کے اسٹیشن پر باہر نکل جانا۔ وہاں تمہیں گانا گانے والے اور بھیک مانگنے والے بہت ملیں گے مگر تم ان کے چکر میں نہ آنا۔ باہر نکل کر فیری اسٹیشن پر پہنچ جانا۔"

"آپ کا مطلب ہے کشتی؟" خان صاحب نے دریافت کیا۔

"ہاں۔ انگریزی میں کشتی کو فیری ہی کہتے ہیں" وہ بگڑ کو بولے۔

"مگر سر' مجھے تو آزادی کا مجسمہ دیکھنا ہے۔ کشتی کی کیا ضرورت ہے؟"

"اوہ۔ میرے خدا' اس شخص کو تو کچھ بھی معلوم نہیں ہے" وہ جھلا کر بولے "ینگ مین۔ آزادی کے مجسمے تک جانے کے لیے تمہیں فیری لینی ہو گی کیونکہ یہ مجسمہ ایک جزیرے میں واقع ہے وہاں تک جانے کے لیے یا تو تم فیری لے سکتے ہو یا پھر سمندر میں چھلانگ لگا کر تیرتے ہوئے جا سکتے ہو۔ بشرطیکہ ڈوبنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ کیا سمجھے؟"

"مگر گرینڈپا۔ ہمیں میوزیم کے لیے دیر ہو رہی ہے" ایک لڑکی نے پھر یاد دلایا۔

"تم صبر کرو لڑکی۔ لوگوں کو راستہ دکھانے سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور نیک کام نہیں ہے۔"

پھر وہ خان صاحب سے مخاطب ہو کر بولے "اب تم سمجھ گئے یا نہیں؟"

خان صاحب قدرے پس و پیش کے بعد بولے "پوری طرح نہیں سمجھا مگر خیر آپ کو دیر ہو رہی ہے اس لیے بہت شکریہ۔"

"نہیں سمجھے!" انہوں نے عینک کے اوپر سے انہیں گھور کر دیکھا "اب تو یہی کسر باقی رہ گئی ہے کہ میں کاغذ پر نقشہ کھینچ کر تمہیں بتاؤں یا تمہیں خود لے کر وہاں جاؤں۔"

خان صاحب نے کہا "مگر سر۔ آپ کو پہلے ہی دیر ہو رہی ہے میوزیم جانے کے لیے۔ ویسے میں نے اس قدر انسانیت پسند اور ہمدرد شخص پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

دوسری لڑکی نے بے زار ہو کر کہا "مگر گرینڈپا' میوزیم....."

وہ بات کاٹ کر بولے "میوزیم کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا۔ ہم وہاں سے ہو کر بھی میوزیم جا سکتے ہیں اور مجسمہ آزادی تو ایسی چیز ہے جسے بار بار دیکھنا چاہیے۔ دل میں آزادی کی امنگ پیدا ہوتی ہے مگر مشکل تو یہ ہے کہ تم نوجوان نسل کے لوگوں کو آزادی سے کوئی

خاص دلچسپی نہیں ہے اس لیے کہ تم نے اس کے لیے جنگ نہیں کی ہے' قربانیاں نہیں دی ہیں۔ تمہیں سب کچھ آپ ہی آپ ریڈی میڈ مل گیا ہے" انہوں نے اچھا خاصا لیکچر دے دیا۔

لڑکیوں نے بے حد برا منہ بنا کر خان صاحب کی طرف دیکھا مگر وہ ان جان بن گئے۔ شاید دل ہی دل میں بد دعائیں دے رہی ہوں گی۔

"سنو" بڑے صاحب نے خواتین سے کہا "تیار ہو جاؤ ہم مجسمہ آزادی سے ہو کر میوزیم جائیں گے' او کے؟"

"او کے گرینڈپا" انہوں نے بے حد مری ہوئی آوازوں میں کہا۔

"مگر جانے سے پہلے تعارف ضروری ہے۔ یہ تہذیب کا تقاضا ہے" یہ کہہ کر انہوں نے خان صاحب کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا "میرا نام جارج ولیم ہے۔ میں کیلی فورنیا میں رہتا ہوں۔ یہ میری بھانجی ہے۔ میری' یہ دونوں میری نواسیاں ہیں یعنی بیٹی کی بیٹیاں۔ اس کا نام میگی ہے اور دوسری ڈیبورہ۔"

خان صاحب نے سب سے باری باری ہاتھ ملایا اور کہا "سر۔ آپ اجازت دیں تو میں بھی اپنا اور اپنے دوستوں کا تعارف کراؤں؟"

"دوست!" انہوں نے حیران ہو کر خان صاحب کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی آئے ہیں" یہ کہہ کر انہوں نے ہمیں اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ ہمارے درمیان میں صرف چند کرسیاں حائل تھیں۔ فاصلہ اتنا کم تھا کہ ہم بہ آسانی ان کی تمام گفتگو سنتے رہے تھے۔ اشارہ پاتے ہی نہایت سعادت مندی سے سر جھکا کر گرینڈپا کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

خان صاحب نے پہلے اپنا تعارف کرایا پھر ہم دونوں کو متعارف کرایا۔ خواتین کے چہروں کی بے زاری کسی قدر کم ہو گئی تھی۔ خصوصاً بڑے میاں کی بھانجی میری کا تاثر بہت حوصلہ افزا تھا۔

بڑے میاں نے کہا "ینگ مین۔ پوچھ سکتا ہوں کہ تم کیا کام کرتے ہو جو بس اور سب وے کا سسٹم بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتا اور کیا یہ سب بھی تمہارے جیسے ہیں؟"

خان صاحب کچھ سٹپٹا سے گئے۔ ہم نے فوراً ان کی مدد کی اور کہا "یہ دراصل زمیندار

ہیں، یعنی فارمر، فصل اور ٹریکٹر کے علاوہ ان کی معلومات محض مویشیوں یا مرغیوں تک ہی محدود ہیں۔"

"اور تم دونوں کیا کرتے ہو؟"

"جی ہم دونوں گاؤں میں رہتے ہیں۔ ہمارے گاؤں شہروں سے بہت دور ہوتے ہیں، وہاں بسیں وغیرہ نہیں ہوتیں۔ بس گھوڑا گاڑی اور بیل گاڑی ہوتی ہے۔ وہاں بس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ یا تو لوگ اپنی بیل گاڑی اور گھوڑا گاڑی میں سفر کرتے ہیں یا پھر پیدل چلتے ہیں۔"

بڑے میاں ایک دم خوش ہو گئے، بولے "پھر تو ان سب کی صحت بہت اچھی ہوتی ہو گی؟"

"اور کیا" ہم نے کہا "ہمارے گاؤں والے تو بیماری کا نام تک نہیں جانتے۔"

بٹ صاحب نے آہستہ سے ٹوکا۔ "بس کرو یار۔ جھوٹ کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔"

ہم نے دبی زبان میں کہا "کیا حرج ہے اگر ہم اپنے ملک کی تعریف کر دیں۔ انہیں کون سا ہمارے گاؤں دیکھنے جانا ہے۔"

بڑے میاں کے کان کھڑے ہو گئے، پوچھنے لگے "یہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے؟"

ہم نے کہا "کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں کا قیمتی وقت خراب نہیں کرنا چاہیے۔ ہم خود ہی مجسمہ آزادی دیکھنے چلے جائیں گے۔"

"خود ہی چلے جائیں گے! ہرگز نہیں، سیروسیاحت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگ آپس میں ملیں۔ نئے نئے مقامات دیکھیں۔ نئے نئے دوست بنائیں۔ کیوں، ہے کہ نہیں؟"

"بالکل ہے" خان صاحب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"لڑکیو۔ تمہیں جو کچھ تیاری کرنی ہے، کمرے میں جا کر کر لو۔ اس کے بعد ہماری روانگی ہے۔"

لڑکیاں ہم لوگوں سے معذرت کر کے رخصت ہو گئیں۔

مسٹر جارج ولیم نے کہا "تم لوگوں کو اگر کوئی تیاری کرنی ہے تو تم بھی کر لو۔"

ہم نے کہا "جی نہیں شکریہ۔ ہمیں کون سا میک اپ کرنا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو، اللہ نے مردوں کو عورتوں سے برتر بنانے کے لیے جو نعمتیں بخشی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہیں میک اپ کی حاجت نہیں ہے مگر میں کچھ دیر کے لیے اجازت چاہوں گا۔"

ہم نے خاموش نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ تاڑ گئے، ہنسنے لگے اور بولے "ارے، میک اپ نہیں کروں گا۔ بس ذرا بیلٹ باندھنا ہو گا۔ مجھے ہرنیا کی شکایت ہے نا، اس لیے۔"

اس طرح ہمیں سمجھا کر وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ بیٹھے ہوئے تھے تو خاصے تندرست اور توانا لگ رہے تھے مگر اٹھ کر کھڑے ہوئے تو بہت مختصر سے لگے۔ کمر بھی قدرے خمیدہ تھی۔ پاس ہی ایک چھڑی رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ اب ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ کافی عمر رسیدہ تھے۔ خان صاحب کا خیال تھا کہ ستر اسی سال عمر ہو گی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ پچاسی سال کے تھے۔ لیکن خاصے چاق و چوبند۔ اگلے وقتوں کی وضع داری اور روایات کا آج بھی پاس کرتے تھے۔

ہم نے کہا "ہم آپ کو ہوٹل کی لابی میں ملیں تو کیسا ہو؟"

بولے "او کے مگر دس منٹ میں وہاں پہنچ جانا۔ گھڑی ملا لو" ہم سب نے گھڑیوں میں وقت دیکھا اور انہیں رخصت کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد بٹ صاحب بہت ناراض ہوئے۔

"بلاوجہ کی ڈراما بازی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ ایک شریف آدمی کو دھوکا دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

خان صاحب بولے "بھائی ہمیں کوئی گائیڈ نہیں مل رہا تھا، کیا حرج ہے، تھوڑا وقت اچھا گزر جائے گا اور ان کا بھی کچھ نہیں جائے گا۔"

"دیکھا نہیں۔ لڑکیاں کتنی ناراض ہو رہی تھیں؟"

بولے "لڑکیوں کا کیا ہے۔ انہیں خوش ہونے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ اچھا اب چل پڑو۔ بڑے میاں گھڑیاں ملا کر گئے ہیں۔ وقت کے بہت پابند معلوم ہوتے ہیں۔"

ہوٹل کی لابی میں گئے تو استقبالیہ پر ایک بالکل نیا چہرہ جلوہ گر تھا۔ یہ ایک خوش ادا اور دلفریب خاتون تھیں۔ ہم لوگوں کو دیکھا تو دانت چمکا کر مسکرائیں "ہائی، ہائی" کیا اور آنے کا

مقصد دریافت کیا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ان کے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کمروں کی چابیاں جمع کرانے کے لیے آئے ہیں۔ وہ ایک بار پھر مسکرائیں اور سارا ماحول جگمگانے لگا۔

خان صاحب کہنے لگے "یہ اتنی خوبصورت عورت اس سے پہلے کہاں تھی۔ میرا تو ایمان تازہ ہو گیا۔"

بٹ صاحب نے تبصرہ کیا "پتا نہیں انہوں نے استقبالیہ پر کتنے لوگ رکھ چھوڑے ہیں۔ جب دیکھو ایک نیا چہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔"

ہم نے کہا "واقعی، کتنی خوبصورت خاتون ہے اور آواز بھی کتنی میٹھی ہے!"

خان صاحب ان سے مخاطب ہوئے "معاف کیجئے محترمہ آپ ہمیں بتا سکتی ہیں کہ مجسمہ آزادی دیکھنے کا بہترین طریقہ کون سا ہے؟"

خان صاحب جواب میں ان سے شیریں گفتاری کی توقع کر رہے تھے مگر انہوں نے مسکراتے ہوئے میز کے ایک کونے میں رکھا ہوا پمفلٹ اٹھایا اور خان صاحب کے حوالے کر دیا اور کہا "اس میں آپ کو سب کچھ مل جائے گا۔"

ان کے پاس سے ہٹے تو بٹ صاحب نے حسب معمول ٹوکا "ان کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

ہم نے کہا "بٹ صاحب۔ اتنی بہت سی دنیا دیکھ لی پھر بھی آپ کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ پہلی ملاقات میں کسی عورت سے اس کا نام نہیں پوچھتے ہیں۔"

بولے "کیا پتا پہلی ملاقات ہی آخری ملاقات ہو۔"

ہم نے کہا "پھر تو نام دریافت کرنے کی کوئی تک ہی نہیں ہے۔"

بٹ صاحب بڑبڑانے لگے "خود دنیا بھر کی حرکتیں کرتے پھرتے ہیں۔ میں نے نام پوچھنے کا کہہ دیا تو کون سی قیامت آگئی۔"

خان صاحب نے ہم سے کہا "اسے کچھ دیر دل کا غبار ہلکا کر لینے دیں پھر خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

ہم دونوں صوفوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ دس منٹ گزر گئے مگر جارج ولیم کی شکل نظر نہیں آئی۔ بارہ، پندرہ یہاں تک کہ بیس منٹ گزر گئے۔ بٹ صاحب بولے "لگتا ہے ہمیں چکر دے کر چلے گئے بڑے میاں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے" ہم نے کہا۔

مگر خان صاحب بدستور پراعتماد تھے، کہنے لگے "دیکھ لینا۔ وہ لوگ ضرور آئیں گے۔"

اور قریباً آدھے گھنٹے بعد وہ سچ مچ آگئے۔ مسٹر جارج ولیم نے ایک نیا سوٹ زیب تن کر لیا تھا اور وہ اپنے سفید برف جیسے بالوں پر ایک عنابی رنگ کا فلیٹ ہیٹ پہن کر آئے تھے جس کی وجہ سے ان کے وقار میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ کہنے لگے "یہ ہوا سے سر کو محفوظ رکھتا ہے۔"

ہم نے کہا "بشرطیکہ تیز ہوا سے اڑ نہ جائے۔"

"بہت شریر ہو" بڑے میاں آنکھیں جھپکا کر مسکرائے۔ ہم نے اپنی گھڑی کی جانب دیکھا۔ مطلب انہیں یہ احساس دلانا تھا کہ وہ کافی دیر سے آئے ہیں۔ انہوں نے دونوں شانے اچکائے اور منہ بنایا۔ اتنی دیر میں خواتین بھی نمودار ہو گئیں۔ جب انہیں دیکھا تو تاخیر کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ ان تینوں نے نہ صرف اپنا میک اپ ری ٹچ کر لیا تھا بلکہ لباس بھی تبدیل کر لیے تھے۔ پہلے والا لباس اگر "ستیاناس" تھا تو یہ لباس "سوا ستیاناس" سمجھ لیجیے۔ ہم اگر ان کے گرینڈپا ہوتے اور ان کے ہمراہ جا رہے ہوتے تو ایسا لباس پہننے کی ہرگز اجازت نہ دیتے لیکن افسوس کہ ہم ان کے گرینڈپا نہیں تھے اور مغرب میں بزرگوں سے اجازت لینے کا دستور متروک ہو چکا ہے۔

"معاف کرنا، کچھ دیر ہو گئی۔ دراصل گھومنے پھرنے کے لیے لباس بھی ہلکا پھلکا ہونا چاہیے، کیوں کیا خیال ہے؟" میری نے ان سب کی جانب سے معذرت پیش کی۔

جن ملبوسات کو وہ ہلکا پھلکا قرار دے رہی تھیں ان کا معاملہ یہ تھا کہ بقول شاعر ؎

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

خان صاحب نے بڑے میاں سے عرض کیا "آپ بھی کوئی ہلکا پھلکا لباس پہن لیتے تو اچھا تھا۔"

وہ بولے "یہ خرافات ان عورتوں کو ہی مبارک ہو۔ ہمیں اب چلنا چاہیے۔"

مسٹر جارج کی قیادت میں یہ قافلہ رخصت ہوا۔ سب وے اسٹیشن ہوٹل سے دور نہیں تھا۔ کافی صاف ستھرا نظر آیا دیواروں پر کچھ لکھا ہوا بھی نہیں تھا۔ مشین کے پاس جا کر بڑے صاحب نے سب سے پہلے ٹکٹ حاصل کیا پھر دوسروں کو اشارہ کیا۔ تمام لڑکیوں نے

باری باری اپنے اپنے پیسوں سے ٹکٹ خریدے۔ ظاہر ہے کہ ہم کو بھی اپنے ٹکٹ خود ہی خریدنے تھے۔ خان صاحب سب سے آگے تھے اس لیے انہوں نے ہم سب کے لیے تین ٹکٹ خرید لیے۔ یہ ہماری مشرقی روایات اور تہذیب کا اثر تھا۔

مغرب میں اس قسم کی باتوں پر اب کسی قسم کی حیرت نہیں ہوتی ہے۔ جس رفتار سے ہم مغرب کی باتیں اپنا رہے ہیں کوئی عجب نہیں کہ چند سالوں کے بعد ہمارے ہاں بھی یہی سسٹم رائج ہو جائے۔ ٹرین میں کافی رش تھا اس لیے شروع میں ہم سب کو کھڑا رہنا پڑا۔ جب ایک سیٹ خالی ہوئی تو خان صاحب نے اس کے نزدیک ہونے کے باوجود بیٹھنا پسند نہ کیا۔ بلکہ میگی کی جانب دیکھا۔ اتنی دیر میں ایک موٹی سی اطالوی قسم کی خاتون اس سیٹ پر تشریف فرما ہو گئیں۔ اگلی بار تین سیٹیں خالی ہو گئیں۔ بڑے صاحب پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکیاں بھی سیٹوں پر براجمان ہو گئیں۔ بٹ صاحب کو بھی ایک سیٹ مل گئی تھی مگر وہ اس پر اٹھتے بیٹھتے رہے۔ وہ یوں کہ جب کوئی خاتون کھڑی ہوئی نظر آتی تھیں' وہ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہماری ہم سفر خواتین ان کی اس "اٹھک بیٹھک" پر مسکرا رہی تھیں۔ خان صاحب آخر وقت تک سیٹ پر نہیں بیٹھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انڈر گراؤنڈ ٹرین میں کھڑے ہو کر سفر کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہے مگر اصل سبب ایک دلربا خاتون تھیں جو ان سے آگے کھڑی ہوئی تھیں اور انہوں نے بھی شاید سیٹ پر نہ بیٹھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ممکن ہے ان کے متناسب جسم کی تراش خراش میں اس "ٹوٹکے" کا بھی کچھ دخل ہو یعنی کھڑا رہنا۔ یہ خان صاحب کا خیال تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک دو بار وہ اور خان صاحب ایک دوسرے سے مخاطب بھی ہوئے۔ بعد میں دریافت کرنے پر خان صاحب نے بتایا کہ ایک بار تو انہوں نے فرمایا تھا کہ موسم کتنا اچھا ہے اور دوسری بار جب کوئی صاحب انہیں دھکا دے کر نکل گئے تو انہوں نے لوگوں کی عجلت پسندی کے بارے میں کوئی تبصرہ کیا تھا۔

بٹ صاحب بولے "یار۔ اتنی دیر میں اس نے صرف دو باتیں کیں اور وہ بھی تم سے نہیں کیں۔ تمہارا اتنی دیر تک کھڑا رہنا تو بے کار ہی گیا۔"

بیٹری پارک کے اسٹیشن پر اتر کر ہم لوگ سب وے سے باہر پہنچ گئے۔ وہاں تو ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ بیشتر تعداد سیاحوں کی تھی جو "لیڈی" کو دیکھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ نیویارک کے لوگ اس مجسمے کو "لیڈی" کہتے ہیں' کوئی شخص نیویارک جائے اور مجسمہ

آزادی کو نہ دیکھے' یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک ہجوم تھا جس میں ہر عمر اور نسل کے لوگ شامل تھے۔ موسم خاصا خوشگوار تھا مگر فیشن کے مطابق خواتین نے کم سے کم لباس پہننے کا مقابلہ سا شروع کر رکھا تھا۔ ہم جن خواتین کے ساتھ تھے وہ بھی اس مقابلے میں کسی سے پیچھے نہ تھیں۔

خان صاحب نے کہا "ایسی جگہوں پر عورتوں کے اس قسم کے لباس پر پابندی لگا دینی چاہیے۔"

"وہ کس لیے؟"

"تاکہ دیکھنے والے ان چیزوں کو دیکھ سکیں جنہیں دیکھنے کے لیے اتنی دور دور سے آتے ہیں۔ یہاں تو سب مجسمہ آزادی کی جگہ خواتین ہی کو دیکھ رہے ہیں۔"

بٹ صاحب کہنے لگے "آپ جیسے ندیدے دیکھ رہے ہیں۔ ہم جیسے سیر چشم تو مناظر دیکھ رہے ہیں۔ آپ خود بتائیے کہ آپ کو اتنی دیر میں ایک مرتبہ بھی "لاحول" کی آواز سنائی دی ہے؟"

بات تو ان کی درست تھی ورنہ قابل اعتراض ملبوسات کو دیکھ کر ان کی زبان سے "لاحول" کا نعرہ نکلنا ایک طے شدہ امر تھا۔

بیٹری پارک ایک وسیع و عریض' خوب صورت سیرگاہ ہے۔ یہاں سے کھڑے ہو کر بھی آپ مجسمہ آزادی کو دیکھ سکتے ہیں۔ درمیان میں سمندر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا حائل ہے جس سے کشتی کے ذریعے لبرٹی آئی لینڈ یعنی "جزیرہ آزادی" تک پہنچنے میں بیس پچیس منٹ لگتے ہیں۔ یہاں سے کشتیاں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چلتی رہتی ہیں جو لوگ جلدی پہنچ کر اگلی قطاروں میں کھڑے ہو جاتے ہیں انہیں ان کشتیوں کے بالائی حصے پر جگہ مل جاتی ہے۔ اوپر کے ڈیک پر خوب رونق اور گہما گہمی تھی۔ عورتوں کا ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ بٹ صاحب نے اس کا نام "غیر سرکاری مقابلہ حسن" رکھ دیا۔ لیکن یہ اس لحاظ سے زیادہ اہم تھا کہ اس مقابلہ حسن میں حصہ لینے والی خواتین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس طرح ججوں کی تعداد بھی بے تحاشا تھی۔ یوں سمجھیے کہ ہر مرد اس مقابلے کے لیے جج کی حیثیت رکھتا تھا اور تو اور مسٹر جارج ولیم بھی شریک حسیناؤں کو نمبر دینے میں بڑی کشادہ دلی کا ثبوت دے رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ پچاس ساٹھ مرتبہ یہاں آچکے ہیں اور

جب پہلی بار انہوں نے یہ مجسمہ دیکھا تھا تو ان کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔

خان صاحب نے پوچھا "سر۔ اس وقت سے آج تک آپ نے کتنا فرق محسوس کیا؟؟"

بولے "فرق کیا ہوتا' ینگ مین۔ یہ مجسمہ پتھر کا بنا ہوا ہے۔ ظاہر ہے اس کے قدو قامت میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی یہ وقت کے ساتھ بوڑھا ہو سکتا ہے۔"

ہم نے کہا "ان کا مطلب یہ ہے کہ کراؤڈ میں آپ کو کیا تبدیلی نظر آتی ہے؟"

بولے "اب لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور فرق نہیں ہے۔ مرد اسی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر عورتوں کو دیکھتے ہیں اور عورتیں اسی طرح بن ٹھن کر آتی ہیں۔"

ہم نے کہا "مگر لباس میں تو فرق پڑ گیا ہو گا؟"

بڑے میاں کہنے لگے "گرمی کے موسم میں تو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ دراصل کم لباسی کا فیشن آج بھی وہی ہے جیسا ساٹھ ستر سال پہلے تھا۔ عورتیں بھی ویسی ہی طرح دار ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب میں انہیں دیکھ کر سیٹی نہیں بجاتا۔"

لبرٹی آئی لینڈ تک پہنچتے ہوئے نیویارک کا ایک حصہ آنکھوں کے سامنے پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ بڑے میاں نے ہمیں بتایا کہ وہ سامنے جو اونچی اونچی خوبصورت عمارتیں ہیں وہ وال اسٹریٹ ہے۔ مین ہٹن کا ایک حصہ بھی یہاں سے بخوبی نظر آتا ہے۔ یہ ایک دلفریب اور پرشکوہ منظر ہے۔ میں نے شاید بتایا ہے کہ نیویارک ایک ہیبت طاری کر دینے والا شہر ہے۔ خوبصورتی' رعب اور وقار کے معاملے میں اس کا ہمسر کوئی نہیں ہے۔ اس کے کئی رخ اور کئی انداز ہیں اور ہر انداز دوسرے سے یکسر مختلف اب یہی دیکھیے کہ لبرٹی آئی لینڈ کو جاتے ہوئے مختصر سے وقت میں نیویارک کا ایک انوکھا رخ نظر آتا ہے۔ اتنی بلند و بالا بلڈنگیں اور اسکائی اسکریپرز دوسرے شہروں میں گنتی کے ہوتے ہیں مگر نیویارک میں ان کی تعداد سینکڑوں میں ہے اور ہر عمارت حسن اور جاہ و جلال میں دوسری سے مختلف نظر آتی ہے۔ نیویارک کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ دور سے دیکھنے میں زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اگر اس کی سڑکوں پر سے دیکھیں تو یہی عمارتیں ڈراؤنے جنات کا روپ دھار لیتی ہیں۔

خان صاحب اور بٹ صاحب اس بحری سفر میں بہت زیادہ مصروف ہو گئے تھے۔ ایک

تو آس پاس کا منظر اور پھر مہربان ہم سفر۔ تینوں خواتین ان سے گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ خدا جانے موضوع کیا تھا۔ ہمارے حصے میں ۸۵ سالہ جارج ولیم آئے تھے۔ وہ ہمیں اپنی جوانی کے قصے سنانے میں مصروف تھے۔ بوڑھے سب جگہ کے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ انہیں ماضی کی داستانوں کے سوا کوئی اور دل پسند موضوع نہیں سوجھتا۔ اس زمانے کی ہر بات انہیں ایک رنگین و حسین پردے میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سننے والوں کو رنگین چلمن نظر نہیں آتی۔ خاص طور پر اگر وہ جوان ہوں۔

لیجیے۔ لبرٹی آئی لینڈ آگیا۔ سب لوگوں نے صبر و تحمل کے ساتھ کشتی سے اترنا شروع کر دیا۔ ہمارے لوگ ہوتے تو دھکم پیل شروع ہو جاتی۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ اس ہنگامے میں سمندر میں بھی گر جاتے پھر ساحل پر پہنچ کر بھکاریوں سے واسطہ پڑتا مگر یہاں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ یہ سب لوگ آزادی کی یادگار کو دیکھنے اور خراج تحسین پیش کرنے آئے تھے۔

یہ مجسمہ دور سے جتنا خوبصورت نظر آتا ہے' قریب سے ایسا نہیں لگتا مگر رعب دار ضرور ہے۔ اس کی اونچائی ۱۵۱ فٹ ہے اور حجم بھی کافی ہے۔ اوپر جانے کے لیے لفٹیں موجود ہیں۔ نچلی منزل پر ایک میوزیم ہے جسے "پناہ گزینوں کا میوزیم" کہتے ہیں۔ معلومات فراہم کرنے کے لیے جارج ولیم صاحب موجود تھے' جنہیں ساری باتیں ازبر تھیں۔

"یہ میوزیم ۱۹۷۲ء میں کھولا گیا تھا۔ یہاں' اس سرزمین پر آنے والوں کی تاریخ موجود ہے۔ جن اقوام نے امریکا کو جنم دیا ہے۔ ان سب کی تاریخ یہاں موجود ہے۔" ہمارے برابر ہی ایک لمبے تڑنگے سیاہ فام صاحب اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے۔ "ہم کالوں کے لیے یہ عمارت پتھروں کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"یہ آزادی کا مجسمہ ہے مگر ہم کالوں کو آزادی کب ملی ہے؟ یہی حال انڈین لوگوں کا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس سرزمین کے اصل باسی غلام بنا لیے گئے اور باہر سے آنے والوں نے آزادی حاصل کر لی" وہ زور زور سے ہنسنے لگے۔

ان کی ساتھی گوری میم نے کہا "اس طرح نہ ہنسو۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

کالے نے کہا "اگر تم میری طرح کالی ہوتیں تو تم بھی اسی طرح ہنستیں۔ یہ تاریخ کی ہنسی ہے جو امریکا پر ہنس رہی ہے۔"

جارج ولیم نے آنکھیں جھپکا کر ہمیں دیکھا اور بولے "اچھا ہے' اس طرح بولنے
ان کے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے" پھر پوچھا "جانتے ہو امریکا کو کس چیز نے متحد
مضبوط بنا کر رکھا ہے؟"

ہم نے انکار میں سرہلا دیا۔ کون پہیلی حل کرنے بیٹھ جائے۔

کہنے لگے "اظہار کی آزادی نے۔ اگر ان لوگوں کو بولنے کی آزادی نہ ہوتی تو آج ہ
ملک بھی آزاد نہ ہوتا" واقعی' فلسفہ تو درست ہی لگتا ہے۔

لوگوں کے ہجوم میں بہتے ہوئے خان صاحب بھی ہمارے پاس پہنچ گئے۔ میری ان
ساتھ تھی۔ بٹ صاحب اور باقی دونوں لڑکیاں دور دور تک نظر نہیں آرہی تھیں۔

ہم نے پوچھا "بٹ صاحب کہاں گئے؟"

بولے "اوپر۔ آزادی کے سر پر چڑھنے گئے ہیں۔"

ہمیں تو اس مجسّمے کی تاریخ کا علم نہ تھا مگر جارج ولیم صاحب باتوں باتوں میں ہمی
سب کچھ بتا چکے تھے۔ مثلاً یہ کہ امریکا کی آزادی کا یہ مجسمہ خود امریکیوں نے نہیں بنایا بل
یہ فرانس والوں کی طرف سے انہیں دوستی کے تحفے میں ملا تھا۔ فرانس کی حکومت نے
مجسمہ پیرس میں بنوایا تھا اور اس کی تعمیر میں دس سال لگے تھے۔ اس مجسّمے کو سب سے پہ
پیرس کے شہریوں نے دیکھا تھا اور بعد میں اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے لکڑی کے ۲۱۴ بڑ
بڑے صندوقوں میں بند کرکے نیویارک بھیج دیا گیا اور لبرٹی آئی لینڈ میں اسے دوبارہ جوڑ ک
موجودہ شکل دے دی گئی۔ اس مجسمہ کی رسم افتتاح صدر کلیولینڈ نے ۱۸۸۶ء میں ادا ک
تھی۔ دوسروں کا تحفہ سہی مگر امریکی اس مجسّمے کو بہت احترام دیتے ہیں۔ شاید ان کی اکثری
کو بھی اس کی حقیقت کا علم نہیں ہے مگر اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ امریکا ایک
ایسا ملک ہے جہاں سبھی لوگ باہر سے آئے ہیں اور انہوں نے ایک اجنبی سرزمین کو ا
وطن بنایا ہے۔ اگر ان کی آزادی کا مجسمہ بھی باہر سے آگیا تو کون سی قیامت آگئی؟

پناہ گزینوں کے میوزیم کو دیکھنے کے بعد ہی لوگ مجسّمے کی لفٹ پر سوار ہو کر اس ک
دماغ تک پہنچتے ہیں۔ لیڈی کے تاجپوش سر سے مین ہٹن کا نظارہ بہت دلکش لگتا ہے۔
سمندر میں بے شمار کشتیاں تیرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور آسمان پر ہیلی کاپٹر پرواز کرتے ہیں۔
یہ سب سیاح ہیں جو زمین سے' سمندر سے اور آسمان سے نیویارک کا نظارہ کرنے میں

صروف ہیں۔ نیویارک میں سیاحوں کی سہولت کے لیے ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر سے لے کر
نی کی کشتی اور سائیکل تک ہر قسم کی سواری دستیاب ہو جاتی ہے۔ اگر سیاحوں کے چھوٹے
بچے ہمراہ ہیں تو کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ ٹیلی فون کیجیے اور بے بی سٹنگ کے لیے ایجنسی
ے کسی کو بلا لیجیے۔ ان کی فیس معقول ہوتی ہے اور ستم یہ ہے کہ آمد و رفت کا کرایہ بھی
نہیں بلانے والوں کو ہی ادا کرنا پڑتا ہے۔ مین ہٹن کے اردگرد سیر کے لیے کشتیوں کے
ریعے بھی گھمایا جاتا ہے۔ یہ کشتیاں ۴۲ویں اسٹریٹ پر دریائے ہڈسن کے پتن سے چلتی
ں اور ۳۵ میل کا چکر کاٹ کر آپ کو پھر وہیں پہنچا دیتی ہیں۔ اس سفر میں تین گھنٹے لگتے
ں اور گائیڈ سامنے کے مقامات کے بارے میں جھوٹ سچ قصے کہانیاں بیان کرتے رہتے
ں۔

نیویارک کو دیکھنے کا ایک ذریعہ ہیلی کاپٹر بھی ہے۔ ہیلی کاپٹر پر پانچ منٹ سے لے کر
ھے پونے گھنٹے تک کی پرواز کرائی جاتی ہے۔ آپ کی جیب میں جتنی گنجائش ہے اتنی سیر
لیجیے۔ پانچ منٹ کی سیر میں صرف اقوام متحدہ کے دفاتر تک لے جاتے ہیں۔ طویل سیر
، ذریعے آپ تمام نیویارک کا طائرانہ نظارہ کر سکتے ہیں۔ ایک ہوائی ٹرام سروس بھی ہے
مین ہٹن اور جزیرہ روز ویلٹ کو آپس میں ملاتی ہے۔ چاہیں تو اس میں بیٹھ کر نیویارک کا
رہ کریں۔ ہمارا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ یہ تمام طریقے نیویارک کی سڑکوں پر کار کے ذریعے
کرنے کے مقابلے میں بہت بہتر ہیں۔ ان سے دیکھنے والوں کو صرف نیویارک کا حسن نظر
ہے۔ بدصورتی نہیں دکھائی دیتی۔

خان صاحب تو جارج ولیم اینڈ فیملی کو لنچ کھلانے کا پروگرام بنا رہے تھے مگر لڑکیوں کو
زیم جانے کی پڑی تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنی نازک کلائیوں میں بندھی
ی گھڑیوں کی طرف نظریں ڈال لیتی تھیں۔ جیسے ہی لبرٹی آئی لینڈ سے ہم لوگ واپس
ی پارک پہنچے انہوں نے توتے کی طرح آنکھیں پھیرلیں اور "بائی" کہہ کر رخصت ہو
ں۔ صرف بڑے میاں کا ووٹ ہم لوگوں کے حق میں تھا۔ شاید اس لیے کہ انہیں کافی
ے کے بعد جوانی کے قصے سننے والے سامعین ہاتھ آئے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ ہمارے
ہی رہ جاتے مگر بے چارے مجبور تھے۔

بیٹری پارک کا علاقہ بہت بارونق اور خوب صورت ہے۔ ہمارے پاس وقت کم تھا اور

نیویارک جیسا غدار شہر ہمیں دیکھنا تھا۔ خان صاحب کا مشورہ تو یہ تھا کہ دو چار مشہور مقاما
دیکھ لو۔ باقی کے لیے نقشے پر نظر ڈال لو۔ اس کے سوا نیویارک دیکھنے کا کوئی مناسب طر
نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر چند روز کے قیام کے دوران۔ جس طرح حلوائی کی دکا
مٹھائی کے شوقین حضرات بوکھلا جاتے ہیں یا جو حال کھلونوں کی دکان پر پہنچ کر بچوں کا
ہے۔ وہی نیویارک پہنچ کر ہمارا ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے کم وقت میں کیا
دیکھیں اور کیا کیا نہ دیکھیں۔ اور جو کچھ دیکھیں وہ کیوں کر دیکھیں۔ سب وے کے اسٹیشنو
کا ہمیں علم تھا مگر راہ میں اور کون سے مقامات آتے ہیں یہ پتا نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک چینی محاورہ ہے کہ جب سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کرنا چاہیے تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ کچھ بھی نہ کرو لہٰذا ہم نے بھی اسی پر عمل کیا اور سب وے کے نزدیک فٹ پاتھ کی ایک بینچ پر جا کر بیٹھ گئے۔

خان صاحب بولے "بھائی یہ بھی تو نیویارک ہے۔ بس یہیں سے دیکھ لو۔ دیگ کا اندازہ لگانے کے لیے بھی ایک چاول کا دانہ ہی دیکھا جاتا ہے۔"

بٹ صاحب نے فوراً اختلاف کیا "خان صاحب۔ دیگ میں اور نیویارک میں بہت فرق ہے۔ اگر اسی طرح دیکھنا تھا تو پھر نقشے پر ہی دیکھ لیتے۔ یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

خان صاحب بولے "میں تو اب بھی اسی کے حق میں ہوں۔ نقشے کے ذریعے نیویارک دیکھنے کا فائدہ یہ ہے کہ جان کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔"

ایک تنہا خاتون کسی طرف سے نمودار ہوئیں اور ہمارے برابر والی بنچ پر بیٹھ گئیں۔ ہم سب کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو گئی۔ کافی اچھی شکل و صورت تھی۔ باقی چیزیں بھی بری نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنے بڑے سے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور جیکٹ کی جیب سے لائٹر نکال کر سگریٹ سلگا لی۔

بٹ صاحب بولے "کتنی پیاری شکل کی لڑکی ہے مگر بگڑ گئی ہے۔"

"آپ کو کس نے بتایا کہ بگڑ گئی ہے؟"

"اس کی حرکتیں دیکھ لو۔ اتنے بڑے خطرناک شہر میں اکیلی پھر رہی ہے۔ سگریٹ پی رہی ہے۔ ہیروئن اور شراب بھی پیتی ہو گی۔ سمجھ میں نہیں آتا ان کے ماں باپ انہیں کیوں نہیں منع کرتے؟"

خان صاحب بولے "ماں باپ کا پتا ہو تو وہ منع کریں اور یہاں تو سب آزاد ہیں۔ کوئی

کسی کو منع نہیں کر سکتا۔"

خاتون نے ہماری طرف دیکھا اور مسکرائیں۔ خان صاحب فوراً چوکنا ہو گئے۔

"ارے' یہ تو ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ کتنی ہنس مکھ لڑکی ہے۔"

دوسرے لمحے وہ لڑکی کھسک کر ہمارے نزدیک آگئی "ہائی!" اس نے کہا۔

جواب میں "ہائی" کی تین عدد آوازیں بلند ہوئیں۔

"ٹورسٹ؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"یس۔ یس۔ یس" پھر تین آوازیں بلند ہوئیں۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" بٹ صاحب نے کہا "وہ کیا سوچے گی؟ ایک بات کے جواب میں سب بول پڑتے ہیں۔ کسی ایک ہی کو جواب دینا چاہیے۔"

"تو پھر میں مترجم بن جاتا ہوں" خان صاحب نے جلدی سے کہا "بٹ صاحب کی تو انگریزی بھی ایسی ہے کہ خواہ مخواہ شرمندگی ہو گی۔"

لڑکی نے سگریٹ کے چند کش لگائے اور اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

خان صاحب نے سرگوشی میں کہا شرط لگالو۔ یہ نشہ کر رہی ہے۔"

"کتنی اچھی لڑکی ہے!" بٹ صاحب نے تبصرہ کیا "اس طرح تو یہ برباد ہو جائے گی۔"

لڑکی دو چار کش لگانے کے بعد کچھ اور نزدیک آگئی اور پوچھنے لگی "لائیک ٹو اسموک؟"

"لاحول ولا قوۃ" بٹ صاحب نے دبی زبان سے کہا "یہ تو ہمیں بھی نشہ باز بنا دے گی۔ چلو یہاں سے۔" وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے ساتھ ہم دونوں بھی اٹھ گئے۔ لڑکی نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا پھر سگریٹ کے ایک دو مزید کش لگائے اور آپ ہی آپ مسکرانے لگی۔ ہم لوگ فٹ پاتھ پر کچھ دور تک خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر بٹ صاحب نے کہا "کتنا اندھیر ہے۔ دن دہاڑے ہمیں نشہ پلانا چاہتی ہے۔ اچھا ہوا ہم وہاں سے آگئے۔"

"وہ زبردستی تو آپ کو نشہ نہیں پلا سکتی تھی" خان صاحب نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

ہم نے کہا "خان صاحب۔ اگر وہ دو چار بار اور مسکراتی اور بالکل قریب آجاتی تو بات

کچھ اور ہو جاتی۔"

خان صاحب کچھ لاجواب سے ہو گئے اور پولیس پر غصہ اتارنے لگے "لگتا ہے کہ پولیس بھی ان لوگوں سے ملی ہوئی ہے۔ تب ہی تو یہ کھلم کھلا ہیروئن پی رہی ہے اور دوسروں کو بھی لالچ دے رہی ہے۔"

ہم نے کہا "یہ پیڈلر ہے۔"

"پیڈلر!" بٹ صاحب نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا "مگر وہ تو پیدل تھی۔"

"جو لوگ منشیات فروخت کرتے ہیں انہیں امریکا میں پیڈلر کہتے ہیں۔"

"دیکھ لینا یہ قوم تباہ ہو کر رہے گی۔ برباد ہو جائے گی۔ یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ خوبصورت لڑکیاں یوں سڑکوں پر دن دیہاڑے ہیروئن کی دعوت دیتی پھر رہی ہیں۔ یہ بھی کوئی ملک ہے؟"

خان صاحب نے کہا "یہ اس سے تو اچھا ہے کہ بدصورت مرد گناہ کی دعوت دیتے پھریں' حسین گناہ اسی کو کہتے ہیں شاید۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں کہیں اور چلنا چاہیے۔" بٹ صاحب بولے۔

"مثلاً کہاں؟"

"یار نیویارک میں اقوام متحدہ کا دفتر بھی ہے اور ہمیں وہاں ضرور جانا چاہیے۔"

"وہ کس لیے۔ کسی سے ملاقات کا وقت مقرر ہے؟"

"وہاں کشمیر کا مسئلہ اٹکا ہوا ہے۔ آخر ہم پر بھی تو کوئی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔"

کشمیر کے مسئلے پر بٹ صاحب کے جذبات کا ہمیں اندازہ تھا اس لیے فوراً معاملہ رفع دفع کرا دیا اور کہا "ٹھیک ہے۔ اقوام متحدہ کے دفتر چلتے ہیں۔ نیویارک آکر اقوام متحدہ کا دفتر نہ دیکھنا تو بیوقوفی ہے۔"

فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر خان صاحب نے ٹیکسی کے لیے ہاتھ ملانا شروع کر دیا۔ چند لمحے بعد ایک ٹیکسی ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ ہم تینوں ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یو این ہیڈ کوارٹر" بٹ صاحب نے بڑے رعب سے انگریزی لب و لہجے میں کہا۔

"پلیز!" ٹیکسی ڈرائیور کے گھورنے پر خان صاحب نے اضافہ کر دیا۔ ڈرائیور نے میٹر

ڈاؤن کر کے ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔

"ہسپانوی لگتا ہے" خان صاحب نے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھ کر کہا۔

"پتا نہیں انگریزی بھی جانتا ہے یا نہیں؟"

"یہ لوگ بھی بالکل پاکستانیوں کی طرح ہوتے ہیں۔"

"انگریزی جانے یا نہ جانے، تمہیں کیا۔ مطلب کی بات وہ سمجھ گیا ہے۔"

"یہاں سے اقوام متحدہ کتنی دور ہے؟" بٹ صاحب نے سوال کیا "کہیں یہ ہمیں مبادا چکر ہی نہ دے دے۔"

"اپنوں کو کون چکر دیتا ہے جناب" ٹیکسی ڈرائیور یکایک بول پڑا۔

ہم تینوں حیران رہ گئے "تم پاکستانی ہو؟"

"سو فیصد" وہ فخریہ انداز میں مسکرایا "بادشاہو تسی کتھوں تشریف لائے او؟"

لیجئے اب اس نے پنجابی بولنی شروع کر دی۔

"ہم لاہور سے آئے ہیں۔" بٹ صاحب جلدی سے بول پڑے "دراصل ہم میامی سے آئے ہیں۔ اس سے پہلے ہم ٹوکیو سے آئے تھے مگر۔"

"بس کرو یار۔ بس توتے کی طرح رٹا ہوا سبق سنانے لگے۔ اتنی لمبی تقریر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کہہ دو کہ لاہور سے آئے ہیں۔ بس کافی ہے۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو اس بات پر بٹ صاحب، خان صاحب سے لڑ پڑتے مگر نیویارک میں ہم وطن کے ملنے کی خوشی میں انہوں نے خان صاحب کو معاف کر دیا۔

"بھائی صاحب۔ آپ کا نام کیا ہے؟" خان صاحب نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"نام تو میرا منظور حسین ہے مگر یہاں سب مجھے "لاٹ" کہتے ہیں۔"

"سب کون؟" بٹ صاحب نے احمقانہ سوال کیا "تمہارا مطلب ہے امریکی؟"

"اجی امریکیوں پر لعنت بھیجو۔ ان سے کون ملتا ہے، اپنی تو دنیا ہی الگ ہے۔"

"لاٹ صاحب، بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" اس کے بعد تعارف کی رسم ادا ہوئی۔

"فکر ہی نہ کرو بادشاہو" وہ ہماری مختصر روداد سن کر بولا "ساری پریشانی بھول جاؤ۔ میں تمہیں نیویارک گھماؤں گا مگر اقوام متحدہ جا کر کیا کرو گے۔؟"

"دیکھیں گے، تاریخی جگہ ہے۔"

"اور ہم وہاں جا کر مظاہرہ بھی کریں گے" بٹ صاحب بولے۔

"دل خوش کر دیا پہلوان" لاٹ صاحب نے نعرہ لگایا "میرے پاس پاکستان کا جھنڈا بھی ہے۔ بس خاموش مظاہرہ کر دیں گے، ٹھیک ہے؟"

"بالکل۔"

اس طرح ہم گویا ایک جلوس کی صورت میں اقوام متحدہ کے دفتر کے سامنے پہنچ گئے۔ یو این پلازا ایک وسیع و عریض جگہ ہے۔ یو این او کی عمارت کا ایک حصہ بہت بلند ہے اور دوسرا نیچا۔

"یہ لوگ دنیا کے ساتھ کیا انصاف کریں گے" لاٹ صاحب نے فرمایا "یہ تو اپنی بلڈنگ میں بھی اونچ نیچ ختم نہیں کر سکے۔ کمزور ملکوں کے لیے یہاں بے انصافی ہی بے انصافی ہے۔ اندھیر ہی اندھیر ہے۔"

انہوں نے اپنی ٹیکسی کافی فاصلے پر پارک کر دی تھی۔ اس کی ڈکی میں سے انہوں نے پاکستان کا ایک جھنڈا بھی نکال لیا تھا جسے ہم چاروں نے دونوں جانب سے تھام رکھا تھا اور ایک بینر کی طرح اٹھائے ہوئے یو این پلازا میں کھڑے خاموش احتجاجی مظاہرہ کر رہے تھے۔ لاٹ صاحب نے اس مظاہرے کو خاموش نہیں رہنے دیا اور کشمیر کے حوالے سے اقوام متحدہ کی خاموشی پر ایک تقریر شروع کر دی۔ پلازا سیاحوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں سے کچھ چلتے پھرتے ہماری طرف بھی آ گئے اور دلچسپی سے لاٹ صاحب کی تقریر سننے لگے۔ ایک پولیس والا جو کچھ فاصلے پر کھڑا تھا، ایک دم الرٹ ہو گیا اور تیزی سے چلتا ہوا کچھ فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ بٹ صاحب اپنی انگریزی کے ہاتھوں مجبور تھے مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ اقوام متحدہ کی عمارت کے سامنے جائیں اور احتجاج نہ کریں چنانچہ انہوں نے اردو اور پنجابی میں اپنے دل کی بھڑاس نکالنی شروع کر دی۔ آنے جانے والے کچھ دیر ٹھہرے اور پھر آگے بڑھ گئے۔ چند منٹ کے بعد بٹ صاحب کے دل کا غبار کافی ہلکا ہو گیا۔ ہم لوگ بھی اس اعصابی کشیدگی سے باہر نکل آئے جس میں کچھ دیر پہلے مبتلا تھے۔ جارج ولیم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دوسروں کو اظہار کی آزادی دے کر امریکا نے اپنی آزادی پکی کر لی ہے۔

اقوام متحدہ کا سیکرٹریٹ اونچی عمارت میں ہے جب کہ جنرل اسمبلی کا اجلاس پستہ قد

عمارت میں منعقد ہوتا ہے۔ سیکریٹریٹ کا ایک حصہ بھی دیکھنے والوں کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ اسمبلی کا اجلاس جاری ہو تو انفارمیشن ڈیسک سے ٹکٹ حاصل کر کے آپ تماشائیوں کی گیلری میں بی بیٹھ سکتے ہیں اور اسمبلی کی کاروائی بھی سن سکتے ہیں۔ مقررہ اوقات میں گائیڈ کی رہنمائی میں ایک گھنٹے کا دورہ بھی کروایا جاتا ہے۔

لاٹ صاحب نے پوچھا "اندر چلنا ہے؟"

"چھوڑو یار۔ اس اندھیر نگری میں جانے کا کیا فائدہ؟" بٹ صاحب نے جواب دیا۔

عمارت کے باہر والے باغ میں بیٹھ کر ہم لوگ اس عظیم الشان عمارت کو دیکھتے رہے جہاں قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں اور جو ہمیشہ طاقتور ملکوں کے حق میں اور کمزوروں کے خلاف ہی ہوتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی یہ عمارت اٹھارہ ایکڑ رقبے پر تعمیر کی گئی ہے جس کے لیے زمین راک فیلر نے عطیہ دی تھی۔ امریکا اور مختلف ملکوں کے گیارہ ماہرین تعمیر نے اس عمارت کا نقشہ تیار کیا تھا جو ۱۹۵۰ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے یہ اقوام متحدہ کا مستقل ٹھکانا بن چکی ہے لیکن چند سال سے یہ تحریک بھی چل رہی ہے کہ اقوام متحدہ کی عمارت کو کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے۔ کیونکہ امریکا اب غیر جانبدار سرزمین نہیں ہے بلکہ دوسرے ملکوں پر بے جا دباؤ ڈال کر اپنی مرضی کے فیصلے کرا لیتا ہے۔

اقوام متحدہ کے سامنے اس مظاہرے کے بعد یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ اب کہاں جائیں؟

لاٹ صاحب بولے "میں بتاؤں؟ سب سے پہلے ہم لنچ کھائیں۔"

نہایت معقول تجویز تھی اس لیے سب کو پسند آئی۔ میکڈانلڈ کی امریکا میں کوئی کمی نہیں ہے۔ کچھ فاصلے پر ایک میکڈانلڈ میں جا کر قطار میں کھڑے ہو گئے۔ لاٹ صاحب سب سے آگے تھے۔

ہم لوگوں کی باری آئی تو انہوں نے سب سے ان کی پسند دریافت کرنی شروع کر دی اور پھر بل بھی ادا کر دیا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"بادشاہو۔ آپ ہمارے مہمان ہیں" پھر وہی مشرقی مہمان نوازی۔

اپنی اپنی ٹرے لے کر ہم لوگ بھی ایک طرف میز پر جا بیٹھے۔ دو سفید فام لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ لاٹ پر نظر پڑی تو مسکرانے لگیں۔

"ہائی۔ کیسے ہو لوٹ؟"

"فائن" لاٹ صاحب نے بھی ہاتھ ہلا دیا۔

"یہ ریستوران میں میرے ساتھ کام کرتی تھیں" انہوں نے ہمیں مطلع کیا۔

"اچھا۔ تم پہلے ریستوران میں بھی کام کرتے تھے؟"

"اجی بہت پاپڑ بیلے ہیں یہاں۔ اسٹور، ریستوران، گیس اسٹیشن اور اب ٹیکسی ڈرائیوری۔"

"مگر ریستوران کی نوکری کیوں چھوڑ دی؟" خان صاحب نے پوچھا۔

بولے "میری داڑھی کی وجہ سے پھڈا پڑ گیا تھا۔"

ہم سب نے حیران ہو کر ان کا کلین شیو چہرہ دیکھا "داڑھی کہاں ہے؟"

وہ ہنسنے لگے "اب تو نہیں ہے مگر اس وقت تھی۔ بس جی یہاں مسلمانوں کو کچھ اچھا نہیں سمجھتے۔ میم کہنے لگی کہ تم اپنی داڑھی صاف کراؤ ورنہ چھٹی کرو۔ میں نے کہا۔ میڈم، یہ ہمارا مذہبی معاملہ ہے۔"

وہ کہنے لگی "داڑھی اور نوکری میں سے ایک چیز چن لو۔ میں نے غصے میں آکر اسی وقت نوکری چھوڑ دی۔"

"تو پھر داڑھی کیوں صاف کرائی؟"

"داڑھی تو بس ویسے ہی بڑھ گئی تھی اس لیے رکھ لی تھی۔ اگر وہ مذہب کی بات نہ کرتی تو میں صاف بھی کر لیتا۔ یہاں ہوٹل اور ریستوران میں داڑھی رکھنے پر پابندی ہوتی ہے۔"

لاٹ صاحب اپنی زندگی کے حالات سناتے رہے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ نیویارک میں پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور بہت زیادہ ہیں۔ اس کام میں آمدنی اچھی ہو جاتی ہے اور کسی کی نوکری بھی نہیں کرنی پڑتی مگر بہت سخت کام ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"دن رات گاڑی چلانا پڑتی ہے۔ نیویارک کی سڑکیں تو آپ نے دیکھی ہیں۔ پھر مجرم جان نہیں چھوڑتے۔ ہم کسی مسافر کے ساتھ جانے سے انکار نہیں کر سکتے۔ وہ کسی سنسان جگہ جا کر لوٹ لیتے ہیں۔ کئی ڈرائیور کو تو مار بھی دیا ہے، یہ کالے اور ہسپانوی بڑے حرام

دے ہوتے ہیں۔"

اپنے بارے میں انہوں نے بتایا کہ پاکستان میں ماں باپ کو پیسے بھیجتے رہتے ہیں۔ چھ سال پہلے یہاں آئے تھے، یہیں ایک برازیلین سے شادی کرلی ہے۔

"مسلمان ہے؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ اس کا تو کوئی بھی مذہب نہیں ہے۔ ویسے کہتی ہے کہ کرسچین تھی۔ اب وہ بھی نہیں رہی۔"

"تو پھر بچوں کا کیا ہوگا؟" بٹ صاحب باقاعدہ فکر مند ہو گئے۔

"بچوں کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ بس تین سال کا معاہدہ ہے۔"

"شادی کا معاہدہ!" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ مجھے گرین کارڈ کی ضرورت تھی، اسے رہنے کے لیے جگہ کی ضرورت تھی۔ بس معاہدہ کرلیا دونوں نے۔ اب تو چھ مہینے باقی رہ گئے ہیں۔"

ہم حیرت سے اس کی باتیں سنتے رہے۔

"چھوڑیے جی۔ اپنی بات کیجیے۔ آپ کو تین دن میں نیویارک دیکھنا ہے۔ بس یہ کام میرے ذمے ہو گیا۔ آپ کو ٹیکسی بھی ملے گی اور گائیڈ بھی۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے۔"

"مگر تمہیں ٹیکسی کا پورا بل لینا ہوگا" خان صاحب نے کہا۔

"بھائی جی۔ کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ تھوڑا بہت ثواب ہمیں بھی کما لینے دو۔ ویسے تو بہت گناہگار ہیں ہم۔"

کافی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ جتنا بل بنے گا وہ اس کا ففٹی ففٹی وصول کریں گے۔ ہم نے پوچھا "کیا نیویارک آنے والے سارے پاکستانیوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہو؟ تو پھر گزارا کیسے چلتا ہے؟"

لاٹ صاحب ہنسنے لگے "آفاقی صاحب۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ ایک بار میں ایکٹر بننے کے لیے اسٹوڈیو میں آپ کے پاس گیا تھا اور آپ نے مجھے سمجھایا تھا کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ آپ کی فلمیں بہت دیکھی ہیں میں نے۔ یہاں اور بھی بہت سے پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور آپ کو اور دوسرے فلم والوں کو جانتے ہیں۔ بس جی، پاکستان کی باتیں کرتے ہیں تو فلموں کی باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔"

ہم نے دماغ پر بہت زور ڈالا مگر کچھ یاد نہیں آیا۔

لنچ کے بعد نیویارک کی سیر شروع ہوئی۔

نیویارک کو تو مہینوں میں بھی ڈھنگ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس کی ترکیب لاٹ نے یہ نکالی کہ بعض علاقوں سے ٹیکسی میں بیٹھ کر گزر گئے۔ کہیں ٹیکسی سے اتر کر پیدل چلے۔ کہیں سب وے کے ذریعے گئے۔ قابل ذکر مقامات انہوں نے دکھا دیے مثلاً ففتھ ایونیو، یہ شان و شوکت کے اعتبار سے صرف امریکا ہی کا نہیں ساری دنیا کا اعلیٰ ترین علاقہ ہے۔ یہ دولت مند لوگوں کی رہائش گاہ تھی۔ بعد میں یہ لوگ دوسرے علاقوں میں منتقل ہو گئے اور یہاں عالی شان اسٹورز، دکانیں اور شوروم قائم ہو گئے۔ ایک سے بڑھ کر ایک شاندار اسٹور اور دکانیں یہاں دیکھ لیجیے۔

ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ، ورلڈ ٹریڈ سینٹر، سٹی ہال، چائنا ٹاؤن۔ گرین وچ ولیج اور سوہو۔ گرین وچ ولیج کسی زمانے میں جیسا تھا اب تو ویسا نہیں رہا اور اس کی قدرتی سادگی کی جگہ شاندار دکانوں اور ریستورانوں نے لے لی ہے لیکن یہ آج بھی نیویارک کا نہایت حسین علاقہ ہے ففتھ ایونیو کے آخری سرے پر واشنگٹن اسکوائر ہے جو نیویارک یونیورسٹی کیمپس کی آماجگاہ ہے۔ اسی جگہ واشنگٹن آرچ بھی واقع ہے جو ۱۸۸۹ء میں صدر واشنگٹن کی صدارت کی سوویں سالگرہ کے موقعے پر تعمیر کی گئی تھی۔ اس کے اردگرد نہایت وسیع اور خوب صورت پارک ہے۔ اس پارک کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں نیویارک کا ایک قدیم ترین درخت آج بھی موجود ہے۔ کسی زمانے میں اس درخت سے لٹکا کر مجرموں کو پھانسی دی جاتی تھی۔ ایک بار تو دو درجن کے قریب راہزنوں کو ایک ہی دن میں یہاں پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔

"سوہو" دراصل ساؤتھ آف ہوسٹن کا مخفف ہے۔ کسی زمانے میں یہ صنعتی مرکز تھا لیکن اب یہ ایسے بے سہارا فن کاروں کا مرکز ہے جنہیں کسی اور جگہ دکانیں یا اسٹوڈیو بنانے کی توفیق نہیں ہے۔ یوں سمجھیے کہ یہ غریب آرٹسٹوں اور مصوروں کی بستی ہے۔ یہاں ہر قسم کے آرٹسٹوں کے نگار خانے اور گھر ہیں۔ کچھ شاندار بھی ہیں لیکن ایسے اسٹوڈیو بھی ہیں جن میں فرش اور دیواروں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کھڑکیوں پر پردے تک نہیں ہیں تاکہ قدرتی روشنی اندر آ سکے۔

لنکن سینٹر نہایت خوبصورت اور وسیع جگہ ہے۔ یہاں پہلے غریبوں کی بستی تھی جسے خرید کر فنون لطیفہ کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ یہ علاقہ بارہ ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ عمارتیں نہایت خوب صورت اور نظر فریب ہیں اور تعمیری حسن کا نمونہ ہیں۔ اس تمام علاقے کی تعمیر و ترقی میں حکومت کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ لوگوں نے عطیات اور چندوں کی مدد سے یہ ثقافتی مرکز بنایا ہے۔ یہاں موسیقی، رقص اور دوسرے فنون کے شاندار مراکز قائم ہیں۔ اس کا پلازا دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ چاروں طرف خوب صورت عمارتیں، ان کے سامنے سرسبز باغ اور درمیان میں ایک دیدہ زیب فوارہ جسے رات کے وقت روشنیوں سے سجایا جاتا ہے۔

نیویارک کا سینٹرل پارک کسی عجوبے سے کم نہیں ہے۔ نیویارک جیسے گنجان، بلند و بالا عمارتوں سے آراستہ اور ماحول کی کثافتوں سے لبریز شہر کے درمیان میں ایک انتہائی خوب صورت اور سرسبز باغ کا تصور ناممکن سا معلوم ہوتا ہے مگر شہر والوں نے یہ ناممکن بھی ممکن کر دکھایا ہے۔ سینٹرل پارک اپنے حسن و دلکشی کے اعتبار سے قابل دید ہے۔ یہ تقریباً دو میل چوڑا اور ڈھائی میل لمبا ہے۔ اسکے اندر کھیل کے میدان ہیں، پیدل چلنے والوں کے لیے پگڈنڈیاں ہیں، اونچے اونچے سرسبز درخت ہیں، حسین پھولوں کے تختے ہیں۔ کہیں لوگ جوگنگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کہیں شہسواری میں مصروف دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس پارک کی عظمت اور وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نیویارک شہر کے بیچوں بیچ یہ قدرتی تفریح گاہ بنانے کے لیے تین ہزار مزدور لگے رہے اور اس کی تکمیل میں بیس سال کا عرصہ لگا۔ اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ انسانوں کا بنایا ہوا پارک نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس پر قدرتی باغ اور جنگل کا گمان گزرتا ہے۔ ایک طرف جنگل کا ماحول ہے تو ساتھ ہی قدرتی جھیل بھی موجود ہے۔ اس میں جنگلی جانور اور پرندے بھی بہت بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ شہسواری کے شوقین لوگوں کے لیے بھی نیویارک کا سینٹرل پارک ایک دلچسپ جگہ ہے۔ ہم نے چند خواتین و حضرات کو گھوڑوں پر سوار پارک کے ایک حصے میں شہسواری کرتے ہوئے دیکھا تو بہت حیران ہوئے۔ نیویارک کے عین درمیان میں گھوڑوں کی دستیابی بجائے خود ایک مسئلہ ہے کہاں یہ کہ اتنے بہت سے گھوڑے دوڑانے والے بھی موجود ہیں۔ گھوڑے دوڑانے یا چلانے کے لیے بھی وہی کچا راستہ ہے جو جوگنگ کرنے

والوں کے لیے مخصوص ہے مگر گھوڑوں اور انسانوں نے بقائے باہمی کے اصولوں کے مطابق آپس میں گزارا کرنے کا معاہدہ کر لیا ہے۔ گھوڑے کو دیکھ کر جوگنگ کرنے والے ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ یہی حال گھوڑوں کا بھی ہے۔ سامنے سے آتے ہوئے جوگر کو دیکھتے ہی وہ ان کے لیے راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔

"یہ گھوڑے آتے کہاں سے ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"اکیڈمی سے!" منظور لاٹ نے جواب دیا "یہاں نزدیک ہی گھوڑوں کی اکیڈمی ہے۔"

یہ سن کر ہمیں تعجب ہوا اور احساس محرومی بھی۔ احساس محرومی اس لیے کہ پاکستان میں تو انسانوں کے لیے بھی اکیڈمی قائم کرنے کا دستور نہیں ہے۔ بے چارے فلم والے مطالبے کر کر کے تھک گئے ہیں کہ فلم والوں کو تربیت دینے کے لیے اکیڈمی قائم کی جائے مگر وعدوں اور لاروں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ مگر نیویارک کے گھوڑے پاکستان کے فلم والوں سے زیادہ خوش نصیب نکلے کہ ان کے لیے اس قدر گنجان اور مصروف شہر کے درمیان میں ایک تربیتی اکیڈمی بھی موجود ہے۔ بعد میں ہم نے یہ اکیڈمی بھی دیکھی اور مزید حیران اور جیلس ہوئے۔ اکیڈمی کا نام "کلیرمونٹ رائڈنگ اکیڈمی" ہے۔ یہ سینٹرل پارک سے تین بلاکوں کے فاصلے پر ہے۔ بلاک تو آپ شاید اب تک سمجھ چکے ہوں گے۔ امریکا میں سڑکیں عام طور پر متوازی ہوتی ہیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایک دوسرے کو کراس کرتی ہیں۔ ان دونوں سڑکوں کے درمیانی حصے کو بلاک کہا جاتا ہے اور ان کا سائز ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ تین بلاک فاصلے کا مطلب قریب قریب ایک فرلانگ سمجھ لیجیے۔ بٹ صاحب اور خان صاحب تو گھوڑوں کو دیکھ کر مچل ہی گئے کہ ان کی اکیڈمی ضرور دیکھیں گے۔

ہم نے کہا بھی کہ بھائی گھوڑوں کو دیکھ لیا، بس کافی ہے۔ ان کی اکیڈمی دیکھ کر کیا کرو گے۔ وہاں آپ کو داخلہ تو ملنے سے رہا مگر آپ جانتے ہیں کہ دانائی کے مشورے ہماری قوم قبول نہیں کرتی اس لیے منظور لاٹ صاحب پر زور فرمائش پر ہم لوگوں کو گھوڑوں کی اکیڈمی دکھانے کے لیے لے گئے مگر اس وقت جب کہ گھوڑوں کی واپسی کا وقت ہو چکا تھا۔

سینٹرل پارک میں رائڈنگ کرنے والوں میں عام لوگوں کے علاوہ بڑے بڑے فن کار، دولت مند، صنعت کار وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ سفارت کار بھی اپنی

مصروفیات میں سے وقت نکال کر گھوڑے دوڑانے کے لیے یہاں آن دھمکتے ہیں۔ ذرا غو سوچیے کہ نیویارک جیسے پرہجوم اور شوروغل، کثافت اور ٹریفک سے بھرپور شہر میں اگر کچھ کھلی اور تازہ فضا میں شہسواری کا موقع مل جائے تو یہ کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ اکیڈمی میں ڈیڑھ دو سو کے قریب گھوڑے رہتے ہیں اور انہیں گھنٹوں کے حساب سے کرائے پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہی "رینٹ اے کار" یا "رینٹ اے بائیسکل" والا حساب ہے۔

جب گھوڑوں کی واپسی کا وقت ہوا تو ان کے انچارج انہیں لے کر تیار ہو گئے اور و ایک ایک کی لمبی قطار میں چل پڑے۔ ہم لوگ بھی گھوڑوں کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

خان صاحب کہنے لگے "یورپ اور امریکا میں لوگ میموں کا پیچھا کرتے ہیں مگر ہم ات احمق ہیں کہ گھوڑوں کا پیچھا کر رہے ہیں۔"

بٹ صاحب نے کہا "ان کا پیچھا کرنے میں بدنامی یا نقصان کا اندیشہ نہیں ہے۔ یہ اعل نسل کے تربیت یافتہ گھوڑے ہیں۔ آپ کو دولتی بھی نہیں ماریں گے۔"

پارک سے نکل کر گھوڑے باہر سڑک پر پہنچ گئے۔ اب انہیں ۸۹ اور دو اور سڑکیں عبور کرنی تھیں۔ یہ پختہ سڑکیں ہیں۔ یہاں گھوڑوں کے چلنے کے لیے کوئی علیحدہ راستہ بھ نہیں ہے اس لیے گھوڑے فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ بسوں والی لین میں چلنے لگے سڑک عبور کرنے کے لیے انہیں باقاعدہ ٹریفک کے اشاروں پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ جب تک س روشنی نہ ہوئی، وہ بڑی شرافت سے کھڑے رہے۔ جب اشارہ کھلا تو بڑے سکون سے چ پڑے۔ ہمیں تو ان کی یہ ٹریفک سینس دیکھ کر بہت شرم آئی۔ وجہ آپ خود جان سکتے ہیں۔

خان صاحب نے بٹ صاحب سے کہا "دیکھا آپ نے۔ کیسے ٹریفک کے اشاروں پابند گھوڑے ہیں۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

بٹ صاحب بولے "مگر وہ اکیلے نہیں ہیں۔ ان پر سوار بھی ہیں۔"

تین بلاکوں پر ٹریفک کے اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے ان گھوڑوں نے ز کراسنگ سے سڑکیں عبور کیں۔ کیا مجال جو کسی اور جگہ سے سڑک پار کرنے کی کوش کی ہو۔ لوگ ان گھوڑوں کو دیکھنے کے لیے رک جاتے ہیں۔ خاص طور پر بچے بہت دلچ سے یہ منظر دیکھتے ہیں۔ بہرحال، گھوڑوں کا پیچھا کرتے ہوئے ہم کلیر مونٹ اکیڈمی پہنچ گ

یہ اینٹوں کی بنی ہوئی ایک سو سالہ پرانی عمارت ہے مگر بالکل نئی لگتی ہے۔ اس کی پانچ منزلیں ہیں۔ ہر منزل پر گھوڑے رہتے ہیں۔ ان کے اوپر جانے کے لیے ریمپ بنے ہوئے ہیں۔ یعنی ڈھلواں راستے جن پر چل کر وہ اپنے کمرے میں پہنچ جاتے ہیں۔

اس اکیڈمی کے انچارج مسٹر پال ..... ہیں۔ ان کے نام کا اگلا حصہ خاصا مشکل تھا اس لیے سمجھ میں نہ آیا۔ منظور لاٹ نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر پال سے ہماری ملاقات کرا دی۔ وہ درمیانی عمر کے خاصے چاق و چوبند آدمی ہیں۔ ایک اسمارٹ اور خوش شکل خاتون کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف تھے جو ان کی نئی ممبر بننا چاہتی تھیں۔ نام تو ان کا یاد نہیں رہا۔ مسز بارنم یا ہازنم تھا مگر اتنا یاد ہے کہ وہ دس میل دور ایک آفس میں کام کرتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ ہفتے میں دوبار دفتر سے چھٹی کر کے سینٹرل پارک میں رائڈنگ کریں۔ انہوں نے کہا "نیویارک جیسے شہر میں گاؤں کی طرح گھوڑے کی سواری کرنے کا موقع مل جائے تو یہ خوش قسمتی ہی ہے نا؟"

اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہم تو گاؤں جا کر بھی گھوڑے کی سواری نہیں کرتے بلکہ ہمارے ہاں جو لوگ گاؤں میں رہتے ہیں اب تو وہ بھی گھوڑے کی جگہ پجارو وغیرہ کی سواری کرتے ہیں۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ نیویارک والے گھوڑے کو ترستے ہیں اور ہم لوگ پجارو اور ہنڈا اکارڈ کو۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ ہر شخص اس چیز کی تمنا کرتا ہے جو اسے حاصل نہیں ہوتی۔

پال صاحب نے ہمیں اکیڈمی کے اندر گھوڑوں کے کمرے دکھائے۔ یہ چھوٹے چھوٹے اصطبل ہیں جن میں گھوڑے بڑے صبر و سکون کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں۔ ان سب کے نام اور نمبر مقرر ہیں۔ جب کوئی ان کا طلب گار آتا ہے تو دفتر والے انٹر کام پر متعلقہ گھوڑے کا نام اور نمبر بتا دیتے ہیں اور اس کا انچارج گھوڑے کو نیچے پہنچا دیتا ہے۔ ان گھوڑوں کی تربیت کے لیے بھی وقت مقرر ہے۔

پال نے "نیویارک جیسے شہر کے بیچوں بیچ رہنے کے باوجود ان گھوڑوں کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا۔"

خان صاحب کہنے لگے "بے چارے ان پڑھ ہیں۔ اخبار تک تو پڑھ نہیں سکتے، نہ سڑکوں کے سائن بورڈ وغیرہ پڑھ سکتے ہیں، انہیں کیسے پتا چلے کہ وہ نیویارک میں ہیں؟"

سینٹرل پارک نیویارک والوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔ لیکن اپنی تمام خوبیوں کے باوجود یہ محض دن کی روشنی میں ہی ایک محفوظ سیرگاہ ہے۔ اندھیرا ہوتے ہی یہ ایک غیر محفوظ مقام بن جاتا ہے۔ لوٹ مار' عورتوں پر مجرمانہ حملے' قتل وغارت کی وارداتیں عام ہیں۔ بلکہ پارک کے سنسان حصوں میں تو دن کے وقت بھی اس قسم کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ نیویارک میں ریور سائڈ پارک بھی ایک قابل دید مقام ہے مگر افسوس کہ ہم تفصیل سے اس کا نظارہ نہ کرسکے۔

☆ ☆ ☆

دنیا کے ہر بڑے شہر کی طرح نیویارک میں بھی ایک "چائنا ٹاؤن" ہے۔ چینی اس معاملے میں بہت متعصب ہوتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ رہنا سہنا انہیں پسند نہیں ہے۔ "چائنا ٹاؤن" میں شہر کے سارے چینی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ وہیں رہتے ہیں۔ وہیں کاروبار کرتے ہیں۔ وہیں ملازمتیں کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ انہیں کسی بھی کام کے لیے باہر نہ جانا پڑے کیونکہ یہ باہر والوں سے بالکل واسطہ نہیں رکھتے اس لیے ان کی اکثریت چینی زبان کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتی۔

چائنا ٹاؤن جانے کے لیے ہم سب وے میں سوار ہوئے۔ خیال تھا کہ اس ٹرین کے سفر میں زیادہ تر چینیوں سے ملاقات ہوگی مگر اکثریت سیاحوں کی تھی جو خان صاحب اور بٹ صاحب کے لیے خوشی کا باعث تھی۔ اتنی کم جگہ میں اتنی بہت سی خوب صورت خواتین یکجا مل جائیں تو خان صاحب کو اور کیا چاہیے؟ بٹ صاحب ویسے تو "لاحول" کا ورد کرتے رہتے ہیں مگر ہم نے نوٹ کیا کہ ایسے مواقع کی تلاش میں بھی رہتے ہیں جہاں انہیں زیادہ سے زیادہ لاحول پڑھنے کا موقع ملے۔ اس مختصر سفر میں انہوں نے خاصی فراخدلی سے "لاحول" کا وظیفہ پڑھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ بٹ صاحب کو ماحول پسند آیا ہے۔ اب اگر کچھ عورتیں فضول سا لباس پہن کر آجائیں تو کوئی کیا کرسکتا ہے؟

خان صاحب کو یہ اعتراض تھا کہ "چائنا ٹاؤن" جانے کے لیے یہ اس قدر برائے نام لباس پہن کر کیوں آگئی ہیں؟ ہم نے سمجھایا کہ دراصل یہ چینی خواتین کو جدید فیشن سے آگاہ کرنا چاہتی ہیں کیونکہ وہ غریب تو کنوئیں کے مینڈک کی طرح اپنے علاقے تک ہی محدود رہتی ہیں۔ جسے ضرورت پڑے وہ خود ہی چائنا ٹاؤن چلا جائے۔

کینال اسٹریٹ کے سب وے اسٹیشن پر جلی حروف میں چائنا ٹاؤن لکھا ہوا تھا۔ انگریزی

میں بھی اور چینی میں بھی۔ گویا چائنا ٹاؤن پہنچتے ہی آپ کو اس بستی کی انفرادیت سے آگاہ
دیا گیا۔ جب آبادی میں پہنچے تو بالکل چین کے کسی شہر کا گمان گزرا۔ ویسی ہی چھوٹی چھو
تپلی تپلی دکانیں جن میں چینی زیورات سے لے کر ملبوسات تک ہر چیز موجود تھی۔ یہا
تک کہ چینی پھل بھی یہاں دیکھ لیجیے اور خرید لیجیے۔ دکانوں کی سجاوٹ کا انداز بھی مختلف
تھا۔ سیلز گرلز اور سیلز مین سے لے کر سڑکوں پر پھرنے والوں تک زیادہ تر چینی ا
مخصوص لباس میں نظر آئے۔ مغربی فیشن اور ملبوسات کا یہاں گزر نہیں ہے۔ سارا ما
خالص چینی نظر آتا ہے۔ چائنا ٹاؤن سیاحوں کی دلچسپی اور خریداری کا مرکز ہے۔ یہاں چ
مصنوعات اور نوادرات کے علاوہ چینی ریستوران بھی بہت کثرت سے ہیں۔ جن میں چ
کے ہر صوبے کے مخصوص کھانے دستیاب ہیں اور ان ریستوران میں کسی وقت بھی
دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ منظور لاٹ صاحب نے بتایا کہ یہ چائنا ٹاؤن نو دس بلاکوں
پھیلا ہوا ہے۔ لاکھوں چینی اس علاقے میں آباد ہیں۔ یہ لوگ آپس میں چینی زبان میں با
چیت کرتے ہیں۔ چینی زبان کے اخبارات بھی یہاں سے شائع ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ
بیشتر لوگ انگریزی نہیں جانتے اور جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ مگر امریکیوں کو اس با
افسوس ہے کہ یہ واشنگٹن سے زیادہ بیجنگ میں رونما ہونے والے واقعات کی فکر رکھتے ہ
جب چینی رہنما ماؤزے تنگ کا انتقال ہوا تھا تو چائنا ٹاؤن میں کئی دن تک سوگ منایا گیا
یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ سارے شہر کے چینی اس محدود اور مختصر سی جگہ میں س
جائیں۔ چائنا ٹاؤن کے باہر بھی چینی رہتے ہیں مگر ویک اینڈ پر وہ بھی خریداری اور ملاق
کے لیے یہاں آجاتے ہیں۔ یہاں چینی میوزیم بھی ہے اور ایک بدھ کا مندر بھی۔ چینی
سال کا تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ پروسلین کے برتن، چینی چائے اور
ملبوسات کو سیاح بھی پسند کرتے ہیں۔ یورپ میں ہمیں یہ مشکل پیش آئی تھی کہ
انگریزی نہیں بولتے۔ چائنا ٹاؤن میں بھی یہی معاملہ ہے۔ دکان دار اور سیلز گرلز چینی
سوا دوسری زبان نہیں جانتے۔

ہم ایک ریستوران میں گئے۔ ویٹرس نے خوب کس کے بال باندھ رکھے تھے
میں تیل بھی ڈال رکھا تھا۔ اب ہم اس سے کہہ رہے ہیں کہ دودھ والی چائے لاؤ اور
بار چینی قہوہ نما چائے لیے چلی آرہی ہے۔ کاؤنٹر پر ایک مختصر سی نوک دار چگی داڑھی

چھوٹے سے اور قدرے موٹے سے چینی بزرگ تشریف فرما تھے اور منہ ہی منہ میں بدبدا
رہے تھے۔ بٹ صاحب کا خیال تھا کہ کوئی چینی وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ خان صاحب کہتے
تھے کہ چیونگم کھا رہے ہیں۔ منظور لاٹ کا کہنا تھا کہ دل ہی دل میں حساب کتاب کر رہے
ہیں۔ لاٹ صاحب نے ایک یہ گپ بھی لگائی کہ چینی بہت زیادہ عمر کے ہوتے ہیں مگر دیکھنے
میں بہت کم عمر لگتے ہیں۔

"اس بابا کی آپ کے خیال میں کیا عمر ہوگی؟" انہوں نے پوچھا۔

ہم نے بابا کو بہت غور سے دیکھا۔ ان کا چہرہ سرخ تھا۔ دانت پورے نظر آرہے تھے۔
سر پر بال بھی کافی تھے اور سفید بال برائے نام ہی تھے۔

ہم نے کہا "پچاس پچپن سال کے ہوں گے۔"

بولے "جی نہیں۔ ان کی عمر کم از کم ڈیڑھ سو سال ہوگی۔"

"یار کیوں گپ لگاتے ہو؟"

خان صاحب نے کہا "خود ان سے تصدیق کر لیتے ہیں۔"

منظور لاٹ بولے "یہ غلطی ہرگز نہ کرنا۔ کسی چینی سے اس کی عمر دریافت کرنا بہت
برا سمجھا جاتا ہے۔"

"تو پھر کیا کریں۔ اس لڑکی سے پوچھیں؟"

مگر مشکل یہ تھی کہ لڑکی چینی کے سوا دوسری زبان نہیں جانتی تھی۔

بٹ صاحب نے فوراً فارسی شعر پڑھ دیا ؂

زبان یار من چینی و من چینی نمی دانم

منظور لاٹ ہمارا امتحان لینے پر تلے ہوئے تھے "اچھا اس لڑکی کی عمر کا اندازہ لگائیں۔"

ہم سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ چھوٹے سے قد کی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ سیاہ بال، سیاہ
آنکھیں۔ چار ساڑھے چار فٹ قد۔ بات نہ سمجھنے کے باوجود بار بار مسکراتی تھی اور جھک کر
تعظیم دیتی تھی۔ ہر بار جب وہ چائے کی جگہ چینی قہوہ لے کر آتی اور ہم لوگ اعتراض
کرتے تو وہ جھک کر چینی زبان میں معذرت کرتی۔ خان صاحب کا خیال تھا کہ سوری کہہ
رہی ہے۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس بائیس سال ہوگی مگر منظور لاٹ کا کہنا تھا کہ وہ کم
از کم ستر سال کی ہوگی۔

"بھائی خدا کے غضب سے ڈرو۔ اتنی کم عمر لڑکی کو بڑھیا بنا رہے ہو۔"

"آفاقی بھائی۔ عمر کے معاملے میں چینی بہت چور ہوتے ہیں۔ ہوتے کچھ ہیں اور نظر کچھ آتے ہیں' یہ ساٹھ ستر سال سے کم نہیں ہے۔"

اس پر ہمیں ایک پرانا لطیفہ یاد آگیا۔ ایک مجمع گیر سڑک پر کھڑا دوائی بیچ رہا تھا جس کے استعمال سے بڑھاپا نزدیک بھی نہیں پھٹک سکتا تھا۔ ایک شکی مزاج نے پوچھ لیا "جناب۔ اگر یہ سچ ہے تو آپ خود یہ دوائی کیوں نہیں استعمال کرتے تاکہ بوڑھے نہ ہوں۔"

مجمع گیر نے کہا "میرے عزیز۔ میں یہی دوائی کھاتا ہوں اس لیے جوان نظر آتا ہوں۔ آپ کے خیال میں میری کیا عمر ہے۔؟"

"کم سے کم پچاس سال۔"

وہ ہنسنے لگا اور کہا "کھا گئے نا دھوکا؟ برخوردار میری عمر پانچ سو سال ہے اور دیکھنے میں آپ کو پچاس سال کا لگ رہا ہوں۔"

سامعین اور ناظرین حیران رہ گئے۔ ایک چالاک شخص نے تجویز پیش کی کہ اس کے بچہ جمہورا سے دریافت کیا جائے۔ کچھ دیر بعد جب مجمع چھٹ گیا تو انہوں نے بارہ پندرہ سالہ بچہ جمہورا کو ایک طرف لے جا کر پچاس روپے کا نوٹ دیا اور کہا "بیٹے۔ سچ سچ بتانا۔ تمہارے استاد جی کی عمر کتنی ہے؟"

لڑکے نے نوٹ لے کر اپنی جیب میں رکھا اور بڑے اطمینان سے بولا "آپ کے سر کی قسم جناب۔ مجھے ٹھیک معلوم نہیں ہے۔"

"پھر بھی۔ کچھ تو بتاؤ۔"

"جھوٹ کیوں بولوں صاحب۔ مجھے ان کے پاس کام کرتے ہوئے ابھی صرف ساٹھ سال ہوئے ہیں۔"

اگر آپ یہ لطیفہ پہلے سن چکے ہیں تب بھی برمحل سمجھ کر درگزر فرمائیں۔ آخر برمحل اشعار بھی تو بار بار سنائے جاتے ہیں تو پھر لطیفے میں کیا حرج ہے؟

آمدم برسر مطلب۔ خان صاحب ویٹریس کی شکایت لے کر "چینی بابا" کے پاس گئے اور آسان انگریزی میں بہت دیر تک شکوہ کرتے رہے کہ جناب۔ اتنی دیر سے اس لڑکی سے کہہ رہے ہیں کہ دودھ والی سیاہ چائے لے کر آئے مگر یہ ہے کہ سنتی ہی نہیں۔ ہر بار چینی

قہوہ لے آتی ہے اور جب اعتراض کرو تو جھک جھک کر آئیں بائیں شائیں کرتی ہے۔

بابا جی بڑے اطمینان سے ان کی بات سنتے اور مسکراتے رہے۔ جب خان صاحب اپنی لن ترانی ختم کر چکے تو انہوں نے اپنی مختصر سی چگی داڑھی پر اپنا چھوٹا سا ہاتھ پھیرا اور خالص چینی زبان میں کچھ فرمایا۔

خان صاحب بے زار اور مایوس ہو کر چلے آئے۔

"کیوں کیا ہوا؟"

بولے "وہ کون سا شعر ہے جس کا مفہوم ہے کہ یہاں تو سبھی کم بخت ہیں۔"

ہم نے کہا "وہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا۔"

بولے "بالکل یہی شعر میرے ذہن میں گھوم رہا تھا۔ بابا جی تو اس لڑکی سے بھی زیادہ چاؤں چاؤں کر رہے ہیں۔ پہلے پتا ہوتا تو ہم بھی تھوڑی سی چینی زبان سیکھ سکتے۔"

"کس سے سیکھتے؟" بٹ صاحب نے پوچھا۔

"اتنے بہت سے چینی ریستوران ہیں ہمارے شہر میں۔ اور پھر چین کے ساتھ ہمارے اتنے پرانے تعلقات ہیں۔"

"بہرحال' اب کچھ نہیں ہو سکتا" ہم نے کہا "اب تو یہی مناسب ہے کہ ہم چینی چائے پی لیں..."

اتنی دیر میں وہی کم فہم چینی دوشیزہ دوبارہ ہماری میز پر آگئی تھی اور جھک جھک کر ہم سے اپنی مادری زبان میں کچھ کہہ رہی تھی ریستوران کے دوسرے کنارے پر کھڑکی کے ساتھ کچھ مغربی خواتین تشریف فرما تھیں جن کی طرف ہم لسانی جھگڑے کی بناء پر کماحقہ' توجہ نہیں دے سکتے تھے مگر وہ ہم پر خاص توجہ دے رہی تھیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان میں سے ایک سرو قد' روشن چشم' تاباں چہرے والی خاتون بڑے دل آویز انداز میں اٹھ کر ہماری طرف آئیں اور میٹھی آواز میں فرمانے لگیں "ایکسکیوزمی!

ہم لوگوں نے پلٹ کر حیرانی سے انہیں دیکھا۔ حیرانی اس بات پر تھی کہ آج تک تو ہم ہی خواتین کو مخاطب کرتے آئے تھے مگر آج ایک حسینہ فرنگ از خود ہم سے مصروف کلام تھیں۔ اس خلاف توقع واقعے پر اگر خان صاحب شادی مرگ ہو جاتے تو ہمیں کوئی تعجب نہ ہوتا بٹ صاحب بھی خاصے حیران تھے۔ صرف منظور لاٹ اس حادثے سے قطعی بے نیاز

دکھائی دیے۔

خان صاحب بے اختیار کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بے ساختہ اردو میں فرمایا "فرمائیے" مگر پھر خود کو سنبھالا اور انگریزی کو ذریعہ اظہار بنایا اور کہا "جی، ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟"

وہ رسان سے مسکرائیں اور کہا "آپ کو شاید زبان کی پرابلم پیش آرہی ہے۔ میں بہت دیر سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، ویٹریس سمجھ نہیں رہی۔"

خان صاحب کو تو شکایت کا دفتر کھولنے کا موقع ہاتھ لگ گیا۔ فوراً رواں ہو گئے "کیا مصیبت ہے۔ یہاں تو کوئی انگریزی تک نہیں جانتا۔ کب سے کہہ رہے ہیں دودھ والی چائے درکار ہے۔ انگلش ٹی مگر اس لڑکی کے پلے نہیں پڑ رہا۔ اولڈ مین سے شکایت کی تو وہ بھی چینی زبان ہی بول رہے ہیں۔ اب بتائیے، ہم کیا کریں؟"

خاتون نے مسکرا کر کہا "پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کا مسئلہ حل کر دیتی ہوں۔" پھر انہوں نے ویٹریس کی طرف رخ کیا اور "چوچاؤ' شوشان" جیسی آوازیں نکالیں۔ لڑکی خاصی سمجھدار تھی۔ فوراً سمجھ گئی اور سرہلا کر اسی قسم کی آوازوں میں کچھ کہتی رہی۔ پھر اس نے ہم لوگوں کے سامنے جھک جھک کر کچھ کہا جو بٹ صاحب کے خیال میں "سوری" تھا۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔

خاتون فرنگ نے خان صاحب کو دیکھا اور کہا "آپ کا آرڈر ابھی پورا ہو جائے گا' اور کچھ؟"

خان صاحب نے پرزور الفاظ میں ان کا بار بار شکریہ ادا کیا اور وہ جواب میں خان صاحب کا شکریہ ادا کر کے دوبارہ اپنے گوشے کی جانب چلی گئیں۔

خان صاحب نے فرمایا "دیکھا آپ نے۔ ہم انگریزوں کو برا تو کہتے رہتے ہیں مگر ان کے بغیر ہمارا کام بھی نہیں چلتا۔ کتنی بااخلاق اور خوبصورت خاتون ہیں یہ۔"

بٹ صاحب سخت ناراض تھے۔ بولے "اسے دیکھ کر آپ کو کھڑا ہونے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بھائی۔ یہ آداب کا تقاضا ہے۔"

"مگر اس کے سامنے اتنی لمبی تقریر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کہہ دیتے کہ ہمیں

چائے چاہیے بس۔"

"ڈونٹ بی جیلس" خان صاحب نے انہیں ڈانٹ دیا "وہ بے چاری اتنی دور سے آئی تھی کچھ تو کہنا ہی چاہیے تھا اس سے۔"

بٹ صاحب کافی دیر تک بڑبڑاتے رہے۔ کچھ دیر بعد چائے آگئی۔ حسب توقع انتہائی بدمزہ تھی۔ دودھ بالکل ٹھنڈا تھا۔ قہوہ بہت ہلکے رنگ کا تھا۔ اس میں مسالے کی خوشبو بھی آرہی تھی۔ ہم نے منہ بنایا مگر خان صاحب کو بہت پسند آئی۔ بولے "کتنی اچھی مسالے دار چائے ہے۔"

چائے کے فوراً بعد کھانے کا بل بھی آگیا۔ بل بھی چینی زبان میں تھا فرق اتنا تھا کہ ساتھ ہی انگریزی حروف اور ہندسے بھی لکھے ہوئے تھے۔

منظور لاٹ نے کہا "شکر ہے کہ انگریزی بھی لکھ دی ہے۔"

بٹ صاحب نے کہا "ورنہ خان صاحب تو بل پڑھوانے کے لیے بھی اس میم کے پاس چلے جاتے۔ آخر تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔"

غنیمت یہ ہوا کہ ہماری موجودگی میں آس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے مہمانوں میں سے کسی نے بھی خالص چینی کھانے نہیں منگوائے۔ آپ نے بھی سن رکھا ہو گا کہ اس میں کتے بلی اور سانپ وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

نیویارک کا گرینڈ سینٹرل اسٹیشن بھی قابل دید جگہ ہے۔ یہ ۴۲ویں اسٹریٹ اور میڈیسن ایونیو سے گزر کر آتا ہے، اس کے سامنے پارک ایونیو ہے۔ اس اسٹیشن کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ۱۹۱۳ء میں مکمل ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہ ریلوے اسٹیشن دو منزلوں پر ہے۔ اوپر کی منزل پر ۶۶ ریلوے لائنیں ہیں اور نچلی منزل پر ۵۷ لائنیں مصروف کار رہتی ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ کس قیامت کا سماں ہوتا ہو گا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن ہے۔ یوں تو یہاں ہر وقت ٹرینوں اور مسافروں کا آنا جانا لگا رہتا ہے مگر صبح اور شام کے وقت بہت زیادہ ہجوم ہوتا ہے۔ اس اسٹیشن کو زیر زمین راستوں کے ذریعے باہر کی سڑکوں اور ہوٹلوں سے ملا دیا گیا ہے۔ یعنی ریل سے نکل کر باہر سڑک پر

جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ سب وے کے ذریعے جہاں چاہیں چلے جائیے۔

یہ سب ویز خاصی کشادہ اور بارونق ہیں۔ اس طرح کہ دو طرفہ دکانیں اور ریستوران ہیں جہاں ہروقت ہجوم اور چہل پہل رہتی ہے۔ نیویارک کا مشہور ''آئسٹر بار'' بھی انہی سب وے میں سے ایک میں ہے جہاں ہر وقت مے خواروں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ یہ بھی عجیب و غریب جگہ ہے۔ گرینڈ سینٹرل اسٹیشن کے عقب میں ''پین امریکن بلڈنگ'' ہے۔ یہ ۵۹ منزلہ عمارت ہے جس میں اس زمانے میں بیس ہزار سے زائد کارکن کام کیا کرتے تھے۔ یہ بہت خوب صورت عمارت ہے اور دور ہی سے پہچانی جاتی ہے۔ اس کی چھت پر ہیلی کاپٹروں کے اترنے کے لیے ہیلی پیڈ ہے۔ (یہ اس زمانے کی بات ہے بعد میں ایک حادثے کے باعث چھت پر ہیلی کاپٹروں کے اترنے کو ممنوع قرار دے دیا گیا) پین امریکن بلڈنگ سے آپ برقی سیڑھیوں کے ذریعے براہ راست ریلوے اسٹیشن تک پہنچ سکتے ہیں۔ گرینڈ سینٹرل اسٹیشن ہمارے لیے تو ایک عجوبہ ہی تھا مگر لاٹ صاحب نے بتایا کہ اس عمارت کے بارے میں نیویارک والوں میں خاصا اختلاف رائے ہے۔ بہت سے لوگ تو اسے تاریخی یادگار سمجھتے ہیں مگر ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ اسے مسمار کر دیا جائے اور مختلف مقامات پر ریلوے اسٹیشن بنا دیئے جائیں۔

نیویارک کی داستان تو داستان الف لیلیٰ کی طرح کبھی نہ ختم ہونے والی ہے مگر مختصر وقت میں نہ تو نیویارک کو ڈھنگ سے دیکھا جا سکتا تھا اور نہ ہی اس کے مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ مگر خان صاحب کا یہ اعلان کہ..... ''نیویارک آکر مجھے لاہور یاد آگیا'' بہت حد تک درست تھا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ نیویارک کی سڑکیں رہ رہ کر لاہور کی سڑکوں کی یاد تازہ کرتی رہتی ہیں۔ شکستہ' ٹوٹی پھوٹی' جگہ جگہ گڑھے' جگہ جگہ سے کٹی اور کھدی ہوئی۔ زیر تعمیر اور ملبے سے اٹی ہوئی۔ کسی اور مغربی شہر میں ان چیزوں کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا' کہاں یہ کہ نیویارک جس پر سارا امریکا ناز کرتا ہے۔ اور صحیح ناز کرتا ہے مگر نیویارک مجموعہ اضداد ہے۔ ایک طرف شان و شوکت' حسن و جمال اور چمک دمک اور رونق ہے تو بے مثال' اور دوسری طرف غربت' گندگی اور سڑکوں کی بدحالی ہے تو وہ بھی بے مثال۔ نیویارک کی بستیوں میں بھی کسی منصوبے اور پروگرام کے تحت سڑکیں بنائی گئی ہیں جو ہو بہو ہماری کچی آبادیوں کی طرح تو نہیں ہیں مگر ان کی یاد ضرور دلا دیتی ہیں۔ گڑھوں کا ہم

پہلے ہی بیان کر چکے ہیں جو لاتعداد ہیں۔ ٹریفک کا یہ عالم ہے کہ پیدل چلنے والوں کو ہر وقت جان کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ ایک بار برونکس کے ایک علاقے میں لگاتار انیس پیدل راہ گیر جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے شہری چیخ اٹھے۔ انہوں نے یہ ترکیب کی کہ آبادی کے لوگ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر بڑی سڑکوں پر کھڑے ہو گئے اور ٹریفک روک لیا۔ ہارن تو نیویارک والے بجاتے نہیں ہیں۔ زبانی ہی جھگڑتے رہے۔ پولیس آئی' ہیلی کاپٹر آئے تب کہیں جا کر ٹریفک دوبارہ رواں ہوا مگر اس تمام ہنگامے کا نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا۔ حادثات بدستور اسی طرح ہو رہے ہیں۔

ہم نے لاٹ صاحب سے پوچھا ''بھائی۔ اتنے حادثے آخر ہوتے کیوں ہیں؟''

بولے ''آفاقی صاحب۔ آپ یقین نہیں کریں گے مگر یہ حقیقت ہے کہ نیویارک میں ہزاروں' لاکھوں' ڈرائیور لائسنس کے بغیر ہی گاڑیاں چلاتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ ٹریفک کی کوئی خلاف ورزی کرنے پر پکڑے جاتے ہیں تب پتا چلتا ہے۔''

ہم حیران رہ گئے۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے اور وہ بھی نیویارک میں!''

بولے ''نیویارک میں کیا نہیں ہوتا۔ بروکلین میں تین اسکول کے بچے کچل کر مر گئے۔ ڈرائیوروں کو گرفتار کیا گیا تو پتا چلا کہ ان میں سے دو ڈرائیوروں کے لائسنس ۱۰۴ بار معطل ہو چکے ہیں۔ تیسرے کے پاس سرے سے لائسنس ہی نہیں تھا اور تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بھی کئی حادثات میں ملوث ہے۔ پچھلے دنوں بروکلین کی ایک بڑی سڑک پر ایک صاحب اسی میل فی گھنٹا کی رفتار سے دوسری کار سے ریس لگاتے ہوئے ایک اور کار سے ٹکرا گئے جس میں سوار ایک عورت اور دو بچے موقعے پر ہی ہلاک ہو گئے۔ یہ ڈرائیور لائسنس سے محروم تھا۔ ایک اور ڈرائیور نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے بارہ افراد کو زخمی کر دیا۔ اس کا لائسنس چالیس بار معطل ہو چکا تھا۔''

یہ باتیں سن کر ہم سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔

''مگر ٹریفک پولیس کیا کرتی ہے؟''

''کچھ نہ پوچھئے۔ پولیس کاریں بھگانے کے سوا ان کا کوئی کام نہیں ہے۔ ان کا بس بھی شریفوں پر ہی چلتا ہے۔ نیویارک پولیس سے تو اللہ ہی بچائے۔ جو ان کے ہتھے چڑھ جائے اس کی کم بختی آجاتی ہے۔ اس کے خلاف بہت سے الزام ڈال دیتے ہیں۔ پولیس سے

مزاحمت کرنا اور پولیس پر ہاتھ اٹھانا تو معمولی الزام ہے۔ کبھی شراب کے نشے کا الزام تھوپ دیتے ہیں، کئی بار تو پڑیا بھی برآمد کر لیتے ہیں۔"

خان صاحب فخریہ انداز میں بولے "دیکھا' میں نے کہا نہیں تھا کہ نیویارک کو دیکھ کر لاہور یاد آجاتا ہے۔"

منظور لاٹ نے بتایا کہ کالوں اور غیر سفید فام لوگوں کے ساتھ پولیس اکثر زیادتی کرتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی بعض پولیس والے پکڑے بھی جاتے ہیں مگر ان کے افسران ان کی طرف داری کرتے ہیں۔"

بٹ صاحب ہماری حیرانی پر بگڑ کر بولے "آخر آپ لوگ اتنے حیران کیوں ہو رہے ہیں؟ امریکی فلموں میں نہیں دیکھتے کہ پولیس والے کیسے کیسے خبیث ہوتے ہیں اور معصوم شہریوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں؟"

بٹ صاحب کی بات سو فیصد درست تھی۔ ذرا غور فرمائیے کہ ٹی وی پر ہم جو فلمیں دیکھتے ہیں ان میں امریکی معاشرے کو مجرموں اور جرائم پیشہ اور ظالم پولیس والوں کو اکثر پیش کیا جاتا ہے۔ فلموں میں تو وہ آخر میں پکڑ لیے جاتے ہیں مگر عام زندگی میں تو ایسا نہیں ہوتا ہو گا۔

ہمیں مشہور امریکی اداکار ایرل فلن کی آپ بیتی کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایرل فلن اپنے زمانے کا مقبول ترین اداکار تھا۔ اس کی فلمیں "رابن ہڈ" اور "تھری مسکیٹرز" دنیا بھر میں پسند کی گئی تھیں اور اس رومانٹک اداکار کی ایک دنیا دیوانی تھی۔ یہی ایرل فلن صاحب ایک بار بہت جلدی میں نیویارک کے ائرپورٹ جا رہے تھے کہ ایک جگہ پولیس کار نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا' وہ رک گئے۔

پولیس والے ان کے پاس آئے اور کہا "فلن۔ ہم تمہارے آٹوگراف لینا چاہتے ہیں۔"

ایرل فلن کو بہت غصہ آیا۔ اس نے کہا "یہ کیا بے ہودگی ہے۔ مجھے ائرپورٹ پہنچنے کی جلدی ہے اور تم نے بلاوجہ مجھے روک لیا۔"

پولیس والا مسکرایا "اب رک ہی گئے ہو تو آٹوگراف دے جاؤ۔"

"بکو مت" ایرل فلن نے غصے سے کہا اور کار اسٹارٹ کرنے کا ارادہ کیا مگر ایک پولیس

مین نے اس سے کار کی چابی چھین لی۔ اس نے مزاحمت کی تو دونوں پولیس والوں نے اس کی خوب مرمت کی اور پکڑ کر تھانے لے گئے۔ اس پر پولیس پر حملہ کرنے کا الزام عائد کر دیا اور چالان کر دیا۔ اس پر انہوں نے شراب پی کر ڈرائیونگ کرنے کا الزام بھی تھوپ دیا۔ اس نے احتجاج کیا اور ٹیلی فون کرنے کی اجازت مانگی تو سارے پولیس والوں نے اسے مل کر خوب پیٹا اور اجازت نہیں دی۔ ان کا کہنا تھا کہ تمہیں پولیس کی ساتھ بدتمیزی کرنے کا مزہ چکھا دیں گے۔

دوسرے دن ایرل فلن نے اپنے وکیل کو فون کیا تو نیویارک اور امریکا کے بڑے بڑے فلم ساز اور اداکار اس کی ضمانت دینے کے لیے آگئے مگر پولیس نے جو مقدمے قائم کیے تھے وہ دو تین مہینے تک چلتے رہے۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد ایرل فلن نے لکھا تھا "یاد رکھو۔ کبھی نیویارک کی پولیس سے نہ بگاڑنا۔"

یہ واقعہ تیس پینتیس سال پرانا ہے۔

نیویارک میں لوگ اکثر موقع پا کر ٹریفک کی خلاف ورزیاں کر ڈالتے ہیں۔ اگر کبھی پکڑے جائیں تو پولیس وارننگ دے کر چھوڑ دیتی ہے یا محض ٹکٹ دے دیتی ہے۔

"مگر کیوں؟" بٹ صاحب نے پوچھا۔

لاٹ صاحب ہنسنے لگے "پولیس والوں کا کہنا ہے کہ ہمارے پاس فکر کرنے کے لیے اس سے زیادہ سنگین جرائم ہیں۔ معمولی ٹریفک کے واقعات پر وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟"

☆ ☆ ☆

روڈ سائن ہمارے ہاں بھی یا تو تلاش کرنے پڑتے ہیں یا پھر پڑھے نہیں جاتے۔ نیویارک میں بھی ایسا ہی معاملہ ہے پارکنگ کے معاملے میں اگر ہم نے اپنوں جیسا کوئی شہر دیکھا تو وہ نیویارک ہے۔ لوگ بڑے اطمینان سے سڑک کے بیچوں بیچ کار پارک کر دیتے ہیں۔ ڈبل پارکنگ کے منظر بھی عام ہیں۔ پولیس ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی کیونکہ کار میں کوئی ایک فرد ضرور بیٹھا ہوتا ہے۔ بعض کو ٹکٹ بھی مل جاتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ چالان کی رقم ادا ہی نہیں کرتے۔ نیویارک میں گڑھے تو ہوتے ہیں اور ان میں انسان اور کاریں گرتی بھی رہتی ہیں۔ ہم میں اور ان میں فرق یہ ہے کہ نیویارک والے

ان نقصانات کے خلاف ہرجانے کے دعوے بھی کر دیتے ہیں اور پیسے وصول کر لیتے ہیں جب کہ ہمیں یہ سہولت بھی نصیب نہیں ہوتی مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ بلدیہ کے حکام شہر اور سڑکوں کو خوب صورت بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ سڑکوں کو خوب صورت بنانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں' اور لوگ ان کوششوں کو ناکام بنانے میں۔ مثلاً گرینڈ سینٹرل پارک وے کے کنارے کنارے پھولوں کے پودے اور گملے سجائے گئے مگر راتوں رات کوئی انہیں چرا کر لے گیا۔ لوگوں کا بھی عجیب حال ہے۔ وہ مقررہ مقامات کے علاوہ بھی جہاں سے بھی جی چاہے سڑکیں عبور کرتے رہتے ہیں۔ نیویارک میں ٹریفک پولیس کو دہری مصیبت کا سامنا ہے۔ ایک طرف تو وہ تیز رفتار ڈرائیوروں کو چیک کرنے کے لیے ویڈیو کیمرے نصب کرتی ہے اور دوسری طرف انہیں پیدل چلنے والوں کو ہر جگہ سے سڑک عبور کرنے سے روکنے کے لیے رکاوٹیں بھی کھڑی کرنی پڑتی ہیں۔ نیویارک کی اکثر سڑکوں پر زیادہ سے زیادہ رفتار کی حد تیس میل فی گھنٹا ہے مگر جہاں کھلی جگہ ملتی ہے کار والے خوب کاریں بھگاتے ہوئے نظر آجاتے ہیں۔ لیکن مین ہٹن اور بروکلین کی سڑکوں پر مصروفیت کے وقت کار کی رفتار دو میل فی گھنٹا بھی نہیں ہوتی حالانکہ پیدل چلنے والوں کی رفتار عموماً چار میل فی گھنٹا ہوتی ہے ۔ مگر وہ تو ایسی مجبوری ہے جس کا کوئی علاج ان کے پاس نہیں ہے۔

کوئی نیویارک جائے اور ہارلیم کا علاقہ نہ دیکھے' یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ بٹ صاحب کو نیویارک میں سب سے زیادہ آرزو مجسمہ آزادی کو دیکھنے کی تھی اور خان صاحب ہارلیم دیکھنے کے لیے بے تاب تھے مگر ہارلیم کے بارے میں اس قدر ڈرا دینے والی باتیں سنی تھیں کہ وہاں جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ دوسرے لوگوں کی تو چھوڑیئے' نیویارک کی سیرو تفریح کے بارے میں سیاحوں کے لیے جو پمفلٹ شائع کیے جاتے ہیں ان میں بھی ہارلیم کے متعلق خاصی پریشان کن ہدایات نظر آتی ہیں۔ رچمنڈ ہوٹل میں استقبالیہ سے ہم نے جو تفریحی گائڈ نما پمفلٹ اٹھایا تھا اس میں ہارلیم کے بارے میں حسب ذیل ہدایات درج تھیں۔

۱۔ اس علاقے میں اکیلے ہرگز نہ جائیں۔
۲۔ بہت زیادہ لوگوں کے گروپ کی شکل میں بھی نہ جائیں۔

۳۔ بہت شاندار اور قیمتی اور فیشن ایبل لباس پہن کر نہ جائیں۔
۴۔ کم سے کم رقم ساتھ لے کر جائیں۔
۵۔ زیورات ہرگز پہن کر نہ جائیں۔
۶۔ یاد رکھیے کہ آپ کے پاس کوئی کیمرا بھی نہ ہو۔
۷۔ بڑی اور بارونق سڑکوں پر ہی گھومتے رہیں۔ وہیں شاپنگ کریں۔ آس پاس کی چھوٹی سڑکوں پر بھول کر بھی قدم رنجہ نہ فرمائیں۔
۸۔ اپنی کار لے کر نہ جائیں۔ ٹیکسی میں جائیں اور کم آباد اور سنسان سڑکوں کا رخ نہ کریں۔
۹۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہاں رات کے وقت جانے کی حماقت نہ کریں۔

یہ ہدایات کسی میدان جنگ کے بارے میں نہیں ہیں' ہارلیم کے بارے میں ہیں۔ جس کے بارے مین یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر آپ نے ہارلیم نہیں دیکھا تو سمجھئے کہ نیویارک ہی نہیں دیکھا۔

خان صاحب کو جب یہ ہدایات پڑھ کر سنائی گئیں تو ان کا ارادہ ڈانوا ڈول ہو گیا۔ ان کا خیال تھا کہ بلاوجہ جان کو خطرے میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر اب بٹ صاحب بضد تھے کہ ہارلیم دیکھے بغیر نیویارک سے نہیں جائیں گے۔ لاٹ صاحب کے سامنے یہ مسئلہ زیر بحث آیا تو انہوں نے فوراً ماہرانہ مشورہ پیش کر دیا۔ انہوں نے بتایا کہ ہارلیم دیکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ گائیڈ ایجنسی کی بس میں سوار ہو کر وہاں جائیں۔ ہارلیم کالوں کا علاقہ ہے اور دنیا بھر میں بدنام ہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ ہارلیم کی سیر کرانے کے لیے جو دو کمپنیاں بندوبست کرتی ہیں وہ دونوں بھی کالوں کی ملکیت ہیں کیونکہ ان کی ہمراہی میں ہارلیم جانا سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ ان کے پاس' جانے والوں کا اتنا زیادہ رش رہتا ہے کہ کم از کم ایک دو دن پہلے بکنگ کرانی پڑتی ہے ورنہ بسوں میں جگہ نہیں ملتی۔ کالے اس بات کے قائل ہیں کہ ہارلیم کی خرابیاں اور خوبیاں بلا کم و کاست ہر سیاح کو دکھائی جائیں۔ ان کا فلسفہ شاید یہ ہے کہ ؎

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا

حکومت یا انتظامیہ بھی اس علاقے کو سیاحوں اور دنیا والوں کی نگاہوں سے چھپا کر

رکھنے کی قائل نہیں ہے۔ اس کا سبب وہی ہے جو پہلے بتایا جاچکا ہے۔ امریکی اپنی کوئی بات دنیا والوں سے نہیں چھپاتے اور اپنی خامیوں پر شرمندہ بھی نہیں ہوتے' تیسری دنیا کے ملکوں میں باہر سے آنے والوں کو اپنے ٹوٹے پھوٹے غربت زدہ اور بدنام علاقوں سے دور ہی رکھا جاتا ہے اور اگر کسی غیر ملکی کی نظر پڑ بھی جائے تو سب شرمندہ ہو کر اس کی تاویلیں پیش کرنے لگتے ہیں مگر مغرب کے لوگوں میں ایسا احساس کمتری نہیں ہے۔

جس روز صبح سویرے ہارلیم جانا تھا اس سے ایک دن پہلے خان صاحب نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ انشورنس کرائے بغیر جانے کی حماقت نہ کی جائے مگر بٹ صاحب نے ان کی بات نہیں مانی کہنے لگے "خان صاحب۔ شرم کیجئے' آپ کیسے خان ہیں۔ کالوں سے ڈر گئے؟ بھئی ہم ہارلیم ہی تو جا رہے ہیں "لام پر تو نہیں جا رہے۔"

خدا خدا کر کے خان صاحب وہاں جانے پر آمادہ ہوئے مگر اس شرط پر کہ وہاں زیادہ دیر نہ لگائی جائے۔

☆ ☆ ☆

ہارلیم کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کچھ عرصہ قبل اس شہر پر بمباری ہو چکی ہے' شکستہ اور جلی ہوئی عمارتیں بلکہ عمارتوں کے ڈھانچے اور جابجا ملبے کے ڈھیر۔ بڑی سڑکیں' جن پر شاپنگ سینٹر بھی ہیں' ٹوٹی پھوٹی اور گندی۔ جگہ جگہ غلاظت کے ڈھیر۔ بد رنگ' سیاہی مائل' بوسیدہ سی عمارتیں۔ میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹے ہوئے زن و مرد۔ ہر طرف سیاہ فام ہی سیاہ فام۔ یہ ہارلیم کی لفظی تصویر ہے۔ ہم جس کوچ میں سوار ہو کر ہارلیم پہنچے تھے اس میں قریباً ۲۵ مسافر سوار تھے۔ ان میں سبھی سیاح تھے' خواتین کی تعداد حسب معمول زیادہ تھی۔ سب کی سب خواتین بقول خان صاحب "میمیں" تھیں۔ لباس انہوں نے حسب معمول کم سے کم پہنا تھا۔ بس کے گائیڈ اور ڈرائیور کا نام سام تھا۔ اس نے سفر کا آغاز کرنے سے پہلے بعض خواتین کے لباس پر ایک گہری نظر ڈالی اور دبی زبان میں ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

"میڈم' شاید آپ نے وہ پمفلٹ نہیں پڑھا جس میں ہارلیم کی سیر کرنے والوں کے لیے ہدایات درج ہیں ورنہ یہ لباس نہ پہنتیں۔"

"میں نے کوئی قیمتی لباس تو نہیں پہنا" وہ خاتون معصومیت سے بولیں۔

سام نے آسمان کی جانب دیکھ کر ایک سرد آہ بھری اور منہ ہی منہ میں کچھ کہا۔ شاید یہ کہا ہو گا کہ ان عورتوں سے خدا ہی سمجھے گا۔

ہارلیم پہنچنے سے پہلے ہی گائیڈ نے اپنی کرخت انگریزی میں اس علاقے کی تاریخ بیان کر دی تھی۔ ہارلیم کا علاقہ ۱۱۰ویں اسٹریٹ سے شروع ہوتا ہے اور سینٹرل پارک کے شمالی حصے تک پھیلا ہوا ہے اس کے ایک طرف ۱۱۰ویں اسٹریٹ ہے تو دوسری طرف ۱۳۶ویں اسٹریٹ۔ درمیان میں مشہور زمانہ ہارلیم ہے۔ چند سال پہلے تک ہارلیم کی آبادی دس لاکھ کے لگ بھگ تھی اور یہ سب کے سب کالے تھے۔ ہوا یہ کہ جب مین ہٹن کے علاقے میں

خوش حالی اور ترقی آئی تو وہاں کی سیاہ فام آبادی' سکڑ کر ایک انتہائی مفلوک الحال علاقے میں اکٹھی ہو گئی۔ ان کی اکثریت نے ہارلیم میں سر چھپانے کا فیصلہ کیا۔ انیسویں صدی کے آغاز تک یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں ہالینڈ کے باشندے آباد تھے۔ جب باہر سے آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو خوشحال ہالینڈ والے دوسرے علاقوں میں منتقل ہو گئے اور یہاں کالوں کی آبادی بڑھنے لگی۔ ۱۹۲۰ء تک ہارلیم خالص کالوں کی بستی میں تبدیل ہو گیا مگر اس وقت یہاں خوشحال اور پیسے والے کالے بھی رہا کرتے تھے۔ وہ زمانہ جاز موسیقی کا زمانہ تھا اور اس میدان میں کالے گلوکار بہت نام پیدا کر رہے تھے۔ ہارلیم میں جب کالوں کے میوزیکل پروگرام ہوتے تھے تو آس پاس کے سفید فام بھی ہارلیم پہنچ جاتے تھے مگر پھر خوش حال کالے بھی یہاں سے رخصت ہو گئے۔ جو غریب کالے رہ گئے وہ پانی بجلی اور گیس کے بل تک ادا نہیں کر سکتے تھے جس کے نتیجے میں عمارتوں کی بجلی' پانی اور گیس منقطع کر دی گئی۔

غربت کے مارے کرائے دار اپنے اپارٹمنٹ کا کرایہ تک ادا نہیں کر سکتے تھے۔ جاڑوں میں پانی کے پائپوں میں پانی جم جایا کرتا تھا تو وہ پھٹ جاتے تھے۔ اس طرح حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ بلدیہ کے حکام ان بوسیدہ عمارتوں کے رہنے والوں کو کسی اور جگہ رہائش دینے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

جب ان عمارتوں سے بے دخل ہونے لگے تو کالوں نے یہ ترکیب نکالی کہ رات کے وقت کسی عمارت میں آگ لگا دیتے تھے اور وہ جل کر راکھ یا کھنڈر بن جاتی تھی۔ ان عمارتوں کا والی وارث کون ہوتا؟ چنانچہ بے انتہا غریب لوگوں نے ان بوسیدہ کھنڈروں میں رہنا شروع کر دیا۔ بعض علاقے قدرے بہتر حالت میں تھے جن میں پیسے والے کالے ر کرتے تھے اور آج بھی وہاں رہتے ہیں حالانکہ انہوں نے دوسرے علاقوں میں بھی گھر خر لیے ہیں۔ اس طرح یہ بے روزگاری کے مارے ہوئے کالوں کی آبادی مشہور ہو گئی جرائم اور مار دھاڑ یہاں عام ہو گئی۔ منشیات کا دھندا شروع ہوا تو غنڈوں نے بھی یہا ڈیرا جما لیا۔ اب یہ عالم ہے کہ پولیس نے بھی یہاں کے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ د ہے۔ چوری' قتل' ڈاکا زنی' منشیات' آبرو ریزی' لوٹ مار ہر قسم کے جرائم یہاں سر ہوتے رہتے ہیں مگر پولیس انجان بنی رہتی ہے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ اس علاقے سے نہ

کوئی گواہ ملتا ہے اور نہ ہی جرم کا ثبوت حاصل ہوتا ہے۔ پھر بلاوجہ وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟

ہم سب ان گندی' ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر گھومتے رہے جہاں کالے لڑکوں اور لڑکیوں کے غول پھر رہے تھے۔ کالے لوگ بچے پیدا کرنے کے معاملے میں شیر ہیں۔ شادی ہو یا نہ ہو' کالوں میں افزائش نسل اور پیدائش کا اوسط بہت زیادہ ہے۔ مردوں کی کام چوری اور بے پروائی کے باعث بچے پالنے کا فرض بھی عورتوں کو ادا کرنا پڑتا ہے اور ان کے لیے کھانے کی ذمے داری بھی ان پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اس علاقے میں ہر عمر کے بچے ورو غل مچانے میں مصروف تھے۔ لڑائی جھگڑے بھی عام ہیں' بعض سڑکیں اور علاقے ذرا تر حالت میں ہیں۔ یہاں شاپنگ سینٹر بھی ہیں۔ ریستوران' شراب خانے اور جوا خانے بھی م ہیں۔ لیکن عجیب ویرانی اور بے سروسامانی کا عالم طاری ہے۔ ہمارا تو کچھ دیر بعد ہی دل ھبرا گیا۔ سیاح خواتین البتہ بہت زیادہ جوش و خروش اور دلچسپی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

ں بے آباد اور خاکستر بستی میں ایک خوب صورت' صاف ستھری عمارت دیکھ کر ہم حیران گئے۔ یہ عمارت سب سے الگ نظر آئی۔ گائیڈ صاحب نے فوراً اس کی تفصیل بیان کر ی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ ایک تاریخی اہمیت کی عمارت ہے۔ یہ ۱۷۶۵ء میں تعمیر ہوئی تھی جارج واشنگٹن نے انقلاب کے زمانے میں اسے اپنا صدر دفتر بنایا تھا۔ بعد میں ایک نسیسی شراب فروش نے اسے خرید لیا۔ اس کے مرنے کے بعد ایک امریکی نائب صدر اس کی بیوہ سے شادی کر لی اور کچھ عرصے اس عمارت میں قیام کیا۔ اب اسے ایک قومی ب گھر کی حیثیت حاصل ہے۔

اس عمارت کے سامنے بھی کالی لڑکیاں اور لڑکے بے کار بیٹھے نظر آئے۔

بٹ صاحب بولے "سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کالے لوگ اس طرح خالی کیوں رہتے ۔ جب دیکھو دیواروں سے ٹیک لگائے کھڑے ہوئے یا ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے ے نظر آتے ہیں۔ آخر یہ لوگ کام کیوں نہیں کرتے؟"

"اس لیے کہ یہ بے کار ہیں" خان صاحب نے جواب دیا "میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کالوں کا معاملہ یہ ہے کہ کیونکہ یہ کوئی کام نہیں کرتے اس لیے بے کار رہتے ہیں اور لہ بے کار رہتے ہیں اس لیے کوئی کام نہیں کرتے۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ اتنے اہم مسئلے کو خان صاحب نے کس طرح دو لفظوں می
حل کر دیا ہے! سچی بات تو یہ ہے کہ امریکی کالوں کا معاملہ کچھ ہماری سمجھ میں بھی نہیں آیا
وہ گوروں کی شکایت تو کرتے رہتے ہیں مگر بذات خود بھی اپنے لیے کچھ نہیں کرتے۔ آباد
بڑھانے کے سوا ان کی کوئی اور مصروفیت نہیں ہے۔ بڑے بڑے خاندان ہیں جو عموماً با
کی سرپرستی سے محروم رہتے ہیں اور بچوں کی فوج اور خاندان کے بڑے بوڑھوں کو پالنے
بوجھ عورتوں پر پڑ جاتا ہے۔ وہ روزی کمائیں یا بچوں کی تربیت کریں؟ خاص طور پر ا
حالت میں جب کہ آس پاس کا ماحول بھی جرائم زدہ اور انتہائی خراب ہو۔ ان کے
اسکول کا رخ نہیں کرتے اور اوائل عمر ہی سے بری صحبت میں پڑ کر جرائم پیشہ بن جا
ہیں۔ ہارلیم ایک مقام عبرت ہے جسے دیکھ کر کالوں کا ماضی، حال اور مستقبل آنکھوں
سامنے پھر جاتا ہے۔

ہم ایک ریستوران میں جا کر بیٹھ گئے۔ یہاں ہر چیز کالی تھی۔ دیواریں، فرنیچر، فر
ویٹریس اور مالکہ تو ظاہر ہے کہ تھیں ہی کالی۔ دیواروں پر انہوں نے جان بوجھ کر سیاہ ر
نہیں کیا تھا بلکہ امتداد زمانہ اور میل کچیل کے باعث ان کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا اور ا
دوبارہ رنگ و روغن کرنے کی توفیق کسی کو نصیب نہ ہوئی تھی۔

اگر کالے رنگ کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ ویٹریس صحیح معنوں میں حسین کہلا
مستحق تھی اور کسی بھی ملک میں جا کر مقابلہ حسن جیت سکتی تھی۔ قدوقامت، جسام
جسم کے تناسب، ناک نقشے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے باعث ہم سب کی نظریں با
اس کی جانب اٹھ جاتی تھیں۔ چار امریکی خواتین کا ایک گروپ بھی ہمارے سامنے والی
براجمان ہو گیا تھا مگر ویٹریس نے پہلے ہماری طرف رخ کیا حالانکہ میمیں ہم سے پہلے
تھیں۔ غالباً یہ کالی ویٹریس کا گوروں کے خلاف خاموش احتجاج تھا۔ ہم نے دیکھا کہ سیا
لوگ گوروں کو نظر انداز کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنواتے۔

ویٹریس چیونگم چباتی ہوئی ڈھیلے ڈھالے انداز میں ہمارے میز کے پاس آ گئی۔ چال
علاوہ اس لڑکی میں کوئی اور چیز ڈھیلی نہیں تھی۔ لباس تو اس قدر تنگ تھا کہ خان صاح
مشورہ تھا کہ کچھ دیر بعد اسے آکسیجن دینی ضروری ہے ورنہ اس کا دم گھٹ جائے گا
لباس بھی کیا تھا؟ ایک گھٹنوں سے اونچا اسکرٹ، نہایت چست۔ یہ جینز کے کپڑے کا

تھا۔ بٹ صاحب کا خیال تھا کہ لڑکی نے اپنے والد بزرگوار کی جینز کا ایک پائنچہ کاٹ کر یہ
اسکرٹ تیار کیا ہے۔ بالائی جسم پر اس نے ایک جینز کے کپڑے سے بنی ہوئی واسکٹ پہن
رکھی تھی جو غالباً اس کے تین چار سالہ بھائی کی ہو گی۔ خدا جانے وہ اس واسکٹ کے اندر
کیوں کر داخل ہوئی ہو گی!

بٹ صاحب بولے "میرا خیال ہے یہ واسکٹ اسی کی ہے۔ اس نے بچپن میں پہنی ہو
گی اور اس وقت سے آج تک بدستور پہنے ہوئے ہے۔"

اس کے گلے میں موٹے موٹے دانوں کی ایک سیاہ رنگ کی مالا تھی۔

منظور لاٹ نے کہا "ان لوگوں کو رنگوں کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ
سفید دانوں کی مالا ہوتی۔"

ہم نے کہا "آپ یہ نہ بھولیے کہ ان لوگوں کو سفید رنگ سے سخت نفرت ہے۔ آپ
نے اگر کسی کالے مرد یا عورت کو سفید رنگ کا لباس پہنے ہوئے دیکھا ہو تو بتائیے؟"

کسی کو یاد نہیں آیا۔ ویٹریس ہمارے پاس آ کر جھکی تو واقعی کمال بن گئی۔ اس نے بہت
اچھی خوشبو لگا رکھی تھی۔

"یا آ؟" اس نے منہ کھول کر کہا۔ شیخ سعدی نے ایک شعر میں فرمایا ہے۔ کہ جب
تک بندہ خاموش رہتا ہے، اس کے عیب و ہنر پوشیدہ رہتے ہیں۔ شیخ صاحب کے مشاہدے
اور تجربے کو ہم ایک بار پھر مان گئے۔ ویٹریس کی آواز اس کے سراپا کے مقابلے میں نہایت
بھونڈی تھی۔ دانت سفید موتیوں کی طرح تھے لیکن بولنے کا انداز اس قدر بے ہنگم تھا اور
اس نے اپنا منہ اتنا زیادہ کھول دیا تھا کہ حلق کا کوا تک صاف نظر آ گیا۔ جب تک ہم نے
آرڈر نہیں دیا وہ اسی طرح کرسی پر ہاتھ ٹیک کر جھکی کھڑی رہی اور چیونگم چباتی رہی۔

خان صاحب نے کہا "بھائی جلدی سے آرڈر دے دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہمیں
چبانے لگے۔"

ہم نے فوراً کافی کی فرمائش کر دی۔

"بلیک؟" اس نے بھرپور منہ کھول کر اپنے حلق کا جلوہ دکھایا۔

ہم نے گھبرا کر پھر ہاں کہہ دیا۔ وہ اسی ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتی ہوئی واپس ہو گئی۔
ہم حیران تھے کہ اتنی اسمارٹ لڑکی اور اتنی کاہلانہ چال؟ خان صاحب نے کہا "اس لڑکی کو

ایک کتاب تحفے میں دینا چاہیے۔"

"کون سی کتاب؟"

"بول چال کا پہلا سبق۔"

بٹ صاحب بولے "میں ایک راز کی بات کا اعتراف کروں؟"

"ہاں ہاں کرو" خان صاحب نے اشتیاق سے کہا۔

"میں اس لڑکی پر عاشق ہونے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اتنی خوش شکل' پرکشش اور دلکش لڑکی میں نے سارے نیویارک میں نہیں دیکھی مگر اس کے بولتے ہی میں نے ارادہ بدل دیا۔"

"یہ تو لڑکی کی خوش قسمتی ہے" ہم نے کہا۔

خان صاحب بولے "معلوم ہوتا ہے کہ اب تک آپ سارے نیویارک میں آنکھیں بند کر کے ہی پھرتے رہے ہیں۔ ورنہ ایک سے بڑھ کر ایک نمونہ حسن نیویارک کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہے۔"

ویٹریس نے پہلے ہمیں کافی لا کر دی اس کے بعد ساتھ والی گوریوں پر توجہ دی۔ کافی بھی کیا تھی۔ سیاہ مگوں میں نری کالی تھی۔ گرم اور انتہائی کڑوی ہونے کے سوا اس میں اور کوئی خوبی نہ تھی۔ نہ دودھ' نہ چینی' نہ کریم۔

کاؤنٹر پر ایک چھ سات فٹ اونچی اور اتنی ہی چوڑی خاتون تشریف فرما تھیں۔ ان کا کام جماہیاں لینے کے سوا کچھ نہ تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ پورا منہ پھاڑ کر جماہی لیتیں۔ آپ ہی آپ مسکرانے لگتیں۔ خدا جانے جماہیوں اور مسکراہٹ میں کون سا باہمی رشتہ تھا؟

ویٹریس نے ویسی بلیک کافی گوریوں کو بھی لا کر دے دی۔ اور واپس جاتے ہوئے ایک نگاہ غلط انداز ہم لوگوں پر ڈال کر نہایت فتنہ انگیز انداز میں مسکرائی۔

"اگر منہ بند رکھے تو یہ قیامت سے کم نہیں ہے" بٹ صاحب نے خیال ظاہر کیا۔

"مگر یہ اس کے بس میں نہیں ہے" خان صاحب نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ مگرمچھ کی طرح بڑا منہ کھولنا ان کا خاندانی طریقہ ہے۔ یقین نہ آئے تو کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی والدہ صاحبہ کو دیکھ لیجیے۔"

کچھ دیر ہم ریستوران میں بیٹھے سامنے سڑک پر آنے جانے والوں اور آوارہ گردی

کرنے والے سیاہ فام لڑکوں کو دیکھتے رہے۔ چار سرخ و سفید گوری خواتین ہماری سامنے بیٹھی ہوئی تھیں مگر ہم سب کی نگاہیں بار بار کالی ویٹریس کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

"بھئی اب چلو۔ کب تک اس حسن سیاہ کو دیکھتے رہو گے؟" منظور لاٹ نے یاد دلایا تو بٹ صاحب نے آنکھیں چار ہوتے ہی ویٹریس کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی طرح ڈھیلے ڈھالے انداز میں چیونگم چباتی ہوئی آئی۔ کاغذ کا ایک پرزہ ہمارے سامنے میز پر رکھا' اسی طرح کرسی پر ہاتھ ٹیکا اور کمان بن کر کھڑی ہو گئی۔

"ہاؤ مچ!" بٹ صاحب نے بوکھلا کر پوچھا۔

"مین! کیا تمہیں پڑھنا نہیں آتا؟" وہ مسکرائی اور سامنے رکھے ہوئے کاغذ کے پرزے کی جانب اشارہ کیا۔

بٹ صاحب نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے اور میز پر ڈال دیے۔ ہم لوگ رخصت ہونے کے لیے کھڑے ہوئے تو ویٹریس بھی سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے بٹ صاحب کے شانے پر انگلی سے دستک دی اور مخمور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی "تم لوگ تھوڑی سی تفریح کرنا پسند کرو گے؟ کیوں' کیا خیال ہے؟"

ہم سب کے سب بھونچکا رہ گئے۔ ایک لمحہ خاموشی رہی پھر بٹ صاحب نے کہا "نو۔ تھینک یو!"

ہم لوگ تیزی سے ریستوران سے باہر نکل گئے۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ کمر پر ایک ہاتھ رکھے کھڑی مسکرا رہی تھی اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔

امریکا اگر نئی دنیا ہے تو ہارلیم اس دنیا کے اندر ایک اور دنیا ہے۔ یوں تو امریکا کے اندر اور بھی بہت سے جہان آباد ہیں۔ اس اعتبار سے یہ انوکھا ملک ہے کہ ہر رنگ نسل اور مزاج کے لوگ یہاں بہت بڑی تعداد میں مل جاتے ہیں اور ہر ایک کا رنگ بالکل علیحدہ ہے۔ واقعی ایک عجیب ملک ہے۔

ہارلیم میں گھومیں پھریں تو امریکا کا ایک نیا چہرہ نظر آتا ہے۔ کالے اس ملک کے ہر شہر میں آباد ہیں اور ان کی بستیاں اپنی انفرادیت کی وجہ سے الگ سے پہچانی جاتی ہیں۔ مگر ہارلیم کو اس کا "نچوڑ" کہا جا سکتا ہے۔ کالے کیا کرتے ہیں؟ اگر کچھ نہیں کرتے تو کیوں نہیں کرتے اور کچھ کرتے ہیں تو کیوں کرتے ہیں۔ کس طرح رہتے ہیں' ان کا کلچر کیا ہے؟ ان

سب سوالوں کے جواب آپ کو ایک ہی جگہ مل جاتے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ ہے
کالے مذہب کے معاملے میں کافی جذباتی ہیں۔ لیکن بداخلاقی' بے راہ روی اور معاشرتی
مذہبی اقدار کو توڑنے میں بھی پیش پیش ہیں۔ امریکا میں جرائم کی بہتات میں نمایاں حصہ
کالوں کا ہے۔ اس طرح جب ہم سنتے ہیں کہ امریکا میں کنواری ماؤں کی تعداد میں بہت زیا
اضافہ ہو گیا ہے تو اس میں بھی کالوں کی تعداد اور تناسب بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ایک سرو
میں بتایا گیا ہے کہ ان کی لڑکیاں بارہ تیرہ سال کی عمر میں بھی مائیں بن جاتی ہیں مگر باپ د
دور تک نظر نہیں آتے۔ سیکس ان کے ہاں ایک روز مرہ کی چیز ہے اور معمول میں داخ
ہے۔ معاشی بدحالی نے اس میں کچھ اور اضافہ کر دیا ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ تیسری دنیا کے ملکوں میں نچلے طبقے اور غریبوں میں آبادی بہ
زیادہ ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تفریح اور آسائش کے دوسرے ذرائع انہیں نصیب نہیں
ہوتے اس لیے افزائش نسل ہی ان کا سب سے محبوب مشغلہ ہے۔ اس سلسلے میں آپ۔
ایک لطیفہ سنا ہو گا۔ ایک بچہ اسکول میں داخل ہونے کے لیے گیا۔ اسکول والوں نے م
معلومات حاصل کرنے کے لیے پوچھا۔

''تمہارے اور کتنے بہن بھائی ہیں؟''

بچے نے کہا ''ابھی گن کر بتاتا ہوں'' پھر اس نے انگلیوں پر گننا شروع کر دیا اور مطلع
''جی ہم تیرہ بہن بھائی ہیں۔ چھ بھائی اور سات بہنیں۔''

ٹیچر نے پریشان ہو کر پوچھا ''تمہارے ابا کیا کام کرتے ہیں؟''

جواب ملا ''جی بس یہی کرتے ہیں۔''

امریکا میں کالوں کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے حالانکہ انہیں ہمارے ملک ک
غریبوں کے مقابلے میں قدرے زیادہ سہولتیں اور آسائشیں حاصل ہیں۔ مثلاً وہ شرا
وغیرہ پی سکتے ہیں۔ ناچ گانے کی محفلوں میں شریک ہو سکتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ا
کے معاشرے میں لڑکوں اور لڑکیوں کے میل جول پر پابندیاں نہیں ہیں۔ آخر الذکر آسا
کے باعث انہیں تیسری دنیا کے لوگوں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ شادی کے بغیر بھی لڑکیا
مائیں بن جاتی ہیں اور کوئی انہیں کچھ نہیں کہتا۔ والد صاحب بذات خود نو عمر اور ۔
روزگار ہوتے ہیں۔ شادی کے بندھن میں ہی گرفتار نہیں ہوتے اس لیے بیوی بچوں

پرورش کی بھی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اس لیے عیش کرتے ہیں۔ نو عمر مائیں ان بچوں کو یا
تو پھینک پھانک کر ان سے چھٹکارا حاصل کر لیتی ہیں یا پھر اپنی ماؤں کے پاس چھوڑ دیتی ہیں۔
اس طرح یہ بن باپ کے بچے معاشرے پر ایک اور بوجھ بن جاتے ہیں۔

کالوں کا ذکر چل نکلا ہے تو یہ بھی بتاتے چلیں کہ امریکا میں اگر مشترکہ خاندان کا رواج
اور دستور باقی ہے تو صرف کالوں میں ہے۔ ساتھ رہنے کا یہ طریقہ ان کے لیے مفید بھی
ہے اور نقصان دہ بھی۔ مفید اس طرح کہ بن مانگے بچے بھی ان خاندانوں میں پل جاتے ہیں
اور نقصان دہ اس لحاظ سے کہ اگر یہ سسٹم نہ ہو تو کالی لڑکیاں اتنی آزادی اور فراخ دلی سے
بچے پیدا نہ کریں اور لڑکے بھی شاید کچھ احتیاط سے کام لیں۔

کنواری ماؤں تک ہی موقوف نہیں ہے۔ شادی شدہ عورتوں کے لیے بھی یہ مسئلہ
ہے کہ بچے عموماً ماؤں کو ہی پالنے پڑتے ہیں۔ باپ کو ان کی اتنی فکر نہیں ہوتی اور نہ وہ ان
کی پرورش کی ذمے داری محسوس کرتے ہیں۔ بس بچے پہ بچے پیدا کرتے رہتے ہیں اور
بذات خود گھومتے پھرتے ہیں۔ بہت ہوا تو کبھی کوئی کام کر لیا' کبھی نہیں کیا۔ شراب نوشی'
آوارہ گردی' لڑائی جھگڑے اور جرائم کے سہارے ان کی زندگی بسر ہوتی رہتی ہے۔ بچے
خدا کے یا پھر ماؤں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کالوں کی پسماندگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے
کیونکہ ان کے برعکس گورے' خاندانی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور زیادہ ذمے داری اور
سلیقے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

پڑھنے پڑھانے کا کالوں کو شوق نہیں ہوتا اور پھر وہی معاشی مسئلہ سامنے رہتا ہے جو
ہمارے ہاں کے نچلے طبقے کے خاندانوں کو درپیش رہتا ہے۔ یعنی یہ کہ اگر بچے پڑھنے لگ
جائیں تو گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟ اس طرح کالوں کی آبادی' پسماندگی اور مسائل بڑھتے
رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی بے زاری اور نظام حکومت سے شکایتوں میں بھی
اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مختصر طور پر امریکی کالوں کا یہی مسئلہ ہے کہ وہ معاشرے کی ذمے
داریاں اور پابندیاں قبول کیے بغیر اس کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ جب اس
میں ناکام ہوتے ہیں تو ان کی بے زاری اور ناراضی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے
وہ تھوڑا بہت الزام تو قسمت کو دیتے ہیں مگر زیادہ ذمے داری گوروں پر ڈال دیتے ہیں اور
اپنی دیرینہ شکایات دہرانے لگتے ہیں۔ یہ امریکی معاشرے کا ایک بہت بڑا المیہ بھی ہے اور

ایک خطرناک حقیقت بھی۔ امریکا والے دنیا کے دوسرے ملکوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے اسلحہ اور ایٹم بموں کے انبار لگانے میں مصروف ہیں لیکن خود ان کی آنکھوں کے سامنے جو "بم" تیار ہو رہے ہیں وہ ایک نہ ایک دن بارود کے ذخیرے کی طرح پھٹ پڑیں گے اور اس وقت امریکی حکومت کیسے بچاؤ کرے گی؟ یہ مسئلہ آج بھی امریکی دانشوروں اور ماہرین اقتصادیات کے لیے خاصا پریشان کن ہے۔

☆ ☆ ☆

ہم نے اس سے پہلے اپنے ملک میں کالے دیکھے تھے مگر امریکی کالوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ نہ صرف وہ بہت زیادہ کالے ہیں بلکہ بہت حد تک ہمارے ملک کے کالوں سے مختلف بھی ہیں۔ ہمارے ذاتی تجربے اور مشاہدے کے مطابق کالے زیادہ ذہین نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس جسمانی قوت ان میں بے پناہ ہوتی ہے۔ یہ شاید ان کی نسلی خصوصیت ہے۔ پڑھنے لکھنے کے معاملے میں وہ سب سے پیچھے نظر آتے ہیں مگر کھیلوں میں سب سے آگے ہیں۔ اسی طرح باکسنگ بھی ان کا "نسلی پیشہ" سمجھ لیجیے اس لیے کہ اس میں بھی طاقت استعمال ہوتی ہے۔ کھیلوں اور بھاگ دوڑ کے علاوہ موسیقی کے میدان میں بھی کالوں کی کچھ تعداد نظر آجاتی ہے۔ اس کے سوا تعلیم و تحقیق کے میدان میں وہ صفر نہیں تو شاید ایک فیصد بھی نہیں ہیں۔

ہم نے ہارلیم کی سڑکوں پر کالے نوجوانوں کو گروہ در گروہ بے کار بیٹھے یا آوارہ گردی کرتے ہوئے دیکھا تو منظور لاٹ سے پوچھا "یہ لوگ کوئی کام کیوں نہیں کرتے۔"

"بس جی۔ کام تو یہ مجبوراً ہی کرتے ہیں ورنہ انہیں کام کرنے کا شوق نہیں ہے۔"

"مگر یہ بچے پڑھنے کیوں نہیں جاتے۔ امریکا میں تو بچوں کو تعلیم دلانا لازمی امر ہے؟"

وہ ہنسنے لگے "کوئی پڑھنا ہی نہ چاہے تو کوئی انہیں کیسے پڑھا سکتا ہے۔ انہیں تو بس اللہ تعالیٰ ہی پڑھا سکتا ہے۔ یہ انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔"

ان کالوں کو آپ خالی بیٹھے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں زیادہ بات چیت بھی نہیں کرتے۔ عموماً خاموش اور سوچ میں گم نظر آتے ہیں۔ ویسے بھی یہ فطری طور پر کم گو ہوتے ہیں۔ ہنسی مذاق بھی زیادہ نہیں کرتے۔

"انہیں ہنسی نہیں آتی" منظور لاٹ صاحب نے چلتے چلتے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں بھائی، یہ کیا بات کہہ دی آپ نے؟" خان صاحب بول پڑے "آپ کو معلوم نہیں ہے کہ انسان تو حیوان ظریف ہے۔ یہی تو فرق ہے انسان اور حیوان میں۔ آپ نے کبھی کسی جانور کو ہنستے مسکراتے یا قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھا ہے؟"

لاٹ صاحب کچھ شرمندہ سے ہو گئے، بولے "آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں ان کالوں کے خلاف ہوں۔ بس ان کی خراب عادتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ان میں سینس آف ہیومر بہت کم ہوتا ہے۔ ہنسی کی بات سن کر بھی خاموشی سے چہرہ تکتے رہتے ہیں۔"

بٹ صاحب ایک دم جوش میں آگئے، کہنے لگے "چلیں انہیں کوئی لطیفہ سناتے ہیں۔ ابھی پتا چل جائے گا۔"

خان صاحب بولے "یار بٹ۔ تم بھی کمال کرتے ہو۔ نہ جان نہ پہچان، بلاوجہ اچانک کسی کے پاس جا کر لطیفہ سنا دینا کہاں کی عقل مندی ہے؟ اب یہ سامنے جو بڑے میاں بیٹھے بیئر پی رہے ہیں تو کیا آپ ان کے پاس جا کر کہیں گے "ہائی" اب ذرا ایک لطیفہ سنئے۔"

بے چارے بٹ صاحب چپ ہو گئے۔ ہم نے کہا "اور بٹ صاحب، آپ انہیں لطیفہ کون سی زبان میں سنائیں گے؟"

"انگریزی میں ہی سنائیں گے۔ اردو پنجابی تو یہ سمجھتے نہیں ہیں۔"

"تو پھر جائیے، بسم اللہ کیجئے۔ ہم سامنے والے اسٹور میں آپ کا انتظار کریں گے"

بٹ صاحب سچ مچ ان صاحب کے پاس چلے گئے جو فٹ پاتھ پر نصب سیمنٹ کی ایک بینچ پر تشریف فرما تھے۔ ان کے سامنے بیئر کا ایک خالی ڈبا رکھا ہوا تھا۔ ایک بیئر کا ڈبا ان کے ہاتھ میں تھا۔ پتا نہیں اس سے پہلے اور کتنے ڈبے چڑھا چکے ہوں گے۔ ہم نے تو مذاق میں کہا تھا۔ یہ گمان بھی نہیں تھا کہ بٹ صاحب جرات رندانہ سے کام لیتے ہوئے واقعی ان کالے بزرگ کو لطیفہ سنانے پہنچ جائیں گے۔ پریشان ہو کر ہم بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔ جب تک ہم بٹ صاحب کو روکتے وہ بینچ کے پاس پہنچ چکے تھے۔

"ہیلو سر۔ گڈ آفٹر نون" بٹ صاحب نے بہت صحیح انگریزی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"ہائی مین" بڑے میاں نے آنکھوں کے سامنے ہاتھ کا چھجا بنا کر انہیں دیکھا "یو فارنر؟" (تم غیر ملکی ہو!)

"یس۔ آئی ایم فرام پاکستان۔"

"پاکستان؟" انہوں نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولے "ہو کیرز" (مجھے پروا نہیں ہے) اس کے بعد کی بات چیت اردو میں ملاحظہ فرمائیے۔

بٹ صاحب "میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟"

"بڑی خوشی سے یہ ایک آزاد ملک ہے" یہ کہہ کر انہوں نے بیئر کا خالی ڈبا بینچ پر سے اٹھایا اور سڑک پر پھینک دیا۔ خالی ڈبا لڑھکتا ہوا کوڑے کے اس انبار کے پاس چلا گیا جو کچھ فاصلے پر نظر آرہا تھا۔

"میرا نام بٹ ہے۔ خاور بٹ۔"

"ہوں' ہوں۔"

"میں ٹورسٹ ہوں۔"

"ہوں۔"

"مجھے ہارلیم دیکھنے کا بہت شوق تھا۔"

"ہو گا۔"

"یہ بالکل مختلف ہے۔"

"کس سے؟"

"میرا مطلب ہے' نیویارک کے دوسرے علاقوں سے۔

"وہ تو ہو گا۔ یہ کالوں کا علاقہ ہے۔"

"میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"ہاں' پوچھو؟"

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"ولیم ایلی جاہ۔"

"بہت اچھا نام ہے۔" بٹ صاحب نے کہا۔

"منظور لاث نے پوچھا "آپ نے ولیم جاہ نام بتایا ہے نا؟"

"بالکل۔ کیا تم اونچا سنتے ہو؟"

منظور نے ہم سے اردو میں کہا "یہ تو مسلمان معلوم ہوتا ہے۔"

بٹ صاحب بہت حیران ہوئے "مسلمان اور یہاں؟"

"کیوں۔ یہاں مسلمان ہونے پر پابندی ہے؟" خان صاحب نے کہا۔

ہم نے مسٹر ولیم سے پوچھا "آپ ایلی جاہ کے ماننے والے ہیں؟"

وہ کچھ ناراض ہو کر بولے "میں اللہ کو ماننے والا ہوں۔ میں مسلم ہوں۔"

کیا آپ کے سارے گھر والے مسلم ہیں؟"

"وہ کچھ اور ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہے' یہ ایک آزاد ملک ہے۔"

بٹ صاحب کا جذبہ ایمانی فوراً جوش میں آگیا۔ انہوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا "میں بھی مسلم ہوں۔ ہم سب مسلم ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

بڑے صاحب نے ہم سب سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن ہم نے محسوس کیا کہ امریکا کے محلے ہارلیم میں ایک کالے مسلمان کو پا کر جتنی خوشی ہمیں ہوئی تھی اس کا عشر عشیر بھی ولیم ایلی جاہ کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ اسلام انہوں نے اس لیے قبول کیا تھا کہ انہیں گوروں کے مذہب پر کاربند رہنا پسند نہیں تھا۔ انہیں گوروں سے نفرت تھی اس لیے ظاہر ہے کہ ان کے مذہب سے بھی وہ متنفر تھے۔ نماز' روزہ اور قرآن شریف وغیرہ کا انہیں کچھ علم نہیں تھا۔ اس کی وجہ انہوں نے بڑی معصومیت سے یہ بتائی "ابھی نیا نیا مسلمان ہوا ہوں نا' اس لئے۔"

یعنی نئے مسلمان کے لیے ان باتوں کا جاننا ضروری نہیں ہے۔ البتہ کلمہ انہیں پڑھایا گیا تھا جو انہوں نے کچا پکا یاد بھی کر لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی زبان سے اس پر عربی سے زیادہ کسی اور زبان کا گمان گزرتا تھا۔

"آپ نماز بھی پڑھتے ہیں؟" بٹ صاحب نے دریافت کیا۔ "نماز؟ تمہارا مطلب ہے عبادت؟"

"جی ہاں۔"

"ہم اپنے چرچ میں جاتے ہیں۔ وہاں ایلی جاہ کا کوئی نائب ہمیں وعظ سناتا ہے۔"

ہم نے کہا "مگر مسلمانوں کی عبادت کی جگہ تو مسجد ہوتی ہے؟"

بولے "ہاں ہوتی تو ہے مگر ابھی ہمارے حالات ایسے نہیں ہیں کہ مسجد بنائیں۔ مسجد بنانے پر تو بہت پیسہ خرچ آئے گا اس لیے پرانے گرجا گھروں کو ہم نے اپنی عبادت گاہ بنا لیا ہے۔"

ولیم صاحب تو مسلمان ہو گئے تھے مگر ان کے سارے گھر والے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

خان صاحب نے پوچھا "آپ مسلمان ہوئے تو وہ لوگ ناراض نہیں ہوئے؟"

بولے "ناراض کیوں ہوتے۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے جب میں ان کے عیسائی ہونے پر ناراض نہیں ہوتا تو وہ میرے مسلمان ہونے پر کیوں ناراض ہوں گے۔"

واقعی بات تو نہایت معقول تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی بیوی کے تعلقات ان کے ساتھ ٹھیک نہیں رہتے اس لیے وہ تو ہرگز مسلمان نہیں ہو گی۔ البتہ ان کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی مسلمان ہو گئے ہیں اور ان کا نواسہ بھی ماں کے ساتھ چرچ میں جاتا ہے۔"

"اور آپ کا داماد یعنی سن ان لا۔"

"اس کی بات نہ ہی کریں تو بہتر ہے ویسے بھی للی اسے کچھ نہیں کہہ سکتی ہے کیونکہ ابھی تو ان کی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔"

"مگر آپ نے ابھی بتایا ہے کہ آپ کا نواسہ بھی ہے؟"

"ہاں۔ وہ تو ایک ٹریجڈی ہو گئی تھی۔"

"ٹریجڈی!"

"ایسے اتفاقات پر کسی کا بس بھی نہیں ہوتا۔ اور پھر للی تو ابھی بہت کم عمر ہے۔ پچھلے دسمبر میں اس کی بارھویں سالگرہ ہوئی تھی۔"

ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ولیم ایلی جاہ نے بیئر کا دوسرا ڈبا بھی خالی کر کے فٹ پاتھ پر لڑھکا دیا۔ ایک لمبی سی ڈکار لی اور پھر کہا "کبھی نہ کبھی تو ان گوروں کو بھی عقل آئے گی اس وقت یہ بھی اس کی طرف دوڑیں گے۔"

ہم نے ولیم ایلی جاہ کو خدا حافظ کہا۔ کچھ دور چلنے کے بعد خان صاحب نے پلٹ کر فٹ پاتھ کی جانب دیکھا اور دبی زبان میں کہا "اگر گوروں کو بھی اسلام کی طرف دوڑ کر ایسا ہی مسلمان ہونا ہے تو ہونا نہ ہونا برابر ہے۔"

منظور لاٹ بولے "ایسا نہ کہئے، دیکھئے، مردم شماری میں تو یہ سب مسلمان ہی لکھے جائیں گے نا۔ اور کسی بھی نازک موقعے پر مسلمانوں کا ہی ساتھ دیں گے۔ مسلمان نہ ہونے سے مسلمان ہونا کہیں بہتر ہے۔"

بٹ صاحب نے کہا "اور بقول ولیم ایلی جاہ کے، ابھی تو یہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، جب پرانے ہو جائیں گے تو شاید اچھے مسلمان بن جائیں گے۔"

خان صاحب نے طنزیہ انداز میں بٹ صاحب کو دیکھا "جی ہاں۔ جیسے پرانے ہو کر آپ ایک بہت اچھے مسلمان بن گئے ہیں۔"

"کیوں۔ میرے مسلمان ہونے میں کیا برائی ہے؟" بٹ صاحب فوراً آمادہ پیکار ہو گئے۔ "آپ سے تو اچھا مسلمان ہوں۔ گنڈے دار نماز بھی پڑھ لیتا ہوں۔ آپ تو شاید عید بقرعید پر بھی مسجد میں نہیں جاتے۔"

"میرے بھائی۔ مسجد میں جانے سے کوئی مسلمان نہیں بن جاتا۔ دل کو مسلمان کرنا چاہیے۔ وہ کیا شعر ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ میرا دل مسجد میں جا کر بھی مسلمان نہیں ہوتا۔"

ہم نے کہا "وہ شعر یہ ہے۔"

مسجد تو بنا دی پل بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

ہم ایک بہت اچھے شاپنگ سینٹر کے سامنے سے گزرے۔ امریکا میں خوب صورت اور شاندار اسٹوروں کی کمی نہیں ہے مگر یہ گوروں کے علاقوں میں ہوتے ہیں۔ ہارلیم کی جو شہرت سنی تھی اس کی وجہ سے ہم اس علاقے میں اتنے اچھے اور شاندار اسٹور کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ یہ اسٹور بہت اچھا اور صاف ستھرا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سیلز گرل سے لے کر اوپر کے اسٹاف تک کوئی گوری رنگت والا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا ورنہ گوروں کے علاقوں میں بھی اسٹورز اور دکانوں پر نیگرو لڑکیاں اور لڑکے کام کرتے ہوئے نظر آ جاتے ہیں لیکن یہاں تو ہر چیز خالص بلیک تھی۔ خریداروں میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ خواتین خوشبوؤں میں بسی ہوئی تھیں اور خاصی خوش لباس تھیں۔ مرد بھی خوش پوش اور خوش باش نظر آ رہے تھے۔ دراصل یہ نسبتاً خوش حال کالوں کا علاقہ تھا۔ ان دکانوں کے مالک بھی

کالے ہی ہیں۔ صرف ہارلیم ہی کے نہیں بلکہ گردونواح کے سیاہ فام بھی یہاں خریداری کے
لیے آجاتے ہیں۔ اس لئے خاصی رونق رہتی ہے۔ چند سیلز گرل بے حد اسمارٹ اور خوش
وضع نظر آئیں۔ قدو قامت، جسم کے تناسب اور نین نقش کے اعتبار سے انہیں حسین ہی
کہا جا سکتا ہے۔ بڑی بڑی مدھ بھری سیاہ غزالی آنکھیں، سیاہ بال۔ یہ سچ ہے کہ جو سیاہ فام
لڑکیاں خوب صورت ہوتی ہیں وہ بہت زیادہ خوبصورت اور پرکشش ہوتی ہیں۔ قطع نظر ان
کی رنگت کے۔

کسی زمانے میں ہارلیم بھی ہالینڈ سے آنے والے گوروں کی آبادی تھی۔ ان لوگوں نے
اپنے رہنے کے لیے جو خوب صورت مکانات بنائے تھے ان میں سے بہت سے گھر آج بھی
موجود ہیں اور بہت بھلے لگتے ہیں۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے درمیانی عرصے میں
کالوں پر بھی خوشحالی کا ایک دور آیا تھا۔ جاز موسیقی میں انہوں نے بہت نام اور پیسہ کمایا۔
پھر دوسرے کاروباروں میں بھی پیسہ لگانے لگے۔ ایک زمانے میں نیویارک میں ٹیکسی
ڈرائیوروں کی بڑی تعداد کالوں پر مشتمل تھی۔ کئی ٹیکسی چلانے والے اداروں کے مالک
بھی یہی سیاہ فام لوگ تھے مگر بعد میں جب دوسری نسلوں اور قوموں کے لوگ یہاں آ
لگے تو ٹیکسی کے کاروبار میں کالوں کی اجارہ داری ختم ہو گئی۔ جب ان کی خوشحالی کا زمانہ
تو نیویارک کے گورے بھی موسیقی اور ہلا گلا کے لالچ میں یہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ یہ
دور تھا جب کالوں اور گوروں کے مابین امتیاز تو تھا لیکن یہ بندشیں ڈھیلی پڑنے لگی تھیں
چوری چھپے دونوں نسلوں کے نوجوانوں میں میل ملاپ کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس کا تذکرہ میلک
ایکس نے اپنی شہرہ آفاق خود نوشت میں بھی کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں
گوروں میں یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ جنسی رفاقت کے لیے کالے بہت اچھے ساتھی ثابت
ہوتے ہیں چنانچہ گورے نوجوان جوق در جوق کالوں کے علاقوں میں جاکر موسیقی اور رقص
کی محفلوں کے بہانے کالی لڑکیوں سے دوستی کر لیا کرتے تھے۔ ان کی غلط فہمی دور کرنے
کے لیے یا پھر ان کی قربت حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی بہنوں کو بھی کالے لڑکوں کے ساتھ
شیروشکر ہونے سے نہیں روکتے تھے۔ اس طرح دونوں نسلوں کا ملاپ ہونے لگا۔ ان خوش
شکل اور خوش حال لوگوں کے ملاپ سے جو اولاد پیدا ہوئی ان کا رنگ بھی کھلا ہوا تھا۔
نقش و نگار بھی دونوں نسلوں کی آمیزش سے ہو گئی تھی لیکن بچے عام طور پر کالی لڑکیوں

کے گھروں میں ہی جنم لیا کرتے تھے۔ سفید فام لڑکیوں کے ہاں کالے باپ کے بچوں کی
ولادت کا تصور اور وہ بھی شادی کے بغیر، اس زمانے میں بھی نہیں تھا۔

منظور لاٹ نے ہم سب کو یاد دلایا کہ بس میں ہمارا گائیڈ ہم سب کا منتظر ہو گا۔ اگر وہ
ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تو مشکل ہو جائے گی۔

ہم لشتم پشتم بس اسٹاپ کی جانب چل پڑے۔ راستے میں ایک دو گلیوں سے گزرے جو
نسبتاً زیادہ غیر آباد تھیں اور یہاں کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی لڑکیاں
بھی خاصی پر اسرار نظر آرہی تھیں۔ ان سڑکوں پر لڑکے عام طور پر نظر نہیں آئے۔

بس اسٹاپ پر قریب قریب سبھی مسافر پہنچ چکے تھے اور خاصے لدے پھندے تھے۔
لوگوں نے کافی خریداری کی تھی۔ خاص طور پر خواتین نے نیگرو فیشن کی بہت سی آرائشی
چیزیں خریدی تھیں۔ بس کا ڈرائیور ایک کاغذ کے گلاس سے کافی پی رہا تھا اور ساتھ ہی
سگریٹ کے کش بھی لگاتا جا رہا تھا۔ ہم لوگ نزدیک گئے تو اس نے معنی خیز انداز میں ہمیں
دیکھا اور مسکرایا "کیا بات ہے، یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہ رہا؟"

"ہاں۔ بہت رنگین جگہ ہے" ہم نے اخلاقاً کہا۔

اس نے ایک آنکھ بند کر کے ہمیں دیکھا اور مسکرا کر پوچھا "رات کو یہاں رہنا چاہو تو
بندوبست ہو سکتا ہے۔ بہت اچھے صاف ستھرے ہوٹل ہیں۔ کرایہ بھی معقول ہو گا۔ ساتھی
بھی زیادہ مہنگا نہیں ہو گا۔"

خان صاحب نے ہمارے کان میں کہا "دفع کرو، اسے لفٹ نہ دینا۔"

لاٹ صاحب نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "ہمیں آج واپس جانا ضروری
ہے۔"

"تمہاری مرضی!" وہ کندھے اچکا کر بولا "ویسے ہارلیم کا یہ مزہ اور کہیں نہیں ملتا سوچ
لے۔"

بٹ صاحب کو یہ بات ایک آنکھ بھی نہیں بھائی۔ انہوں نے اتنی بلند آواز میں لاحول
بھی کہ آس پاس کے لوگوں بھی دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔
کہنے لگے "یہ تو کوئی آبرو باختہ آدمی لگتا ہے۔ یہ بس ڈرائیور ہے یا دلال؟"
منظور لاٹ نے کہا "ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یہاں ایسے ہی چلتا ہے۔"

معلوم ہوا کہ بس کے رخصت ہونے میں ابھی نصف گھنٹا باقی تھا۔ خان صاحب کو ب
بار کافی شاپ کا خیال آ رہا تھا "کیا خیال ہے' ایک ایک کپ کافی کا نہ ہو جائے؟"
بٹ صاحب' ایک کائیاں' بولے "وہ سامنے ایک دکان ہے۔ وہاں سے لے کر آ
ہیں۔"

خان صاحب مردہ دلی سے بولے "چلو رہنے دو' سامنے سے آئس کریم کھا لیتے ہیں۔"

آئس کریم فروخت کرنے والی لڑکی خاصی البیلی اور تیکھے نقش و نگار کی مالک تھ
سوائے اس کے کہ رنگ سیاہ تھا اور ہونٹ موٹے تھے' اس میں کوئی کمی نہیں تھی "ہا
وہ ہاتھ لہرا کر بولی۔

"ہاؤ مچ؟" خان صاحب نے اس کے پاس جا کر دریافت کیا۔ "۳۵ سینٹ"
مسکرائی۔

خان صاحب نے چار انگلیاں اٹھا کر کہا "فور پلیز!"

اس نے مسکراتے ہوئے تین کون ہمارے حوالے کیں پھر منظور لاٹ کے بھاری بھ
جسم کو دیکھ کر مسکرائی "مین۔ تمہیں تو ڈائیٹ آئس کریم کی ضرورت ہے۔"

منظور کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ انہوں نے فوراً بازو اکڑا کر اپنے مسلز دکھائے اور
"دیکھ لو' نو فیٹ' آئی ایم اے باڈی بلڈر" انہیں اپنے توانا جسم پر بہت ناز تھا۔

لڑکی ایک بار پھر ان پر نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے مسکرائی اور پھر کن انکھیوں سے
ہاتھ کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک ساڑھے چھ یا سات فٹ اونچا' سیاہ دیو کا دیو جھومتا جھ
ہمارے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے لڑکی کو دیکھ کر سیٹی بجائی۔

"ہائی ہنی! اس نے چیونگم چباتے ہوئے لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی نے ایک بار پھر منظور لا
پر نظر ڈالی اور ایک حقارت آمیز مسکراہٹ اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر نمودار ہو
جیسے کہہ رہی ہو کہ دیکھا تم نے' باڈی بلڈر ایسے ہوتے ہیں!

ہم سب دوبارہ بس اسٹاپ پر پہنچ گئے جہاں ڈرائیور مسافروں کو بلانے کے
آوازیں لگا رہا تھا۔ بس میں قدم رکھنے ہی والے تھے کہ ایک کالے صاحب کہیں سے نمو
ہوئے۔ ان کے موٹے' سیاہ ہونٹوں کے درمیان میں ایک موٹا سا سگار لٹکا ہوا تھا اور وہ
سے مسلسل انجن کی طرح دھواں اگل رہے تھے۔ جسامت اور حجم کے لحاظ سے بس

نزدیک کھڑے ہوئے وہ بذات خود ایک چھوٹے سائز کی بس نظر آ رہی تھے۔ یکایک انہوں
نے اپنا درخت کے تنے جیسا ہاتھ بڑھایا اور ہمارے سامنے پھیلا دیا "ایک ڈالر ہو گا تمہارے
پاس؟"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ خاصے خوش پوش درمیانی عمر کے آدمی تھے۔ کلین
شیو' چمکدار چہرہ' سفید موتیوں کی مالا جیسے دانت۔

ہم نے استفسار کے لیے منظور لاٹ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں
میں اشارہ کیا کہ کڑوا گھونٹ پی جاؤ۔ ہم نے خاموشی سے ایک ڈالر کا نوٹ نکال کر ان
صاحب کی طرف بڑھا دیا جو انہوں نے ہمارے ہاتھ میں سے یوں جھپٹا جیسے چھین لینا چاہتے
ہیں۔ شکریے کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ بٹ صاحب' خان صاحب اور منظور لاٹ سے
بھی انہوں نے ایک ایک ڈالر طلب کیا۔ ہم تینوں نے تو خیر چپکے سے پیش کر دیا مگر بٹ
صاحب اکڑ گئے "سوری" کہہ کر وہ بس میں سوار ہو گئے۔

"بھئی یہ کیا قصہ ہے؟" ہم نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے لاٹ صاحب سے دریافت کیا۔

"ہارلیم ٹیکس۔ یہاں کالے' سیاحوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔"

ہم نے کہا "اور اگر کوئی نہ دے تو؟"

"تو کچھ بھی نہیں۔ مگر اکثر لوگ دینے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔"

یہ تو کھلی غنڈا گردی ہے" بٹ صاحب برہمی سے بولے "ہم سے کوئی کیا غنڈا گردی
کرے گا؟"

"اور کیا" خان صاحب نے گرہ لگائی "آپ تو خود بہت بڑے غنڈے ہیں۔"

شریف آدمی سے بڑا کوئی غنڈا نہیں ہوتا۔ ہم تو لاہور کے غنڈوں سے بھی نہیں
ڈرتے۔"

"فرق یہ ہے کہ وہ لاہور ہے اور یہ ہارلیم۔"

"انہیں پولیس بھی کچھ نہیں کہتی!" بٹ صاحب نے ذرا حیران ہو کر سوال کیا۔

لاٹ صاحب نے کہا "پولیس کا کوئی سپاہی نظر آیا ہے آپ کو؟"

واقعی۔ سارے ہارلیم میں ہم نے ایک بار پولیس والا نہیں دیکھا تھا۔ خدا جانے یہ
اتفاق تھا یا معمول؟

بس اسٹارٹ ہوئی تو اس کے ساتھ ہی گائیڈ کی تقریر بھی اسٹارٹ ہو گئی۔

"خواتین و حضرات۔ ابھی آپ نے ہارلیم کا شہرہ' آفاق علاقہ دیکھا۔ ہمیں یقین ہے
یہ خوش گوار تجربہ آپ کو زندگی بھر یاد رہے گا۔ یہاں آپ کو امریکی کالوں کے کلچر کا عک
نظر آئے گا جس پر ہم سب کو فخر ہے......"

"شاباش ہے بھئی" بٹ صاحب نے ہمارے کان میں کہا "شرم تو آتی نہیں ہے' فخ
رہے ہیں۔"

منظور لاٹ نے بہت فلسفیانہ بات کہی' بولے "ترقی یافتہ قومیں کسی بات پر شر
نہیں ہوتیں۔ صرف فخر ہی کرتی ہیں! شرمندہ ہونا تو ہم جیسے ملکوں کے حصے میں آیا
بات بات پر شرمندہ ہوتے رہتے ہیں۔"

بٹ صاحب بڑی سنجیدگی سے پوچھنے لگے "لاٹ صاحب' اس کا کوئی علاج بتائیں۔"

خان صاحب بولے "علاج میں بتاتا ہوں۔"

"بتائیں۔"

"علاج یہ ہے کہ ہم بھی ترقی یافتہ ہو جائیں۔ ان کی ساری اچھائیاں' برائیاں اپنا
گے تو پھر یہ فرق آپ ہی آپ مٹ جائے گا۔"

☆ ☆ ☆

واپسی پر زیادہ تر گفتگو کالوں کے بارے میں ہوتی رہی۔ منظور لاٹ صاحب ا
تجربات و مشاہدات سے آگاہ فرماتے رہے اور ہم سب انکی معلومات آفریں گفتگو
رہے۔ ان کے خیال میں کالوں میں خامیاں ہی خامیاں ہیں۔ کام چور ہیں' بد اخلاق
پسماندہ ہیں۔ بلا کام کیے امیر بننا چاہتے ہیں اور اپنی ساری پسماندگی کا الزام گوروں پر
دیتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

بٹ صاحب بولے "معلوم ہوتا ہے انہیں کوئی زبردست تکلیف پہنچائی ہے
نے۔ اتنی شکایتیں تو ان سے گوروں کو بھی نہیں ہیں۔"

وہ بولے "گوروں نے تو ان پر صبر کر لیا ہے۔ یوں سمجھیں کہ انہیں عاق کر د
جیسے والدین اپنی ناخلف اولاد کو عاق کر دیتے ہیں۔ ان کے کسی قول و فعل کے ذمے دا

نہیں ہوتے۔ وہ جو چاہیں کریں' ان کی بلا سے۔"

"مگر آخر اس قوم میں کوئی ایک خوبی تو ہو گی۔"

"خوبیاں تو بہت سی ہیں" منظور لاٹ نے کہا "ان کی صحت بہت اچھی ہوتی ہے۔ قد آور اور طاقت ور ہوتے ہیں اس لیے ایتھلیٹ' باکسر اور کھلاڑی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ جو کوئی گانا سیکھ لے وہ اچھا سنگر بن جاتا ہے مگر سیکھے کون۔ ان کی سب سے بڑی خرابی ان کی کاہلی ہے۔ لوٹ مار بھی اتنی سستی اور کاہلی سے کرتے ہیں کہ پکڑ لیے جاتے ہیں۔ اگر ہمارے ملک جیسی پولیس اور وہاں کی طرح قانون ہو تو انہیں چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ دو دن میں ٹھیک ہو جائیں مگر گوروں نے بھی انہیں اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔"

بس اسٹاپ پر ہم لوگ اترے تو بس ڈرائیور نے مسکرا کر دریافت کیا "مین' ہارلیم کا وزٹ کیسا رہا' پسند آیا کچھ؟"

"ہاں۔ ذرا مختلف ہے" خان صاحب نے کہا۔

وہ بولا "ذرا مختلف نہیں' یکسر مختلف ہے باقی نیویارک سے۔ یہ سب ان گوروں کی بدمعاشی ہے۔ ہمیں تو یہ انسان ہی نہیں سمجھتے مگر کوئی بات نہیں۔ ایک وقت آئے گا جب یہ پچھتائیں گے۔ اپنے ملک میں جا کر اس بارے میں سب کو بتانا۔ ان کی ترقی اور نیکی کا بھانڈا پھوڑنا ہے۔ بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

منظور لاٹ نے ہمیں کہنی ماری اور بولے "دیکھا آپ نے۔ سارا الزام گوروں کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تم خود بھی تو ہاتھ پھیر ہلا لیا کرو۔"

"یہ تو نہ کہو لاٹ" خان صاحب نے کہا "ہاتھ پاؤں تو بہت ہلاتے ہیں۔ ہر روز جو لوٹ مار اور قتل و غارت کرتے ہیں تو بنا ہاتھ ہلائے تو نہیں کرتے۔"

پارکنگ لاٹ میں منظور لاٹ کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم سب اس میں بیٹھ گئے۔ "آج میں آپ لوگوں کو اپنے گھر لے جاؤں گا۔ پھر موقع ملے' نہ ملے۔"

"پھر موقع کیوں نہیں ملے گا؟"

"دراصل یہاں سے میرا اپارٹمنٹ بالکل نزدیک ہے۔ آسانی سے پیدل بھی جا سکتے ہیں۔"

پارکنگ ایک بہت بڑے میدان میں تھی۔ سوائے کھلے میدان کے یہاں اور کچھ نہ

تھا۔ کوئی سایہ تک نہ تھا۔ صفائی بھی کوئی خاص نہ تھی۔ ٹیکسی باہر نکلنے لگی تو پھاٹک کے
پاس سے ایک لمبا تڑنگا، کالا آدمی نمودار ہوا "ہائی مین۔"

"ہائی" منظور لاٹ نے دو ڈالر اس کے ہاتھ میں وھما دیے اور ٹیکسی لے کر چل پڑا۔

"بھئی یہاں تو پارکنگ بہت سستی ہے" ہم نے کہا۔

"خاک سستی ہے۔ اتنی دیر کے لیے یہ چھ سات ڈالر سے کم نہیں وصول کرتے۔"

"تو پھر۔ تمہارے ساتھ اتنی رعایت کیوں کر دی؟"

وہ ہنسنے لگے پھر ایک آنکھ بھینچ کر بولے "رعایت نہیں، یہ رشوت ہے۔ مالک کے پا
تو ایک ڈالر بھی نہیں جائے گا، دیکھ لیا یہ حال ہے ان کالوں کا۔"

"اور آپ کا کیا حال ہے" بٹ صاحب نے کہا، وہ بعض موقعوں پر چپ نہیں
سکتے۔

"ہمارا کیا ہے، ہم تو پردیسی ہیں۔ یہ کوئی ہمارا ملک تھوڑا ہی ہے۔ یہ ہمارے ملک والو
کو بے وقوف بناتے ہیں۔ ہم نے اگر تھوڑا سا بے وقوف بنا دیا تو کیا حرج ہے" لا
صاحب نے مخصوص پاکستانی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ بٹ صاحب کو یہ بات پ
نہیں آئی۔ انہوں نے بولنے کے لیے جھرجھری لی مگر ہم نے ان کا بازو تھام کر خاموش
دیا، بلاوجہ بحث کرنے کا فائدہ؟

منظور لاٹ کا اپارٹمنٹ ایک بارہ منزلہ عمارت میں تھا۔ یہ بہت اچھی جگہ تو نہیں
مگر خاصی معقول ضرور تھی۔ آس پاس کھلا میدان اور پارک۔ درمیان میں عمارت اور ا
کے اندر جانے کے لیے باقاعدہ حفاظت کا انتظام تھا۔ جب تک اندر سے کوئی نہ کھولے، با
کا دروازہ کھل نہیں سکتا تھا۔ پہلے کسی سے فون پر بات کیجیے پھر وہ اندر سے ایک بٹ
دبائے گا تو دروازہ کھلے گا، ورنہ نہیں۔

"دیکھا حفاظت کا کتنا اچھا بندوبست ہے" بٹ صاحب بولے "یار ایک بات ہے،
امریکن انتظام بہت اچھا کرتے ہیں۔ اب بتاؤ چوری کا تو بالکل کوئی چانس ہی نہیں ہے۔"

"جی ہاں۔ انتظام تو بہت اچھا ہے مگر ہر مہینے دس بارہ چوریاں ہو جاتی ہیں۔ چھ سا
نقب زنی کی وارداتیں، ایک دو ڈاکے، چار چھ عورتوں کی آبرو ریزی کے واقعات۔"

بٹ صاحب اور خان صاحب حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے۔ ہم کو تو ان باتوں کا پتا

اس لئے خاموش رہے "ابھی پچھلے منگل کو ایک خاتون لانڈری کے لئے تہ خانے میں گئی تو
دو آدمیوں نے اسے گھیر لیا۔ زیور اور پیسے بھی چھین لیے اور عزت بھی حالانکہ دن کا وقت
تھا۔ یہ لوگ تو اپارٹمنٹ کے اندر بھی گھس جاتے ہیں حالانکہ سب اپنے دروازے لاک
رکھتے ہیں۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے، اتنا اچھا تو انتظام ہے؟"

"بس یہی بات تو سمجھ میں نہیں آتی کہ انتظام تو بہت اچھا ہے مگر پھر بھی سبھی کچھ ہوتا
رہتا ہے۔ اگر انتظام کو دیکھو تو یہ ملک تو جنت کا نمونہ ہونا چاہیے مگر حالت یہ ہے کہ جہنم
سے بھی بدتر ہے۔"

لاٹ صاحب نے چابی نکال کر بیرونی دروازہ کھولا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وہ پھر خود ہی
لاک ہو گیا۔ انہوں نے کہا "اس طرح میں قفل کھول کر آیا ہوں۔ اسی طرح دوسرے لوگ
بھی میرے ساتھ ہی اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ یہاں کوئی کسی کو جانتا تو ہے نہیں، یہی سمجھتے
ہیں کہ یہیں کا رہنے والا ہو گا۔ اس طرح وارداتیں کر کے وہ آرام سے باہر نکل جاتے
ہیں۔"

عمارت کی لابی کافی بڑی تھی۔ سیمنٹ کے بڑے بڑے گملوں میں پودے سجائے گئے
تھے۔ دیواروں پر سنگ مرمر لگا ہوا تھا۔ ایک جانب کی پوری دیوار شیشے کی تھی۔

"جگہ تو بہت شاندار ہے" خان صاحب نے کہا "مگر لفٹ خراب ہوتی ہے تو لوگ کیا
کرتے ہیں؟"

"یہاں لفٹ خراب نہیں ہوتی۔"

"مگر بجلی تو غائب ہو سکتی ہے۔"

"بھائی یہ سارے کام یہاں نہیں ہوتے۔ یہ سب نقصان والی باتیں ہیں۔ بجلی خراب
ہو جائے تو سارا نظام ہی درہم برہم ہو کر رہ جائے بلکہ چوپٹ ہو جائے۔ ایک منٹ میں
لاکھوں کروڑوں کا نقصان ہو جائے۔ یہ گھاٹا کون برداشت کر سکتا ہے۔ یہاں پر یہ سارے
کام پرائیویٹ کمپنیاں کرتی ہیں۔ حکومت کی اجارہ داری نہیں ہے کہ نفع ہو یا نقصان، کسی
کو پروا ہی نہیں ہے۔"

لفٹ خاصی کشادہ تھی اور خلاف توقع ایک چھوٹے سے اسٹول پر ایک لفٹ مین......

تشریف فرما نظر آیا۔ ورنہ اکثر و بیشتر عمارتوں میں لفٹیں خود کار ہوتی ہیں۔ لفٹ مین عیاشی کے زمرے میں آتا ہے۔ لاٹ صاحب نے بتایا کہ اپارٹمنٹ والوں نے مل کر دو لفٹ مین رکھے ہیں۔ ان کی تنخواہیں چندہ کر کے حاصل کی جاتی ہیں۔ مقصود حفاظت ہے تاکہ مجرم آرام سے بھاگ نہ سکیں۔

"اس کے باوجود بھی اتنی وارداتیں ہوتی ہیں؟" خان صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

منظور لاٹ مسکرائے اور کہا'

"سمجھ میں نہیں آتا کہ وارداتیں کرتا کون ہے۔ شیطان یا فرشتے۔ نظر تو کوئی آتا نہیں ہے اور نہ ہی کوئی پکڑا جاتا ہے۔ کم از کم میرے یہاں ہوتے ہوئے تو کوئی چڑیا کا بچہ تک نہیں پکڑا گیا۔"

لفٹ مین نے بڑی بے زاری اور بے نیازی سے ہم لوگوں کو دیکھا۔ وہ کوئی جاپانی یا کوریائی ٹائپ کا آدمی تھا۔ کمر پر پستول بھی لگا ہوا تھا۔

"ہائی" منظور لاٹ نے اسے دیکھ کر خوش مزاجی سے نعرہ لگایا۔

"ہائی" اس نے بے دلی سے جواب دیا اور پوچھا "کون سی منزل؟"

"بارھویں۔"

اور لفٹ بڑی تیزی سے چل پڑی۔

"دیکھا آپ نے" لاٹ نے کہا" اسے حفاظت کی خاطر رکھا گیا ہے مگر یہ کسی کو نہیں جانتا۔ نہ پہچانتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ لوگ اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں' مہمان آئے ہیں یا واردات کی غرض سے تشریف لائے ہیں' اس کی بلا جانے۔"

بٹ صاحب نے پوچھا "اس کا نام کیا ہے؟"

کہا "پتا نہیں۔"

خان صاحب نے فوراً بٹ صاحب پر فقرہ چست کر دیا "بٹ صاحب' کیا بات ہے' اب تو آپ لڑکوں کے نام بھی پوچھنے لگے ہیں۔"

اتنی دیر میں لفٹ بارھویں منزل پر پہنچ گئی۔ منظور لاٹ نے رخصت ہوتے ہوئے پچاس سینٹ کا ایک سکہ لفٹ مین کے ہاتھ میں تھما دیا جو اس نے شکریہ ادا کیے بغیر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

بٹ صاحب نے کہا "یہ تو بہت بدتمیز آدمی ہے۔ شکریہ تک نہیں کہا۔ آپ کو اسے ٹپ دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

منظور لاٹ نے جواب دیا "بس یوں ہی کبھی کبھار اسے ٹپ دے دیتا ہوں کہ شاید اسی بہانے شناسا بن جائے مگر توبہ کیجیے' یہ تو نسل ہی الگ ہے۔"

گیلری میں کافی دور چلنے کے بعد لاٹ صاحب کا اپارٹمنٹ تھا۔ وہاں تک جاتے ہوئے انہوں نے مختصر طور پر اپنی رہائش گاہ کے بارے میں بھی بتا دیا۔ وہ ایک کمرے والا اپارٹمنٹ تھا جسے امریکا میں "افی شنسی" کہتے ہیں۔ یہ اپارٹمنٹ آل ان ون ہوتا ہے۔ یعنی اسی میں باتھ روم' کچن' بیڈ روم' ڈائننگ' ڈرائینگ روم سب کچھ ہوتا ہے۔ قاعدے قانون کے مطابق "افی شنسی" میں ایک تنہا شخص یا پھر "جوڑا" رہ سکتا ہے۔ ورنہ ایک سے دوسرے مکین کے رہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

لاٹ صاحب نے جیب سے چابی نکال کر اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ ہم سب ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ بٹ صاحب نے جیسے ہی منظور لاٹ کے بعد کمرے میں قدم رکھا' وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔

"لاش.... قتل!" انہوں نے گھبرا کر نعرہ لگایا۔

ہم سب نے بھی ان کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔ سامنے والے صوفے پر ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے لاش میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ لاش نہیں تھی۔ کوئی زندہ آدمی تھا۔

اس بار خان صاحب کے منہ سے نکلا "ڈاکو؟" اور وہ غیر ارادی طور پر منظور لاٹ اور بٹ صاحب کی آڑ میں ہو گئے۔

لاش سے ڈاکو میں تبدیل ہونے والی شخصیت نے آنکھیں پھاڑ کر ہم سب کو دیکھا۔ منظور لاٹ کو دیکھتے ہی اس کے دونوں ہاتھ بے اختیار آگے کو پھیل گئے۔ اور اس نے ایک دلدوز نعرہ مارا "اوئے لاٹ۔ کدھر غائب تھا۔ میں کب سے انتظار کر رہا ہوں۔"

اب پتا چلا کہ وہ نہ لاش تھی' نہ ڈاکو۔ بلکہ منظور لاٹ کا لنگوٹیا دوست تھا۔ لاٹ صاحب بے اختیار آگے کو لپکے اور کمرے کے عین درمیان میں دونوں بغلگیر ہو گئے۔

"اوئے غفور' تو کہاں؟" لاٹ صاحب نے گلے لگتے ہوئے کہا۔ دونوں حضرات خوب

گرم جوشی سے گلے ملتے رہے۔ یوں لگتا تھا جیسے عرصہ دراز کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔
معلوم ہوا کہ دو دن پہلے ہی غفور صاحب لاٹ صاحب کے گھر سے رخصت ہو کر گئے تھے
"اب کیا ہوا؟" لاٹ صاحب نے پوچھا۔

"یہ پوچھ کہ کیا نہیں ہوا' یہ دیکھ۔ یہ دیکھ اور یہ بھی دیکھ" انہوں نے لاٹ صاحب
اپنے چہرے' گردن اور ہاتھوں پر پڑے ہوئے نشانات دکھانے شروع کر دیے۔

"مگر ہوا کیا آخر؟"

"وہی جو ہر بار ہوتا ہے' بس لاٹ! بہت ہو گئی' اب مجھے طلاق چاہیئے" یکایک انہی
احساس ہوا کہ کمرے میں کچھ دوسرے اجنبی لوگ بھی موجود ہیں۔ تو وہ خاموش ہو گئے۔

"یہ پاکستان سے آئے ہیں" لاٹ نے ہمارا تعارف کرایا "اور یہ نیویارک کا دوست
ہے' غفور احمد۔"

ہم سب نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔

"مگر تم آئے کب؟" لاٹ نے پوچھا۔

"دو گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ معلوم ہے آج کیا ہوا؟" غفور نے کہا۔

لاٹ نے کہا "بس بس رہنے دے یار۔ گھر کی بات گھر کے اندر ہی رہنی چاہیے" پھر
ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا "اس کی بیوی سے کچھ جھگڑا چل رہا ہے۔ مار پیٹ بھی ہو جاتی
ہے۔"

"بیوی پاکستانی ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"پاکستانی ہوتی تو اس کا دماغ ٹھکانے نہ لگا دیتا۔ یہ تو نامراد جاپانی ہے۔"

"اچھا اچھا" لاٹ صاحب نے انہیں تسلی دی "ٹھیک ہے یار۔ یہ پاکستان سے مہمان
آئے ہیں' یہ باتیں بعد میں ہو جائیں گی۔"

پاکستان کا نام سنتے ہی مسٹر غفور میں جیسے اسپرنگ لگ گئے انہوں نے اچھل اچھل کر ہم
سب سے دوبارہ ہاتھ ملائے۔ گلے ملے پھر دیر تک پاکستان کا احوال پوچھتے رہے۔

"یار چنگا تھا جو ہم ادھر سے آتے ہی نہیں" انہوں نے بالآخر نتیجہ برآمد کر لیا۔ "نہ
ادھر آتے اور نہ یہ شامت آتی۔"

"اچھا ٹھیک۔ ذرا کافی تو بناؤ۔ میں ذرا آلو اور مٹر گاجر نکالتا ہوں۔"

چند منٹ کے اندر آلو کا بھرتا' ابلے ہوئے مٹر اور گاجریں ہمارے سامنے رکھی ہوئی
تھیں۔ کافی کے بھاپ اڑاتے ہوئے مگ بھی تیار تھے۔ کافی پیتے ہوئے دوبارہ باتوں کا سلسلہ
چل نکلا۔ لاٹ صاحب نے غفور کے بارے میں بتایا کہ نیویارک میں ایک غیر ملکی لڑکی سے
شادی کر لی ہے اس لیے بہت دکھی ہے۔ جب بھی جھگڑا ہوتا ہے' اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آجاتا
ہے۔

"بیوی سے ڈرتے ہو کیا؟" خان صاحب نے دو ٹوک سوال کیا۔

"ڈر تو بہت کمزور لفظ ہے" لاٹ نے بتایا "اس کی تو روح فنا ہوتی ہے بیوی سے۔"

پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ مذاق کی بات ہے مگر جب ان دونوں کے انتہائی سنجیدہ تاثرات
دیکھے تو مانتے ہی بن پڑی حالانکہ غفور کا چھ فٹ لمبا قد اور مضبوط قدو قامت دیکھ کر کوئی
سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے ڈرتا ہو گا بلکہ اسے خاطر میں بھی لاتا ہو گا۔

"بس جی۔ اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے۔ غریب۔ گرین کارڈ کے چکر میں ایک
جاپانی امریکن سے شادی کر لی۔ اب یہ حال ہے کہ میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں مگر کمبل مجھے
نہیں چھوڑتا۔"

بٹ صاحب کو جوش آگیا۔ "یار! کچھ تو شرم کرو۔ پاکستانی ہو کر ایک چھوٹی سی جاپانی
بیوی سے ڈرتے ہو۔"

لاٹ نے کہا "وہ چھوٹی ضرور ہے پر کھوٹی بھی ہے۔ بس کچھ نہ پوچھئے" ایک آہ بھر کر
وہ خاموش ہو گیا۔

اتنی دیر میں کال بیل بجی۔ غفور نے ذرا پریشان ہو کر ہم سب کو اور پھر منظور لاٹ کو
دیکھا۔

"جا۔ غسل خانے کے اندر چھپ جا شاید تیری بیوی آگئی ہے تیری تلاش میں۔"

غفور کی مردانگی جوش میں آگئی "بس کرو یار۔ ہم غسل خانے میں چھپنے والے شوہر
نہیں ہیں۔"

"تو پھر آپ کہاں چھپتے ہیں؟" خان صاحب نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا۔ غفور
کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ منظور نے دروازہ کھولا تو ایک عجیب و غریب حلئے کے صاحب وہاں
کھڑے ہوئے تھے۔ قد تو ان کا درمیانہ تھا مگر وزن قد کے مقابلے میں تین گنا ہو گا۔ گندمی

رنگ، گھنے سیاہ بال، چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھیں جو موٹاپے کے باعث اور زیادہ چھوٹی
رہی تھیں۔ بڑی بڑی مونچھیں خاصی بارعب شخصیت تھی۔

"لو، بس ان ہی کی کمی رہ گئی تھی" لاٹ صاحب نے آنے والے سے سب کا تعار
کرایا۔ ان کا نام محمد حسین ڈوگر تھا۔ یہ سنتے ہی بٹ صاحب بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے
انہیں بے ساختہ گلے لگا لیا۔ گلے تو خیر کیا لگاتے کہ اول تو یہ طویل القامت تھے اور وہ کو
دوسرے یہ کہ ان کے موٹاپے نے دونوں کے مابین خاصی دوری پیدا کر دی تھی۔ پھ
بٹ صاحب نے جیسے بھی بنا، ڈوگر صاحب کو بغلگیر کیا۔ ہم سب ان کی اس گرم جوشی
حیران تھے۔

بعد میں اس والہانہ پن کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ محمد حسین چونکہ ڈوگر تھے اور
صاحب بھی کشمیری تھے اس لئے پردیس میں ایک اور کشمیری کو دیکھ کر نہال نہال ہو گئے
بڑی بے تکلفی سے پوچھا "آپ کب آئے؟"

"کتھوں؟" (کہاں سے) ڈوگر صاحب نے دریافت کیا۔ ہم سب ان کی آواز سن
حیران رہ گئے۔ بلکہ کچھ دیر تک تو یہی معلوم نہ ہو سکا کہ یہ مہین منمناتی ہوئی آواز کہ
سے آئی ہے اس لیے کہ ان کے دیو پیکر وجود کے اندر سے اس قدر باریک و نحیف آ
پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ پتا چل گیا کہ ان کا ظاہر و باطن ایک ج
نہیں ہے یعنی دیکھنے میں باہر سے جس قدر تنومند نظر آتے ہیں اندر سے اتنی ہی باریک ا
کمزور سی آواز پیدا کرتے ہیں۔

بٹ صاحب بھی ہم سب کے مانند حیران تھے اس لئے ان کی "کتھوں" کا جواب د
کے بجائے سر سے پیر تک انہیں گھور رہے تھے۔

جب اپنے سوال کا جواب نہ پایا تو ڈوگر صاحب نے دوبارہ بٹ صاحب سے دریافت
"آپ نے بتایا نہیں کہ میں کیا بتاؤں؟" ایک بار پھر ان کی منمناتی ہوئی آواز برآمد ہوئی تو
سب کو یقین ہو گیا کہ اس آواز کے یہی مالک ہیں۔

بٹ صاحب نے پوچھا "میرا مطلب تھا کہ آپ کشمیر سے کب آئے ہیں؟"

ڈوگر صاحب بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ قہقہہ کیا تھا، بس ایک باریک سی
نما آواز تھی جو ان کے گلے سے برآمد ہوئی تھی۔ آواز تو ایک ہی بار ان کے منہ سے نکل

بند ہو گئی۔ لیکن وہ کافی دیر تک ہلتے رہے۔ جس سے اندازہ ہوا کہ وہ بدستور ہنس رہے
ہیں۔ پنجابی میں بولے "بادشاہو۔ ہم تو کشمیر گئے ہی نہیں تو وہاں سے آنے کا کیا سوال
ہے؟"

پتا چلا کہ وہ بھی بٹ صاحب کی ٹائپ کے ہی کشمیری تھے جنہوں نے کشمیر صرف
تصویروں میں دیکھا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے آباؤ اجداد ڈیڑھ سو سال قبل ہجرت کر
کے کشمیر سے پنجاب چلے گئے تھے اور ریاست کپور تھلہ میں آباد ہو گئے تھے۔

خان صاحب بولے "معاف کرنا جناب۔ اتنی دیر میں تو کشمیر کی آب و ہوا کا اثر بھی ختم
ہو چکا ہو گا۔ آپ پھر بھی خود کو کشمیری کہتے ہیں۔"

وہ بولے "دیکھیے جناب، بہت سے ایسے لوگ بھی خود کو بخاری کہتے ہیں جن کے
خاندان میں کوئی ایک آدمی بھی بخارا نہیں گیا تھا اور پھر میں نے تو اپنے آپ کو کشمیری کہا
بھی نہیں۔"

"تو یہ ڈوگر کیا ہے؟"

"یہ تو ایک ذات ہے۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ کہیں گے تو میں اپنے نام سے ڈوگر بھی
ہٹا دوں گا۔"

ہم ان کی صلح جوئی اور معقولیت سے بہت متاثر ہوئے "ارے نہیں صاحب۔ آپ
ان کے کہنے پر اپنی ذات کیوں بدلتے ہیں۔ آپ وہی رہیے جو آپ کے باپ دادا تھے۔"

کہنے لگے "باپ دادا تو نہ جانے کیا تھے۔ ڈوگر تو میں نیویارک میں آکر بن گیا ہوں۔ محمد
حسین ذرا مشکل نام ہے۔ امریکی مجھے "محمد محمد" کہہ کر بلاتے تھے۔ ان کی ناپاک زبانوں سے
اس طرح اپنے رسول پاک ﷺ کا نام مجھے اچھا نہیں لگا۔ بس سوچ سوچ کر "ڈوگر" نام
کے ساتھ لگا لیا۔ یہ بھی ذرا رعب شوب والا نام ہے۔ بولنے میں بھی اچھا لگتا ہے۔"

اس کے بعد مزید تعارف کی ضرورت ہی نہ رہی۔ ڈوگر صاحب چار پانچ سال سے
امریکا میں مقیم تھے۔ پہلے شکاگو میں رہے، پھر نیویارک پہنچ گئے۔

خان صاحب نے پوچھا "معاف کرنا۔ آپ کا تعلق جرائم سے ہے؟"

"نہیں تو۔ آپ نے کیسے جانا؟"

"آپ پہلے بھی ایسے شہر میں تھے جو کرائم کے لئے مشہور ہے۔ بعد میں بھی ایسا ہی شہر

آپ کو پسند آیا۔ بزنس کیسا جا رہا ہے آپ کا؟ یہاں تو سنا ہے کہ منٹ منٹ پر قتل، ڈاکا اور چوری عام ہے۔"

"بات آپ کی بھی ٹھیک ہے مگر میری تو مجبوری تھی۔ میرا بھائی شکاگو میں رہتا تھا ا نے مجھے بلایا تھا۔ دو سال وہاں رہا۔ اب تین ساڑھے تین سال سے نیویارک میں ہوں اور ٹیکسی چلاتا ہوں۔"

"گرین کارڈ ہے آپ کے پاس؟"

"بس جی، کریڈٹ کارڈ ہے ابھی تو۔ اللہ نے چاہا تو گرین کارڈ بھی کبھی مل جائے گا۔"

ہمیں بہت حیرت ہوئی کہ غیر قانونی سکونت ہے پھر بھی نیویارک میں ٹیکسی چلائے پھرتے ہیں۔

"ٹیکسی چلانے میں یہی تو آرام ہے کہ زیادہ سوالات نہیں پوچھے جاتے۔ کون ہو کہاں رہتے ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ قانونی ہو کہ غیر قانونی ہو۔ گرین کارڈ ہے کہ نہیں ہے۔ یہ سب باتیں ٹیکسی والوں سے نہیں پوچھی جاتی ہیں۔ بس ڈرائیونگ آنی چاہیے اور شہر کے راستوں کا تھوڑا بہت پتا ہو۔"

"اور انگریزی آتی ہو" ہم نے لقمہ دیا۔

"انگریزی کی خیر ہے۔ یس، نو، تھینک یو وغیرہ بہت کافی ہے۔ اجی اس شہر میں انگریزی جاننے والے ہوتے کہاں ہیں۔ ایمان سے کہتا ہوں اگر کوئی سچا انگریز نیویارک آجائے تو پھڑک کر جان دے دے۔ انگریزی کے تو دشمن ہیں سب یہاں، بس کچھ نہ پوچھیے۔"

ڈوگر صاحب کی باتیں کچھ دیر بعد ہماری سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ دراصل ان کا جثہ دیکھ کر ان سے دور رہنے کی جو ضرورت محسوس ہوتی تھی، ان کی آواز سن کر وہ ان کے قریب تر جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ ان کی آواز بقول خان صاحب کے، اتنی باریک تھی کہ اس میں آپ دھاگا ڈال کر کپڑے سلائی کر سکتے ہیں۔ ایک تو باریک اور پتلی سی آواز۔ اس پر ان کے بولنے کی رفتار، یوں سمجھیے کہ خودکار بندوق کی طرح ان کے منہ سے تڑاتڑ الفاظ نکلتے تھے اس لئے سننے اور سمجھنے کے لئے ضروری تھا کہ دھیان سے، کان لگا کر سنیں یا پھر تھوڑا بہت سنیں اور باقی کے بارے میں اندازہ لگالیں۔

بٹ صاحب نے کہا "ڈوگر صاحب کی باتیں سن کر اردو قواعد کے استاد بہت یاد آتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ بھی ہر سوال کے بعد کہا کرتے تھے کہ خالی جگہیں پر کرو ان کی بات چیت میں بھی خالی جگہیں خود ہی پر کرنی پڑتی ہیں۔"

جو بھی تھا، ڈوگر صاحب آدمی دلچسپ اور ہردلعزیز تھے۔ اگر کہیں ان کی آواز بھی "پوری" ہوتی تو ہر محفل کی جان ہوتے مگر وہ اپنی اس "خامی" سے بے پرواہ تھے۔ بلاتکان بولتے تھے اور بولتے ہی چلے جاتے تھے۔ ان کی باتیں ہماری سمجھ میں تو بس واجبی ہی آتی تھیں۔ خان صاحب نے کہا "بس انکل سے سمجھ لیتے ہیں۔"

ڈوگر صاحب بھی نزدیک ہی کہیں رہتے تھے۔ پاکستانی تھے اور ٹیکسی ڈرائیور بھی تھے اس لیے ان سب لوگوں کا آپس میں بہت میل جول اور پیار و اخلاص تھا۔ ہر کوئی ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشی میں برابر کا شریک ہوتا تھا۔ ڈوگر صاحب کے آتے ہی ہم تینوں کا تعارف کرایا گیا اور وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ انہوں نے پاکستان میں بہت سی فلمیں دیکھی تھیں بلکہ ایک زمانے میں تو اداکار بننے کے لیے نگار خانوں کے چکر بھی بہت لگائے تھے۔ انہیں لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ اگر فلموں میں کامیڈی کریں تو گوپ کو پیچھے چھوڑ سکتے ہیں۔ ہندوستانی کامیڈین گوپ بھی بہت موٹا تھا اور آواز بھی اس کی پتلی تھی مگر ڈوگر صاحب کے مقابلے میں تو بہت موٹی تھی۔ جب تک وہ بولتے رہے، ہم ان کی سنتے رہے۔

بٹ صاحب نے ہمارے کان میں کہا "یہ کیا منمناتا رہتا ہے۔ کم از کم گلے کا آپریشن ہی کرا لے۔"

خان صاحب بولے "اس کا نام تو "من من" ہونا چاہیے۔"

یہ نام اتنا پسند آیا کہ ہم نے ان کا نام "من من" ہی رکھ دیا۔

سب سے پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ پاکستان سے "مہمان" (ہم لوگ) آئے ہوئے تھے۔ ان کی مہمان داری کیوں کر کی جائے؟

ہم تو پس و پیش کرتے رہے مگر ان سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ ہم لوگوں کے اعزاز

میں ایک پارٹی کی جائے۔ حاضرین مجلس کے علاوہ کچھ اور دوستوں کو بھی مدعو کیا جائے۔

"مگراس کی ضرورت کیا ہے؟" ہم نے کہا۔

"ضرورت تو ہے اس طرح ایک تو آپ لوگوں سے اطمینان سے باتیں ہو جائیں دوسرے یہ کہ آپ کو بھی نیویارک کے پاکستانی ٹیکسی ڈرائیوروں کے معاملات سے واق ہو جائے گی۔ حضور۔ یہ بالکل نرالی مخلوق ہے" منظور لاٹ نے کہا۔ طے پایا کہ دوس دن رات کو کسی ایک کے فلیٹ پر "پارٹی" منعقد کی جائے۔ مگر کس کے گھر؟

"غفور کا گھر تو آؤٹ آف کوسچن ہے" لاٹ صاحب نے کہا "وہاں جا کر تو اپی عزتی خراب کرنے والی بات ہے۔"

"یار کیوں شرمندہ کرتے ہو" غفور نے احتجاج کیا "ایسی بات بھی نہیں ہے۔ مہما کی وہ بڑی قدر کرتی ہے۔ اب تو میرے فلیٹ پر ہی پارٹی ہو گی۔"

"سرجی۔ اس کی باتوں میں نہ آنا" من من صاحب نے کہا "ہاتھ پیر سلامت رہے گا کسی کا بھی۔ بڑی خطرناک عورت ہے جوڈو کراٹے جانتی ہے۔"

غفور صاحب کو بہت شرم آئی۔ انہوں نے جوش میں آکر اعلان کر دیا کہ چاہے چلی جائے مگر یہ پارٹی ان ہی کے اپارٹمنٹ میں ہو گی۔

خان صاحب نے کہا "ٹھیک ہے' اگر آپ ضامن ہیں تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا۔ ہم تو آپ کے مہمان ہیں۔"

بٹ صاحب بولے "مگر ایک بات سن لیں غفور صاحب"

"وہ کیا؟"

"آپ کی جاپانی بیوی ہمارے ساتھ چاہے جو سلوک کرے مگر مینڈک شینڈک پکا ک کھلائے بلکہ پانی کا کوئی جانور نہ پکائے۔"

"وہ کیوں۔ پانی کا جناور تو پاک ہوتا ہے۔ ہر وقت غسل کرتا رہتا ہے۔"

"بس۔ ہم زیادہ پاکیزہ چیزوں کی بے حرمتی بھی نہیں کرنا چاہتے۔"

من من صاحب بولے "بس جی۔ ہو گیا فیصلہ۔ میٹھا میرے ذمے۔"

کچھ دیر اور یہ محفل آرائی رہی۔ پھر ہم نے ان سب سے اجازت طلب کی۔

☆ ☆ ☆

چلتے چلتے خان صاحب نے ان سب کو یاد دلایا کہ دہلوی ٹیکسی ڈرائیور کو بلانا نہ بھولیں۔ "قبلہ" کو قریب قریب سبھی جانتے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ کام بہت کرتے ہیں اور فارغ اوقات میں پارٹ ٹائم عشق کرتے ہیں اس لیے بہت زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ منظور لاٹ نے ہمیں یہ پر خلوص مشورہ دیا کہ دہلوی صاحب سے شعر سنانے کی فرمائش ہرگز نہ کی جائے۔ ورنہ کسی کی خیر نہیں ہے۔ وہ مسلسل چوبیس گھنٹے شعر سنا سکتے ہیں۔

"مگر اتنے شعر آتے کہاں سے ہیں۔ کیا بہت بڑے اور پرانے شاعر ہیں؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"شاعر تو بس میرے جیسے ہی ہیں مگر حافظہ بہت اچھا ہے۔ سارے شاعروں کا کلام انہیں یاد ہے اور جب وہ بھی ختم ہو جاتا ہے تو پھر فلمی گانوں کی باری آجاتی ہے۔"

لاٹ صاحب تو ہمیں منزل مقصود تک پہنچانے پر اصرار کر رہے تھے مگر ہم نے ان سے بمشکل یہ کہہ کر اجازت طلب کر لی کہ اب ہم "آزادانہ" گھومنا پھرنا چاہتے ہیں۔ یعنی کسی پروگرام کے بغیر۔ دوسرے ملکوں اور شہروں میں جا کر اس طرح بے مقصد اور بے پروگرام گھومنا بھی ایک خاص لطف رکھتا ہے۔ لاٹ صاحب کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ بہرحال طے یہ پایا کہ دوسرے دن آٹھ بجے رات کو وہ ہمیں ہوٹل سے پک کر لیں گے مگر اس سے پہلے کسی اسپتال میں جا کر کمرا بھی بک کریں گے۔

"اسپتال میں کمرا کس کے لیے بک کریں گے؟"

"غفور کے لیے دعوت کے بعد اس کا جو حشر ہو گا وہ آپ نہیں جانتے۔ اس کی بیوی بڑی خطرناک بلیک بیلٹر ہے۔"

بٹ صاحب نے کہا "غفور صاحب' آپ بھی جوڈو کراٹے کیوں نہیں سیکھ لیتے۔ آپ بھی بلیک بیلٹ یا ریڈ بیلٹ حاصل کر لیں۔"

بولے "بس جی ہنگامہ زیادہ ہو جائے گا' میری جان پھر بھی نہیں چھٹے گی۔ کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

وہ سب لوگ ہمیں نیچے تک چھوڑنے آئے۔ آتے ہوئے بھی منظور لاٹ نے پچاس

سینٹ بخشش کے طور پر لفٹ مین کو پیش کیے جو اس نے شکریہ ادا کیے بغیر جیب میں ڈال
لیے۔ خدا جانے ایسے بدمزاج شخص کو اس قدر باقاعدگی سے ٹپ دینے میں ان کی کیا
مصلحت تھی؟

ادھر ادھر گھومتے ہوئے ہم ایک زیر زمین اسٹیشن پر چلے گئے۔ بٹ صاحب بولے "
آپ کہاں لے آئے ہیں بھائی جی۔ ہم تو زمین کے اندر پہنچ گئے ہیں۔ یہاں تو یہ بھی
نہیں چلتا کہ ٹرین آرہی ہے یا جارہی ہے؟"

"یار جہالت کی باتیں مت کرو۔ تم اس وقت نیویارک میں ہو۔ کوئی سن لے گا تو
جاکر چڑیا گھر میں بند کر دے گا۔ اگر زمین کے اندر پہنچ گئے ہیں تو کیا ہوا۔ آپ دیکھ رہے
ہیں کہ ٹرینیں آبھی رہی ہیں اور جا بھی رہی ہیں" خان صاحب نے کہا۔

ہم نے کہ "ان کا مطلب شاید یہ ہے کہ انہیں یہ پتا نہیں چلتا کہ ٹرین کہاں سے آرہی
ہے اور کہاں جائے گی؟"

"بالکل ٹھیک سمجھا آپ نے۔"

"مگر بھائی۔ وہ سامنے دیوار پر روشن نقشے لگے ہوئے ہیں۔ چھت سے لٹکے ہوئے
سائن بورڈ بتا رہے ہیں کہ کون سی ٹرین آرہی ہے اور کہاں جائے گی۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے ہمیں تو کسی جگہ کا نام اور پتا بھی معلوم نہیں ہے۔ ہمارے
تو سبھی جگہیں ایک جیسی ہیں۔"

ہم نے اپنے ذہن پر زور ڈالا تو ان کی بات کافی حد تک معقول لگی۔ نیویارک کے
صرف چند ہی مقامات سے ہم واقف تھے اور یہ جاننا مشکل تھا کہ ہمیں کون سی ٹرین کس
جگہ پہنچادے گی جو ہمارے ہوٹل کے نزدیک ہوگی؟

اس کا دیسی علاج خان صاحب کے پاس موجود تھا۔ انہوں نے برابر سے گزرنے والی
ایک کشیدہ قامت اور خوش لباس خاتون کو "ایکسکیوزمی" کہہ کر روک لیا۔ وہ دستور کے
مطابق رک گئیں۔ اب خان صاحب اپنے ہوٹل کا نام اور پتا بھول گئے۔ ان سے پوچھیں
کیا پوچھیں۔

ہم سے پوچھنے لگے "ہمارا ہوٹل کون سے محلے میں ہے؟"

بٹ صاحب نے کہا "محلہ بی بی پاک دامن میں۔"

"یار بکواس کیوں کرتے ہو۔ اس سے ہم پوچھ لیتے ہیں کہ ہمیں کون سی ٹرین لینی
چاہیے۔"

خاتون بے چینی اور پریشانی سے ہم سب کو باری باری دیکھ رہی تھیں۔ بٹ صاحب
نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ہوٹل کا کارڈ نکالا اور خاتون کے سامنے پیش کر دیا۔ اس
بہانے وہ ان کے نزدیک تر بھی ہو گئے۔

خاتون نے کارڈ پر نظر ڈالی "اسے میں کیا کروں؟"

"اس کا پتا ہمیں بتا دیں" بٹ صاحب ہکلانے لگے۔ نہ جانے رعب حسن سے یا
انگریزی میں کمزوری کے باعث! خاتون نے حیرت سے بٹ صاحب کو دیکھا اور کہا۔

"پتا تو اس کارڈ پر لکھا ہوا ہے۔"

ہم نے فوراً دخل در معقولات کر دیا "میڈم۔ دراصل ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس
جگہ تک جانے کے لیے ہمیں کون سی ٹرین لینی ہوگی؟"

وہ مسکرانے لگیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی مسکراہٹ بھی ان کی باقی ماندہ
شخصیت کی طرح بہت دلکش اور چمکدار تھی۔ حسن کی طرح حسن اخلاق کی بھی ان کے
پاس کوئی کمی نہ تھی۔ بہت تفصیل کے ساتھ انہوں نے ہمیں سمجھایا کہ کون سی ٹرین ہمیں
اس جگہ کے نزدیک تر پہنچا دے گی۔ کہنے لگیں۔

اور وہاں سے آپ دوسری ٹرین لینے کے بجائے باہر نکل جائیں اور پیدل ہی چلے
جائیں۔ بہت اچھی واک ہے۔"

ہم نے تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ پوچھنے لگیں "آپ لوگ ٹورسٹ ہیں؟"

بٹ صاحب نے فوراً اپنی تقریر شروع کر دی۔ یہ ان کا رٹا رٹایا جملہ تھا "ہم لوگ
میامی سے آئے ہیں۔ اس سے پہلے جاپان سے آئے تھے مگر ہم رہنے والے پاکستان کے
ہیں۔"

خاتون نے بڑی دلجمعی سے ان کی مختصر تقریر سنی اور پھر کہا "آپ کی اس تفصیل
وضاحت کے لیے میں شکر گزار ہوں مگر میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ آپ کس ملک سے
تعلق رکھتے ہیں۔ پاکستان کو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔"

کیا آپ پاکستان جا چکی ہیں؟" خان صاحب نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ مگر میں اکثر ٹیکسیوں میں سفر کرتی رہتی ہوں اور نیویارک میں بہت زیادہ پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور ہیں۔ ان سے کافی معلومات ملتی رہتی ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔"

وہ کھٹ کھٹ کرتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔ "شرمندہ کر گئی نا" بٹ صاحب بولے۔

"کس طرح؟"

"ہمیں طعنہ دے گئی کہ پاکستانی ٹیکسی چلاتے ہیں۔"

"اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ یہاں کسی کام کو ذلیل اور گھٹیا نہیں سمجھا جاتا۔"

"پھر بھی۔ شرم تو آتی ہے نا۔"

"شرم آتی ہے تو شرماتے رہو۔ آؤ اب باقی ٹرین میں بیٹھ کر شرمالینا۔"

خود کار ٹکٹ گھر سے ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد پلیٹ فارم پر پہنچے تو ایک گلستان کھلا ہوا تھا۔ خوب رونق تھی اور خوب روؤں کی کمی نہ تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور خوشبوؤں سے مہکتا ہوا وجود۔

بٹ صاحب نے فوراً کہا "ہم تو بے وقوف ہی ہیں جو ٹیکسیوں پر مارے مارے پھرتے ہیں۔"

"کس لیے؟"

"بھائی ٹیکسی میں تو ہمارے علاوہ صرف ایک ڈرائیور ہوتا ہے مگر ٹرین میں سینکڑوں لوگ ہوتے ہیں اور سب ایک دوسرے سے بڑھ کر۔ بس آج کے بعد ٹیکسی میں سفر نہیں کریں گے' ہو گیا فیصلہ۔"

اتنے میں گھنٹی سی بجی اور ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہوئی۔ سب لوگ سمٹ کر پلیٹ فارم کے اگلے حصے پر پہنچ گئے۔ ٹرین داخل تو بڑی تیز رفتاری سے ہوئی تھی اور لگتا تھا کہ شاید رکے گی ہی نہیں مگر ایک دم رک گئی۔ لوگوں کا ایک ریلا' بڑے منظم انداز میں باہر نکلا' بعد میں سفر کرنے والے بڑے اطمینان سے ٹرین میں سوار ہو گئے اور فوراً ہی ٹرین چل پڑی۔ ان ملکوں میں نظم و ضبط کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ وقت ضائع نہیں ہوتا اور بڑے اطمینان اور سکون سے مرحلہ طے ہو جاتا ہے ورنہ پلیٹ فارم پر جتنے لوگ تھے اور جتنے ٹرین کے اندر سے برآمد ہوئے تھے۔ اگر ہمارا ملک ہوتا تو وہ دھکم پیل ہوتی کہ کئی منٹ تک تو باہر

نکلنے والوں کو موقع نہ ملتا کیونکہ اندر جانے والے زور لگانے میں مصروف ہوتے۔ دھکم پیل اور دھینگا مشتی کے باعث ماحول اور موڈ الگ خراب ہوتا اور ٹرین کے رخصت ہونے میں دیر لگتی وہ الگ۔ ان ٹرینوں میں جب تک خود کار دروازے بند نہ ہو جائیں یہ اسٹارٹ نہیں ہوتیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے لباس کا کوئی حصہ دروازے میں اٹک جائے اور دروازہ پوری طرح بند نہ ہو تب بھی ٹرین نہیں چلتی۔ اگر ہمارے ہاں یہ ٹرین ہو اور دستور بھی وہی ہو تو ذرا تصور فرمائیں کہ کیا ہو؟ شاید ٹرین اسٹیشن سے حرکت ہی نہ کر پائے۔

☆ ☆ ☆

ٹرین کے اندر مسافروں کا ہجوم تھا۔ بیشتر خواتین تھیں۔ خدا جانے یہاں عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے یا مرد لوگ ہی کم سفر کرتے ہیں۔ ہجوم کے باوجود ڈبا خوشبو سے مہک رہا تھا۔ مختلف اقسام کی خوشبوؤں نے مل جل کر خوشبوؤں کی ایک کاک ٹیل سی بنا دی تھی۔ اس موسم میں مکمل ائر کنڈیشننگ کی وجہ سے اندرونی ماحول نہایت لطیف اور پرلطف ہوتا ہے۔ اس لیے بھی یہ لوگ عموماً خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ خان صاحب اس ہجوم میں بھی راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ "منزل" پر پہنچ کر رک گئے۔ یہ ایک خوش ادا' خوش لباس خاتون تھیں۔ اول تو ان کا لباس ہی خاصا خلاف شرع تھا۔ اس پر ستم یہ کہ انہوں نے اپنے بالائی لباس کو شانوں پر سے کھینچ کر کچھ اور نیچے کھسکا لیا تھا جس کی وجہ سے وہ بقول بٹ صاحب کے "فحاشی کی آخری حدوں تک پہنچ گیا تھا۔" وہ زیر لب لاحول بھی پڑھ رہے تھے۔

ہم نے کہا "بٹ صاحب' فحاشی کی کوئی آخری حد نہیں ہوتی۔"

"بولے "ہاں۔ پاکستان سے باہر نکل کر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے" پھر کہنے لگے "آئیں' ہم بھی ذرا خان صاحب کے پاس چلتے ہیں۔"

ہم نے کہا "خان صاحب کے پاس یا اس "شرع شکن" عورت کے پاس۔"

"لاحول ولا قوۃ ۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا حرکتیں کرتے ہیں۔"

چنانچہ ہم بھی اس بہانے ان خاتون کے پاس جا پہنچے۔ مغربی ملکوں میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ چاہے کتنا بھی زیادہ ہجوم ہو ایک دوسرے کو دھکیلنے کا رواج قطعی نہیں ہے۔ ہر

شخص بڑی شائستگی اور اخلاق کے ساتھ اپنا راستہ بناتا ہے مگر بٹ صاحب نے عجلت
مارے چند لوگوں کو دھکے بھی لگائے۔ خواتین تو محض گھور کر ہی رہ گئیں مگر ایک سیاہ فا
نے جس کا سر چھت سے ٹکرا رہا تھا' اپنی کہنی سے ایک ہلکا سا جوابی دھکا مارا اور بٹ صاحب
کمر تھام کر رہ گئے۔

کالے کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ مسکرا کر پوچھنے لگا ''آپ کو دھکا تو نہیں لگا؟''

بٹ صاحب تو کمر تھام کر کراہتے اور گھورتے رہے مگر ہم نے فوراً کہا ''جی نہیں
شکریہ۔''

بٹ صاحب کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ ذرا آگے چلے تو بولے ''یہ بھی کوئی بات ہے
اس نے اتنی زور سے دھکا دیا اور آپ شکریہ ادا کر رہے ہیں۔''

ہم نے کہا ''دھکا تو آپ نے بھی اسے مارا تھا۔ مگر ''دھکائے ہر کس بقدر ہمت
اوست'' کہ ہر شخص اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق ہی دھکا مار سکتا ہے اور رہا شکریہ تو
ہم نے اخلاقاً ادا کیا تھا۔''

اس گفتگو میں جتنا بھی وقت ضائع ہوا وہ واقعی ضائع ہو گیا کیونکہ جب ہم اس شعلہ
بدن کے' معاف کیجیے خان صاحب کے پاس پہنچے تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اب
خاتون ایک بہت اونچے لمبے سفید فام آدمی کے زیر سایہ تھیں اور دونوں بہت گھل مل
باتیں اور پیار کرنے میں مصروف تھے۔ یہ صاحب یقیناً رگبی کے کوئی کھلاڑی یا پھر باسک
بال کے چیمپئن رہے ہوں گے کیونکہ پورے دیو کے دیو تھے۔ خان صاحب اپنی تمام طو
القامتی کے باوجود اس کے سامنے طفل مکتب نظر آ رہے تھے۔ خاتون ان صاحب کے پیچ
اتنی چھپ گئی تھیں کہ بٹ صاحب چند لمحے تو انہیں ڈھونڈتے ہی رہ گئے' پھر بولے ''کہا
چلی گئی' کہیں باہر تو نہیں نکل گئی؟''

ہم نے کہا ''چلتی ٹرین سے تو کوئی روح یا جن بھوت ہی باہر نکل سکتے ہیں۔''

''تو پھر؟ وہ کہاں گئی؟''

ہم نے جواب میں کہا ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔''

اتنی دیر میں بٹ صاحب نے بھی خاتون کی جھلک دیکھ لی تھی اور خان صاحب کی بر
بھی۔ خان صاحب خاصے ناراض اور مایوس تھے' کہنے لگے' ''آپ لوگ یہاں کیوں آ

یار کسی ایک جگہ کھڑے ہوا کرو۔ بلاوجہ ادھر ادھر دھکے مارتے پھرتے ہو۔ یہ لوگ کیا سوچتے
ہوں گے۔''

بٹ صاحب نے کہا ''آپ ہمارے دھکوں کی فکر نہ کریں۔ آپ کے دل میں جو دھکا لگا
ہے اس کی بتائیں۔''

''کون سا دھکا۔ کیسا دھکا؟''

''کون سا دھکا' تو آپ کے سامنے ہے۔ رہا کیسا دھکا' تو یہ آپ بتائیے۔''

بولے ''یہاں بہت رش ہو گیا ہے۔ میرا تو دم گھٹنے لگا ہے'' یہ کہہ کر وہ مزید دھکے
بازی کرتے ہوئے کچھ اور آگے نکل گئے۔ چلے تو اتنی تیزی سے تھے کہ ہم سمجھے کہ شاید
ٹرین سے باہر ہی نہ نکل جائیں مگر کچھ دور جا کر رک گئے۔ دیکھا تو وہ ایک بزرگ خاتون کا
بیگ اٹھا کر انہیں دے رہے تھے اور وہ ان کا شکریہ ادا کرنے میں مصروف تھیں مگر ان سے
زیادہ ممنون احسان ان کی ہمراہی خاتون تھیں جو قریب قریب ان ہی خاتون کی صفات کی
حامل تھیں جن سے دل برداشتہ ہو کر خان صاحب نے ڈبے میں دھکم پیل شروع کر دی
تھی۔

''دیکھا آپ نے؟'' بٹ صاحب نے ہمیں کہنی ماری مگر وہ برابر کھڑے ہوئے ایک
مریل سے ایشیائی کو لگی۔ وہ غریب بٹ کو گھورنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ چنانچہ بٹ صاحب
نے اسے ''سوری'' کہنے کے بعد دوبارہ کہنی ماری جو اس بار صحیح نشانے پر بیٹھی یعنی ہماری
کمر میں جا لگی۔

''اس شخص کو نہ تو شرم ہے' نہ لحاظ ہے۔ آپ دیکھتے رہیے۔ پاکستان واپس جا کر میں
آپ کی گواہی دلاؤں گا اس کے خلاف۔''

ہم نے کہا ''مناسب ہو گا اگر آپ ان دونوں خواتین کی گواہی بھی دلوائیں۔ آپ کو
کیونکہ اب تک یہ تو پتا چل ہی چکا ہو گا کہ ایک عورت کی صرف نصف گواہی ہوتی ہے مگر
دو عورتوں کی گواہی پوری ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے والی ان دو عورتوں کی گواہی دلانے میں
فائدہ یہ ہے کہ گواہی سننے کے لیے بہت سے لوگ اکٹھے ہو جائیں گے اور اس طرح خان
صاحب کی مزید رسوائی ہو گی۔''

جواب میں بٹ صاحب نے ہماری طرف کوئی توجہ نہیں دی اور دیتے بھی کیسے کہ وہ تو

ہمہ تن خان صاحب کی طرف متوجہ تھے۔ خان صاحب نے اب بڑی بی کی ہمراہی خاتون
بہت زیادہ گھل مل کر باتیں شروع کر دی تھیں اور وہ بھی ان کے ساتھ خاصی بے تکلف
نظر آرہی تھی۔ دونوں کی مسکراہٹ اور انہماک اس بات کی علامت تھی کہ "آغاز" بہ
مناسب ہوا ہے۔ بٹ صاحب کا اور تو کچھ بس چلا نہیں' انہوں نے رہ رہ کر یہ دریافت کر
شروع کر دیا کہ "ہمارا اسٹیشن کب آئے گا" ان کی بے چینی رنگ لائی اور ہمارا اسٹیشن بھ
جلد ہی آگیا۔ دیکھا تو خان صاحب دنیا و مافیہا سے بے خبر کھڑے تھے اور اپنی نئی نویلی
کے ساتھ شیرو شکر ہو رہے تھے۔ بٹ صاحب اچانک دو قدم آگے بڑھا کر خان صاحب
پاس پہنچے اور خاتون سے مخاطب ہو کر "سوری" کہنے کے بعد خان صاحب کو ڈانٹ ڈپ
کرنے لگے۔

"یہ کیا فضول حرکت ہے۔ جہاں کوئی اچھی شکل دیکھتے ہو بس وہیں کھڑے ہو جا
ہو۔ کچھ پتا بھی ہے تمہیں کہ ہمارا اسٹیشن آنے والا ہے۔ اب چلو میرے ساتھ" یہ کہہ
انہوں نے خان صاحب کا بازو تھام لیا اور کھینچ کر چل پڑے۔ ان کی مخاطب خاتون حیران
کر دیکھتی رہیں مگر خان صاحب کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ "سوری میڈم' سوری میڈ
کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

پلیٹ فارم پر ہم سب بھی ٹرین سے برآمد ہو گئے۔ خان صاحب کا دھیان ابھی تک
ٹرین ہی کی جانب تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خواتین کے پاس واپس پہنچ جائیں۔

"بٹ۔ تم ہو نہایت بدتمیز اور جنگلی" وہ غصے سے بولے۔

"اس لیے کہ میں نے تمہارے رنگ میں بھنگ ڈال دی؟ تم ذرا واپس پاکستان چلو۔
میں تمہارا پول کھولوں گا۔ تم تو اپنی اوقات ہی بھول گئے ہو یہاں آکر۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ میں تو ایک ضروری بات کر رہا تھا اس سے۔

"وہ کیا؟"

"میں نے اس سے کہا تھا کہ ہمیں ایک ایسی غیر شادی شدہ خاتون کی تلاش ہے جو
پاکستانی سے پیپر میرج کر لے تاکہ اسے گرین کارڈ مل جائے۔"

"دیکھ لیا آپ نے" بٹ صاحب نے ہمیں مخاطب کیا "یعنی چوری اور سینہ زوری
بھائی' تمہاری آنکھ کا پانی تو بالکل ہی مر چکا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"پھر یہ بھی پوچھتے ہو کہ کیوں۔ کیا پاکستان واپس جا کر کسی کو منہ نہیں دکھاؤ گے؟
ساری عمر تو گرین کارڈ بالکل کام نہیں آئے گا۔ الٹی سزا دلائے گا تمہیں۔"

خان صاحب ہنسنے لگے "یار تم بھی سچ مچ کے بٹ ہو۔ میں اپنے لیے تو نہیں کہہ رہا
تھا۔ ہمارے اتنے بہت سے پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور یہاں غیر قانونی طور پر رہتے ہیں۔ اگر کسی
کا بھلا ہو جائے تو کیا حرج ہے۔"

بٹ صاحب قدرے ٹھنڈے پڑے۔ "مگر ایسی عورتیں پیپر میرج نہیں کرتیں۔ وہ تو
خاصی کھاتی پیتی اور خاندانی عورت نظر آرہی تھی۔"

"آپ کا اندازہ بالکل صحیح ہے۔ وہ بہت بڑی افسر ہے اور طلاق یافتہ بھی ہے۔"

"تو پھر وہ گرین کارڈ دلانے کے لیے جھوٹ موٹ کی شادی کیسے کرے گی؟"

"نہیں کرے گی۔ میں بھی جانتا ہوں مگر کیا حرج ہے اگر تھوڑا سا وقت باتوں میں اچھا
گزر جائے۔ یار ایک بات تو بتاؤ۔ تم اس قدر جیلس اور احساس کمتری کے مارے ہوئے
کیوں ہو؟ بھائی ہم یہاں سیرو تفریح کے لیے آئے ہیں' تجربے کرنے کے لیے آئے ہیں۔
نئی دنیا دیکھنے کے لیے آئے ہیں مگر تم ہر وقت سڑے ہی رہتے ہو۔ تم کون سے مولوی ہو۔
اندر سے تم بھی کیا کم ہو مگر بس منافق ہو۔"

خان صاحب کی اس طویل تقریر نے بٹ صاحب کو اس طرح بوکھلا دیا کہ وہ سناٹے
میں آگئے۔ شاید شرمندہ ہو گئے یا پھر لاجواب تو ہو ہی گئے تھے۔ خان صاحب کا پوائنٹ بھی
ٹھیک ہی تھا۔ یورپ امریکا میں جا کر اگر کوئی وہاں لوگوں سے میل جول بھی نہ کرے' گپ
شپ اور سیرو تفریح نہ کرے تو پھر جانے کا فائدہ؟ اپنے جیسے پاکستانی لوگوں کی تو ملک میں بھی
کوئی کمی نہیں ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ خان صاحب کی اس تقریر دل پذیر نے بٹ
صاحب کو خاصا متاثر کیا اور وہ کافی دیر تک چپ رہے۔ اس کے بعد بھی انہوں نے خان
صاحب کی "آزاد خیالیوں" پر نکتہ چینی نہیں کی بلکہ خود بھی بڑھ چڑھ کر "تجربات" حاصل
کرنے کی دوڑ میں شریک ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

ہمارا ہوٹل زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ لابی میں داخل ہوئے تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔ سا
ایک دائرہ نما صوفے پر دہلوی صاحب ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے تھے اور آنکھیں بند ک
ہوئے اس طرح سرہلا رہے تھے جیسے شعر موزوں کر رہے ہوں۔

"ارے' وہ رہے دہلوی صاحب" خان صاحب کی تو باچھیں کھل گئیں۔

دہلوی نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور فوراً اٹھ کر بغل گیر ہو گئے "بھائیو معاف کرنا

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ہم سب نے فوراً اس باموقع شعر پر انہیں داد دی۔ معلوم ہوا کہ ایک گھنٹے سے یہا
تشریف فرما ہیں اور منتظر بیٹھے ہیں۔

"آپ کہیں جا کر دوبارہ آجاتے" ہم نے کہا۔

"یہی تو مشکل ہے قبلہ کہ اس کام میں واپسی اپنے بس میں نہیں ہوتی۔ ہاکی' فٹ با
کے سینٹر فارورڈ کی طرح ٹیکسی ڈرائیور کا بھی کچھ پتا نہیں ہوتا کہ اگلے لمحے وہ شہر کے کو
سے علاقے میں ہو گا اور وہاں سے گیند (یعنی سواری) کے پیچھے کس طرف نکل جائے گا۔"

بٹ صاحب نے کہا "تو پھر سینٹر فارورڈ کھیلتے ہی کیوں ہو۔ گول کیپر بن جاؤ۔ مز
سے ایک ہی جگہ کھڑے رہو۔"

"قبلہ اگر ایسا کام کروں گا تو آمدنی کم ہو گی اور پابندیاں زیادہ۔ خیر آپ اوپر کمرے می
تو چلئے" ہم نے اپنی اپنی چابیاں سنبھالیں۔ اس وقت استقبالیہ پر ایک بالکل مختلف خاتو
تشریف فرما تھیں اور خاصی دلکش اور متناسب الاعضا تھیں۔

خان صاحب بولے "ان ہوٹل والوں نے تو استقبالیہ پر سیل لگا دی ہے۔ جب دیکھو
مال نظر آتا ہے' کیوں دہلوی صاحب قبلہ؟"

وہ بولے "میں نے اس طرف زیادہ اعتنا نہیں کیا۔ میں چاہوں گا کہ آپ اپنے کمروں
رخ تو کریں قبلہ۔"

کمروں میں پہنچے تو سب کچھ حسب معمول تھا۔ ظاہر ہے تبدیلی ہوتی بھی کیا۔ سوا
اس کے کہ کمرا صاف کر دیا گیا تھا لیکن یہ تو چند لمحے بعد معلوم ہوا کہ واقعی "صاف" کر د
گیا تھا۔ بٹ صاحب اپنے کمرے سے تلملاتے ہوئے آئے اور بتایا کہ وہ اپنا بیگ سا

ٹیبل پر چھوڑ گئے تھے جس میں دو سو ڈالرز اور کچھ رسیدیں تھیں۔ اب بیگ تو ہے مگر ڈالرز نہیں ہیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" خان صاحب نے کہا "بھائی ذرا غور سے دیکھو۔ چیک کرو' یہ کوئی ایسا ہوٹل نہیں ہے۔ کہیں اور رکھ دیے ہوں گے۔"

"بالکل نہیں۔ رسیدیں بھی ساتھ ہی رکھی ہیں۔ ڈالر کہاں چلے گئے؟ میں تو شکایت کروں گا۔"

دہلوی صاحب بول پڑے "شرمندہ ہونے کی بات نہیں ہے قبلہ۔ امریکا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ بلکہ کافی ہوتا ہے۔ درمیانہ درجے کے ہوٹلوں میں ہی نہیں بلکہ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بھی چوریاں ہوتی ہیں' چیزیں غائب ہو جاتی ہیں۔"

"تو پھر کیا ہوتا ہے؟"

"تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پہلے تو مسافر سمجھتا ہے کہ وہی کہیں اور رکھ کر بھول گیا ہے۔ پھر وہ سوچتا ہے کہ امریکا جیسے ملک میں ہوٹل میں چوری کیسے ہو سکتی ہے؟ بہت سے مسافر یا تو جلدی میں ہوتے ہیں یا احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں اس لیے چپ رہتے ہیں' وہ کیا کہتے ہیں دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں قبلہ۔"

"بٹ صاحب نے پہلے تو دماغ پر زور ڈالا اور یاد کیا کہ واقعی ڈالرز پرس میں ہی تھے۔ انہیں کوئی احساس کمتری تھا نہ ہی واپسی کی جلدی" اس لیے طے پایا کہ ہوٹل والوں سے شکایت کی جائے۔ قبلہ دہلوی نے یہ فرض اپنے ذمے لیا اور استقبالیہ سے رابطہ ملا کر فرمایا کہ مجھے منیجر سے بات کرنی ہے۔

"منیجر سے؟ وہ کس سلسلے میں جناب۔ مجھے حکم کیجیے۔ کیا شکایت ہے؟"

"شکایت چوری کی ہے۔"

"اوہ۔ اپنا کمرا نمبر بتائیے۔ وہ ابھی وہیں ہوں گے۔"

ہم نے دہلوی سے کہا کہ یار کہیں مروا نہیں دینا۔ ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں کیونکہ یہ امریکی تو بات بات پر مقدمہ ٹھونک دیتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے خلاف ہتک عزت یا بدنامی کا مقدمہ دائر کر دیں۔

انہوں نے کہا "آفاقی صاحب۔ آپ یہ خیال دل سے نکال دیجئے کہ یہاں سب ایماندار

اور فرشتے ہوتے ہیں۔ بہت بڑی تعداد میں جھوٹے، لفنگے، بے ایمان اور لٹیرے بھی پ پائے جاتے ہیں۔ آپ یقین کیجیے کہ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بھی لوگوں کی گھڑیاں، زیور دوسری قیمتی چیزیں غائب ہو جاتی ہیں حالانکہ ہمارے ملک میں تو ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا ہمیں خواہ مخواہ احساس کمتری ہے۔"

دروازے پر بیل بجی۔ "یس کم ان پلیز۔" خان صاحب نے آواز لگائی۔

دروازہ کھلا اور اس میں سے وہی خوش اندام و خوش اطوار خاتون اندر داخل ہوئیں ہمیں استقبالیہ پر ملی تھیں۔ وہ یوں مسکراتی ہوئی ہماری طرف بڑھیں جیسے کسی خوشی مبارک باد دینے آئی ہیں۔ ان کے عقب میں ایک معقول قسم کے ادھیڑ عمر صاحب تھے کی داڑھی مونچھوں سے لے کر سر کے بالوں تک ہر چیز صفاچٹ تھی۔ خدا جانے انہ نے سر پر خود استرا پھروایا تھا یا قدرت نے پھیر دیا تھا۔ وہ سوٹ پہنے ہوئے تھے اور وہ مسکرا رہے تھے۔

"ہائی....ہائی۔"

خاتون نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگوں کو کچھ غلط ہو گئی ہے؟"

ہم نے کہا "غلط فہمی نہیں ہمارا نقصان ہو گیا ہے۔"

ان کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی، بولیں۔ "ان سے ملئے یہ ہمارے اسٹ مینیجر ہیں مسٹر گیٹ۔"

بٹ صاحب نے زیر لب کہا "یعنی دروازہ۔ کیا فضول نام ہے۔"

وہ دونوں ان کی طرف دیکھنے لگے۔ "معاف کیجئے، کچھ کہا آپ نے؟"

ہم نے کہا ان ہی کے ڈالرز گم ہوئے ہیں۔" اس کے بعد انہیں بٹ صاحب ساری تفصیل بتائی۔

مینیجر صاحب بولے۔ "معاف کیجیے گا، آپ نے تھوڑی سی بے پروائی برتی۔ کمر میں کیش چھوڑ کر جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

ہم نے کہا "مگر یہ کمرا تو مقفل تھا۔ اس کی دوسری چابی ہوٹل کی انتظامیہ کے پ ہوتی ہے۔ تیسرا کوئی شخص تو اندر آ ہی نہیں سکتا۔"

"پھر بھی سر، احتیاط تو لازم ہے۔"

خاتون نے کہا "ہم نے تو لکھ کر لگا دیا ہے کہ اپنے سامان کی خود حفاظت کیجیے یا پھر قیمتی سامان ہمارے پاس جمع کرا دیجیے۔"

مسٹر دہلوی نے فوراً امریکی لہجے میں مداخلت کی۔ "خاتون! آپ قانونی سہارے تلاش نہ کریں، ورنہ ہمارا وکیل بھی کافی نکتے ڈھونڈ لے گا۔ بہتر ہو گا کہ ہم آپس میں اسے طے کر لیں۔"

یہ سن کر وہ دونوں چوکنا ہو گئے۔ قانون اور وکیل دو ایسی چیزیں ہیں۔ جن کا استعمال امریکا میں کثرت سے ہوتا ہے اور امریکی ان دونوں چیزوں سے گھبراتے بھی ہیں۔

"مگر دیکھیے نا، اگر کوئی مہمان اپنا بیگ چھوڑ جائے اور اس میں دو سو ڈالرز بھی ہوں تو اسے آپ کیا کہیں گے؟"

دہلوی نے کہا "اسے ہم اعتماد کہیں گے۔ ہوٹل پر اور امریکی قوم پر۔ اگر اتنا سا اعتماد بھی نہ رہے تو پھر لوگ ہوٹلوں میں ٹھہرنا چھوڑ دیں گے۔ اور جہاں تک قیمتی چیزیں ساتھ لے جانے کا تعلق ہے، یہ بتائیے کہ جس شخص کے پاس سارا سامان ہی قیمتی ہو، کیا وہ ہر بار ہوٹل سے باہر جاتے ہوئے۔ یہ سامان لے جا کر آپ کے پاس جمع کرائے یا کہ اپنے ساتھ لیے لیے پھرے؟"

ان دونوں نے پریشانی سے دہلوی صاحب کو دیکھا۔ ہم نے بھی اس بار ذرا مرعوب ہو کر ان کو دیکھا۔ ہم تو قبلہ کو بس یوں ہی سمجھ رہے تھے مگر وہ تو چھپے رستم نکل رہے تھے۔

"اب بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے عملے سے پوچھ گچھ کریں اور اگر کسی نے غلطی سے ان کے ڈالرز کسی اور جگہ رکھ دیے ہیں تو انہیں نکال کر دے دیں ورنہ پھر میں اپنے وکیل کو فون کرتا ہوں۔ یہ بھی خیال رہے کہ ہرجہ خرچہ ہارنے والے کے ذمے ہوتا ہے۔ ہوٹل کی بدنامی ہو گی، سو الگ۔" یہ کہہ کر وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھے۔

مسٹر گیٹ اور مس بائٹر (بعد میں پتا چلا کہ ان کا یہ نام تھا) دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر مسٹر گیٹ گلا صاف کر کے بولے۔ "دیکھیے، آپ ہمیں سوچنے کی مہلت تو دیجئے۔ ہم اپنے اسٹاف سے بات کرتے ہیں۔ او کے؟"

"او کے!"

وہ دونوں قدرے پریشان ہو کر چلے گئے۔ دہلوی صاحب نے ایک زور دار قہقہہ
اور کہا "مبارک ہو۔ آپ کی رقم مل گئی۔"

"مگر....."

"میں ان امریکیوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اب یہ قابو آ گئے ہیں۔ آپ
پیسے مل جائیں گے قبلہ۔"

خان صاحب نے کہا "تو کیا یہ مالک' انتظامیہ اور اسٹاف کی ملی بھگت ہے؟"

"جی نہیں۔ یہ اسٹاف کی بدمعاشی ہوتی ہے۔ یہ قوم بھروسے کے لائق نہیں۔
قبلہ۔ ویسے ہوٹل کا بھی کچھ نہیں جائے گا۔ یہ انشورنس کمپنی والوں سے وصول کر
ہیں"

اس کے بعد دہلوی صاحب کو گزشتہ ایام کی رپورٹ پیش کی گئی۔ ہماری جن لوگو
سے ملاقات ہو چکی تھی وہ ان میں سے اکثر سے واقف تھے بلکہ من من تو ان کے لنگو
تھے۔ کہنے لگے۔ "جب تک آپ کی رقم ملے' آپ ذرا میرے کمرے تک زحمت کریں
میں آپ کو ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ "آپ کے کمرے تک؟"

"قبلہ' آپ ہی کے ہوٹل میں ہے۔ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔"

"تو کیا آپ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں؟" بٹ صاحب نے پوچھا۔

"ٹھہرا ہوا نہیں ہوں' بس آج ہی ٹھہرا ہوں۔ آپ آیئے تو قبلہ۔"

ان کا کمرا اسی فلور پر تھا مگر ذرا چکر کاٹ کر وہاں جانا پڑتا تھا۔ کمرے کے دروازے
سامنے پہنچ کر انہوں نے بڑے پر اسرار انداز میں جیب سے ایک چابی نکالی کچھ پڑھ کر اس
پھونکا اور پھر ہمیں بھی پھونکنے کو کہا۔ اس جادوئی حرکت کے بعد انہوں نے مسکرا کر
دروازے پر دستک دی اور پھر دروازہ کھول کر دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر کہا "یہ دیکھئے قبلہ
تحفہ ہے تحفہ۔"

ہم سب نے بے تابی سے اندر کمرے میں جا کر دیکھا۔ کمرا بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔
صرف سجاوٹ کا سامان اور فرنیچر موجود تھے۔ ہم سمجھے کہ شاید انہوں نے کچھ نظربندی وغیرہ
کی ہے اور چند لمحے بعد کوئی چیز ہمارے سامنے نمودار ہو جائے گی مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ اس

کے بدلے ہوا یہ کہ دہلوی صاحب نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی اور انگریزی میں کہا "کم
آن۔"

ہم سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھتے رہے کہ شاید یکایک کوئی چیز یا شخصیت
ہماری آنکھوں کے سامنے نمودار ہو جائے گی یا کسی دوسرے دروازے یا دیوار میں سے کوئی
اندر داخل ہو جائے گا مگر توبہ کیجئے۔ سناٹے اور تنہائی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

دہلوی صاحب ذرا بے چین ہو کر آگے بڑھے۔ کلوزٹ میں جھانکا پھر الماریوں کو دیکھا'
غسل خانہ چیک کیا آخر میں بیڈ کے نیچے بھی دیکھ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک لمبی سرد
آہ بھری اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

ہم سب پریشان ہو گئے۔ "کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے قبلہ؟"

یہ سن کر وہ دوبارہ اٹھے۔ الماری میں لٹکے ہوئے کوٹ کی جیبیں تلاش کیں اور پھر آہ
بھر کر بیٹھ گئے۔ "کام دکھا گئی آخر!"

"کون؟"

"آپ کی ہونے والی آدھی بھابی!"

یہ معما ہماری سمجھ سے تو بالا تر تھا مگر پھر انہوں نے بتایا کہ ان کی ملاقات ٹیکسی میں
ایک دوشیزہ سے ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں دوستی ہو گئی اور ڈیٹ پکی ہو گئی۔ دہلوی صاحب
نے سوچا کہ کیوں نہ اسے ہمارے ہوٹل میں لے آئیں تاکہ ہم لوگ بھی ان کی باتوں سے
لطف اندوز ہوں۔

خان صاحب بولے۔ "ارے کوئی پیشہ ور کال گرل ہو گی۔"

"بالکل نہیں۔ بہت معقول اور شریف لڑکی تھی۔ اب ہمیں کال گرلز اور اچھی
عورتوں کی خوب پہچان ہو گئی ہے قبلہ۔"

"مگر قبلہ یہاں تو پہچاننے میں غلطی کھا گئے؟"

"ہاں۔ یہ تو ہے' آخر انسان ہوں قبلہ۔"

دہلوی صاحب اس لڑکی سے کافی مرعوب اور متاثر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بڑی
مشکل سے ڈیٹ پر راضی ہوئی تھی۔ اس شرط پر کہ دہلوی صاحب کے دوست بھی موجود
ہوں گے۔ وہ تعلیم یافتہ اور خوش پوش تھی۔ خوش شکل تو ظاہر ہے کہ تھی ہی۔ لطف کی

بات یہ ہے کہ دہلوی صاحب جب اسے کمرے میں چھوڑ کر گئے تو اپنا کوٹ بھی اتار
الماری میں لٹکا گئے جس کی ایک جیب میں سو ڈیڑھ سو ڈالرز بھی تھے۔ ان کے باہر جاتے
وہ خاتون رقم لے کر چلتی بنیں۔

خان صاحب نے کہا "آپ تو کہتے تھے کہ ان امریکیوں کی رگ رگ سے واق
ہیں۔"

ہنس کر بولے "بھائی انسان ہوں' ماشیا تو نہیں ہوں۔ بہت سی رگیں میرے علم
بھی نہیں ہوں گے شاید۔"

دہلوی صاحب نے بتایا کہ نیویارک میں یہ بھی عموماً ہوتا ہے کہ سیاحوں کو اچھی لڑکیا
کے روپ میں کال گرلز مل جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ہوٹل جاتی ہیں اور موقع پاتے ہی نقد
لے کر غائب ہو جاتی ہیں۔ کئی بار تو اس غریب کا پاسپورٹ' ویزا اور دوسرے کاغذات
ساتھ لے جاتی ہیں۔ جتنا بڑا شہر' اتنی ہی زیادہ تعداد میں ایسی وارداتیں۔

کچھ دیر بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ہم سب کو حیرت ہوئی کہ نیویارک کے اس ہو
میں ہمیں فون کرنے والی ہستی کون ہو سکتی ہے؟

ٹیلی فون کے دوسرے کنارے پر اسسٹنٹ منیجر مسٹر گیٹ بول رہے تھے۔ "سر' ہم
افسوس ہے کہ آپ کو تکلیف پہنچی اور شکایت کا موقع ملا۔ آپ کا نقصان ہوٹل کی انتظا
پورا کر دے گی۔ آپ جس وقت چاہیں' اپنا چیک وصول کر لیں۔"

بٹ صاحب کا نقصان تو ہوٹل کی انتظامیہ نے پورا کر دیا مگر قبلہ دہلوی صاحب کا
نقصان ہوا تو وہ کون پورا کرتا؟ وہ بے چارے تو ہوٹل انتظامیہ سے شکایت بھی نہیں کر
تھے۔ ویسے دہلوی صاحب کی نیت بہت نیک تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنی نئی دوست
ہمراہ ہم لوگوں کو گھمانے پھرانے لے جائیں گے مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

بٹ صاحب نے کہا "قدرت نے ہمیں ایک گناہ سے بچا لیا۔"

"گھومنے پھرنے اور سیر و تفریح کرنے میں گناہ تو نہیں ہوتا۔" قبلہ نے احتجاج کیا۔

"نامحرموں کے ساتھ تو بات کرنا بھی گناہ ہوتا ہے قبلہ۔"

قبلہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگے "اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں آ
تک کسی لڑکی کے ساتھ ڈیٹنگ میں کامیاب نہیں ہوا تو کیا آپ یقین کر لیں گے؟"

ہم سب نے اقرار میں سر ہلایا تو بولے "سچی بات یہ ہے کہ پہلے تو میری ہمت ہی نہیں
پڑتی کسی گوری لڑکی سے بات کرنے اور ڈیٹ کی دعوت دینے کی اور اگر کبھی اتفاق سے ایسا
ہو بھی جائے تو ڈیٹنگ کی نوبت نہیں آتی۔ ایک مثال تو آپ کے سامنے موجود ہے۔"

"تو پھر آپ صبر کیوں نہیں کر لیتے قبلہ؟" بٹ صاحب نے مشورہ دیا۔ "ڈیٹنگ اور
فلرٹیشن سے باز کیوں نہیں آجاتے؟"

بولے "بس قبلہ' وہ جو شاعر نے کہا ہے تو شاید ہم جیسوں کے لیے ہی کہا ہے کہ۔

جب کبھی ہم نے کیا عشق پشیماں ہوئے
زندگی ہے تو ابھی اور پشیماں ہوں گے

اب اگر نیویارک میں رہ کر بندہ عشق اور ڈیٹنگ تک نہ کرے تو اس کی زندگی کا
فائدہ؟ پھر اپنے ملک میں رہنے میں کیا برائی ہے؟ دہلوی صاحب ایک نفسیاتی معما تھے۔ بہت
سی باتیں جو دوسرے لوگوں کو سخت ناپسند تھیں وہ انہیں پسند کرتے تھے اور دوسروں کی
ناپسندیدہ حرکات ان کو پسند آیا کرتی تھیں۔ مثلاً لڑکیوں کے ساتھ ڈیٹ گزارنے کا مسئلہ ہی
لے لیجیے۔ ڈیٹ سے مراد یہ ہے کہ آپ ایک شام کسی لڑکی کے ساتھ گزاریں گے۔
ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جو لڑکا اور لڑکی ڈیٹنگ کے لیے جاتے ہیں' وہ
یقیناً بے ہودگی اور عشق و عاشقی بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل
"ڈیٹ" کی نوعیت کا انحصار دونوں فریقوں پر ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کے لوگ ہیں' کس
طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی تہذیبی اور تعلیمی حیثیت کیا ہے۔ بہرحال یہ تصور
سرے سے غلط ہے کہ لڑکے اور لڑکی کا ایک ساتھ باہر جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک
ساتھ رات گزاریں گے۔ آپ حیران ہوں گے کہ کئی بار تو ڈیٹنگ کے دوران میں لڑکا اور
لڑکی ایک دوسرے کے نزدیک بھی نہیں آتے۔ "ڈیٹنگ" مغرب کی ایک تہذیبی مصروفیت
ہے۔ اس کے لیے بھی باقاعدہ ادب آداب اور ضوابط و قانون ہوتے ہیں مگر ایک رکھ رکھاؤ
اور وضع داری کا خیال ضرور رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ یوں تو فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست
ہوتی ہے۔ تمیزدار اور بدتمیز لوگ تو ہر ایک معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔

قبلہ کی مشکل یہ تھی کہ وہ بچپن میں ایک ایسے ماحول میں پلے تھے جہاں لڑکیاں تو
لڑکیاں' لڑکوں کو بھی شرم و حیا سکھائی جاتی ہے اور انہیں صنف مخالف سے فاصلہ رکھنے کی

تسلیم دی جاتی ہے۔ دہلوی صاحب کی یہ عادت اتنی پختہ ہو گئی کی فطرت میں داخل ہو گ
اب امریکہ میں رہنے کے باوجود ان کا یہ عالم تھا کہ اکیلے میں کسی حسین لڑکی کو دیکھ لی
ہاتھ پسیج جاتے اور پسینے چھوٹ جاتے۔ بات وہ صرف واجبی سی کرتے تھے۔ ڈیٹنگ کے
جس بے تکلفی اور جارحیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس سے محروم تھے چنانچہ اس کا
انہوں نے یہ نکالا تھا کہ جب تنہائی سے اکتا جاتے اور فریق مخالف کی صحبت کے خواہش
ہوتے تو سڑک پر سے کوئی اچھی سی کال گرل پسند کر کے ساتھ لے جاتے۔ دو چار گھنٹے ا
ادھر کی باتیں کرتے، اگر اس کا کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ حل کر دیتے اور پھر وہ لوگ دو بہترین
مخلص دوستوں کی طرح رخصت ہو جاتے۔ طے شدہ رقم اسے دینا نہ بھولتے تھے۔
لڑکیاں انہیں بیوقوف، سادہ لوح یا بیمار سمجھ کر ان پر ترس کھاتی تھیں حالانکہ ایسی کوئی با
نہ تھی۔ کہتے "اگر وہ سمجھتی ہیں تو سمجھتی رہیں، مجھے کیا۔"

ہم نے ان سے کہا۔ "قبلہ! یہاں تو سینکڑوں، ہزاروں ایسی کمپنیاں موجود ہیں جو و
گزارنے کے لیے بہت اچھے رفیق فراہم کر دیتی ہیں۔ آپ کے ذوق کے مطابق ہمراہی
جاتا ہے۔ پھر آپ سڑکوں پر سے یہ کوڑا کرکٹ کیوں اٹھا لیتے ہیں؟"

بولے۔ "اول تو یہ کوڑا کرکٹ نہیں ہوتا، اچھی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ بس ذرا حالات
ستائی ہوئی ہوتی ہیں۔ بے چاری۔ میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ ان کی اکثریت
ضرورت کے تحت ایسا کرتی ہے، شوقیہ نہیں۔ بعد میں ان میں سے بہت سی عورتیں ا
اپنا پیشہ بھی بنا لیتی ہیں۔"

اسکورٹ یا رفیق فراہم کرنے والی کمپنیوں کی فیس عام طور پر بہت زیادہ ہوتی۔
جس کا بوجھ ایک ٹیکسی ڈرائیور کی جیب برداشت نہیں کر سکتی اس لیے دہلوی صاحب
پھرتے اپنے لیے گپ شپ کرنے والے ساتھی تلاش کرتے رہتے ہیں۔

ہماری رقم تو ہوٹل والوں نے ادا کر دی تھی اور دہلوی صاحب نے اپنی رقم پر صبر کر
تھا لیکن بٹ صاحب اور خان صاحب کا اصرار تھا کہ ہمیں یہ ہوٹل فی الفور بدل
چاہیے۔

"مگر کس لیے؟ اچھا خاصا تو ہے۔"

"یہاں کا عملہ چور ہے۔"

"آپ کو کیا پتا کہ دوسرے ہوٹل کا عملہ چور نہیں ہو گا؟"

"یار، بلاوجہ بحث مت کرو۔ انسان تجربات کے ذریعے بہت کچھ سیکھتا ہے۔"

ہمیں ہوٹل چھوڑنے پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر مشکل یہ تھی کہ ہم نے جن حضرات کی
ت قبول کی تھی وہ ہوٹل بدلنے کی صورت میں ہمیں کہاں تلاش کرتے؟ دہلوی صاحب
ے بتایا کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آپ یہاں اپنا اگلا پتا چھوڑ سکتے ہیں۔ ہوٹل والے
یافت کرنے والوں کو فراہم کر دیں گے۔

سامان پیک کر کے ہم سب تیار ہو گئے۔ لوڈر نے آ کر ہمارے سوٹ کیس اٹھائے اور
چے استقبالیہ پر پہنچا دیئے۔ استقبالیہ پر گئے تو وہاں ایک نئی خاتون تشریف فرما تھیں اور سچ تو
ہے کہ اب تک نظر آنے والی خواتین و حضرات میں سب سے زیادہ خوش نظر اور خوش
تھیں۔ ان کے بال لہروں کی شکل میں شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ ماہتاب تھا تو
نکھیں ستارہ۔ قدو قامت اور تناسب بھی ایسا کہ کیا کسی کا اس سے بہتر ہو گا۔

خان صاحب نے ہمارے کان میں کہا۔ "معلوم ہوتا ہے، ہوٹل کی مالکہ ہے۔"

بٹ صاحب بولے۔ "مالکہ نہیں ملکہ۔ دیکھتے نہیں کس شان و شوکت سے بیٹھی
ہے۔"

ابھی ہم لوگ ان کے نزدیک نہیں پہنچے تھے اس لیے تبصرہ آرائی جاری تھی۔ "مگر یہ
ینہ خوش جمال اس سے پہلے کہاں تھی۔ نظر کیوں نہیں آئی؟"

"اگر نظر آ جاتی تو آپ کیا کرتے؟ ہو سکتا ہے وہ شادی شدہ ہو۔"

بٹ صاحب بگڑ گئے۔ "خان صاحب، آپ میرے کیریکٹر پر حملہ نہ کریں۔ میں آپ کی
رح دل پھینک اور عاشق مزاج نہیں ہوں۔ اور یہ شادی شدہ والی بات کیا کہہ دی آپ
نے؟ یہاں تو جتنی دیر میں شادی ہوتی ہے اس سے بھی کم دیر میں طلاق ہو جاتی ہے۔"

خان صاحب نے کہا۔ "بہت خوش فہمی ہے آپ کو اپنے بارے میں۔ ایسے ہی ہیں تو
ن کی طلاق کرا کے دکھا دیں۔"

اگر دکھا دیا تو کیا دو گے؟" بٹ صاحب نے بگڑ کر پوچھا۔

"یہی عورت آپ کے نکاح میں دے دوں گا۔" خان صاحب نے بڑے اطمینان سے
واب دیا۔

دہلوی صاحب خاموشی اور حیرت سے یہ گفتگو سنتے رہے بولے۔ "آپ کو تو یہ بھی نہیں کہ یہ کون خاتون ہیں۔ شادی شدہ ہیں یا طلاق یافتہ ہیں۔ کس مذہب اور قومیت ۔ تعلق رکھتی ہیں۔ مگر آپ نے شادی اور طلاق کی شرط بھی لگالی؟"

خان صاحب نے کہا۔ "دہلوی صاحب' یہ ہمارا مشغلہ ہے اور شرط لگانے میں جاتا کیا ہے۔ بھئی یا تو انسان شرط جیت لیتا ہے یا ہار جاتا ہے۔ تیسری کوئی صورت نہیں ہو فائدہ یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے انسان کی رگوں میں جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے وقت اچھا گزر جاتا ہے"

"مگر ہارنے والے کو نقصان جو ہو جاتا ہے۔"

اس کی خیر ہے۔ نقصان تو تب ہو جب ہارنے والا کچھ ادا کرے۔ ہار جیت سے کر بحث کو غرض ہے۔ مقصد تو محض شرط لگانے سے ہے۔"

اس دوران میں ہم استقبالیہ تک پہنچ گئے جہاں وہ جمال آراء تشریف فرما تھیں او الوقت ایک ٹیلی فون کا تار مروڑتے ہوئے کس سے گفتگو کر رہی تھیں۔ آواز سنی تو وہ دوسری تمام چیزوں کے عین مطابق نکلی۔ میٹھی' بھرپور اور اکسا دینے والی۔ وہ بولتی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے کوئی جذباتی مکالمہ بول رہی ہیں۔ دل میں خواہ مخواہ گدگدی ہونے لگتی تھ یہ عالم اس وقت تھا جب کہ وہ کسی اور سے فون پر مخاطب تھیں۔ تصور فرمائیں کہ اگر راست آپ ہی سے مخاطب ہوں تو کیا ہو؟

وہی جو اس کے بعد ہوا۔ انہوں نے فون بند کر کے بڑی دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ سب کو دیکھا۔ پھر ایک لمبی سی آہ بھر کر انہوں نے اپنی رسیلی آواز میں ماحول سے کچھ رس سمیٹ لیا اور فرمایا "ہائی !"

اس علیک سلیک کے بعد انہوں نے دونوں سنگ مرمر جیسے بازو سامنے میز پر پھیلا انگڑائی لینے کا ارادہ کیا مگر پھر ارادہ بدل کر رہ گئیں۔ شاعر کا وہ شعر تصویر بن کر ہما نگاہوں کے سامنے لہرا رہا تھا۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

فرق صرف یہ تھا کہ وہ ہاتھ اٹھانے سے پہلے مسکرائی تھیں اور ہاتھ چھوڑنے کے

ہمیں گھور رہی تھیں۔ خان صاحب کے دل میں جو کھد بد ہو رہی تھی اس کی آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ بٹ صاحب بھی اپنی باڈی بلڈنگ کے زور پر اپنے دل کو سینے سے باہر نکلنے سے روکنے میں کامیاب رہے تھے۔ ہم دونوں بھی بس ایضاً ایضاً ہی تھے۔

انہوں نے پوچھا۔ "میں آپ کے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟"

کس قدر سادہ مگر پروقار سوال تھا بلکہ ترغیب انگیز کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ خان صاحب نے ہمارے کان میں کہا۔ "چھوڑو یار۔ ایک دو دن کی تو بات ہے' اسی ہوٹل میں رہ لیتے ہیں۔ اپنے سامان کی ذرا زیادہ حفاظت کر لیں گے۔"

ہم نے کہا۔ "میڈم! آپ کے ہوٹل میں۔"

انہوں نے مسکرا کر بات کاٹ دی۔ "مس.... مسٹر! میں میڈم نہیں ہوں' مس گارنر میرا نام ہے۔"

بٹ صاحب نے کان میں کہا۔ "گارڈنر کتنا اچھا نام ہے۔"

ہم نے بٹ صاحب کو محض گھورنے پر اکتفا کیا لیکن ہمارا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ بھلا کہاں کا انصاف ہے کہ ایک تو ہوٹل میں سامان چوری ہو جائے اور پھر جب اس کی شکایت کی غرض سے ہوٹل تبدیل کرنے کے لیے مسافر یا جماعت ہوٹل استقبالیہ پر جائیں تو وہاں ایک خوبصورت عورت کو بٹھا کر ان لوگوں کے جذبات سے کھیلا جائے اور انہیں بے وقوف بنایا جائے۔ یہ سخت بے اصولی کی بات تھی۔

ہم نے کہا۔ "مس گارنر! آپ کو شاید علم ہو چکا ہو گا کہ اس ہوٹل میں ہمارے ایک ساتھی کی رقم چوری کر لی گئی اور...... اور...... اور بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہوا۔"

ہم نے دہلوی صاحب کی منت آمیز نظریں دیکھ کر ان کی بات گول کر دی۔

"میرے علم میں کچھ نہیں ہے۔ یقین کیجیے۔" انہوں نے بے اعتنائی سے فرمایا اور اپنے ہاتھوں کے ناخنوں پر کیوٹکس لگانی شروع کر دی۔ کبھی وہ ایک رنگ لگاتیں کبھی دوسرا' پھر انگلیوں کو منہ کے پاس لے جا کر ان کا جائزہ لیتیں۔ پھونک مارتیں اور منہ بنا کر روئی سے رنگ صاف کر دیتیں۔

"یہ بھلا دکانداری کا کون سا انداز ہے؟" بٹ صاحب نے غصے سے کہا۔

وہ چونک کر بولیں۔ "آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"

"جی ہاں۔ یہ ہوٹل محفوظ جگہ نہیں ہے اس لیے ہم اسے چھوڑ رہے ہیں۔"

"بسرہ چشم۔" وہ مسکرائیں۔ "آپ کا بل ایک منٹ میں تیار ہو جائے گا۔ آپ اتنی سامنے صوفے پر تشریف رکھیں یا پھر یہیں کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھیں۔" پھر مزید مسکرا بولیں۔ "مردوں کے لیے یہ ایک دلکش منظر ہوتا ہے اسی لیے میں عام طور پر ڈیوٹی اوقات میں ایسا کرتی ہوں۔"

"عجیب عورت ہے۔" دہلوی صاحب نے اردو میں کہا۔ پھر اس سے مخاطب ہو "مگر مس، کیا آپ کو ہماری شکایت اور تکلیف سے کوئی غرض نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں ہے۔ اسی لیے تو آپ کو روکا نہیں گیا۔ البتہ معذرت طلب کرنا بھول گ تھی۔ دراصل ایسے ہوٹلوں میں عموماً ایسا ہو جاتا ہے۔"

"ایسے ہوٹلوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"مطلب یہ کہ یہ فی الحال ایک بدنصیب ہوٹل ہے۔"

"کس لحاظ سے؟"

"اس لحاظ سے کہ اس پر ان دنوں ریسیور بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا کوئی ایک والی وار نہیں ہے۔ اس کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔ مالک قرضہ ادا نہیں کر سکا۔ حصے دار، بینک او انشورنس کمپنیاں گدھوں کی طرح اس کی بوٹیاں نوچنے میں مصروف ہیں۔ اس کی کیفیت ایک ایسی بے سہارا عورت جیسی ہے جو سڑک پر تنہا رہ گئی ہے اور ہر طرف حسن ک پجاریوں کا ہجوم ہے۔"

یہ ایک اچھی خاصی طویل تقریر تھی جو ان صاحبہ نے اس انداز میں کی تھی جیسے رٹ رٹا کر یاد کی ہو اور ریہرسل کرنے کے بعد ناظرین کے سامنے دہرا دی ہو۔ ایک خوبصورت خوش وضع عورت کی زبان سے ہم اس قدر جذباتی اور حقیقت پسند تقریر کی توقع نہیں ک رہے تھے۔"

"تو کیا یہ دیوالیہ ہو چکا ہے؟"

"جی ہاں۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ اس سے وابستہ ہر شخص کتنا بے زار اور بے پروا ہے۔"

ہم نے دل ہی دل میں کہا کہ کم از کم آپ تو ایسی ہی نظر آ رہی ہیں۔"

"میں بھی بس چند دنوں کے لیے یہاں آئی ہوں۔ بینک میں جسے خالی وقت ملتا ہے وہ یہاں استقبالیہ پر آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ میری ڈیوٹی کل شام یا پرسوں صبح تک ہو گی۔ اس کے بعد کوئی اور آ جائے گا۔ دنیا کا یہی دستور ہے۔"

ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سب کا سر انکار میں حرکت کر رہا تھا۔ مطلب یہ کہ ہوٹل چھوڑنے کے حق میں کوئی نہ تھا۔

"یار، یہ تو وہی بات ہو گی کہ مرے کو مارے شاہ مدار۔"

"اور کیا۔ یہ ہوٹل تو پہلے ہی دیوالیہ ہو چکا ہے۔ ہم بھی چلے جائیں گے تو اور زیادہ نقصان ہو گا بے چاروں کا۔"

"اور پھر لڑکی نے بھی سفارش کر دی ہے قبلہ۔" یہ دہلوی صاحب تھے۔

"ہاں ٹھیک تو ہے" ہم نے اپنی رائے ظاہر کی۔ "ہمیں کون سا ہمیشہ قیام کرنا ہے نیویارک میں۔ جو دو چار دن باقی ہیں یہیں گزار دیتے ہیں۔ بلاوجہ دوسرے ہوٹلوں میں جانے کی کیا ضرورت ہے اور ہو سکتا ہے کہ دوسرا اس سے بھی برا ہو"

خان صاحب نے فرمایا۔ "اور ہو سکتا ہے کہ وہاں استقبالیہ والی لڑکی بھی اس سے بری ہو!"

مس گارنر بدستور اپنے ناخنوں کی افزائش حسن میں مصروف تھیں مگر گاہے گاہے اپنی نیلی نیلی آنکھیں اٹھا کر ہماری طرف دیکھ کر مسکراتی بھی جاتی تھیں۔

پوچھنے لگیں۔ "اپنے کمروں کے نمبر دیں تو آپ کا بل بنا دوں!"

ہم نے کہا۔ "مس گارنر! ہم لوگوں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ ہم صرف کل پرسوں تک یہاں مقیم ہیں۔ بلاوجہ ہوٹلوں میں مارے مارے پھرنے کا فائدہ؟"

"بہت معقول خیال ہے۔" وہ مسکرائیں۔ "سستے اور اچھے ہوٹل ملتے کہاں ہیں آج کل۔ رہی سامان کی چوری تو اس کی تو حفاظت کی جا سکتی ہے۔ اور اب تو یہ کام اور آسان ہو گیا ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

"اس طرح کہ اب آپ جانتے ہیں ادھر سامان چوری کرنے والا بھی جان گیا ہے کہ آپ جان گئے ہیں کہ یہاں سامان چوری ہو جاتا ہے۔ جب دونوں ہی جان گئے ہیں اور

ہوٹل انتظامیہ بھی جان گئی ہے کہ یہاں سامان چوری ہو جاتا ہے تو پھر تمام پارٹیز محتاط رہیں
گی۔ کم از کم آپ لوگوں کی حد تک ورنہ اگر آپ کسی نئے ہوٹل میں گئے تو یہ مان لیجیے کہ
چوری تو وہاں بھی ہوتی ہے مگر وہاں چوری کرنے والا نہیں جانتا کہ آپ جانتے ہیں کہ وہاں
چوری ہوتی ہے اور نہ ہی آپ جانتے ہیں کہ چوری کرنے والا جانتا ہے کہ.....''

ہم اس طولانی تقریر کو درمیان میں چھوڑ کر ہی وہاں سے چلے آئے۔

خان صاحب نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا۔ ''حد ہو گئی تھی۔ اتنی خوبصورت لڑکی اور
اتنی بے معنی باتیں!''

''معلوم ہوتا ہے پہلے کسی خوبصورت لڑکی سے واسطہ نہیں پڑا آپ کا۔'' دہلوی
صاحب نے کہا۔

یہ لڑکی بیوقوف سہی، کم از کم خوبصورت تو تھی اور ایک خوبصورت لڑکی میں دوسری
خوبیاں کون تلاش کرتا ہے؟ چنانچہ لوڈر کو ہدایت کی گئی کہ وہ ہم سب کا سامان واپس کمرے
میں لیجا کر رکھ دے۔ دہلوی صاحب نے ایک کمرا بک ضرور کرایا تھا مگر سامان ان کے پاس
ایک اٹیچی کیس کے سوا کچھ نہ تھا۔ سامان لے جانے اور لانے والا نو عمر لڑکا بار بار سامان
زمین پر گرا رہا تھا۔ سوٹ کیس اٹھاتا تو گرا دیتا، رکھتا تو پھر گرا دیتا۔ میز ٹھیک کرنے لگتا تو
بھی گر جاتی۔

خان صاحب نے کہا۔ ''یہ تو کوئی تخریب کار معلوم ہوتا ہے۔''

ہم نے کہا ''خان صاحب۔ یہ بخشش کا طلب گار ہے اور یہ اس کا حق بھی ہے۔''

بولے ''اسے بخشش وہی دے جس نے ہوٹل تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔''

یہ حرکت بھی خان صاحب ہی کی تھی۔ انہوں نے ہی یہ تجویز پیش کی تھی لہٰذا بخشش
بھی انہیں ہی دینی پڑی۔

☆ ☆ ☆

نیویارک کا بہت بڑا حصہ تو ہم نے دیکھ ہی لیا تھا اگرچہ وہ اونٹ کی داڑھ میں زیرے
کے مانند تھا۔ ورنہ نیویارک کو دیکھنا کوئی کھیل تو نہیں ہے مگر بہت سے قابل ذکر مقامات اگر
نہیں تو کم از کم باہر سے گزرتے ہوئے ہم نے ضرور دیکھ لیے تھے۔

خان صاحب بولے۔ ''نیویارک تو دیکھ لیا۔ اب کوئی اور خاص چیز ہو تو بتائیے۔''

دہلوی صاحب مسکرانے لگے۔ ''قبلہ اگر نیویارک کی ویڈیو فلم بنا کر آپ کو دکھائی
جائے تو یہاں بیٹھ کر بھی آپ کئی ہفتوں میں نیویارک نہیں دیکھ پائیں گے۔ یہ کم بخت شہر
نہیں ہے، پورا طلسم ہے۔ آپ نے طلسم ہوشربا پڑھی ہے؟''

بٹ صاحب اور خان صاحب نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ہم نے کہا۔ ''ہاں ہم نے پڑھی
ہے۔''

''یہ اس سے بھی بڑا طلسم ہے۔ ایک دنیا کے اندر مختلف دنیائیں اور ایک زمانے کے
اندر مختلف زمانے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شہر نہیں، جادو نگری ہے۔ پوری الف لیلیٰ۔ الف سے
یے تک دیکھ لیجیے یہاں اس طرح کی کہانیاں بھی قدم قدم پر ملتی ہیں۔ علی بابا بھی ہیں،
چالیس چوروں کی بھی کمی نہیں ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''کیوں نہ دریائے ہڈسن کے کنارے چل کر سیر کریں۔ کشتی میں گھومیں،
ماہی گیری کریں۔''

بٹ صاحب نے کہا۔ ''بھائی یہ راوی نہیں، ہڈسن ہے۔ اسٹیمر اور جہاز چلتے ہیں
یہاں۔ ادھر کھگا مچھلی نہیں ہوتی۔ یہاں وہیل ہوتی ہے۔ شارک ہوتی ہے۔ یہ بہت
خطرناک مچھلیاں ہوتی ہیں۔ میں تو فلم میں بھی انہیں دیکھ کر ڈر جاتا ہوں حالانکہ میں
ڈرپوک آدمی نہیں ہوں۔''

''پتا ہے۔ پتا ہے۔ تم بہادر ڈرپوک ہو۔ یہ بھی غنیمت ہے۔''

''قبلہ، اگر تھوڑا فالتو وقت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔'' دہلوی صاحب نے کہا۔

ہم نے کہا۔ ''فقرہ آپ نے غلط بول دیا ہے۔ کہنا یہ چاہیے تھا کہ اگر جان کی امان
پاؤں تو کچھ عرض کروں۔''

وہ ہنسنے لگے۔ ''بس جناب نیویارک میں رہ کر زبان خراب ہو گئی ہے اپنی۔''

''شکر کرو۔ اتنی خراب نہیں ہوئی جتنی کراچی اور لاہور میں رہ کر ہماری خراب ہو گئی
ہے۔''

''دیکھیے سب سے پہلے تو ہم سامنے والے کیفے میں چلتے ہیں۔ کافی پیتے ہیں اور پھر
ایک پروگرام عرض کروں گا آپ لوگوں کی خدمت میں۔''

کیفے میں حسب معمول خوب رونق تھی۔ مختلف قسم کے لوگ، مختلف چہرے، مختلف زبانیں، کیفے کی ویٹریس ہی اس کی مالکہ بھی تھیں، کاؤنٹر کے پیچھے جو صاحب تشریف فرما تھے وہ ان کے شوہر بھی تھے اور باورچی کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے۔ اپنی امداد کے لیے انہوں نے ایک اور ویٹریس بھی رکھی ہوئی تھی۔ جس کا دھیان کام سے زیادہ گاہکوں کی طرف تھا۔ بہرحال ہمارا آرڈر مالکہ نے ہی وصول کیا اور بڑے دھیان سے وصول کیا۔ وہ بار بار مسٹر دہلوی کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی بھی رہیں اور "امیگو امیگو" کہہ کر انہیں مخاطب بھی کرتی رہیں۔

خان صاحب نے ان کے جانے کے بعد پوچھا۔ "یہ امیگو آپ کی عرفیت ہے؟"

"جی نہیں۔"

"اچھا تو پھر پیار کا نام ہو گا۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ یہ لڑکی ہسپانوی ہے۔ مجھے پیار میں "امیگو" کہہ کر بلاتی ہے۔"

خان صاحب کی آنکھیں پھیل گئیں۔ بولے۔ "انسٹینٹ کافی تو ہم نے سنی تھی مگر "انسٹینٹ محبت" پہلی بار دیکھی ہے۔ بھائی، نگاہیں ملتے ہی آپ دونوں عشق کی راہ پر چل پڑے؟"

وہ کچھ شرمائے ہوئے انداز میں کہنے لگے۔ "نگاہیں تو بہت عرصہ پہلے چار ہو چکی ہیں قبلہ۔ میرا اکثر اس طرف آنا ہوتا ہے۔ اس ہوٹل میں کافی مسافروں کو لے کر آتا رہتا ہوں۔"

"اچھا تو اس لیے آپ نے ہمیں یہاں ٹھہرایا تھا؟"

"ہرگز نہیں۔ دراصل آپ کے لیے یہ سب سے موزوں ہوٹل تھا۔ مجھے تو آپ کا فائدہ مقصود تھا قبلہ۔"

"مگر یہ امیگو تو شادی شدہ ہے۔"

"امیگو مرد کو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے مسٹر یا ڈیئر۔"

بٹ صاحب نے کہا۔ "تو پھر وہ دوسرا امیگو جو اندر بیٹھا ہوا ہے وہ چانپیں بنانے والی چھری سے آپ کا قیمہ نہیں بنا دے گا۔"

دہلوی صاحب مسکرائے۔ "بٹ صاحب، یہ پاکستان نہیں ہے، امریکا ہے اور امریکا میں

بھی نیویارک۔ یہاں شادی بیاہ، عشق و محبت ہر طرح کا ہوتا ہے۔ اول تو لوگ شادی کرتے ہی نہیں ہیں اور اگر کرتے بھی ہیں تو طلاق کا بندوبست پہلے کر لیتے ہیں۔ کوئی ایک دوسرے کے معاملے میں دخل نہیں دیتا۔"

اتنی دیر میں ویٹریس کافی کی ٹرے اور ڈونٹس لے کر آگئی۔ خاصی دلکش اور شاداب جسم لڑکی تھی۔ مسکراتی تھی تو دونوں گورے گالوں میں گڑھے سے پڑ جاتے تھے جو دریا میں رونما ہونے والے بھنور کی طرح ہر ایک کو اپنی جانب کھینچ لیتے تھے۔ لباس اس کا عام ویٹریس لڑکیوں جیسا تھا۔ اسکرٹ، بلاؤز مگر خاصا مختصر بلاؤز اور اسکرٹ دونوں کا رنگ سیاہ تھا۔ گوری گردن میں اس نے سیاہ موتیوں کی ایک مالا ڈال رکھی تھی۔ ظاہر ہے مصنوعی ہو گی۔ مگر قبلہ نے فرمایا۔

"ارے نہیں قبلہ، بالکل اصلی موتی ہیں۔ میں نے خود خرید کر دیئے ہیں۔"

لیجیے۔ بات اور کھل گئی۔ لڑکی نے میز پر بڑے اہتمام سے برتن سجائے۔ اس دوران میں وہ بڑی لگاوٹ اور دلکش انداز میں دہلوی صاحب کی طرف بار بار دیکھتی رہی اور مسکراتی رہی اور اس کے رخساروں میں بھنور بھی نمودار ہوتے رہے۔

"او کے امیگو؟" سامان رکھ کر اس نے دہلوی صاحب سے پوچھا۔

"تھینک یو سینورا۔ میرے دوستوں سے ملو۔ یہ میرے ملک سے آئے ہیں۔"

"پاکستان؟"

"ہاں پاکستان سے۔ ٹورسٹ ہیں۔"

اس نے بڑی گرمجوشی سے ہم سب سے مصافحہ کیا۔ دراصل ہسپانوی لوگوں میں آج کل کچھ اپنائیت ہی محسوس ہوتی ہے۔ آخر ہمارے اجداد نے وہاں سینکڑوں سال حکمرانی کی ہے۔ شادی بیاہ کیے ہیں۔ عشق و محبت کی ہے۔ لڑائیاں لڑی ہیں۔ عربوں اور مشرق کی بہت سی نشانیاں آج بھی وہاں پائی جاتی ہیں۔ یہ لڑکی بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔ خدا جانے کس مسلمان کا خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہو گا۔ اس کے آبا نہ جانے کن کے حرم رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے وہ کسی زمانے میں عرب ہوں، مسلمان ہوں، اس ملک کے حکمرانوں میں اس کے بزرگ بھی شامل ہوں۔ سیاہ آنکھیں، سیاہ بال، گورا بے داغ رنگ، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی مسکراہٹ، بات چیت اور ہاتھ ملانے کے انداز میں ایک

گرمجوشی تھی۔ یہ گرمی یورپ والوں میں مفقود ہوتی ہے۔

اتنی دیر میں باورچی خانے کی جانب سے ایک آواز بلند ہوئی۔ اس کا شوہر بتا رہا تھ دوسرے گوشے میں بھی کچھ گاہک منتظر ہیں۔ وہ چمکدار مسکراتی ہوئی آنکھوں سے معذ طلب کرکے رخصت ہو گئی۔

"کتنی اچھی ہے بھابی۔" خان صاحب نے تبصرہ کیا۔

"بھابی تو نہیں ہے قبلہ۔ ہاں آدھی بھابی کہہ سکتے ہیں۔ ویسے لڑکی اچھی ہے۔ خیال ہے؟"

"نام تو پوچھا ہی نہیں۔" بٹ صاحب نے ہم سے شکوہ کیا۔

"ہاں قبلہ' ان محترمہ کا نام ہے زنجان۔ زنجان سمجھتے ہیں نا؟"

"جی نہیں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ کسی وقت یاد رہا تو دریافت کروں گا۔"

"زنجان کچھ عجیب سا نام ہے۔" خان صاحب نے تبصرہ کیا۔

"لڑکی بھی تو بہت عجیب ہے قبلہ۔"

"یہ تو آپ نے صحیح فرمایا۔ واقعی عجیب تو ہے کہ اپنے شوہر کو سامنے بٹھا کر والے شوہر سے گپ شپ لگا رہی ہے۔"

"اسے آپ مائنڈ نہ کریں قبلہ۔ یہاں کا یہ عام رواج ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ ہمیں گھومنے کے لیے کہاں جانا چاہیے؟"

ہم نے کہا۔ "قبلہ یہ تو آپ ہمیں بتائیے۔ نیویارک کے بارے میں آپ ہم سے جانتے ہیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے۔ "قبلہ' نیویارک کے تو ہزار رنگ اور ہزار پہلو اسے تو دیکھنے کے باوجود پورا نہیں دیکھا جا سکتا۔ زمین کے اوپر کا نیویارک تو آپ نے ہی لیا ہے۔ اب کہئے تو آپ کو زمین کے اندر والا نیویارک دکھائیں؟"

"آپ کا مطلب ہے انڈر گراؤنڈ کا سفر؟ وہ تو ہم کر چکے ہیں۔"

بولے "آپ نے انڈر گراؤنڈ چلنے والی ٹرینیں تو دیکھی ہیں مگر انڈر گراؤنڈ رہنے انسان نہیں دیکھے ہوں گے۔"

"بھائی صاحب' معاف ہی رکھئے۔ ہمارا ابھی زیر زمین جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ نیویارک کے نیچے بھی ایک دنیا آباد ہے۔ یہ بالکل نئی اور انوکھی قسم کی دنیا ہے۔ نیویارک کا یہ رنگ بہت سے نیویارک والوں نے بھی نہیں دیکھا ہو گا۔ آئیے آئیے آپ کو زیر زمین نیویارک دکھاتے ہیں۔" انہوں نے سر اٹھا کر اشارہ کیا اور ان کی شادی شدہ محبوبہ دوڑی ہوئی آ گئی۔

"امیگو؟" اس نے پھولی ہوئی سانس کے درمیان کہا۔

"چیک!" یہ سن کر اس نے اپنے بلاؤز کی جیب سے ایک کاغذ کا پرزہ نکالا اور سامنے میز پر رکھ دیا۔ دہلوی صاحب نے ایک معقول رقم میز پر رکھ دی اور "سی یو سینورا" کہہ کر ہمارے ساتھ چل پڑے۔ غریب سینورا کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ انہیں رخصت کے وقت الوداع کہتی لہٰذا بل کی رقم لے کر چلتی بنی اور ہم دہلوی صاحب کی قیادت میں اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

دہلوی صاحب نے ہمیں سب وے اسٹیشن میں لے جا کر ٹرین میں بٹھایا اور کہا کہ
۳۴ویں اسٹریٹ کے سب وے اسٹیشن پر جا رہے ہیں۔ سب وے اسٹیشن معمولی سی تبد
سے سب کے سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ویسا ہی تھا۔ ٹرین سے باہر نکل کر باہر
طرف جانے کے بجائے دہلوی صاحب ہمیں پلیٹ فارم کے ایک آخری کنارے پر
گئے۔ کافی دور چلنے کے بعد پلیٹ فارم ختم ہو گیا تو ہم حیران ہوئے کہ آخر دہلوی صاحب
ہمیں کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ شاید جادو کے زور پر سامنے والی دیوار توڑ کر ہمیں کوئی ا
جگہ دکھائیں گے۔ کچھ فاصلے پر ہمیں ایک خاتون نظر آئیں۔ یہ سفید فام تھیں۔ عمر ۵
سال کے لگ بھگ ہو گی۔ صورت شکل واجبی۔ لباس بھی صاف ستھرا تھا۔ وہ ایک مشی
میں سے کوکا کولا کا ڈبے نکالنے میں مصروف تھے۔

"ہائی نینسی۔" دہلوی نے نعرہ لگایا۔

ہائی۔" انہوں نے بھی گرمجوشی سے جواب دیا۔ پھر ہم لوگوں کو دیکھا تو پوچھا۔ "آ
پھر کوئی پارٹی مل گئی ہے کیا؟"

"نہیں یہ میرے ہم وطن اور دوست ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔ ان سے ملو۔"
کہہ کر انہوں نے ہم سب کا تعارف کرایا۔ "یہ نینسی ہیں۔ انڈر گراؤنڈ اپارٹمنٹ میں ر
ہیں۔ اور نینسی یہ لوگ میرے وطن سے آئے ہیں۔"

نینسی ایک عام امریکن عورت نظر آتی تھی مگر وہ عام عورت نہیں تھی کیونکہ وہ ز
کے اندر رہا کرتی تھی۔ پلیٹ فارم جہاں تک ختم ہو رہا تھا وہاں سیمنٹ اور کنکریٹ کی ا
دیواروں کے درمیان نینسی کا گھر تھا۔ یہ دراصل ان دونوں دیواروں کے اوپر ٹرین کی پٹڑیا
تھیں۔ ان کے نیچے ایک مختصر سی جگہ پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ٹھوس زمین کا سلسلہ
شروع ہو جاتا تھا۔ یہی نینسی کی رہائش گاہ تھی۔ اس میں کوئی دروازہ تو نہیں تھا۔ بس کھ

ہوئی جگہ سی تھی۔ اندر جو کمرا نما کھوہ یا کھوہ نما کمرا تھا۔ اس میں نینسی نے اپنا سامان سجا رکھا
تھا۔ زمین پر ایک گھسا پٹا پرانا سا قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک جانب گتے کا ایک ڈبا تھا جسے وہ میز
کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ نینسی کے اپارٹمنٹ کی کل آرائش یا فرنیچر ان ہی دو چیزوں پر
مشتمل تھی۔

"یہ میرا غریب خانہ ہے۔" اس نے کسی احساس کمتری کے بغیر ہمیں بتایا۔ ہم یہ گھر
دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یقین نہیں آیا کہ دنیا کے دولت مند ترین ملک کے سب سے بڑے
شہر میں لوگ غاروں میں بھی رہتے ہوں گے۔

"کم آن۔ آرام سے بیٹھیں۔" اس نے ہمیں قالین پر بیٹھنے کی دعوت دی۔
"تھوڑے دنوں پہلے بھی مسٹر ڈی چند سیاحوں کو لے کر یہاں آئے تھے۔ انہوں نے میری
اور میرے گھر کی تصویریں بھی بنائی تھیں۔ اس کے عوض ان لوگوں نے مجھے دس ڈالر
دیئے تھے۔ نہیں نہیں، آپ سے میں کچھ نہیں لوں گی کیونکہ آپ مسٹر ڈی کے ہم وطن
اور دوست ہیں۔"

مسٹر ڈی غالباً دہلوی کا مخفف تھا۔ نینسی نے ہمیں آس پاس اسی قسم کے پانچ غار نما
کمرے بھی دکھائے اور بتایا کہ پہلے اس کا قبضہ دو کمروں پر تھا مگر پھر ایک روز وہ کہیں گئی
ہوئی تھی تو ایک اپارٹمنٹ پر کسی اور نے قبضہ کر لیا۔ لڑائی جھگڑا کرنے کی قوت نہیں تھی،
دوسرے خود نینسی کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو مزید لوگوں کو اس قلمرو میں داخل
ہونے سے روک دے۔ نینسی نے برابر والے اپارٹمنٹ میں گتے کے ڈبوں سے بنے ہوئے
قالین پر سوئے ہوئے سیاہ فام شخص کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہی اس کا پڑوسی ہے۔ یہ
صاحب محض ایک نیکر پہنے ہوئے محو خواب تھے۔ اس غار میں بھی کوئی دوسرا سامان نظر
نہیں آیا۔ دراصل وہاں سامان رکھنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ دیکھا جائے تو وہاں تو کسی
ایک انسان کے سونے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ جہاں پر پلیٹ فارم زمین کی سطح سے جا کر
مل جاتا تھا وہاں تک ان لوگوں نے رہائش گاہیں بنا رکھی تھیں۔ شروع کا حصہ تو روشن ہو
جاتا تھا مگر آگے جا کر تاریکی کا راج تھا۔ نینسی نے بتایا کہ آگے والی جگہ پر بھی چار افراد رہتے
ہیں۔ ان میں سے ایک کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی ہے اور دوسرا بیمار ہے اور مستقل کھانستا رہتا
ہے۔ تصدیق کے طور پر نینسی نے ہمیں ان صاحب کے کھانسنے کی آواز بھی سنوا دی۔

"کیا آپ لوگ مجھ سے انٹرویو کریں گے؟" نینسی نے دریافت کیا۔
"نہیں تو۔ مگر ہم تم سے کچھ جاننا چاہیں گے۔"
"میری عمر ۳۵ سال ہے۔ میں ایک گیس اسٹیشن میں کام کرتی ہوں۔ میر
چھوٹے بچے ہیں جو ایک یتیم خانے میں رہتے ہیں۔ میں ہفتے میں ایک روز یا چھٹی
دن ہی ان سے جا کر مل سکتی ہوں۔"
"ان کا باپ کب مرا تھا؟"
وہ ہنسنے لگی۔ "کون کہتا ہے؟ وہ تو زندہ ہے۔ نیویارک ہی میں کہیں جھک مار رہا
میری تو چار سال سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ مجھ سے اور ان بچوں سے کبھی نہیں ملتا۔
"کیا وہ بہت غریب آدمی ہے۔ خان صاحب نے پریشان ہو کر پوچھا۔
"بیوی بچوں کو ساتھ رکھنے کے لیے آدمی کو امیر ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی
تھوڑے احساس ذمے داری کی ضرورت ہوتی ہے"
نینسی نے ہمیں بہت دلچسپ اور انوکھی باتیں سنائیں۔ بولی۔ "سب وے کا
مسافروں کے لیے بہت فائدہ مند ہے مگر نیویارک کی سب وے کے اندر تقریباً دو ہزار
بسیرا کرتے ہیں میری طرح۔ نیویارک بڑا غریب پرور شہر ہے" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔
نینسی خاصی معقول عورت تھی۔ اگر ہماری کہیں اور ملاقات ہوئی ہوتی تو ہمیں
تک نہ گزرتا کہ وہ اس طرح کیڑے مکوڑوں کی طرح رہتی ہوگی۔
"کیڑے مکوڑے بھی میرے ساتھ رہتے ہیں۔" اس نے شاید میرے دل کی بات
لی تھی۔ "کاکروچ تو اتنے زیادہ ہیں کہ کیا بتاؤں۔ کم بخت سونے بھی نہیں دیتے۔ مگر
مجھے عادت پڑ گئی ہے۔ شروع میں چیخ مار کر بیدار ہو جاتی تھی۔"
شہروں میں سر چھپانے کے لیے انسان مختلف جگہیں تلاش کر لیتے ہیں۔ پلو
نیچے، ریلوے کے ڈبوں کے اندر۔ جھونپڑیوں میں یا فٹ پاتھوں پر رہنے والوں کے ب
میں تو سن رکھا تھا مگر زمین کے سینکڑوں فٹ اندر ریل گاڑیوں کی پٹڑیوں کے درمیان
والی مخلوق ہم نے پہلی بار نیویارک میں ہی دیکھی تھی۔ ریلوے کی پٹڑیوں کے عین در
میں رہنے کے لیے آنا جانا بھی ہوتا رہتا ہے اور بہت سے لوگ تیز رفتار ٹرینوں سے کٹ
مر بھی جاتے ہیں۔

"اس سال اب تک بیس سے زیادہ لوگ ٹرینوں سے کٹ کر مر چکے ہیں۔" نینسی نے
ہمیں مطلع کیا۔ "ایک بار ایک شخص اپنی گرل فرینڈ کو گلے لگا کر اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا
کہ ٹرین کی زد میں آگیا اور دونوں محبت کرنے والے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان واقعات
کے بعد اب ٹرین ڈرائیور اور کنڈیکٹر ٹرین کی رفتار کافی کم کر لیتے ہیں۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ
کوئی صاحب نشے میں دھت اپنے اپارٹمنٹ میں جانے کے بجائے ٹرین کی پٹڑی پر ہی
مدہوش ہو کر گر گئے۔"
ماحول خاصا گھٹا ہوا تھا۔ ہم نے دہلوی صاحب سے کہا کہ ہمارا تو دل گھبرا رہا ہے۔ اگر
نینسی کے پاس کچھ وقت ہو تو اسے کسی ریستوران میں لے چلتے ہیں۔ وہاں چل کر باتیں
کریں گے۔ نینسی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس کے پاس ہمارے لیے وقت ہی وقت
تھا۔ کسی اچھے ریستوران میں کھانا اور موقع ملے تو پینا اس کے لیے عیاشی سے کم نہ تھا۔
ہم لوگ ۳۴ ویں اسٹریٹ کے ایک لب سڑک ریستوران میں جا کر فروکش ہو گئے۔
"آخر لوگ اس قدر خراب، گھٹے ہوئے بیمار کر دینے والے تنگ و تاریک ماحول میں
رہتے کیوں ہیں؟" ہم نے پوچھا۔
"تو پھر کہاں رہیں؟ آپ کو پتا ہے کہ نیویارک میں رہنے کی جگہ کتنی کم اور کس قدر
مہنگی ہے؟"
"نہیں تو۔"
اس نے کہا "بس۔ تو پھر آپ ان لوگوں کی مشکل کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان غاروں
میں رہنے کا سب سے بڑا فائدہ تو یہی ہے کہ کرایہ نہیں ادا کرنا پڑتا۔ پھر یہ سب وے
اسٹیشن رات دن کھلے رہتے ہیں۔ آج جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ آباد اور
بارونق جگہیں ہوتی ہیں اس لیے عورتوں کی آبرو ریزی اور مردوں کو لوٹ مار کا بھی ڈر
نہیں ہوتا۔"
نیویارک کا سب وے سسٹم انیسویں صدی کے آغاز میں تعمیر کیا گیا تھا۔ سارے شہر
میں اس کے ۱۴۶۹ اسٹیشن ہیں اور ریل کی پٹڑیاں ۱۱۴۲ کلو میٹر لمبی ہیں۔ ان اسٹیشنوں کے
اندر جہاں بھی جگہ مل جاتی ہے غریب، بے گھر اور بے آسرا لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح
رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ بعض مقامات پر زیادہ لوگ رہتے ہیں کیونکہ وہاں گنجائش زیادہ

ہے۔ مثلاً سیکنڈ ایونیو اور براڈوے کے اسٹاپ کے درمیان سب سے زیادہ لوگوں کا
ہے۔ نینسی نے ہمیں یہ جگہ بھی دکھائی۔ خدا کسی کو یہ جگہ نہ دکھائے اور نہ ہی کسی کو
مقامات پر رہنے پر مجبور کرے۔ یہ علاقہ کیونکہ زیادہ آباد ہے اور نزدیک ہی ریستوران
بھی موجود ہیں اس لیے یہاں حشرات الارض کی بھی کثرت ہے۔ ہیر پھیر والی تنگ و تا
سیڑھیوں سے گزر کر جہاں پہنچتے ہیں وہ چوہوں کی آماجگاہ ہے۔ چوہے بھی خرگوش کے
کے۔ ہم تو ڈر اور گھبراہٹ کے مارے اندر گئے نہیں مگر چوہوں کی بھاگ دوڑ دور ہی
نظر آرہی تھی۔ اب ذرا سوچیے کہ اس جگہ انسان بھی رہتے ہیں۔ غضب خدا کا۔ یہ
کیونکہ مین ہٹن کے جنوبی علاقے میں ہے اس لیے کچھ نیک دل اور مخیر لوگوں نے
علاقے میں غریبوں کے لیے "لنگر" بھی بنا رکھے ہیں۔ "لنگر" اس لحاظ سے کہ یہاں دن
ایک بار مفت سوپ تقسیم کیا جاتا ہے۔ غریب اور ضرورت مند لوگ ان سے مفت
حاصل کرلیتے ہیں اور نیچے سب وے اسٹیشن پر جاکر سو جاتے ہیں۔

نینسی جیسی عورتیں نیویارک میں بھی بہت کم ہیں جو ایسے مقامات پر رہنا پسند کر
ان "غاروں" میں ۹۰ فیصد مرد رہائش پذیر ہیں اور ان میں سے بیشتر کبھی نارمل نہیں کہا
جاسکتے۔ کچھ عادی شرابی ہیں اور ہر وقت نشے میں رہتے ہیں۔ کچھ منشیات کے عادی ہ
ان میں ذہنی معذوروں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ اکثر کا گزارا بھیک پر ہے یہ پھر چھ
موٹے کام کرلیتے ہیں۔ مثلاً گاڑیوں پر کپڑا مار دیا یا سامان ادھر سے ادھر پہنچا دیا۔ مگر یہ
تو محض بہانے ہیں۔ ان میں سے اکثریت کا گزارا خیرات پر ہے ان کے "غاروں" کو د
رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ روشنی، تازہ ہوا اور صفائی کا یہاں نام و نشان تک نہیں
گندگی کے ڈھیر، پرانے اخباروں کی ردی، بوسیدہ میٹریس۔ ہیروئن استعمال کرنے والوا
پھینکی ہوئی سرنجیں۔ کوکین کے خالی ڈبے، یہ ان مقامات پر ڈھیروں کی صورت میں
آتے ہیں اور اسے دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کس قسم کے بدنصیب لوگ ہیں او
حالات میں زندگی گزارتے ہیں۔ نیویارک کی سب وے کے ذریعے ہر روز ۳۵ لاکھ افرا
کرتے ہیں مگر ان کو بھی غاروں میں رہنے والے ان ہم وطنوں کے بارے میں کوئی علم
ہے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ اگر وہ لوگ ان خاک بسر لوگوں کے حالات زندگی
واقف ہو جائیں تو سنگدل ترین شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

غاروں کی دنیا ایک علیحدہ دنیا ہے۔ یہاں کے رہنے والے بہت پیار و اخلاص کے ساتھ
تے ہیں لیکن نہ تو ایک دوسرے سے سروکار رکھتے ہیں اور نہ ہی موقع ملنے پر کوئی لحاظ
تے ہیں۔ "جگہ" حاصل کرنے کے لیے یہ ایک دوسرے کی جان لینے سے بھی گریز نہیں
تے۔ نینسی نے ہمیں ایک صاحب سے ملایا۔ ان کا نام کلف ہے۔ یہ اپنے ایک دوست
ں کے ساتھ دو غاروں میں مقیم ہیں۔

"کیا بتائیں۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں اتنی اچھی جگہ مفت میں رہنے کو مل
ہے۔ نہ چوری کا کھٹکا ہے، نہ لوٹ مار کا اندیشہ، کوئی کرایہ ادا کرنے پر ہمیں بے دخل کر
ا ہے اور نہ ہی ہر ماہ پانی، بجلی اور گیس کا بل ادا کرنے کا جھنجھٹ ہے۔" مارک نے بتایا۔

"مگر یہاں تو اندھیرا رہتا ہے...... نہ ہوا آتی ہے۔"

"جتنی بھی ہے وہ زندہ رہنے کے لیے کافی ہے۔" اس نے جیب سے ایک مڑی تڑی
ریٹ نکال کر سلگا لی۔ "مگر یہاں اور بھی بہت سی مشکلیں ہیں۔ پٹڑیوں کے اسٹیل سے
ڑ کھانے کے باعث جو غبار سا بن جاتا ہے وہ بہت زہریلا ہوتا ہے۔ ایک بار تو کلف کی
نوں ٹانگیں اتنی سوج گئی تھیں کہ ہمیں فکر ہی پڑ گئی۔ ایک ڈاکٹر نے تو کہا کہ کاٹنا پڑیں گی
ر ایک دوسرے ڈاکٹر نے علاج کیا تو ٹھیک ہو گئیں مگر پھر بھی کبھی کبھی ورم ہو جاتا ہے۔
ھانسی بخار تو عام بیماری ہے۔ ہماری بستی میں رہنے والے اکثر لوگوں کو ٹی بی ہے۔ مجھے تو
ا لگتا ہے کہ اگر مجھے کبھی یہاں سے باہر نکل کر رہنے کا موقع ملا تو مجھے کینسر ہو چکا ہو گا۔
مد کی بیماریاں تو خیر بہت عام ہیں۔"

وہ ان بیماریوں کا تذکرہ یوں کر رہا تھا جیسے کسی اور کے بارے میں باتیں کر رہا ہو۔
اتنی دیر میں ایک چوہا کہیں سے نکل آیا۔ مارک نے کھڑے کھڑے ایک پیر مارا اور چوہا
پلپلا کر رہ گیا۔ ہمیں تو بہت گھن آئی۔

"کیا کریں۔ دیکھیے یہاں ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی رہ سکتا ہے۔ چوہے یا
سان؟"

"آپ لوگوں کو یہاں کوئی تنگ تو نہیں کرتا؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"کیا بتائیں۔ پولیس والے بہت تنگ کرتے ہیں۔ جب پولیس والے دورے پر آتے
یں تو ہم سب ایک دوسرے کو باخبر کر دیتے ہیں اور ان کے چھاپے سے پہلے ہی غائب ہو

جاتے ہیں۔"

گویا پولیس سے آنکھ مچولی جاری رہتی ہے۔ یہ اس ملک کے شہروں کا حال ہے
ساری دنیا کو قرضے دیتا ہے اور خیرات تقسیم کرتا ہے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ ان لوگوں پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ سب وے نظام کی د
بھال کے لیے ایک ادارہ قائم ہے جسے "سٹی ٹرانزٹ اتھارٹی" کہتے ہیں۔ ایک اور ادارہ
ہے جو صفائی کا ذمے دار ہے۔ اسے "سٹی ٹرانسپورٹ اتھارٹی کلینرس" کہتے ہیں۔ انہ
دیکھیے تو یوں لگتا ہے جیسے جنگ کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ ربر کی دستانے اور ربر کے لبا
پہنتے ہیں اور ہر روز نوے ٹن کے قریب گندگی سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔ اتفاق سے ہمار
باہر نکلتے نکلتے صفائی کرنے والوں سے بھی ملاقات ہو گئی۔ اس کے انچارج ایک سیاہ
صاحب ہیں۔ اونچے، مضبوط اور خوب ہٹے کٹے۔ وہ اس محکمے میں ۲۳ سال سے کام کر ر
تھے ان کا نام پی پی ٹیلر ہے۔

"آپ کام کیا کرتے ہیں؟" دہلوی صاحب نے ان سے پوچھا۔

"میرا کام یہ ہے کہ سب وے کے نظام کو محفوظ بنایا جائے۔ اگر ہم لوگ یہاں ..
نہ کریں تو غلاظت کے ڈھیر سے سب وے سسٹم بند ہو جائے۔ اس کی وجہ سے ٹرینو
حادثے بھی پیش آسکتے ہیں۔ آتشزدگی بھی ہو سکتی ہے۔"

پی پی ٹیلر اس آبادی بلکہ زیر زمین دنیا کے انچارج ہیں۔ یہ ایک ہمدرد اور نیک
قسم کے انسان ہیں۔ اپنے فرائض کی حدود میں رہ کر ان قسمت کے ماروں کی مدد بھی ک
رہتے ہیں۔ زیر زمین دنیا کے بارے میں انہوں نے ہمیں بہت سی معلومات فراہم کیں

"دیکھیے مسٹر۔ آپ کوئی بھی ہیں، کہیں سے بھی آئے ہیں، میں آپ سے کچھ
چھپاؤں گا۔ یہ بڑی دکھ کی بات ہے کہ آج کے زمانے میں زمین کے اوپر تو نعمتو
آسائشوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور زمین کے نیچے جاگتے انسان حشرات الارض کی
رہنے پر مجبور ہیں۔"

ٹیلر کی کہانی بذات خود کسی افسانے سے کم نہیں ہے۔ ٹیلر نے ورجینیا کے ایک
خاندان میں جنم لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ غریب اور پسماندہ تھا۔ بچپن میں ٹیلر کو سانپ
مینڈک پکڑنے کا شوق تھا۔ آس پاس کے کسان اس سے سانپ پکڑواتے تھے اور

ضے کے طور پر کچھ رقم بھی دے دیا کرتے تھے۔ ان سانپوں کو وہ چوہے کھانے کے لیے
تعمال کرتے تھے کیونکہ چوہے ان کی فصلوں کو برباد کر دیتے تھے۔ جب ٹیلر نے تلاش
اش میں ورجینیا سے نیویارک کا رخ کیا تو اپنے اس شوق کو پیشہ بنا لیا۔ نیویارک کے سب
ے سسٹم میں ہزاروں لاکھوں چوہے آباد ہیں۔ لوگ کھا پی کر جو چیزیں پھینک دیتے ہیں،
ہیں کھا کر یہ خوب موٹے تازے ہو جاتے ہیں۔ جب ایسا من بھاتا اور قیمتی کھانا دستیاب
جائے تو پھر چوہے وہاں کیوں آباد نہ ہوں؟ ٹیلر صاحب کا کام یہ بھی ہے کہ وہ ضائع شدہ
راک پر زہر چھڑک دیتے ہیں جسے کھا کر چوہے فوراً مر جاتے ہیں۔ ان مردہ چوہوں کی
شوں کو اٹھانا ایک الگ کام ہے۔

ٹیلر صاحب کی کارکردگی کا یہ عالم ہے کہ جب تک انہوں نے یہ زہر ایجاد نہیں کیا تھا،
ب وے میں لاکھوں چوہے دوڑتے پھرتے تھے۔ اب ان کی تعداد ہزاروں میں رہ گئی ہے
گر جتنے مرتے ہیں ان سے زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ ٹیلر نے مسکرا کر کہا "یہ چوہے فیملی
لاننگ کے بالکل قائل نہیں ہیں۔ تعلیم سے بے بہرہ جو ہیں۔ اس لیے۔"

نیویارک کی زندگی کا یہ رخ نہایت روح فرسا ہے۔ جب ٹیلر نے بتایا کہ یہ موٹے
تازے تندرست چوہے انسانی گوشت بھی کھا جاتے ہیں تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے
لیکن اس سے زیادہ ہولناک بات یہ ہے کہ بہت سے انسان بھی چوہوں کو کھا جاتے ہیں۔
سب وے کی زیر زمین دنیا میں چوہوں کو کھائے ہوئے انسانوں اور انسانوں کے کھائے
ہوئے چوہوں کی لاشیں بھی ملتی رہتی ہیں۔ یہ دنیا کی سب سے عظیم سپرپاور کے سب سے
بڑے شہر کے باسیوں کی داستان ہے۔

خان صاحب کی طبیعت تو اتنی خراب ہوئی کہ انہیں یہ باتیں سن کر الٹی ہو گئی۔ ہمارا
دل بھی متلانے لگا تھا۔ ٹیلر صاحب کو ہمراہ لے کر ہم جب زمین سے باہر نکلے تو وہاں کی تازہ
ہوا اور روشنی میں سانس لینا بہت بڑی نعمت معلوم ہوئی۔ ہر طرف رنگوں اور روشنیوں کی
بارش ہو رہی تھی۔ خوش حالی اور دولت مندی کا دور دورہ تھا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ
روشنیوں کے اس شہر کے نیچے کیسی کیسی بستیاں آباد ہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ حکومت
ان حالات سے بے خبر ہے۔ سب وے میں رہنے والوں کی امداد کے لیے حکومت مختلف
اقدامات کرتی رہتی ہے۔ ان لوگوں کو رہنے کی جگہ فراہم کرنے کی اسکیمیں بناتی ہے مگر وہ

اپنے گھر بیچ باچ کر دوبارہ وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ میونسپل کارپوریشن نے بے گھروں کے ر چھپانے کے لیے پناہ گاہیں بھی بنائی ہیں۔ جہاں لوگوں کو مفت رکھا جاتا ہے مگر وہ دوبا بھاگ کر اپنے "غاروں" کا رخ کر لیتے ہیں۔

"بھئی آخر آپ انسانوں کی طرح زندگی بسر کیوں نہیں کرنا چاہتے؟" ٹیلر نے ایک کالے سے پوچھا جو چوتھی بار پناہ گاہ سے بھاگ کر زیر زمین غار میں پہنچ گیا تھا۔ "اچھا بھلا گھ چھوڑ کر یہاں آنے کا فائدہ؟"

"توبہ توبہ۔ وہ بھی کوئی گھر ہے؟ ارے صاحب پرانے گوداموں کو پناہ گاہیں بنا دیا ہے جہاں ایک ایک ہال میں آٹھ آٹھ سو آدمی رہتے ہیں۔ نہ کوئی پردہ ہے نہ پرائیویسی۔ چور چکاری عام ہے۔ غار میں اگر آپ حفاظت کے لیے ایک آنکھ کھول کر سوتے ہیں تو وہا دونوں آنکھیں کھول کر سونا پڑتا ہے کیونکہ آنکھ جھپکتے ہی کوئی آپ کا سامان صاف کر د۔ گا۔ کافی لوگ ان پناہ گاہوں میں رہتے ہیں۔ تیس ہزار تو ہوں گے مگر اس کے باوجود صرف مین ہٹن کے علاقے میں بے گھروں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ" بٹ صاحب جو بہت دیر سے خاموش بلکہ گم صم تھے' اچانک بو پڑے۔ "یہ ہے خوشحالی کا وہ خواب جو امریکی ساری دنیا کو دکھا رہے ہیں اور یہ ہے اس تعبیر!"

زیر زمین رہنے والوں کی اکثریت بے کار اور بے روزگار ہے۔ یہ لوگ بھیک' چوری لوٹ مار پر گزارا کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں اب کام کرنے کی عادت بھی نہیں اور نہ ہی ضرورت ہے۔ ان کی دنیا ہی الگ ہے اور زندہ رہنے کا ڈھنگ بھی الگ ہے۔ ا میں پانچ میں سے چار افراد بے کار یا بے روزگار ہیں اور جو لوگ کام کرتے بھی ہیں تو وہ غ قانونی اور ناجائز ہوتا ہے۔ مثلاً نینسی نے ہمیں دو اصحاب سے ملایا۔ یہ میکسیکو سے آئے ت اور گزشتہ گیارہ سال سے نیویارک میں مقیم ہیں۔ انہوں نے گرین کارڈ یا امریکی شہر حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔ یہ نیویارک کے فیش ایبل علاقے ففتھ ایونیو کے نیچے رہتے ہیں۔ اوپر دولت اور عیش و عشرت کی ریل پیل ہ سب وے کے اندر ایک جگہ فولادی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔ یہ ایک طرح کا خالی گڑھ ہے۔ دونوں ان سلاخوں میں سے گزر کر اپنے "گھر" میں پہنچ جاتے ہیں۔ گھر کیا ہے' بلیک ہو

ہے۔ اس مختصر سی جگہ میں بے شمار کاکروچ بھی ان کے ہمسائے ہیں۔ چوہوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ غنیمت ہے کہ یہ چوہے انسانی گوشت کھانے کے عادی نہیں ہیں مگر ان چوہوں کی وجہ سے یہاں رہنے والوں کو بہت سی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ دراصل یہ غریب جس زمین پر سوتے ہیں وہاں چوہوں کا پیشاب اور فضلہ بھی ہوتا ہے جو انسانوں کے لیے بہت سے عوارض کا سبب بن جاتا ہے۔ بتائیں بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے؟

"یہ لوگ کون ہیں؟ اور کہاں سے آئے ہیں؟"

"یہ بھی ہمارے اور آپ جیسے انسان ہیں۔ بہت سے تو بے سہارا اور اکیلے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جنہیں بچپن میں یا پیدا ہوتے ہی ماں باپ نے پھینک دیا تھا یا دوسروں کے حوالے کر دیا تھا۔ ان کا نہ کوئی گھر ہے نہ رشتے دار۔ معاشرے نے بھی انہیں دھتکار دیا ہے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو ذہنی طور پر معذور ہیں۔ اسپتالوں میں ان کے لیے جگہ نہیں ہے۔ کوئی ایسا رشتے دار یا ہمدرد نہیں ہے جو انہیں اپنے پاس رکھے اور ان کی دیکھ بھال کرے۔ نیویارک کی سب وے اور فٹ پاتھوں پر ہر رات جو لوگ سوتے ہیں ان میں تیس چالیس ہزار ذہنی معذور ہیں۔ یہ بدنصیب' ٹھکرائے ہوئے' بے زر بے در اور بے آسرا لوگ اگر منشیات اور شراب کا سہارا نہ لیں تو کیسے زندہ رہیں؟"

ٹیلر صاحب اصرار کر رہے تھے کہ وہ ہمیں "مسٹر سن گلاسز" سے ملانا چاہتے ہیں۔

"مسٹر سن گلاسز' کون صاحب ہیں؟" بٹ صاحب نے پوچھا۔ "عینکوں کا بزنس کرتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ یہ ایک بلیک ہیں جو سب وے کے غار میں رہتے ہیں۔ ان کا قیام ایک پانچ فٹ لمبے اور چار فٹ چوڑے "گھر" میں ہے۔ یہ میوزک کے بہت شوقین ہیں۔ ان کے بازوؤں میں ہر وقت ٹرانسسٹر لٹکا رہتا ہے جس کی مدد سے وہ چوبیس گھنٹے سوتے جاگتے' کلاسیکی موسیقی سنتے رہتے ہیں۔" مسٹر ٹیلر نے بتایا "یہ صاحب ۱۹۷۹ء سے اسی جگہ رہتے ہیں۔ نہ کسی سے بات کرتے ہیں' نہ ملاقات کرتے ہیں' بول چال کے علاوہ اشارتاً بھی کسی سے مخاطب نہیں ہوتے۔ دن ہو یا رات' یہ صاحب ہر وقت آنکھوں پر گہرا سیاہ چشمہ چڑھائے رکھتے ہیں۔ بدبودار گندگی کے انبار اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کے پاس ان کا بسیرا ہے۔ معلوم نہیں یہ کیا کام کرتے ہیں لیکن کوڑے کباڑ میں سے خدا جانے کیا کیا چنتے رہتے

ہیں۔ ان کا گزارا کیسے ہو جاتا ہے؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔"

ہم نے تو ان صاحب سے ملنے سے معذرت کرلی

ٹیلر نے کہا "میں نے جب اس کی حالت زار دیکھی اور معلوم ہوا کہ اس عالم میں بھی وہ کلاسیکی موسیقی سن رہا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔"

دیکھا آپ نے امریکا میں بھی لوگ کس کس طرح زندہ ہیں؟

☆ ☆ ☆

ہم لوگوں نے ہوٹل تبدیل کرنے کا خیال بالکل ترک کردیا۔

"یار کیا کریں گے ہوٹل چھوڑ کر۔ کہاں جاکر ٹکریں ماریں گے" خان صاحب بولے۔

بٹ صاحب نے کہا "کیوں۔ ٹکریں مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ کسی اور ہوٹل میں جا کر رہ لیں گے۔"

"ہوٹل بھی مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ یہ بھی آسانی سے تو نہیں ملا۔ اگر ابرار دہلوی نہ ہوتے تو آٹے دال کا بھاؤ پتا لگ جاتا۔ ویسے بھی اب ہمیں نیویارک میں رہنا ہی کہاں ہے۔ ایک دو روز کے لیے ہوٹل بدلنا بلاوجہ کی پریشانی کے سوا اور کیا ہے؟"

بٹ صاحب ہماری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ہم بھی صورت حال کو سمجھ رہے تھے۔ دراصل خان صاحب کا دل مس گارنر کو دیکھ کر پسیج گیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اب نیویارک میں جتنے بھی دن گزارنے ہیں ان ہی کی زلفوں کی چھاؤں تلے گزار دیں حالانکہ زلفیں ان کی اتنی زیادہ نہیں تھیں۔ بوائے کٹ تو نہیں کہنا چاہیے لیکن ان کے بال خاصے چھوٹے ترشے ہوئے تھے۔

"مگر اس کے چہرے پر کتنے بھلے لگتے ہیں جیسے چاند کے گرد سنہری ہالہ" خان صاحب نے رائے ظاہر کی۔

"یہ بات تو ہے" ہم نے کہا "گلابی چہرے کے آس پاس سنہری بالوں کی جھالر واقعی بہت حسین لگتی ہے۔"

بٹ صاحب ہمیں گھورنے لگے "لگتا ہے کہ خون خرابہ ہو گا ایک لڑکی کی خاطر۔ اور وہ بھی ایک غیر لڑکی۔ پرائے ملک کی، پرائے مذہب کی، پرائے ماحول کی۔ یار تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے آخر۔ تمہارا اخلاق کہاں چلا گیا۔ تمہارا احساس کیوں مر گیا؟" بٹ صاحب واقعی

جذباتی ہو گئے تھے۔ ”آپ دونوں شادی شدہ ہیں۔ صاحب اولاد ہیں۔ اس قسم کی حرکـ
کرتے ہیں شرم آنی چاہیے۔“

”یار‘ کیوں مکالمے بولے جا رہے ہو۔ کس قسم کی حرکتیں کی ہیں ہم نے؟ کس لڑ
لے کر بھاگ گئے؟ کس کے ساتھ منہ کالا کر لیا۔ آخر ہوا کیا؟ بلاوجہ پارسا اور ناصح نہ بنا
تم۔ خود اپنی طرف دیکھو۔ گریبان میں جھانکو۔ تم کون سے نیک اور پرہیز گار ہو“
صاحب سچ مچ ناراض ہو گئے۔

”خان۔ تم گھر واپس چلو۔ میں تمہاری خبر لوں گا۔ بھابی کو سب کچھ بتا دوں گا۔“

”کیا بتا دو گے؟“

”یہی کہ تم کیا گل کھلاتے رہے ہو۔“

”مجھے بھی اللہ نے زبان دی ہے۔ تمہارے سارے کرتوت سناؤں گا تمہارے گھر وا
کو۔“

وہاں تو واقعی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے بمشکل درمیان میں مداخلت کی اور
بچا کر صلح صفائی کرائی۔

”بھائی۔ سوت نہ کپاس۔ جلاہے سے لٹھم لٹھا۔ تم دونوں کی تو وہی مثل ہے۔ شیخ
کی طرح خود ہی منصوبے بناتے ہو اور لڑتے رہتے ہو۔ آخر ہوا کیا ہے۔ بھئی ایک ا
شکل و صورت کی لڑکی کو دیکھ کر اگر دل خوش ہو جاتا ہے تو اس میں کیا برائی ہے؟“

”تم قسم کھا کر بتاؤ۔ کیا تمہیں وہ اچھی نہیں لگتی؟ تمہارا دل نہیں چاہتا اسے دیکھنے
دیکھو جھوٹ نہ بولنا۔ تمہیں درگاہ حضرت بل کی قسم“ خان صاحب نے فوراً بٹ صاحب
دکھتی رگ پکڑ لی۔

بٹ صاحب بالکل ہی ٹھنڈے پڑ گئے‘ بولے ”بات تو سچ ہے۔ وہ مجھے بھی اچھی
ہے مگر میں نے تو کوئی حرکت نہیں کی۔“

”تو پھر میں نے کیا حرکت کر دی ہے۔ بس ایسے ہی سوچا کہ اتنے دن تک ایک اچھا
دیکھنے کو مل جائے گا اور نیا ہوٹل تلاش کرنے سے بھی جان چھوٹے گی۔“

دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تو ہم نے کہا ”مس گارنر کو آپ لوگوں نے کیا سمجھ
ہے۔ وہ کہنے کو مس ہیں مگر کئی بار مسز بن چکی ہوں گی۔“

”تو پھر کیا ہوا۔ ہمیں کون سا ان سے رشتہ کرنا ہے۔“

ہم ہوٹل میں داخل ہوئے تو مس گارنر پوری شان کے ساتھ استقبالیہ پر جلوہ گر تھیں
اور اب میک اپ کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ ہم ان کے نزدیک پہنچے تو وہ بھوؤں پر پنسل لگا
رہی تھیں۔ ہمیں دیکھا تو چابیاں ہمارے حوالے کر دیں اور مسکرا کر بولیں ”اپنے کمروں
میں جا کر اطمینان کر لیجیے کہ اب کون سی چیز گم ہوئی ہے۔“

”کیوں شرمندہ کرتی ہیں“ ہم نے کہا۔

”دیکھیے۔ یہ ہوٹل اس وقت یتیمی کی حالت میں ہے۔ اپنے سامان کی حفاظت کرنا
آپ کا فرض ہے۔ ایسا نہ ہو کہ انتظامیہ آپ کا نقصان پورا ہی نہ کر سکے۔ احتیاط لازم ہے“
وہ مسکرائیں۔ انہوں نے بھنوئیں بنانے کے بعد اب اپنی لپ اسٹک چیک کرنی شروع کر
دی تھی۔ غیر مطمئن ہو کر انہوں نے دستی آئینہ اٹھا کر ہونٹوں کو مختلف گولائیوں کی شکل بنا
کر دیکھا اور پھر بیگ میں سے لپ اسٹک نکال کر ہونٹوں پر پھیرنے لگیں۔ اس کے بعد
انہوں نے اپنے دونوں ہونٹوں کو ملا کر دیکھا اور پھر منہ کھول کر لپ اسٹک کی رنگت کا جائزہ
لیا۔ ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔ لپ اسٹک وغیرہ
بیگ میں رکھی اور ہم لوگوں کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ ہم تینوں انہیں یوں دیکھ رہے
تھے جیسے کوئی تماشا ہو رہا ہو۔ دیکھا جائے تو یہ غیر اخلاقی اور معیوب حرکت تھی مگر ہوٹل
کے استقبالیہ پر بیٹھ کر اگر کوئی خوبصورت عورت اور اس طرح کی حرکتیں کرنے لگے تو پھر
ہوٹل میں مقیم لوگ ہم جیسی حرکت کیوں نہ کریں۔

خان صاحب نے ہمت کر کے پوچھا ”مس گارنر۔ کیا آج آپ کو ڈیٹ وغیرہ پر جانا
ہے؟“

مسکرائیں اور کہا ”آپ کو کس نے بتایا؟“

”آپ کی تیاریوں نے۔“

وہ دل کھول کر مسکرانے لگیں ”کیسی لگ رہی ہوں؟“ انہوں نے اپنے چہرے کو
دائیں بائیں اور اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے ہم لوگوں کو دعوت تنقید دی۔

”میک اپ بہت اچھا ہے‘ کیا آپ اپنے منگیتر کے ساتھ جا رہی ہیں؟“

”منگیتر ابھی کہاں۔ ابھی تو دو تین ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ ویسے میں شادی اور منگنی کی

قائل نہیں ہوں۔"

"وہ تو ظاہر ہے" ہم نے کہا "تب ہی تو ابھی تک مس ہیں۔"

وہ ہنسنے لگیں "اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ میں دو بار شادی کر چکی ہوں پہلے!
اب سوچتی ہوں کہ کیا حاصل ہے شادی سے؟"

"سچ کہا ہے آپ نے۔ اگر اس کا انجام طلاق ہی ہونا ہے تو پھر واقعی شادی کرنے
فائدہ کیا ہے؟"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ اور پھر نقصان یہ ہے کہ شادی کے بعد انکم ٹیکس بھی زیا
دینا پڑتا ہے۔"

"ٹھیک تو ہے" ہم نے کہا "دفع کیجیے شادی وادی کو۔"

"آپ سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہیں" وہ بولیں۔

"جی! مگر ہم شادی شدہ ہیں۔"

"کتنے عرصے سے؟" انہوں نے یوں ہمدردی سے پوچھا جیسے پوچھ رہی ہوں کہ
عارضہ کب سے لاحق ہے۔

"کئی سال ہو گئے۔"

"تو پھر کیا ارادہ ہے؟"

"مجبوری ہے۔ دراصل ہمارے ملک میں طلاق کا زیادہ رواج نہیں ہے۔ بلکہ اسے
سمجھا جاتا ہے۔"

وہ حیران رہ گئیں "کون سا ملک ہے آپ کا؟"

"پاکستان۔"

"پاکستان! انہوں نے اپنے نازک ذہن پر زور ڈالا۔ یہ تو نقشے میں دیکھنا پڑے گا۔
عجیب نام کا ملک ہے آپ کا۔ پھر لوگ وہاں کس طرح زندہ رہتے ہیں؟"

ہم نے کہا "شادی شدہ ہی مرجاتے ہیں۔"

خان صاحب اور بٹ صاحب بڑی مشکل سے ہنسی روک رہے تھے۔

انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور ایک لحاظ سے اظہار ہمدردی کے طور پر کہا "میں
حیران ہوں۔ بہرحال، اپنا اپنا دستور ہے۔ میں تو ایسے ملک میں کبھی نہ رہنا پسند کروں۔"

"ہم بھی ملک بدلنے کا سوچ رہے ہیں۔"

"اور ان دونوں حضرات کا کیا معاملہ ہے؟" انہوں نے پوچھا۔ اس اچانک توجہ پر خان
صاحب اور بٹ صاحب دونوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔

ہم نے کہا "وہی ہمارے والا معاملہ ہے۔ یہ دونوں بھی شادی شدہ ہیں کافی عرصے
سے۔"

اتنی دیر میں تین چار نئے مسافر سامان سے لدے پھندے داخل ہوئے۔ مس گارنر
بڑے دلکش انداز میں مسکرائیں اور ہمیں یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ "امید بہار رکھ" انگریزی
میں ان کا فقرہ تھا۔ "لیٹ اس ہوپ فار دی بیٹر" اس کا ترجمہ خان صاحب نے یہ کیا اور
بالکل درست کیا کہ "امید پر دنیا قائم ہے"

شکر ہے کہ کوئی چیز گم نہیں ہوئی تھی۔ شاید چوروں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ہمیں معلوم
ہو گیا ہے کہ اس ہوٹل میں چوری ہوتی ہے اور یہ صورت بقول مس گارنر کے ہمارے حق
میں جاتی تھی۔

دعوت کے لیے تیاری بھی کرنی تھی اور خان صاحب کو دوبارہ شیو بھی کرنی تھی۔ اس
کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ اگر بندہ کلین شیو ہو تو بالکل ہی کلین شیو ہونا چاہیے۔ یہ
نہیں کہ داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔ ان کا بیان تھا کہ ان کی داڑھی بہت تیزی سے بڑھتی ہے
اس لیے وہ کسی تقریب میں جانے کے لیے شام کو بھی شیو کر لیتے ہیں۔

"مگر یہ تو تقریب نہیں ہے۔ بس دوستوں کا جمگھٹا ہو گا" بٹ صاحب نے اعتراض
کیا۔

"یار سمجھا کرو۔ آخر وہاں دوسرے لوگ بھی ہوں گے۔ امریکن ہمیں گندا سندا دیکھ
کر کیا سوچیں گے"

ہم نے کہا "بٹ صاحب، آپ بھی ذرا تیار اور اسمارٹ ہو کر چلنا۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ اگر ہم لوگوں کے بارے میں امریکیوں کی رائے خراب ہو گئی تو کشمیر
کے مسئلے پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ یہاں کے لوگوں کی رائے حکومت
پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔"

وہ مسکرانے لگے "ہر وقت مذاق نہ کیا کریں" مگر جب کچھ دیر بعد ہمارے پاس آئے نہایت صاف چمک رہے تھے۔ شیو کرنے کے بعد انہوں نے خاصی مقدار میں کریم لگائی تھی اور ایک خوب صورت سوٹ میں ملبوس تھے' بولے "یار امپریشن تو اچھا ہی پڑنا چاہیے دوسروں پر۔"

"مگر ہم وہاں جائیں گے کیسے؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"غفور صاحب ہمیں لینے آجائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ہم خود تو نہیں جاسکتے۔ ہمیں پتا بھی معلوم نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ دعوت ملتوی ہو جائے گی۔"

"کیوں؟"

"غفور کی بیوی کی وجہ سے۔ سنا نہیں کہ وہ کس قدر خوفناک عورت ہے اور غفور کا اس کے سامنے دم نکلتا ہے۔ بلاوجہ ہماری وجہ سے مشکل میں پڑ گیا بے چارہ۔"

خان صاحب بولے "عورت خوفناک نہیں ہے' مرد ہی ڈرپوک ہے۔"

"یار شریف آدمی ہے۔ بیوی سے ہاتھاپائی کرتے ہوئے اچھا لگے گا کیا۔ اور پھر وہ جوڈو کراٹے کی ماہر بھی ہے۔ کیا کر سکتا ہے۔ بے چارہ" بٹ صاحب نے خیال ظاہر کیا۔

خان صاحب بولے "طلاق تو دے سکتا ہے نا۔ اس ملک میں تو چھینک مارنے پر بھی طلاق ہو جاتی ہے۔ کیا وہ بیوی کے مارپیٹ کرنے پر طلاق نہیں حاصل کر سکتا۔"

یہ ایک قانونی اور شرعی سوال تھا اس لیے ہم چپ ہو رہے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ فون اٹھایا۔ یہاں ہمیں کون فون کرنے والا تھا۔ یہ خیال گزرا کہ ہو سکتا ہے مس گارنر نے یاد کیا ہو۔

دوسری طرف ابرار دہلوی چہک رہے تھے۔

قبلہ آداب بجالاتا ہوں۔"

"بجائیے۔"

"شکریہ۔ اجازت ہو تو حاضر ہو سکتا ہوں۔"

"آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"جی میں استقبالیہ سے عرض گزار ہوں قبلہ۔"

"قبلہ اتنے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اجازت کے بغیر بھی تشریف لا سکتے ہیں۔"

"دراصل میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔"

"بھائی قیامت بھی ساتھ ہو تو لے آئیے' ہماری طرف سے اجازت ہے۔"

انہوں نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔

"بھائی کسے قیامت ساتھ لانے کو کہہ رہے ہو؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"قبلہ کمرے میں آنا چاہتے ہیں۔ ساتھ میں کوئی اور بھی ہے۔"

خان صاحب گھبرا گئے "اللہ خیر کرے۔ بس کوئی کالا نہ ہو۔"

دروازے پر دستک ہوئی اور "لیں کم ان" کہنے پر ابرار دہلوی صاحب کا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ بڑے خوش لباس نظر آرہے تھے۔ خوشبو بھی لگا رکھی تھی۔

"آئیے۔ خوشبو تو بہت اچھی لگا رکھی ہے۔ ساتھ میں کون ہے؟"

مگر فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی دروازے میں ایک دم روشنی ہو گئی۔ دیکھا تو ایک ماہتابی چہرہ جلوہ گر تھا۔ ذرا غور سے دیکھا تو پہچان بھی گئے۔ ابرار دہلوی صاحب اپنی محبوبہ کو بھی ہمراہ لے کر آئے تھے۔ یعنی شادی شدہ محبوبہ زنجان کو۔

"اوہو۔ فنجان بھی ساتھ ہیں؟" بٹ صاحب بوکھلا کر بولے۔

خان صاحب نے "ہائی" کہہ کر خیر مقدم کیا مگر پھر مشکوک نظروں سے دہلوی صاحب کو گھورنے لگے۔ اردو میں گویا ہوئے "قبلہ۔ یہ کیا حرکت ہے۔ پرائی بیوی کو اپنے ساتھ لیے پھر رہے ہیں اور ہمارے پاس بھی لے آئے ہیں؟ کہیں ہم پردیسیوں کو کسی مصیبت میں نہ پھنسا دینا۔"

دہلوی صاحب قہقہہ مار کر ہنسے' بولے "قبلہ۔ آج میری اور زنجان کی ڈیٹ ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اور یہ اپنے امیگو کو بتا کر آئی ہے۔" اتنا کہنے کے بعد انہوں نے ٹوٹی پھوٹی ہسپانوی زبان میں زنجان کو مخاطب کیا جس کے جواب میں وہ مسکرا کر "امیگو۔ امیگو" کرتی رہی۔ پھر انگریزی میں ہم سے مخاطب ہو کر بولی "آج کی ڈیٹ ہم دونوں اپنے مہمانوں کے ساتھ گزاریں گے۔ امیگو نے بتا دیا تھا کہ آج وہ اپنے ہم وطنوں کی دعوت میں شریک ہوں گے۔"

زنجان بہت خوش و خرم نظر آرہی تھی۔ وہ سرخ رنگ کا پھولدار لباس پہنے ہو
تھی جو خاصا معقول تھا۔ یعنی روایتی اسکرٹ اور بلاؤز جو کہ اب بہت تبدیل ہو چکا ہے
سکڑ کر اتنا مختصر رہ گیا ہے کہ اسے غسل کا لباس قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا گورا رنگ
بال اور سیاہ آنکھیں بہت بھلے لگ رہے تھے۔ بٹ صاحب نے اسے "بھابی' بھابی'
شروع کر دیا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے تو قبلہ دہلوی نے
وضاحت کی کہ دراصل ہماری قومی زبان میں قابل احترام عورتوں کو بھابی کہا جاتا ہے۔

وہ شرارت سے کہنے لگی "ضرور کوئی اور بات ہے۔ آپ لوگ مجھے سچ سچ بتائیے۔

ہم نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ اپنے بھائی کی بیوی کو "بھابی" کہا جاتا ہے۔ آپ ابرا
ساتھ آئی ہیں اس لیے یہ آپ کو "بھابی" کہہ رہے ہیں۔"

زنجان مسکرانے لگی' بولی "مگر یہ ذرا قبل از وقت ہے۔ اس کے لیے ابھی آپ
انتظار کرنا پڑے گا۔"

خان صاحب کہنے لگے "قبلہ۔ ہونے والی بھابی بہت اچھی ہے مگر ذرا سی بے
ہے۔"

قبلہ بولے "اس کی فکر نہ کیجیے۔ اس ملک میں رہنے کے لیے تھوڑا سا بے شر
ضروری ہے۔

بٹ صاحب زنجان کو مستقل فنجان کہہ کر مخاطب کر رہے تھے ہم نے انہیں
بولے "حرج کیا ہے؟"

ہم نے کہا "حرج یہ ہے کہ دونوں چیزوں میں فرق ہے۔ زنجان اس کا نام ہے
فنجان' شیشے کے پیالوں کو کہتے ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد "فنجانوں" میں 'یاسمین ٹی'
فرمایا کرتے تھے۔"

بٹ صاحب کہنے لگے "اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے ایک تاریخی چیز سے ا
رشتہ ملا دیا ہے۔ اس کی خیر ہے۔ فنجان میری زبان پر چڑھ گیا ہے۔ جب لڑکی کو اع
نہیں ہے تو پھر آپ کو کیا تکلیف ہے۔"

زنجان کی کافی سے تواضع کی گئی۔ ابرار صاحب نے مطلع فرمایا کہ دعوت کا وقت
دس بجے کا ہے۔ اس سے پہلے میں آپ لوگوں کو لوئر ایسٹ سائڈ کا علاقہ دکھاؤں گا اور

ٹریڈ سینٹر کی سیر کرا دوں گا جو کہ دنیا بھر میں ایک انوکھی عمارت سمجھی جاتی ہے۔ ہم لوگ ان
کی قیادت میں نکل کھڑے ہوئے۔ وہ اپنی ٹیکسی میں آئے تھے۔ زنجان کو احتراماً بلکہ رسماً
اگلی والی سیٹ پر بٹھایا گیا اور ہم تینوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

بٹ صاحب نے پوچھا "ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں کیا بکتا ہے اور لوئر ایسٹ سائیڈ میں کون رہتا
ہے؟"

دہلوی صاحب ہنسنے لگے "قبلہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر دراصل دو بہت اونچی عمارتوں کا نام ہے
جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور لوئر ایسٹ سائڈ ایک جگہ کا نام ہے۔"

نیویارک کا حسن رات کے وقت پورے عروج پر تھا۔ روشنیاں آنکھوں میں چکاچوند
پیدا کر رہی تھیں اور ٹریفک کے ہجوم نے سڑکوں کو کچھ اور روشن اور رنگین بنا دیا تھا۔ اس
میں کوئی شک نہیں کہ نیویارک رات کے وقت ایک خوابناک جزیرے کا منظر پیش کرتا
ہے۔ اور پھر اتفاق یہ تھا کہ ہم جن علاقوں سے گزرے وہ بہت اچھے' شاندار اور روشن
تھے۔ دہلوی صاحب کی مشکل یہ تھی کہ وہ ہم لوگوں کو ان جگہوں کے بارے میں اردو میں
بتا رہے تھے جہاں سے ہم گزر رہے تھے اور ساتھ ہی انگریزی اور شکستہ ہسپانوی میں اپنی
محبوبہ کے ساتھ بھی مصروف کلام تھے۔

"یار خوشامد کی بھی ایک حد ہوتی ہے" بٹ صاحب نے کہا "اس کو اردو سکھانے کے
بدلے اس کی زبان سیکھنے میں لگ گئے ہو۔ تم تو زن مرید ہو جاؤ گے' میرا مطلب ہے کہ
شادی کے بعد۔"

☆ ☆ ☆

کچھ دیر بعد ہم لوئر ایسٹ سائڈ کے علاقے میں پہنچ گئے۔ "یہ بھی نیویارک کا ایک
مخصوص علاقہ ہے۔"

"وہ کیوں کر؟"

"اس علاقے میں یہودیوں کی بستی ہے۔ چائنا ٹاؤن بھی اسی جگہ ہے اور اٹلی کے
لوگوں کی بھی بہت بڑی آبادی ہے۔ جسے چھوٹا اٹلی کہتے ہیں۔"

لوئر ایسٹ سائڈ دراصل ایک نہایت وسیع و عریض علاقہ ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ

اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تین مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والوں کی بستیاں یہاں آباد ہیں جو ہر ایک بجائے خود اپنی جگہ ایک شہر ہے۔ "چائنا ٹاؤن" تو ہم دیکھ چکے تھے۔ "جیوئش کوارٹر" اور "لٹل اٹلی" اس رات دہلوی صاحب نے ہمیں دکھا دیے۔ یہودیوں کی آبادی ظاہر ہے کہ دولت مندوں کی بستی ہے مگر یہودیوں کی مثالی کنجوسی کا بھی مظہر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کروڑ پتی اور ارب پتی ہیں مگر آبادی میں ایسی شان و شوکت والی کوئی بات دیکھنے میں نہیں آتی۔ "لٹل اٹلی" اٹلی والوں کی بستی ہے اور بظاہر عمارتوں وغیرہ کے اعتبار سے تو یہ نیویارک کے دوسرے علاقوں کی طرح ہے۔ لیکن رسم و رواج اور مزاج کے لحاظ سے خالص اطالوی ہے۔ اٹلی والے اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے بھی ساری دنیا میں بدنام ہیں۔ چینی بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ایک وقت آئے گا جب امریکا میں "مافیا" پر چینیوں کا تسلط ہو جائے گا اور وہ اٹلی والوں کو بے دخل کر دیں گے۔

ہم نے دہلوی صاحب سے کہا کہ کہیں ٹیکسی روک کر ہمیں چلنے پھرنے کا موقع بھ دیں۔ دراصل حسن اطالیہ کو دیکھنے کے بٹ صاحب بہت شائق تھے۔ وہ بار بار روم، وینس اور فلورنس کا تذکرہ کر رہے تھے۔ دہلوی صاحب نے صاف انکار کر دیا۔

کہنے لگے "قبلہ یہاں تو جان و مال کا خطرہ رہتا ہے۔ سیاحوں کو خاص طور پر آگاہ کیا جا ہے کہ وہ رات گئے لوئر ایسٹ سائڈ کے علاقوں میں نہ جائیں۔"

"مگر یہ ہے کیا بلا؟ اس جگہ کو یہ نام کیوں دیا گیا ہے؟"

"قبلہ۔ یہ آپ نے بہت عقلمندی کا سوال کیا ہے۔ بہت سے نیویارک کے ر والے بھی اس کے پس منظر سے واقف نہیں ہیں مگر میں نے بھی کسی سے یہ سوال کیا ت اس لیے میں اس کا جواب جانتا ہوں۔"

پھر انھوں نے بتایا کہ پچھلی صدی کے آخر میں جب غیر ملکیوں نے نیویارک آنا شرو کیا تو وہ سب سے پہلے بندرگاہ سے اتر کر یہیں آباد ہو جاتے تھے کیونکہ یہ مختلف ملکوں آتے تھے اس لیے انگریزی نہیں جانتے تھے۔ اس جگہ قیام کے دوران میں وہ انگریزی تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرتے تھے اور پھر آگے چلے جاتے تھے۔ مگر چینی اور اطالو لوگوں نے یہیں اپنی بستیاں آباد کر لیں جو رفتہ رفتہ شہروں کی طرح ہو گئیں۔ یہودیوں بھی اس علاقے کی ایک جگہ کو اپنی رہائش کے لیے پسند کیا اور وہیں آباد ہو گئے۔

دن کے وقت ان علاقوں میں سیاحوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے مگر رات کے وقت انہیں ادھر جانے سے منع کیا جاتا ہے۔ پھر بھی جو تقدیر کے مارے پہنچ جاتے ہیں وہ لٹ لٹا کر واپس جاتے ہیں یا پھر اپنی جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

بٹ صاحب بولے "قبلہ پھر تو ٹیکسی کی رفتار ذرا تیز کر دیجیے۔"

دہلوی صاحب ہنسنے لگے "ارے نہیں۔ اب ایسی بھی بات نہیں ہے، یہ شہری آبادی ہے۔ کوئی چلتی ہوئی کار میں تو ڈاکا نہیں ڈال سکتا۔"

"کیوں نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ لوگ کاریں روک کر بھی لوٹ لیتے ہیں یا ٹریفک کے اشاروں پر کھڑی ہوئی کاروں میں سوار ہو کر کار والوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔"

دہلوی صاحب ہنسنے لگے، مگر پھر سنجیدہ ہو گئے۔ زنجان نے ان سے ہسپانوی زبان میں کچھ کہا۔ غالباً پوچھا ہو گا کہ اے بندہ خدا' ہنسے کیوں اور روئے کس لیے؟ جواب میں انہوں نے پہلے تو ہسپانوی زبان میں کچھ کہا مگر بہت جلد فیل ہو گئے تو پھر انگریزی میں شروع ہو گئے اور اسے بتایا کہ کیا گفتگو ہو رہی ہے۔ وہ بھی ہنسنے لگی لیکن پھر سنجیدہ ہو گئی۔ ہمارے جی میں تو آئی کہ اس سے پوچھیں کہ اے خاتون تو ہنسی کس لیے اور سنجیدہ کیوں ہو گئی؟ مگر پھر مصلحتاً خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

ایک جگمگاتی ہوئی جگہ پہنچ کر قبلہ دہلوی صاحب نے ہم سے کہا "وہ دیکھیے، سامنے وہ اونچی اونچی عمارتیں دیکھ رہے ہیں نا؟"

ہم نے سامنے دیکھا۔ وہاں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی دو بہت بڑی عمارتیں نظر آئیں۔ اس سائز کی کوئی ایک عمارت بھی ہمارے لاہور یا کراچی میں موجود نہیں ہے۔ بعد میں بتایا گیا کہ اس کی ایک سو دس منزلیں ہیں۔

ہم نے احتجاجاً ان سے کہا "بھائی صاحب۔ یہ آپ نے ہم سے کیا سوال کیا ہے۔ اتنی بڑی عمارت بھلا ہمیں نظر کیوں نہ آئے گی۔ اسے تو چھوٹا موٹا اندھا بھی دیکھ سکتا ہے۔"

وہ کچھ شرمندہ سے ہو گئے، کہنے لگے "میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں نے محاورتاً کہا تھا۔"

خان صاحب بولے "بھائی۔ ایک بات سن لو میری۔ ہمارے ساتھ زیادہ محاورے نہ بولنا۔ ہم زیادہ پڑھے لکھے لوگ نہیں ہیں۔ اور آپ ٹھہرے دہلوی۔ حالانکہ کبھی دہلی دیکھا

تک نہیں۔"

"وہ بولے "واقعی عجیب بات ہے۔"

"کچھ اتنی عجیب بات بھی نہیں ہے۔ آپ جیسے اور بھی لوگ پائے جاتے ہیں دنیا میں مثلاً ان صاحب کو دیکھیے۔ یہ بٹ کشمیری ہیں اور کشمیر کے ایک ایک چپے کی خاطر جا دے سکتے ہیں مگر انہوں نے کشمیر کو صرف تصویروں میں ہی دیکھا ہے۔"

اتنی دیر میں دہلوی صاحب کی ٹیکسی ایک پارکنگ پر جا کر رک گئی۔ ہم سب باہر نک اور ہم نے دوبارہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی طرف دیکھا تو بجائے ایک کے ایک ہی جیسی دو دیو ہیکل عمارتیں نظر آنے لگیں۔ پریشان ہو گئے کہ ایک ایک کے دو دو کیوں نظر آ رہے ہیں آنکھیں مل کے دیکھا۔ خان صاحب اور بٹ صاحب کا بھی یہی حال تھا۔

دہلوی صاحب نے کہا "آپ بلاوجہ پریشان نہ ہوں۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی دو عمارتیں ہی اس وجہ سے بہت سے لوگ کنفیوز ہو جاتے ہیں۔"

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا نام سن کر یوں لگتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کوئی بڑی سی عمارت ہوگی لیکن حقیقت میں یہ دو عمارتیں ہیں اور اس قدر اونچی اور وسیع کہ خدا کی پناہ۔ ان کی اونچائی ایک ہزار تین سو فٹ ہے اور اس پر کھڑکیوں کی تعداد تینتالیس ہزار چھ سو ہے۔ یہ دو بلند ٹاور نما عمارتیں ہیں۔ ہر عمارت میں تیس مخصوص اور بہتر عام لفٹیں لگی ہوئی ہیں جو شب و روز چلتی رہتی ہیں اور وہ بھی ہوا کی رفتار سے۔ یہ تمام سینٹر سولہ ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ لاکھوں افراد ہر روز یہاں آتے ہیں۔ اس میں دفاتر بھی ہیں۔ بینک بھی ہیں شاپنگ سینٹر بھی ہیں۔ ریستوران بھی ہیں۔ کیا بتائیں ایک الگ ہی دنیا ہے۔

دہلوی صاحب یہ معلومات فراہم کرنے کے بعد بولے "ہمیں یہ معلومات رکھنی پڑتی ہیں تاکہ مسافروں کو بتا سکیں۔ اس طرح وہ زیادہ ٹپ دے دیتے ہیں۔ اب آپ کو میں اس عمارت کی چھت پر لے چلتا ہوں۔"

ہم نے سر اٹھا کر دیکھا تو عمارت کا دوسرا کنارہ تک نظر نہ آیا۔ لگتا تھا جیسے یہ دونوں عمارتیں آسمان کے اندر خلا میں پہنچی ہوئی ہیں۔

خان صاحب بولے "اسے دیکھنے کے لیے تو زمین پر لیٹنا پڑے گا۔"

ہم نے گھبرا کے کہا "خدا کے لیے ایسا نہ کر بیٹھنا۔ لوگ کیا سمجھیں گے۔"

دہلوی صاحب کو زنجان مسلسل ٹھوکے دے رہی تھی کہ آخر یہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ دہلوی صاحب ہماری گفتگو کا خلاصہ اسے بتا دیتے تھے جس پر وہ مسکرانے لگتی تھی۔ زنجان کا خیال تھا کہ بجائے نیچے سے اوپر دیکھنے کے، بہتر ہے کہ ہم لوگ اوپر سے نیچے کا نظارہ کریں چنانچہ قبلہ ہمیں بہتر لفٹوں میں سے ایک لفٹ کے پاس لے گئے جس میں سے چیونٹیوں کی طرح انسانوں کا سیلاب برآمد ہوتا تھا اور پھر ایک ہجوم اس میں غائب ہو جاتا تھا۔ لفٹ میں سوار ہونے سے پہلے بٹ صاحب ہمیں ایک طرف لے گئے اور خان صاحب کو بھی اشارہ کر کے بلا لیا پھر بولے "اچھی طرح سوچ لیجیے۔ کہیں قبلہ کی باتوں میں آ کر مارے نہ جائیں۔"

"کیوں؟"

خان صاحب نے کہا "بھائی یہ عمارت تو آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے جسمانی طور پر اتنے نزدیک تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ ان کے مابین بھی زیادہ فاصلہ تھا۔ مگر اس عمارت کی چھت تو فرشتوں کے آنگن تک پہنچی ہوئی ہوگی۔ بٹ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ اتنی اونچی عمارت پر چڑھنے سے پہلے سوچ لیجیے، اچھی طرح۔"

ہم نے کہا "کیا سوچیں۔ بھائی یہاں تو ہزاروں لاکھوں آدمی اوپر جا رہے ہیں۔ ہم ان سے نرالے تو نہیں ہیں۔"

بولے "وہ لوکل ہیں اور مقامی حالات کے مطابق بنے ہوئے ہیں۔"

ہم نے بٹ صاحب کو سمجھایا "دیکھو بٹ جی۔ یہ کشمیریوں کی عزت کا سوال ہے۔ وہ ہسپانیہ کی رہنے والی نازک سی لڑکی تک خوفزدہ نہیں ہے تو پھر تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مانا کہ تم بہادر ڈرپوک ہو مگر پھر بھی خدا کا خوف کرو۔"

کشمیر کا سوال درمیان میں آجانے کے بعد تو بٹ صاحب اللہ میاں کے پاس جانے کے لیے بھی تیار ہو سکتے تھے لہٰذا فوراً کمربستہ ہو گئے۔

لفٹ کیا تھی ایک اچھا خاصا ہال کمرا تھا جس میں بے شمار لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ بٹ جی نے کہا "اتنی اونچائی پر جانا ہے، کم از کم بیٹھنے کا بندوبست تو ہونا چاہیے تھا۔"

خان صاحب نے کہا "یار چپ کرو۔ کھڑے ہونے میں زیادہ فائدہ ہے۔ دیکھتے نہیں

کتنے خوب صورت، مہکتے ہوئے لوگ ہمارے آس پاس کھڑے ہیں۔"

بٹ صاحب نے لقمہ دیا "اور آپ کو دھکے مارنے اور دھکے کھانے کا موقع فراہم کر رہے ہیں۔"

لفٹیں ہم نے پہلے بھی دیکھی تھیں مگر یہ نرالی ٹائپ کی چیز تھی۔ بھئی زیادہ سے زیادہ ایک طرف منزلوں کے بٹن لگے ہوتے ہیں، انہیں دبا دیں۔ مگر یہاں تو کوئی کمپیوٹر قسم کی چیز تھی اور جب ایک سو دس منزلیں ہوں تو کتنے بٹن ہوں گے، یہ آپ خود اندازہ لگالیجیے۔

قبلہ بولے "سب سے پہلے ہم ایک سو ساتویں منزل پر جائیں گے" اس کے ساتھ ہی انہوں نے زنجان کو ترجمہ بھی سنا دیا۔

"ایک سو ساتویں منزل!" بٹ صاحب ڈر گئے "کچھ منزلیں کم نہیں ہو سکتیں؟"

"دیکھو" ہم نے کہا "جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔ ایک سو کے بعد دو سو بھی منزلیں ہو جائیں تو کیا پروا ہے۔ اور یہ تو بجلی کی لفٹ ہے۔ آپ کو پیدل تو نہیں لے جا رہے۔"

بولے "ایک سو سات منزل کا سن کر میرا دل بیٹھ رہا ہے۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہم ایک سو ساتویں منزل پر پہنچ گئے۔ برق رفتاری کی بھی کوئی حد تک ہے مگر یہاں وہ بھی نہ تھی۔

لفٹ سے باہر نکلتے ہوئے خان صاحب اور بٹ صاحب حسب معمول خواتین سے ٹکرائے۔ جان بوجھ کر نہیں بلکہ جلدی اور گھبراہٹ میں۔ خواتین سے اس لیے کہ زیادہ تعداد ان ہی کی تھی اور بیشتر خواتین سیاح تھیں یا کم از کم امریکی سیاح ضرور تھیں۔

"ہم ایک سو ساتویں منزل پر کیوں آئے ہیں؟" خان صاحب نے پوچھا "ایک سو آٹھ پر کیوں نہیں گئے؟"

"اس لیے کہ یہاں ایک شاندار ریستوران ہیں۔ قبلہ، میں آپ لوگوں کو وہاں چائے کافی پلانا چاہتا ہوں" دہلوی صاحب نے جواب میں عرض کیا۔

ریستوران نہایت شاندار اور صاف ستھرا تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا۔ کہ یہاں ہر روز لاکھوں افراد آتے ہوں گے۔ یہ ریستوران بہت مشہور ہے اور مشہور ہونے کا مستحق بھی ہے۔ ایک تو ایک سو ساتویں منزل پر ہے اس لیے، دوسرے یہ کہ دیکھنے سے تعلق

رکھتا ہے۔ شیشے کی دیواروں سے نیویارک شہر کا جگمگاتا ہوا نظارہ ایک خواب گیں منظر پیش کر رہا تھا۔ یہ ٹھاٹ کسی اور شہر میں بھلا کہاں؟

ریستوران کی سیٹیں انتہائی آرام دہ تھیں۔ ہم تو نیم دراز ہو گئے مگر بٹ صاحب نے کہنی مار کر چونکا دیا، بولے "فنجان کیا سوچتی ہو گی۔ ذرا ڈھنگ سے رہو۔"

مگر زنجان کو سوچنے کی فرصت کہاں تھی۔ وہ اور قبلہ ابرار صاحب ایک دوسرے کے ساتھ باتوں میں مگن تھے۔ اگر وہ سوچ رہی ہو گی تو محض قبلہ کے بارے میں سوچتی ہو گی۔ ہماشا کے بارے میں سوچنے کا اس کے پاس وقت تھا نہ موقع۔

بہت بڑا ریستوران تھا اور لبالب بھرا ہوا تھا۔ ہمیں بھی کچھ انتظار کرنا پڑا۔ اتنی دیر تک ہم لوگوں کا تماشا دیکھتے رہے۔ شاید دنیا بھر کے حسین چہرے اس ریستوران میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ کم از کم ہمیں تو ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے کسی مقابلہ حسن میں شریک ہو گئے ہیں۔ مطلب یہ کہ ججوں اور مبصرین کی حیثیت سے۔ ویسے مقابلے میں شریک ہونے کے لیے ہمارے پاس زنجان بھی تھی۔ وہ بھی کسی سے کم نہ تھی اور اس وقت تو خاص طور پر شعلہ جوالا بنی ہوئی تھی۔

کرسی پر بیٹھتے ہی بٹ صاحب نے ہمارے کان میں کہا "بہت بدنصیب ہے یہ ابرار۔"

"مگر کیوں؟" ہم نے پریشانی سے کہا۔

"اتنی خوب صورت لڑکی سے شادی کرے گا تو خوش کیسے رہ سکتا ہے۔ یا لڑکی اسے دکھی کرے گی یا دنیا والے۔ اسے تو بس دوستی رکھنی چاہیے۔ شادی وادی کا قصہ غلط ہے۔"

ہم نے کہا "مناسب سمجھیں تو یہ مخلصانہ مشورہ اسی کو دے دیں۔ ہم سے تو یہ حاسدانہ مشورہ نہ دیا جائے گا۔"

بولے "آپ بھی گول کریں۔ اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔"

اتنا بڑا اور نہایت مصروف ریستوران تھا اور بہت سی ویٹریس خوشنما ملبوسات میں موجود خدمت میں مصروف تھیں اس لیے ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک آفت کی پرکالہ ہمارے پاس بھی آرڈر لینے آگئیں اور کافی اور جوس کا آرڈر لے کر رخصت ہو گئیں۔ کافی ہمارے لیے اور جوس زنجان کے لیے یہ خاتون ڈائٹ پر تھیں اس لیے بہت ناپ تول کر

کھاتی پیتی تھیں۔ ان کے بیان کے مطابق تو وہ نصف ہوا پھانک کر زندہ تھیں۔ خدا جانے
اصلیت کیا تھی۔ ان کا سراپا اور ترشا ہوا جسم دیکھ کر ان کے بیان پر یقین کرنے کو جی چاہتا
تھا مگر ہو سکتا ہے کہ یہ سب خداداد ہو۔

"آج موسم اچھا ہے" ابرار صاحب نے کہا "کافی پی کر ہم ایک سو دسویں منزل پر
چلیں گے۔"

"اس کا موسم سے کیا تعلق ہے؟" ہم نے پوچھا۔

بولے "قبلہ آپ اس وقت زمین سے ایک ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر ہیں۔ بادل
اور بارش ہوں یا برف پڑ رہی ہو تو اس سے اوپر کی منزل پر جانا ممکن نہیں ہوتا۔"

پوچھا "مگر وہاں جانے کی ضرورت کیا ہے؟"

"اوپر ایک کھلی جگہ ہے جہاں سے نیویارک کا نظارہ بہت عجیب و غریب لگتا ہے۔"

ہم نے کہا "حضور ہمیں تو معاف ہی رکھیں۔ ہمارے لیے ایک سو ساتویں منزل ہی
کافی ہے۔ باقی آپ کسی اور کے لیے چھوڑ دیں۔ یہاں بے وقوفوں کی کمی تو نہیں ہوگی۔"

"کمال ہے قبلہ۔ اس میں بے وقوفی کی کیا بات ہے؟" وہ ناراض ہو گئے۔

ہم نے کہا "قبلہ ایک سو ساتویں منزل سے کیا نظر نہیں آتا جو ہم ایک سو دسویں منزل
پر چلے جائیں۔ یہاں ہم آرام سے بیٹھے ہیں۔ وہاں تو کھلی ہوا ہوگی۔ اگر تیز ہوا چلی تو؟
اڑ ہی نہ جائیں کہیں۔"

وہ کچھ مایوس ہو گئے۔ مگر پھر بھی سینٹر کے بارے میں معلومات فراہم کرنے سے باز
نہیں آئے۔ بتایا کہ اس سینٹر کا افتتاح ۱۹۷۰ء میں ہوا تھا۔ اس کی اوپر کی منزل پر دنیا کی بلند
ترین، سیارے دیکھنے والی دوربین لگی ہوئی ہے۔ دونوں عمارتوں میں ہزاروں دفاتر ہیں اور
ایک بائیس منزلہ ہوٹل ہے۔ شاپنگ سینٹرز ہیں، رہنے کے لیے فلیٹس ہیں اور خدا جانے کیا
کیا ہے۔

یہ سینٹر ڈاؤن ٹاؤن کے علاقے میں ہے۔ اس کی تعمیر کے بعد ڈاؤن ٹاؤن کی قدر و
منزلت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ پہلے یہ جگہ ویران ہوا کرتی تھی اب خوب رونق ہونے لگی۔
آس پاس دوسری عمارتیں، ہوٹل ریستوران اور دکانیں بھی بن گئیں جس کی وجہ سے جنگل
میں منگل ہو گیا۔

ہم نے گھڑی دیکھی تو اس روز اتفاق سے دن بھی منگل کا ہی تھا۔

قبلہ بولے "قبلہ۔ آپ نیویارک آئیں اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر دیکھے بغیر چلے جائیں گے تو
یہ ہمارے لیے تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ لوگ کہیں گے کہ ابرار کا خون سفید ہو گیا ہے،
اپنے پرائے میں تمیز نہیں کرتا۔"

ہم نے کہا "قبلہ۔ آپ بے دھیانی میں ایک بار پھر محاورے بولنے لگے ہیں۔ ہمارے
ساتھی اس شعبے میں ذرا کمزور ہیں۔ کاش ہمارے ساتھ ہمارے دوست افسانہ نگار انتظار
حسین ہوتے تو ہم پوچھتے کہ آٹے دال کا کیا بھاؤ ہے۔ آپ چوکڑی بھول جاتے بغلیں
جھانکنے لگتے اور آپ کو یوں لگتا جیسے پہاڑ تلے اونٹ آگیا ہے۔"

وہ کرسی سے بے ساختہ اٹھ کھڑے ہوئے "واہ واہ۔ سبحان اللہ، ماشاء اللہ۔ کیا محاورے
استعمال کیے ہیں آپ نے فدوی کا دل خوش کر دیا۔ گستاخی نہ سمجھیں تو پوچھ سکتا ہوں کہ
جناب کا وطن مالوف کون سا ہے۔ کہیں شہر آشوب دہلی تو نہیں؟"

ہم نے کہا "ہرگز نہیں۔"

"تو پھر آپ لائق صد ہزار تحسین ہیں۔ کمترین جیسے درجنوں دہلوی آپ کی خاک پا پر
قربان ہیں۔"

وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہونے لگے تھے۔ دراصل محاوروں کی مار بہت بری ہوتی ہے۔
خاص طور پر کسی دلی والے کے لیے۔ اس غریب کو بھلا نیویارک میں اردو محاورے سننے اور
سنانے والا کہاں ملتا ہوگا؟

جب ویٹریس لپک جھپک بل لے کر آئی تو ابرار دہلوی صاحب نے بل کی رقم کے
ساتھ تین ڈالرز بطور ٹپ بھی پیش کر دیے جو اس زمانے میں خاصی معقول ٹپ تھی۔ وہ
ہزاروں مسکراہٹیں لٹاتی ہوئی رخصت ہوئی تو زنجان نے دہلوی صاحب کا بازو تھام کر ان کی
وہ درگت بنائی کہ رہے نام اللہ کا۔ ہماری سمجھ میں تو "ایگو، ایگو" کے سوا کچھ نہیں آرہا
تھا مگر اتنا جان گئے تھے کہ آتش رقابت میں جل کر راکھ ہو گئی ہے اور ان سے جھگڑا کر رہی
ہے کہ مجھے تو کبھی اتنی ٹپ دی نہیں پھر اس کلموہی پر اتنی مہربانی کس لیے؟

خان صاحب بھی تاڑ گئے تھے۔ ہم سے سرگوشی میں بولے "ابلہ۔ رقابت کی آگ
ہے، اور کچھ نہیں ہے۔"

جب زنجان نے گفتگو میں فل اسٹاپ لگایا تو ہم نے ابرار صاحب سے پوچھا "کیا معاملہ ہے؟"

بولے "قبلہ وہی مثل ہے کہ کتے کا کتا بیری۔ یہ خود ویٹریس ہے نا اس لیے دوسری ویٹریس سے خار کھاتی ہے۔"

ہم نے کہا "ابلہ آپ تو دلی والے ہیں۔ محاورہ تو بول گئے مگر تذکیرو تانیث کا تو خیال کر لیا ہوتا"۔

ہنس کر کہنے لگے "سچ کہا آپ نے۔ "کتیا کی کتیا بیری" کہنا چاہیے تھا۔ بہرحال آپ مفہوم سمجھ گئے۔ یہی میرے لیے باعث افتخار ہے۔"

زنجان کا موڈ کچھ دیر خراب رہا مگر جب پارکنگ میٹر کے پاس دہلوی صاحب نے اس سے کچھ ریزگاری طلب کی تو وہ ہنس پڑی اور صلح صفائی ہو گئی۔ شاعر نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ۔

بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے
جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

اس کے بعد تو وہ اس قدر مہربان ہوئی کہ بازو سے الگ ہی نہ ہوئی۔ دہلوی صاحب کے۔

☆☆☆

ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے واپس ہوتے ہوئے ایک اور چیز جو ہمیں بہت اچھی اور نمایاں لگی وہ ایک بہت بڑا جست یا کانسی کا بنا ہوا گلوب تھا۔ جس کی اونچائی پچیس فٹ ہے۔ یہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پلازا کی سجاوٹ میں اضافہ کرتا ہے اور رات کے وقت تو خاص طور پر یہ ایک بہت خوب صورت منظر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس رات کو ہمیں نیویارک کا حسن دو چند نظر آیا۔ یہ شہر واقعی شہروں میں انتخاب ہے۔ اپنی خوب صورتی اور خوبیوں کی وجہ سے بھی اور اپنی خامیوں اور بد صورتیوں کی وجہ سے بھی۔ امریکی ٹھیک تو کہتے ہیں۔ نیویارک دنیا بھر میں اپنی قسم کا انوکھا شہر ہے۔

واپسی پر ابرار دہلوی کی زبان میرٹھ کی قینچی کی طرح چلتی رہی اور وہ مختلف علاقوں کے

بارے میں ہم لوگوں کو بتاتے رہے جو کہ ایک غیر ضروری کوشش تھی۔ یوں سر راہے چیزوں کے بارے میں بتانا کون سا یاد رہ جاتا ہے اور پھر بیک وقت اتنی بہت سی چیزوں کے بارے میں بتانے کا فائدہ بھی کیا ہے؟

رات کافی گزر چکی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ اب شاید ابرار صاحب زنجان کو اس کے گھر ڈراپ کر دیں گے اس لیے کہ ہم لوگ جس تقریب میں شریک ہونے کے لیے جا رہے تھے وہاں تو رت جگے کے امکانات تھے اور زنجان ایک گھریلو' شادی شدہ خاتون تھی مگر دہلوی صاحب نے ہمیں یہ بتا کر حیران کر دیا کہ زنجان بھی ہم لوگوں کے ساتھ ہی جائے گی۔ جب فارغ ہوں گے تو اسے گھر چھوڑ دیں گے۔

بٹ صاحب بول پڑے "یہ آپ کیا کر رہے ہیں' اس کا میاں کیا کہے گا؟"

خان صاحب نے کہا "جو کہے گا وہ سن لیں گے۔ اس کے منہ میں بھی زبان ہے۔ آپ اس کی وکالت کیوں کر رہے ہیں؟"

بٹ صاحب کہنے لگے "یہ تو بہت غلط بات ہے۔ ایک شادی شدہ' شوہر والی عورت کو اس طرح لیے پھرنا کہاں کی شرافت ہے؟"

"یہاں کی" ابرار صاحب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "قبلہ آپ فکر مند ہونے کی کوشش نہ کریں۔ خواہ مخواہ دبلے ہو جائیں گے اور حاصل بھی کچھ نہ ہو گا۔"

بٹ صاحب کہنا تو بہت کچھ چاہتے تھے مگر جب اکثریت کو اپنا مخالف پایا تو بل کھا کر رہ گئے۔

اب ہم نیویارک کے پاکستانی ٹیکسی ڈرائیوروں کی دعوت کھانے جا رہے تھے۔

☆☆☆

نیویارک میں ٹیکسی چلانے کے شعبے پر پاکستانیوں کا قبضہ ہے۔ نیویارک میں ایک اندازے کے مطابق صرف دس فیصد امریکن ٹیکسی چلاتے ہیں۔ باقی ڈرائیوروں کا تعلق دوسرے ملکوں سے ہے جن میں ہندوستان' پاکستان اور بنگلہ دیش کے لوگوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یوں سمجھیے کہ اس شہر کے تیس فیصد ٹیکسی ڈرائیور پاکستانی ہیں۔ ان کے بعد بھارت اور بنگلہ دیش والوں کی باری آتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس عظیم شہر میں ٹیکسی کے کاروبار

پر پاکستانیوں کا تسلط بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی صنعت ہے اور ان تین ملکوں
لوگ اس بزنس پر قابض ہیں۔ یوں تو امریکا کے دوسرے شہروں میں بھی یہی صورت
ہے لیکن نیویارک میں مین ہٹن میں تو یلو کیب پر پاکستانیوں کی اجارہ داری ہے۔ ان
سبھی مالک نہیں ہوتے۔ یہ دوسروں کی ٹیکسی بھی چلاتے ہیں۔ لیکن پاکستانیوں
ہندوستانیوں کی ایسی کمپنیاں بھی ہیں جو بیک وقت تین تین سو ٹیکسیوں کے مالک ہیں۔
چلانا اگرچہ دشوار گزار کام ہے لیکن اس میں آمدنی معقول ہوتی ہے اور پھر نوکری کر
مسئلہ بھی نہیں ہے۔ انسان اپنی مرضی سے کام کرتا ہے۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور ایک
رات میں ٹیکسی چلا کر چھ سو ڈالر بھی کما سکتا ہے جس کا ایک چوتھائی یعنی ڈیڑھ سو ڈا
کی بچت سمجھ لیجیے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف
اتنے ہی وقت میں زیادہ سے زیادہ تیس ڈالر کماتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کی بڑی
پارٹ ٹائم یہ کام کرتی ہے۔ پارٹ ٹائم کرنے والے عموماً ایک ہفتے میں تیس یا بتیس گ
کرتے ہیں اور آسانی سے پانچ سو ڈالر فی ہفتہ کما لیتے ہیں۔ یعنی دو ہزار ڈالر فی مہینہ
ایک نہایت معقول آمدنی تصور کی جاتی ہے۔ ایک ہائی اسکول کا ٹیچر اور کالج کا پار
لیکچرر بھی قریباً اتنی ہی رقم کماتا ہے۔

دہلوی صاحب راستے بھر "بک بک" کرتے رہے۔ یہ خیال خان صاحب نے
تھا۔

"بڑے شرم کی بات ہے۔ وہ شخص اتنی محبت اور خلوص سے ہمیں بتا رہا ہے ا
اسے بک بک کہہ رہے ہیں" بٹ صاحب نے شکوہ کیا۔

"بھائی۔ جب دوسرا سننے کے لیے تیار نہ ہو اور آپ بولے جائیں تو چاہے
محبت سے بولیں اور کتنے ہی قیمتی خیالات کا اظہار فرمائیں اسے "بک بک" ہی کہا
کیونکہ کوئی اس کو سننے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔"

ابرار دہلوی کے اس تمام "بک بک" کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ بیک وقت ہ
مطمئن اور خوش کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ یعنی وہ اپنی دانست ہم لو
معلومات میں بھی اضافہ کر رہے تھے اور اپنی محبوبہ کے ساتھ چہلیں کرنے میں بھی
تھے۔ یعنی وہی مثل تھی کہ ؎

رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی

یہ ایک خاصا مشکل کام تھا۔ مطلب یہ کہ محبوبہ کو بھی خوش رکھنا اور مہمانوں کو بھی
ناراض نہ ہونے دینا حالانکہ ہم سب کی خواہش تھی کہ وہ کچھ دیر کے لیے خاموشی اختیار
کریں یا کم از کم ہمیں معلومات فراہم نہ کریں تاکہ ہم یکسوئی اور اطمینان سے مناظر دیکھ
سکیں اور آپس میں باتیں بھی کریں مگر توبہ کیجیے۔ انہوں نے ہمیں یہ موقع ہی نہیں دیا۔
ایک لمحہ پہلے وہ زنجان سے ہسپانوی میں محو کلام ہوتے اور دوسرے ہی لمحے آواز لگاتے
"قبلہ۔ وہ سامنے والا چوک دیکھ رہے ہیں آپ؟ یہ بہت مشہور علاقہ ہے۔ جہاں....." اور
پھر معلومات کا دریا بہانا شروع کر دیتے۔ انہیں شاید احساس ہو گیا تھا کہ ہم لوگ ان کی باتیں
توجہ سے نہیں سن رہے اس لیے وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہم میں سے ہر ایک کو نام
لے کر مخاطب کرتے اور کہتے "کچھ سمجھے آپ؟" یا پھر "آپ سن رہے ہیں نا قبلہ۔"

ان کے قبلہ کہنے سے شروع شروع میں تو خان صاحب بہت برہم ہوا کرتے تھے مگر
بعد میں صبر کر لیا۔ ہم لوگ بھی جواباً انہیں قبلہ کہہ دیا کرتے تھے۔ خان صاحب کا خیال تھا
کہ وہ اگر اردو میں بات چیت کریں تو اپنی شادی شدہ محبوبہ، زنجان کو بھی قبلہ کہہ کر ہی
مخاطب کریں گے۔

"یار، تمہیں قبلہ سے اتنی چڑ کیوں ہو گئی ہے" بٹ صاحب نے کہا "عزت کا لفظ
ہے۔ کوئی گالی تو نہیں ہے۔"

خان صاحب نے فلسفہ جھاڑا "بعض اوقات اچھی باتیں بھی گالیاں بن جاتی ہیں۔ یہ
مجھے قبلہ کہتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔"

"یہ بات نہیں ہے" بٹ صاحب نے کہا "بات یہ ہے کہ بعض لوگوں کو عزت ہضم
ہی نہیں ہوتی۔ وہ بے چارہ اتنی عزت اور خاطر کر رہا ہے اور آپ کے نخرے ہی نہیں ملتے،
مجھے تو شرم آتی ہے یہ سوچ کر۔"

خدا کا شکر ہے کہ ہمارا طویل سفر ختم ہوا اور اس کے ساتھ ہی یہ بحث بھی پایہ اختتام کو
پہنچی۔ ایک چوڑی سی سڑک سے گزر کر ہم ایک اور سڑک پر پہنچے جس کا نام ہائیٹ اسٹریٹ
تھا۔ دہلوی صاحب نے مطلع کیا کہ غفور کا اپارٹمنٹ اسی سڑک پر واقع ہے۔ اچھا صاف ستھرا
علاقہ تھا۔ یہ ایک رہائشی علاقہ تھا اس لیے خاصا پرسکون بھی تھا۔ سب سے بڑی وجہ دہلوی

صاحب نے یہ بتائی کہ یہ کالوں سے محفوظ تھ مگر یہاں دوسری قومیتوں کے لوگ
تھے۔ اطالوی، ہسپانوی، چینی، انڈین، پاکستانی۔ لیکن سبھی سلیقے سے رہنے کے قائل
ورنہ ان نسلوں سے تعلق رکھنے والوں کے علاقے ہم نے بھی دیکھے ہیں اور انہیں
کان پکڑے ہیں۔

ایک بہت اونچی عمارت کے سامنے پہنچ کر دہلوی صاحب نے ایک نعرہ مارا "لیج
گئے قبلہ۔" یہ گول سی عمارت بیس تیس منزلہ تھی۔ دراصل منزلوں کو نیویارک میں
اہمیت نہیں ہے۔ جب لنکا میں سبھی باون گزے ہوں تو کسی اونچے قد والے کو آ
گھاس ڈالیں گے۔ بیس تیس منزلہ عمارت تو نیویارک میں ٹھگنی اور پستہ قد کہی جاتی
یعنی اسے آپ درمیانہ قد بھی نہیں کہہ سکتے۔ ایک جانب انڈر گراؤنڈ پارکنگ کا اشارہ
تھا جس کا بڑا سا گیٹ بند تھا مگر جب کار نزدیک پہنچی تو وہ بڑا سا دروازہ علی بابا کے غا
دروازے کی طرح خود بخود کھل گیا۔ ہو سکتا ہے دہلوی صاحب نے زیر لب "کھل
سم سم" کہا ہو مگر ہم نے نہیں سنا

بولے "یہ پارکنگ رہنے والوں کے لیے ہے مگر رات کے وقت بہت سی جگہیں
مل جاتی ہیں۔"

پارکنگ بجائے خود ایک عالی شان عمارت تھی جس میں حد نظر تک ستون اور
نظر آرہی تھیں۔ کاروں کی اس شہر میں بہتات ہے۔ اور ورائٹی بھی بہت زیادہ ہے۔
ایسا ملک ہے جہاں کوئی اپنی کار کے ماڈل یا سائز سے نہیں پہچانا جاتا کیونکہ کار یہاں
سے گئی گزری ایک عام سواری لگتی ہے اور جس کے پاس دیکھیے کئی کئی بڑی بڑی
ہیں۔ یہ سب قرض کی برکتیں ہیں۔ کچھ رقم ادا کی اور پھر سالہا سال تک قسطیں ادا
رہے۔ کار لینے کے بعد لوگ یہ حساب بھی بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے کریڈٹ
عوض کتنی زیادہ رقم ادا کر دی ہے۔ انہیں تو بس کار سے غرض ہے۔ یعنی آم کھانے
مطلب ہے۔ پیڑ گننے سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ کاریں ہی کیا، ہر معاملے میں ان
حال ہے۔

☆ ☆ ☆

آپ یہاں سنتے ہیں کہ فلاں شخص امریکا گیا تھا، اس نے اپنا گھر بھی خرید لیا ہے۔ کار
بھی لے لی ہے۔ عیش کرتا ہے مگر یہ نہیں جانتے کہ وہاں تو ہر شخص قرضے پر گھر اور کار
حاصل کر سکتا ہے۔ رہا سوال عیش کرنے کا تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امریکا میں
تھوڑے سے خوش نصیب عیش کرتے ہیں۔ باقی سب کے سب ان کے لیے بے وقوفوں کی
طرح دن رات کام میں جتے رہتے ہیں۔ ان کی مصروفیت دیکھ کر گھبراہٹ بھی ہوتی ہے اور
ان پر ترس بھی آتا ہے۔ یہ بدترین قسم کی معاشی غلامی ہے اور لطف یہ ہے کہ غلام کو اپنی
غلامی کا مطلق احساس نہیں ہے۔ اسے زندہ رہنے کے لیے آسائش حاصل ہو جاتی ہے مگر
بال بال قرض میں بندھ جاتا ہے اور روح تک گروی ہو جاتی ہے لیکن جس کسی نے پاکستان
میں سائیکل سے بڑی سواری کا منہ نہ دیکھا ہو اسے وہاں سواری کے لیے کار نصیب ہو
جائے تو غلامی اور آزادی کی فکر کون کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ
چوبیس گھنٹے میں اٹھارہ انیس گھنٹے محض "غلامی" کرنے میں صرف کر رہا ہے۔ اس کا اپنا کچھ
بھی نہیں ہے۔ سبھی کچھ قرض خواہوں کا ہے اور وہ جیتے جی ان کا قرض ادا کرنے کے فرض
پر مامور ہے۔ اس کی اپنی زندگی، اپنی تفریح، اپنی خوشی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وہ تو بس کولہو
کا بیل ہے۔ تنہائی اور مصروفیات کا شکار ہے۔ چیونٹی کی طرح مسلسل حرکت کرنے اور
بھاگنے پر مجبور ہے۔ امریکا پہنچ کر تو کوئی خوش نصیب ہی کبھی پوری نیند لے سکتا ہے۔ ورنہ
زندگی بے خوابی کے عالم میں جماہیاں لیتے ہی گزر جاتی ہے اور بے وقت سونے کے لیے
شراب اور گولیاں اس کا مقدر ہیں۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ سمجھ لیجیے۔ ذکر کاروں کا ہو رہا تھا۔ کاروں کا ایک ہجوم تھا جس
کے درمیان کسی جگہ دہلوی صاحب نے بھی اپنی ٹیکسی کھڑی کر دی اور ہاتھ جھاڑ کر باہر نکل
گئے۔ دوسری طرف جا کر انہوں نے اگلا دروازہ کھولا اور زنجان کو باہر نکلنے میں مدد دی۔

خان صاحب نے کہا "بس یہ چار دن کی چاندنی ہے۔ جس دن اس سے شادی ہو گئی۔
اخلاق و آداب سب ختم ہو جائے گا۔"

ہم نے پوچھا "وہ کیوں؟"

"بھائی کون پاکستانی اپنی بیوی کے لیے ایسے تکلفات افورڈ کر سکتا ہے۔ یہ چیز ہماری
فطرت میں ہی نہیں ہے۔"

بہر حال، فی الحال تو زنجان بہت مسرور اور مطمئن تھی۔ اندر ہی اندر ہم ایک لفٹ
پاس پہنچ گئے یعنی پارکنگ سے باہر نکلنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہیں سے مطلوبہ منزل
پہنچ جائیے۔ دیکھا آپ نے، اس نظام نے انسان کو قدم قدم پر کتنی آسائش فراہم کی ہے
صرف اس لیے تاکہ وہ ان کی خدمت گزاری کے لیے زیادہ وقت نکال سکے اور ان کا
بھی رہے۔

لفٹ میں سوار ہوئے تو ہم نے دبی زبان میں ابرار دہلوی سے کہا "قبلہ اگر برا
منائیں تو آپ سے ایک بات دریافت کریں؟"

کہنے لگے "اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ آپ جو چاہے پوچھئے۔"

ہم نے کہا "آپ کے یک طرفہ پاکستانی عشق کا کیا ہوا؟ آپ تو کہتے تھے کہ پیسہ کما
واپس پاکستان جائیں گے اور اپنی پاکستانی محبوبہ سے شادی رچائیں گے۔"

وہ ہنسنے لگے، بولے "آفاقی صاحب، وہ تو بس میرے دل کی آواز ہے قبلہ۔
خواہش ہے۔ ہر خواہش حقیقت میں تو نہیں ڈھل جاتی۔" پھر وہ اداس ہو گئے "مجھے پتا
کہ میں کبھی اتنا پیسہ نہیں کما سکوں گا کہ پاکستان جا کر بزنس کروں۔ اس وقت تک کوئی
لڑکی میرے انتظار میں کنواری تو نہیں بیٹھی رہے گی۔"

ہم نے کہا "اسی لیے آپ زنجان پر مہربان ہو گئے ہیں۔"

بولے "کل کی پوری سے آج کی آدھی غنیمت ہے قبلہ۔ کل والی کا تو کچھ پتا
ہے۔ آج والی آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

اتنے میں لفٹ تیسویں منزل پر پہنچ چکی تھی۔ لفٹ یہاں بہت تیز رفتاری سے
ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو سارا دن اونچی اونچی عمارتوں پر چڑھنے اترنے میں ہی صرف ہو
اور اگر کہیں یہاں بجلی بھی جانے لگے تو کیا ہو؟ کچھ نہ پوچھئے۔ امریکا میں اگر انقلاب
ہے تو وہاں لوڈ شیڈنگ شروع کر دیجئے۔ چھ ماہ کے اندر یہ سپر پاور صفر پاور بن کر رہ
گی۔

تیسویں منزل پر غفور صاحب کا اپارٹمنٹ نمبر ۲۰ تھا۔ ان کے دروازے پر
دہلوی صاحب نے ہم سب کو مختصر سا لیکچر دیا اور بتایا کہ غفور کے گھر میں ہمیں ذرا احتیا
حفاظت سے کام لینا پڑے گا۔

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ"

ابھی ان کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ سامنے والا دروازہ کھل گیا۔ دروازے کی چوکھٹ
ں ایک نہایت صاف و شفاف اور خوب صورت، نازک اندام خاتون کھڑی مسکرا رہی
ھیں۔ ان کے بال سیاہ تھے۔ آنکھیں بھی سیاہ تھیں۔ چہرے کی رنگت سفید اور سرخ
ھی۔ یہ ایک صحت مندی سے دمکتا ہوا چہرہ تھا۔ ان کا قد بمشکل پانچ فٹ ہو گا۔ جسم متناسب
لہ ضرورت سے زیادہ متناسب تھا۔ ہم لوگوں نے حیران ہو کر انہیں اچانک نمودار ہوتے
وئے دیکھا مگر ہم لوگوں کو دیکھ کر ان کی مسکراہٹ اور زیادہ وسیع ہو گئی۔ انہوں نے اپنا سر
ودب ہو کر جھکا لیا اور کمر تک جھک کر تسلیم بجالائیں۔

خان صاحب نے چپکے سے کہا "مارے گئے۔ ہم تو جاپانیوں میں پھنس گئے۔"

یہ کہا اور خود بھی رکوع میں چلے گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہم سب بھی سر جھکا کر
کھڑے ہو گئے اور کن انکھیوں سے خاتون کو دیکھنے لگے۔ وہ سیدھی کھڑی ہو چکی تھیں مگر
ہمارے سیدھا ہوتے ہی دوبارہ رکوع میں چلی گئیں۔ مجبوراً ہمیں بھی ایسا ہی کرنا پڑا۔ باری
باری اس طرح جھکنے کا سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ ان کی تو شاید یہ ورزش ہو گی مگر
ہماری کمر کا بھرکس نکل گیا۔

ہم نے دبی زبان میں پوچھا "یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟"

اتنی دیر میں وہ ایک بار پھر سیدھی کھڑی ہو چکی تھیں اور اس بار ان کے ساتھ ہی ہم
لوگ بھی سیدھے ہو گئے تھے۔ ہمارا ارادہ تو ایک بار پھر جھکنے کا تھا مگر دیکھا کہ انہوں نے
ارادہ تبدیل کر دیا ہے اور سیدھی کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ چنانچہ ہم سب پر بھی سیدھے
کھڑے ہونا اور مسکرانا لازم ہو گیا۔

ابرار دہلوی بھی ہم سب کے ساتھ اسی حرکت میں مصروف تھے اور ان کی محبوبہ زنجان
کا بھی یہی عالم تھا۔ ابرار صاحب نے مسکراتے ہوئے خاتون کو "ہائی" کہا اور جواب میں
"ہائی" سن لیا۔ پھر انہوں نے انگریزی میں دریافت کیا "مجھے امید ہے کہ غفور گھر کے اندر
ہوں گے؟"

خاتون نے اپنی زبان سے انگریزی کے قتلے بناتے ہوئے فرمایا "نو پروبلوم" ہی از ان

سائڈ" پھر وہ دروازے میں راستہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں اور ہاتھ سے اندر چلنے کا اشارہ
کرتے ہوئے فرمایا "کوم ان۔"

ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ ہر لفظ کو گول کرنے کی عادی ہیں۔ پرابلم کو پروبلوم۔ کم کو کوم
آفس کو اوفس کہتی ہیں۔ بہرحال، زبان ان کی تھی، گھر ان کا تھا، وہ جو چاہے کہیں اور
انگریزی سے جس طرح چاہے بدسلوکی کریں۔ ہم بیچ میں بولنے والے کون ہوتے ہیں؟ یہ
سوچ کر چپ چاپ اندر چلے گئے۔

یہ گھر عام امریکی اپارٹمنٹ کے مانند تھے لیکن نہایت سلیقے سے سجا ہوا۔ دیواروں پر
جاپانی آرٹ کے نمونے لٹکے ہوئے تھے۔ خان صاحب کو تو فرنیچر میں بھی جاپانی پن نظر آیا۔

"بھائی فرنیچر کے جاپانی ہونے کا کیوں شبہ ہوا آپ کو؟" ہم نے پوچھا۔

بولے "دیکھتے نہیں چپٹا چپٹا سا فرنیچر ہے۔ میز، کرسیاں، صوفے سبھی چپٹے ہیں" ان کا
مطلب تھا کہ تمام فرنیچر کی اونچائی کم تھی۔ صوفہ سیٹ بھی زمین سے زیادہ اونچا نہ تھا۔ اس
لیے واقعی اس پر چپٹا ہونے کا گمان گزرتا تھا یا شاید ہمارا وہم تھا۔

کمرے میں پہنچے تو خاتون نے ایک بار پھر جھکنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ہمیں
بھی جوابی کارروائی کرنی پڑی۔ شکر ہے کہ ہماری کمر ٹوٹ جانے سے قبل ہی ایک طرف
سے غفور صاحب نمودار ہو گئے۔

"اوئے خیراں بھئی خیراں" وہ سب سے پہلے تو ابرار دہلوی سے لپٹ گئے۔ پھر ہم سب
کی طرف متوجہ ہوئے۔ باری باری ہم سب کو گلے لگایا مگر زنجان کی طرف بڑھ کر رک گئے
اور محض ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔ اگر ان کی بیگم سامنے نہ ہوتیں تو شاید وہ زنجان سے بھی
گلے مل لیتے اور اسے بھی کوئی خاص اعتراض نہ ہوتا۔

غفور صاحب نے سب کو بٹھانے سے پہلے اپنی بیگم سے متعارف کرایا۔ اس خاتون کو
دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ اس قدر دھان پان، نازک اندام اور نستعلیق قسم کی عورت
تھیں۔ مگر دہلوی صاحب نے اس کا کچھ اور نقشہ پیش کیا تھا۔ ان کے بیان اور غفور صاحب
کی مظلومیت کے پیش نظر ہم کسی لمبی تڑنگی، خوفناک شکل عورت کا تصور کر رہے تھے مگر
وہ ہماری توقعات کے برعکس تھی۔ آخر بٹ صاحب سے نہ رہا گیا اور جب چان شو
لوگوں کے لیے مشروبات لینے کی غرض سے گئی تو بٹ صاحب نے غفور صاحب سے پوچھ

"بھائی۔ تم نے تو بڑا خطرناک نقشہ کھینچا تھا۔ تمہاری بیوی تو بہت شریف اور معقول عورت
لگتی ہے۔"

وہ بولے "بس لگتی ہی ہے۔ ایسی ہے نہیں" پھر پنجابی کا محاورہ سنایا کہ "راہ پیا جانے یا
واہ پیا جانے۔"

اتنی دیر میں چان شو دوبارہ نمودار ہو گئی۔ وہ ہم سب کے لیے کوک لے کر آئی تھی۔
غفور نے انگریزی میں کہا "ڈارلنگ۔ تمہیں ان لوگوں سے پوچھ تو لینا چاہیے تھا، ہو سکتا
ہے یہ میری طرف تمہاری خوشی اور مرضی کے پابند نہ ہوں۔"

وہ بولی "نو پروبلوم!" پھر ہم سے پوچھا "نو کوک پلیز!

ہم نے جواب دیا "نو پلیز۔"

"کافی پلیز!"

"تو پلیز۔"

"ٹی پلیز؟"

"نو ٹی پلیز۔"

"نو تھنک؟" وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔

ہم نے بتایا کہ ہم کچھ دیر پہلے ہی کافی پی کر آئے ہیں۔ ذرا دیر بعد کچھ پئیں گے۔

بولیں "نو پروبلوم۔"

"نو پروبلوم" ان کا تکیہ کلام تھا۔ ان کے لیے کوئی پرابلم، پرابلم نہ تھی جب کہ غفور
کے لیے وہ بذات خود بہت بڑی پرابلم تھیں مگر شاید سادگی اور بھولے پن کے باعث اس
حقیقت سے آشنا نہیں تھیں۔

"بڑی مکار ہے یہ عورت" غفور صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر بولے "اگر اپنی
زبان میں بھی اس کی برائی کرو تو ساتھ میں مسکراتے رہنا تاکہ اسے پتا نہ چلے۔"

ان کی اس ترکیب پر ہم عمل کرتے رہے مگر کچھ عجیب سا لگ رہا تھا کہ ایک سادہ دل
عورت کو دھوکا دے رہے ہیں بلکہ بقول خان صاحب "اس کی آنکھوں میں دھول جھونک
رہے ہیں" مگر صاحب خانہ کی فرمائش کے مطابق عمل کرنا بھی ضروری تھا۔

چان شو بہت اچھی مہمان دار تھی۔ مہمانوں کے آگے بچھی جا رہی تھی اور بات بات

پر رکوع میں چلی جاتی تھی۔ بٹ صاحب اور خان صاحب کیونکہ تازہ تازہ جاپان سے آ
تھے اس لیے وہاں کے آداب سے واقف تھے۔ ہم سب بھی جواب میں جھک کر تعظیم د
تھے۔ یہاں تک کہ ہماری تو کمر دکھنے لگی۔ دوسرے لوگوں کا بھی یہی حال تھا مگر چان ش
کوئی اثر نہیں نظر آیا۔ شاید اس لیے کہ وہ جوڈو کراٹے کی ماہر تھی اور بچپن ہی سے عا
تھی۔

بٹ صاحب بولے "معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کمر میں تو ہڈی ہی نہیں ہے۔"

غفور نے کہا "یہ خود سرتاپا ہڈی ہے۔"

قبلہ نے فرمایا "بلکہ کباب میں ہڈی ہے۔ یہ غفور کی ہر خوشی کی راہ میں حائل ہے۔"

☆ ☆ ☆

کچھ دیر بعد منظور لاٹ بھی تشریف لے آئے۔ ہمیں تو اندیشہ تھا کہ کہیں اس گھر میں جاپانی کھانا ہی نہ کھانا پڑے کیونکہ ایک جاپانی عورت کو پاکستانی کھانا پکانا کہاں آسکتا ہے مگر جب میز پر بریانی اور قورمہ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ معلوم ہوا کہ چان شو نے پکایا ہے۔ چکھا تو مزہ بھی بہت اچھا تھا۔ کھانا پکانا اس نے غفور سے سیکھا تھا اور قریب قریب سبھی پاکستانی کھانے پکا لیتی تھی۔ غفور کو جو کھانے پسند تھے وہ سب کے سب وہ بہت شوق اور بہت اچھے پکاتی تھی۔ جب وہ رات گئے ٹیکسی چلا کر واپس گھر پہنچتا تھا تو اس کا جسم دباتی تھی اور مالش کرتی تھی۔ اسے حتی الامکان کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دیتی تھی۔ ناشتے میں پراٹھے اور آملیٹ بنا کر کھلاتی تھی۔ گھر کو دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ کسی سلیقہ مند عورت کا گھر ہے۔ اس کے اخلاق اور ملنساری کا نمونہ ہم سب دیکھ ہی رہے تھے۔

ہم نے غفور سے مسکراتے ہوئے (مسکرانا ضروری تھا) پوچھا "یار اتنی اچھی بیوی تم کو ملی ہے۔ ایسی تو پاکستانی بیویاں بھی نہیں ہوتیں مگر پھر بھی تم کو شکایت ہے۔"

غفور کے جواب دینے سے پہلے منظور لاٹ نے کہا "ایمان کی بات بتاؤں۔ دراصل بھابی جوڈو کراٹے اس وقت دکھاتی ہے جب غفور بے وفائی کرتا ہے یا دوسری لڑکیوں کے پیچھے جاتا ہے۔"

"مگر اسے پتا کیسے چل جاتا ہے؟"

"اسے خدا نے خاص صلاحیت بخشی ہے" غفور نے کہا "جب میں گھر واپس آتا ہوں تو یہ کم بخت سونگھ کر پہچان جاتی ہے کہ میں نے کسی لڑکی سے فلرٹ کیا ہے۔ بس پھر جھگڑا اور مار پٹائی۔"

چان شو ایک ادارے میں جوڈو کراٹے کی تربیت دیا کرتی تھی۔ بہت معقول آمدنی تھی بلکہ بقول دہلوی صاحب "کافی پیسے والی عورت تھی۔" غفور پر وہ جان دیتی تھی۔ اسے گرین

کارڈ دلانے میں بھی اس نے نمایاں حصہ لیا تھا مگر گرہستی میں بھی طاق تھی۔ وفادار تھی۔ اسے اگر شوہر سے شکایت تھی تو "ہرجائی پن" کی۔ اس بات پر وہ غفور کو جوڈو کراٹے کا ہاتھ دکھاتی تھی ورنہ وہ اس کی پرستش کرتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ غفور شکایت کرنے کے باوجود اس کو چھوڑنے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ ایسی بیویاں تو قسمت والوں کو ہی ملتی ہیں۔

"اور ایسے شوہر؟" بٹ صاحب نے پوچھا۔

"قسمت کی ماریوں کو" ابرار صاحب نے گرہ لگائی۔

کھانا بہت لذیذ تھا۔ بعد میں انگلستان کی ارل گرے چائے سے تواضع کی گئی۔ پاکستانی دعوت کا لطف آگیا۔

کھانے کے بعد گپ شپ کا آغاز ہوا۔ زنجان باورچی خانے میں چان شو کا ہاتھ بٹانے چلی گئی۔ چان شو میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ مغرب میں پرورش پانے کے باوجود وہ ایک خالص مشرقی بیوی تھی اور کسی قیمت پر بھی یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ اس کا شوہر کوئی گھریلو کام کرے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ محفل میں جس پیشے سے تعلق رکھنے والوں کی اکثریت ہوتی ہے، موضوع گفتگو بھی وہی رہتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کی محفل میں ان کے تجربات و مشاہدات کے علاوہ کوئی دوسری بات کہاں ہو سکتی ہے مگر ہم نے ان کی باتوں سے بہت کچھ حاصل کیا۔ ٹیکسی چلانا ایک سنسنی خیز اور دلچسپ کام تو ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انتہائی خطرناک بھی ہے۔ خصوصاً نیویارک جیسے شہر میں جہاں جرائم کی رفتار سارے ملک میں بلکہ شاید دنیا بھر سے زیادہ تیز ہے۔

"قبلہ پیسے تو اچھے ملتے ہیں مگر جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں" یہ ابرار دہلوی تھے "لٹنے اور زخمی ہونے کے علاوہ جان سے ہاتھ دھونے کا خطرہ بھی لگا رہتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کو لوٹ مار اور تشدد کا نشانہ بنانا بہت آسان ہوتا ہے کیونکہ وہ کسی شخص کو انکار نہیں کر سکتے۔ دیکھنے میں کوئی خواہ مجرم ہی کیوں نہ نظر آئے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ٹیکسی خالی نہیں ہے" انہوں نے بتایا کہ ہر سال نیویارک میں سینکڑوں ٹیکسی ڈرائیور زخمی اور درجنوں ہلاک ہو جاتے ہیں اور لوٹ لیتے ہیں۔ مزاحمت کرنے پر گولی یا چاقو بھی مار دیتے ہیں۔ صرف اسی

سال اس وقت تک سینتیس ڈرائیور قتل کیے جا چکے تھے۔ اس قسم کی وارداتیں کرنے والوں میں زیادہ تر کالے پیش پیش ہوتے ہیں مگر دوسری نسلوں سے تعلق رکھنے والے بھی شامل ہوتے ہیں۔

"بھئی جب یہ ایسا خطرناک کام ہے تو اتنے زیادہ لوگ کرتے کیوں ہیں؟"

"اس لیے کہ آمدنی زیادہ ہے۔ کسی کی نوکری نہیں کرنی پڑتی اور کام دینے سے پہلے کوئی زیادہ پوچھ گچھ بھی نہیں کرتا۔ اس کام کے لیے تعلیم یافتہ ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ کوئی دوسرا کام تلاش کرنے جاؤ تو بڑے بڑے فارم بھرنے پڑتے ہیں اور اپنے بارے میں ہر طرح سے یقین دہانی کرانا پڑتی ہے کہ کہاں سے آئے ہیں، یہاں کس حیثیت میں رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

ٹیکسی ڈرائیوروں کا تعلیم یافتہ ہونا نیویارک میں بالکل ضروری نہیں ہے۔ یہ تجربہ اور مشاہدہ تو خود ہم کو بھی ہو چکا تھا ٹیکسی ڈرائیور تو شاید دوسرے شہروں اور ملکوں کے بھی عالم فاضل نہیں ہوتے مگر نیویارک میں تو ہم نے زیادہ تر ڈرائیور جاہل ہی دیکھے۔ پاکستانیوں کی بات ذرا مختلف ہے۔ یہاں دو قسم کے پاکستانی ٹیکسی چلاتے ہیں۔ ایک تو وہ جو کہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہوتے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو بی اے، ایم اے پاس ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ پڑھے لکھے ہیں اور انہیں کوئی مناسب نوکری نہیں مل سکی اس لیے ٹیکسی چلاتے ہیں۔ یا پھر یہ پڑھے لکھے لوگ "پارٹ ٹائم" میں ٹیکسی چلاتے ہیں۔

خان صاحب نے کہا "میرا خیال ہے کہ نیویارک کے ٹیکسی ڈرائیور دنیا میں سب سے زیادہ جاہل ہوتے ہیں۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"بہت سے تو انگریزی تک نہیں جانتے۔ یس اور نو کے علاوہ کچھ نہیں بول سکتے۔ جو صحیح انگریزی تک نہ بول پائے وہ جاہل ہی ہو گا۔"

منظور لاٹ فوراً بحث پر آمادہ ہو گئے "معاف کیجیے گا خان صاحب، آپ نے بڑی غلط بات کر دی ہے۔ یہ نظریہ تو پاکستان تک محدود ہے کہ جو شخص انگریزی نہیں جانتا وہ جاہل ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی زبان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے مگر انگریزی نہیں جانتا تو آپ اسے جاہل کیسے کہہ سکتے ہیں؟ آپ کو پتا نہیں ہے کہ ہسپانوی کتنی بڑی اور ترقی یافتہ زبان ہے۔

یہاں بہت سے لوگ ہسپانوی ہیں تعلیم یافتہ ہیں اور جان بوجھ کر انگریزی نہیں سیکھتے۔ یا پھر دوسری زبانوں والے بھی انگریزی سیکھنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اور پھر ایک ٹیکسی ڈرائیور کے لیے انگریزی جاننا ضروری بھی نہیں ہے۔ اسے اپنی سواری کو لیکچر تو دینا نہیں پڑتا۔ بس کام چلانے کے لیے انگریزی بول لیتا ہے۔ مثلاً کہاں جانا ہے؟ کتنا کرایہ ہو گا؟ وغیرہ وغیرہ۔"

نیویارک کے ٹیکسی والوں کے بارے میں شاید ہم بتا چکے ہیں کہ بہت بڑی تعداد پاکستانیوں کی ہے۔ اس کے بعد ہندوستانیوں کا نمبر آتا ہے۔ پھر بنگلہ دیشی ہیں۔ دوسری نسلوں کے لوگ بھی ہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ صرف دس بارہ فیصد امریکی ٹیکسی چلاتے ہیں۔ ان کی بجائے اس بزنس پر "غیر قوموں" کا قبضہ ہے۔

کمرے میں لگے ہوئے انٹر کام کا "بزر" بجا تو غفور صاحب نے بات شروع کر دی "لیں؟"

"لیس کے بچے۔ میں ڈوگر ہوں۔ دروازہ کھولو" جواب میں ایک باریک سی آواز سنائی دی۔

سب لوگ خوش ہو گئے "لو بھئی۔ ڈوگر بھی آگیا۔"

یعنی وہی موٹا تازہ مگر باریک ہی آواز والا شخص جس کا نام ہم نے "من من" رکھ دیا تھا۔ غفور نے دروازہ کھولنے کے لیے بٹن دبایا اور پھر چان شو کو آواز دی۔

"چان۔ چان" یوں لگا جیسے "چاند" کہہ کر بلا رہا ہو۔ چان شو باورچی خانے سے افتاں و خیزاں کمرے میں داخل ہوئی۔ "کیا بات ہے؟"

"ڈارلنگ! تم ڈوگر کو بھول ہی گئیں۔ وہ آگیا ہے' اس کے کھانے کا کیا ہو گا؟"

چان شو' مسکرائی "کوئی اور ہوتا تو اسے بچا ہوا کھانا کھلا دیتے پر وہ تو تھوڑے بہت کھانے سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔"

"اوکے۔ تو پھر پزا کے لیے فون کر دو ورنہ وہ بہت بگڑے گا۔"

"اس کو پزا پر ٹرخاؤ گے؟" چان شو نے شرارت سے پوچھا۔

"اس نے دیر بھی تو بہت کر دی ہے۔"

"فکر مت کرو۔ اس کے لیے کھانا موجود ہے" چان شو نے کہا۔

"ہم سب کی پلیٹوں میں بچا ہوا؟"

"نہیں۔ میں نے پہلے ہی الگ کر دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بھی ضرور آئے گا۔ تم تو بھول ہی گئے تھے۔"

واقعی۔ غفور صاحب اپنے لنگوٹیے کو بھول ہی گئے تھے۔ دراصل باتوں میں سب اتنے کھو گئے تھے کہ خیال ہی نہیں رہا۔ کال بیل بجی اور ڈوگر صاحب اندر داخل ہوئے۔

ہائی۔ ایوری باڈی السلام علیکم۔ کی حال چال اے؟"

"میرا جان جگر آگیا" غفور نے فوراً ڈوگر صاحب کو گلے لگا لیا اور کہا "یار ناراض نہ ہونا۔ تیرے لیے کھانا نہیں بچا ہے۔ پزا منگا دیں گے تجھے۔"

"مجھے تو معلوم تھا کہ میری چھینی بھابی مجھے پزا پر ہی ٹرخائے گی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہم تو مہمانوں سے ملنے آئے ہیں۔ ان کی باتوں سے پیٹ بھر لیں گے۔"

وہ آگے بڑھ کر ہم سب سے گلے ملے۔ بس یہ فرق ہے پاکستانیوں اور امریکیوں میں۔ وہ زیادہ سے زیادہ مصافحے پر ٹرخا دیتے ہیں جب کہ پاکستانی معانقہ کیے بغیر باز نہیں آتے مگر صرف مردوں سے' عورتوں کے ساتھ تو ہاتھ ملانا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔

چان شو تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی "ڈوگار۔ ادھر آؤ۔"

ڈوگر صاحب ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے "میں چھینی بھابی سے بہت ڈرتا ہوں۔ ایک منٹ میں تارے دکھا سکتی ہے۔"

"تم کچن میں ہی آجاؤ۔ اور دیکھو کھانا ذرا بھوک رکھ کر ہی کھانا۔ بعد میں شکایت کرو گے۔"

"کھانا اگر اچھا پکا ہو تو زیادہ کھانے سے بھی کچھ نہیں ہوتا چان شو۔" وہ ہنستے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے کچن میں چلے گئے۔ اتنی دیر میں زنجان واپس آگئی۔ شاید اپنے حصے کے برتن دھو کر آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ٹیکسی والوں کے تجربات اور مشاہدات کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔

"ٹیکسی والوں کو طرح طرح کے مسافر ملتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر تو اچھے ہی ملتے ہیں۔ بزنس مین' اسٹار' اٹھائی گیرے' سیاح' ہر قسم کے لوگ ٹیکسی میں سفر کرتے ہیں۔ کئی بار تو

حیران رہ جاتے ہیں جب کوئی ٹی وی اسٹار ٹیکسی میں سوار ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کو کہ
پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے اس لیے وہ اپنی کار استعمال نہیں کرتے۔ یا پھر پہچانے جانے کے
سے بھی ٹیکسی میں سفر کرتے ہیں۔"

"مگر بزنس مین کو کیا ضرورت ہے کہ اپنی رولز رائس چھوڑ کر ٹیکسی میں سفر کرے؟"

"وہ جب خفیہ ملاقاتوں کے لیے جاتے ہیں تو ٹیکسی ہی استعمال کرتے ہیں۔ خاص طو
ر پر گرل فرینڈ کے پاس جانے کے لیے۔ اس طرح نہ کوئی ان کی کار کو پہچانتا ہے اور نہ
انہیں۔ ورنہ اخبار والے تو ان کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔"

پاکستان اور ہندوستان کی ایک پہچان نیویارک میں ٹیکسی ڈرائیور بھی ہیں۔ باتونی مسا
سوار ہوتے ہی سوال کرتے ہیں "پاکستانی؟ یا انڈین؟" اس کے بعد چند فقرے ان ملکوں
بارے میں ضرور بولتے ہیں۔ اس طرح یہ ٹیکسی والے نیویارک میں اپنے ملکوں کا تعار
بھی کراتے ہیں۔

منظور لاٹ نے کہا "ایک روز رات کے وقت ٹائم اسکوائر سے ایک موٹا سا گنجا آ
ٹیکسی میں سوار ہوا۔

"کہاں جانا ہے؟"

"چاہے جہاں لے چلو۔ پاکستان، ہندوستان۔ بنگلہ دیش! مجھے ہر جگہ کے لوگ جا
ہیں۔"

میں نے کہا "سر معاف کرنا۔ آپ کو تو میں نے بھی نہیں پہچانا۔ میرے ملک کے لوگ
کیسے جانیں گے؟"

وہ ہنسنے لگا "بس یہی باتیں سننے کا مزہ آتا ہے تم لوگوں کے ساتھ۔"

وہ میوزک کنڈکٹر تھا جس کا نام ہربرٹ وان راجون ہے مگر ہمارے ملکوں میں تو پڑ
لکھے لوگ تک اس کے نام سے واقف نہیں ہیں۔ اس روز وہ اچھے موڈ میں تھا۔

"میرا شو بہت اچھا گیا ہے۔ تمہیں اپنی دھن سناؤں؟" اور میرا جواب سننے سے پہلے
اس نے بازو ہلا ہلا کر گانا شروع کر دیا۔ ایک ریستوران پر اترا تو اس نے بہت بھاری ٹپ
دی اور کہا "تمہاری موسیقی پسندی کے نام پر" حالانکہ مجھے وہ جناتی گانا ذرا بھی اچھا نہیں
تھا۔"

غفور نے کہا "موسیقار تو قسمت والوں کو ہی ملتے ہیں۔ زیادہ تر لوٹ مار کرنے والوں
سے ہی واسطہ پڑتا ہے۔ ہفتے میں دو تین بار ایسے مسافر ضرور ٹکر جاتے ہیں۔ آج تک تو بچا
ہوا ہوں۔ پیسے لے کر ہی جان چھوڑ دیتے ہیں۔"

دہلوی صاحب کافی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔

"کیا بات ہے بھائی۔ کیا بریانی کا نشہ ہو گیا ہے۔ یا دلی کی گلیاں یاد آ رہی ہیں؟" غفور
نے انہیں چھیڑا۔

"دلی کی گلیاں کیا یاد آئیں گی قبلہ۔ وہ تو ہم نے دیکھیں ہی نہیں۔ ہماری تقدیر میں تو
نیویارک کی خاک چھاننی لکھی تھی۔"

"کچھ آپ بھی فرمائیں قبلہ" خان صاحب نے چھیڑا "آپ کا کیا تجربہ ہے؟"

بولے "تجربہ تو اچھا برا ہر طرح کا ہوتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور کو
ماہر نفسیات بھی ہونا چاہیے۔ یا پھر کچھ عرصے بعد وہ خود بخود نفسیات کا ماہر بن جاتا ہے۔
طرح طرح کی رنگ برنگی سواریاں ملتی ہیں۔ کبھی خوش، کبھی ناخوش۔ کوئی زندگی سے بے
زار ہے تو کوئی خوشیوں سے لدا ہوا ہے۔ کسی کو اسپتال جانا ہے اور وہ زندگی سے مایوس
ہے۔ کوئی تندرست ہو کر نکلا ہے۔ کسی کو عشق میں مایوسی ہوئی ہے تو کسی کی محبوبہ نے
شادی کا وعدہ کر لیا ہے۔ ایسے لوگ باتونی ہوتے ہیں۔ دل کھول کر باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ ہم
بھی خوب باتیں کرتے ہیں۔ ان کے دلوں کا غبار ہلکا ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں امریکا
میں کسی کو فرصت نہیں ہے جو کسی دوسرے کے مسائل سنے۔ یہ کام ماہر نفسیات کرتے
ہیں اور اس کے لیے بہت بھاری فیس وصول کرتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ مسافر
مفت میں دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔ میں تو ہر ایک کو تسلی بھی دیتا ہوں، ہاں میں ہاں بھی
ملاتا ہوں اور امید بھی دلاتا ہوں۔ ایسے لوگ جب ٹیکسی سے اترتے ہیں تو جیب کی خاصی
رقم ٹپ کے طور پر دے جاتے ہیں۔"

دہلوی صاحب کی بات بالکل درست تھی مگر وہ جس قسم کے ٹیکسی والے کی بات کر
رہے تھے اس کے لیے تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ پاکستانی اور ہندوستانی ٹیکسی ڈرائیوروں
میں تعلیم کا اوسط کافی اچھا ہے۔ یا تو تعلیم مکمل کرنے کے لیے آنے والے پارٹ ٹائم ٹیکسی
چلاتے ہیں یا پھر "امریکی خواب" کی تعبیر میں آنے والے تعلیم یافتہ لوگ کوئی مناسب کام نہ

ملنے پر ٹیکسی چلانے لگتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب امریکا آنے والوں میں زیادہ تعداد پڑھے
لکھوں کی ہوا کرتی تھی۔ مگر ۱۹۷۰ء کے بعد کم تعلیم یافتہ یا بالکل ہی ان پڑھ لوگوں نے بھی
امریکا کا رخ کر لیا ہے۔ جو یہاں پہنچ گیا وہ اپنے غریب اور بے روزگار رشتے داروں کو بلاتا
ہے۔ جنہیں شہریت حاصل ہے وہ قانونی طور پر بلاتے ہیں اور "خرد برد" ہو جانے والے غیر
قانونی طور پر۔ یہاں پہنچ کر وہ نیویارک کے گھنے اور عظیم جنگل میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔
کام کاج کی کمی نہیں ہے۔ جنہیں یہاں "ODD JOBS" یا چھوٹا موٹا کام کہا جاتا ہے وہ
تو مل ہی جاتا ہے اور اس کا معاوضہ اتنا ہوتا ہے جس کا وہ اپنے ملک میں تصور بھی نہیں کر
سکتے۔ یہ اور بات ہے کہ اخراجات بھی بہت زیادہ ہیں مگر قرض دینے والے اور کریڈٹ کارڈ
سلامت رہیں۔ ان کی بدولت زندگی گزارنے کے لیے بنیادی سہولتیں تو حاصل ہو ہی جاتی
ہیں۔ پھر یہ لوگ مصائب کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہاں آکر بھی پیسہ
جوڑنے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور بہت جلد گھر لے لیتے ہیں۔ کار خرید لیتے ہیں۔ یہ وہ
نعمتیں ہیں جو انہیں اپنے ملکوں میں نصیب نہیں ہوتیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے عوض
وہ بہت بھاری قیمت ادا کرتے ہیں مگر امریکی زندگی کی چکا چوند ان کی آنکھوں کو دھندلا دیتی
ہے اور پھر وہ اس دلدل میں اس بری طرح دھنس جاتے ہیں کہ اس سے باہر نکلنے کے لیے
جتنا زور لگاتے ہیں' اتنے ہی اس کے اندر پھنستے جاتے ہیں۔

امریکی طرز زندگی کے بارے میں ہمارے ملک میں جو اطلاعات پہنچتی ہیں وہ درست
نہیں ہوتیں۔ کوئی کوئی اس میں خامیاں نکالتا ہے لیکن اکثریت ایسی ہے جو ان کے گن گاتی
رہتی ہے۔ لیکن اصل بات کیا ہے؟ یہ صرف وہی جانتا ہے جو روزگار کی تلاش میں امریکا
جاتا ہے اور چند سال اس مشین کا پرزہ بن کر زندگی گزارتا ہے۔

غفور نے کہا "دیکھیے جناب' ٹیکسی چلانا جان جوکھوں میں ڈالنے والا ایک کام ہے۔ اگر
مسافر آپ کو مجرم نظر آتا ہے مگر آپ اس کے باوجود اس کے ساتھ جانے سے انکار نہیں کر
سکتے۔ بس یہی ہماری مجبوری ہے۔ سواری نیویارک کے دوسرے کونے پر جانا چاہے'
آدھی رات کے وقت ہارلیم جانے کی فرمائش کرے' ان کی شکلیں بھی خوفناک ہوں'
دیکھنے میں خطرناک مجرم بھی نظر آتے ہوں' ان کا لب و لہجہ بہت کرخت اور ناقابل
برداشت ہو' اس کے باوجود ہم مسافر کو "نہ" نہیں کر سکتے۔ یہ یہاں کا قانون ہے۔ اگر ہم

اس کی خلاف ورزی کریں گے تو ٹیکسی چلانے کا لائسنس چھن جائے گا۔ اب یہ آپ کی
قسمت ہے کہ سواری آپ کو لوٹ کر چھوڑ دے یا ساتھ میں مار پٹائی بھی کرے۔ ٹیکسی
ڈرائیور ایسے موقعے پر بالکل جھگڑا نہیں کرتے' پھر بھی بعض دل جلے چاقو چھری یا گولی مار
دیتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور اپنی جان سے جاتا ہے اور پولیس محض خانہ پری کر کے رہ جاتی
ہے۔"

ہم نے کہا "غفور صاحب۔ مانا کہ ٹیکسی چلانا ایک خطرناک کام ہے مگر زیادہ آمدنی کے
علاوہ اس میں کچھ اور فائدہ یا مزہ بھی تو ہو گا جو آپ لوگ اتنی بھیانک تصویر پیش کرنے کے
باوجود اس سے وابستہ ہیں۔"

وہ ہنسنے لگے۔ اتنی دیر میں چان شو اور زنجان بھی کمرے میں آگئی تھیں۔ چان شو غفور
کے صوفے کے پاس فرش پر اس کے قدموں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ زنجان دہلوی صاحب کے
صوفے کے موٹے تازے ہتھے پر سوار تھی۔ غفور نے پیار سے چان شو کے کوئلے کی طرح
کالے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور کہا "میری بیوی تو مجھ سے کہتی رہتی ہے کہ حفاظت کے لیے
پستول ساتھ رکھا کرو اور جوڈو کراٹے سیکھ لو مگر یہ دونوں خطرناک کام ہیں۔ ابھی تو مار پیٹ
کے بعد چھوڑ دیتے ہیں لیکن اگر پستول دیکھ لیا تو بے دریغ گولی مار دیں گے اور اگر میں نے
جوڈو کراٹے استعمال کیا تو ہو سکتا ہے ہڈی پسلی ہی توڑ دیں۔"

خان صاحب بہت دیر سے خاموش بیٹھے سن رہے تھے' بولے "دیکھیے جناب۔ ہم
لوگ یہاں آپ کی دکھ بھری کہانیاں سننے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ ہم تو اچھا وقت گزارنے
آئے ہیں۔ یار کوئی اچھی اچھی باتیں سناؤ۔ بلاوجہ دل جلانے والی باتیں کیوں سناتے ہو؟"

"یہ ہوئی نا بات" من من صاحب منمنائے "بس یہاں موجود تمام لوگ اپنا کوئی ایک
دلچسپ واقعہ پیش کریں تاکہ مہمانوں کا دل بہل جائے۔"

سب نے اس خیال کو بہت پسند کیا "پہلے آپ ہی شروع کریں" غفور نے کہا "اس
کے بعد دہلوی صاحب سنائیں گے۔ پھر منظور لاٹ کی باری آئے گی اور سب سے آخر میں
میزبان اپنی روداد پیش کرے گا' کیوں کیا خیال ہے؟"

چنانچہ سب سے پہلے ڈوگر صاحب نے اپنی داستان سنائی "کئی بار مجھے اتفاقاً مشہور
لوگوں کو ٹیکسی میں سوار کرنے کا موقع مل گیا۔ ایک بار نائٹ کلب کے سامنے کھڑا تھا کہ

اندر سے شور وغل کی آواز آئی اور پھر چند دیر بعد ویٹر حضرات ڈنڈا ڈولی کر کے ایک شخص
نائٹ کلب سے باہر لے کر آئے اور سامنے لان میں پھینک کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے
گئے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ صاحب نشے میں دھت تھے اور اندر کوئی زیادہ ہی گڑبڑ کر
ہوں گے۔ کچھ دیر تو وہ خاموش پڑے رہے پھر اٹھ کر بیٹھ گئے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا
کر دنیا والوں کو برا بھلا کہنے لگے۔ خلاصہ یہ تھا کہ اے رب العالمین یہ کیسی دنیا بنائی
جہاں انسانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ ایک مشہور ٹیلی ویژن اسٹار تھے جن کا نام
رابرٹ نیرو ہے۔ میں نے انہیں پہچان لیا تو ان کے پاس گیا۔

"ہائی سر۔ گڈ ایوننگ۔"

انہوں نے مجھے دیکھا اور بولے "خاک گڈ ایوننگ۔ جوئے میں سب کچھ ہار گیا۔
شراب پی کر بہک گیا۔ یہاں تک کہ کلب والوں نے باہر نکال کر پھینک دیا۔ آج کی رات
میں اچھائی کون سی ہے؟"

میں نے کہا "سوری سر۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا
ہوں؟"

بولے "میری کار یہیں کہیں کھڑی ہے مگر میں اس کا نمبر بھول گیا ہوں اور چابی
اس ہنگامے میں کہیں گر گئی ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم مجھے میرے گھر چھوڑ دو۔"

میں نے ان کا جائزہ لیا۔ وہ نشے میں بالکل دھت تھے۔ ابھی تک ہوش و حواس سے
بیگانہ تھے' میں نے کہا "مگر سر۔ کیا آپ کو اپنے گھر کا پتا یاد ہے؟"

وہ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے' بولے "میں بہت مشہور آدمی ہوں۔ مجھے
بھلا کون نہیں جانتا اور تم تو کیب ڈرائیور ہو۔ تمہیں تو یقیناً معلوم ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "سر کیب ڈرائیور ہوں' نجومی تو نہیں ہوں۔ جب تک وہاں جانے کا اتفاق
نہ ہو کیسے یاد رکھ سکتا ہوں۔"

کہنے لگے "بس تو پھر مجھے ٹیکسی میں بٹھالو۔ پتا میں خود بتا دوں گا' اس کے بعد
بھولنا تمہارا کام ہے۔ اوکے!"

"اوکے" میں نے بڑی مشکل سے سہارا دے کر انہیں ٹیکسی میں بٹھایا۔ بلکہ ٹھونس کر
اندر ڈال دیا۔

"اب فرمائیے' کدھر چلنا ہے؟"

بولے "یہ تم جانتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور تم ہو یا میں؟"

میں انہیں لے کر ایک قریبی اسنیک بار پر گیا اور گرم گرم بلیک کافی کے دو مگ انہیں
پلائے تو ان کے ہوش ذرا ٹھکانے آئے مگر پھر بھی وہ مدہوش ہی رہے۔

صرف اتنا یاد آیا کہ انہوں نے اپنی سڑک کا نام بتا دیا۔ اپارٹمنٹ پھر بھی یاد نہیں آیا۔
میں انہیں اس سڑک پر لے گیا۔ وہاں تو آسمان سے باتیں کرتی ہوئی بہت سی عمارتیں
تھیں۔ ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ نیرو صاحب قریباً سو گئے تھے۔ یکایک آنکھ کھلی تو پوچھا "میرا گھر
آ گیا؟"

میں نے کہا "سر اپارٹمنٹ بلڈنگ کا نام اور اپارٹمنٹ کا نمبر تو بتائیے؟"

بولے "وہ ایک اونچی سی عمارت ہے۔ جس میں سامنے کی طرف بہت سی کھڑکیاں
ہیں۔"

بتائیے بھلا' یہ کیا پتا ہوا۔ یکایک انہوں نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا اور سامنے
کی عمارت کو دیکھ کر بولے "بس۔ یہی بلڈنگ ہے' وہاں چلو۔"

ہم اپارٹمنٹ بلڈنگ میں چلے گئے۔ سیکیورٹی والے سے بات کی تو وہ انہیں پہچان گیا۔
اتفاق سے عمارت صحیح نکلی۔ باقی کام سیکیورٹی افسر نے پورا کر دیا۔ اب یہ ہوا کہ نیرو صاحب
کی جیب میں کچھ بھی نہیں تھا اس لیے فرمائش کی کہ میں انہیں ساتھ لے کر اپارٹمنٹ میں
جاؤں تاکہ وہ میرا کرایہ ادا کر دیں۔ میں نے ٹیکسی پارکنگ میں کھڑی کی اور سیکیورٹی افسر کی
مدد سے انہیں سہارا دے کر لفٹ تک لے گیا۔ پھر ان کے اپارٹمنٹ تک پہنچا دیا۔ انہوں
نے فوراً اندر چلنے کی دعوت دی۔ پھر خاطر مدارات شروع کی۔ وہسکی اور برانڈی سے شروع
کی اور کوک کافی تک پہنچ گئے۔ ظاہر ہے کہ کافی بھی مجھے خود ہی بنانی پڑی کیونکہ وہ اس
حالت میں نہیں تھے کہ کافی بناتے۔ میں نے کافی بنا کر خود بھی پی اور انہیں بھی پلائی۔ اب
ان کی آنکھیں ذرا کھلیں تو انہوں نے مجھے اپنے برابر صوفے پر بٹھا لیا اور بولے "تم عیسائی
ہو؟"

"جی نہیں۔ میں مسلم ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں اچھا عیسائی بنانا چاہتا ہوں۔"

"مگر میں تو ایک اچھا مسلمان ہوں۔"

"پھر بھی عیسائی بننے میں کیا حرج ہے" اس کے بعد انہوں نے عیسائیت کے بار
مجھے ایک لمبا چوڑا لیکچر دیا اور اونگھنے لگے۔

میں نے کہا "سر۔ میرا کرایہ؟"

بولے "وہ کلوزٹ میں میرا کوٹ لٹک رہا ہے اس میں سے پیسے نکال لاؤ۔"

میں نے کئی کورٹ ٹٹولے اور ایک کورٹ کی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکا
ان کے پاس پہنچا تو وہ سو چکے تھے انہیں پکارا' آوازیں دیں' ہلایا مگر وہ ٹس سے م
ہوئے بلکہ خراٹے لینے لگے۔ میں نے ان کے جوتے اتارے' کوٹ اتارا اور صو
آرام سے لٹا دیا۔ نوٹوں کی گڈی میں سے اپنا کرایہ نکالا۔ پھر خیال آیا کہ کہیں چوری ک
نہ آجائے۔ میں نے استقبالیہ پر فون کر کے سیکیورٹی افسر کو بلایا اور گن کے نوٹ ا
حوالے کیے۔

وہ بولا "سر۔ آپ فکر نہ کریں' یہ مسٹر نیرو کا روز کا معمول ہے۔ پیسے آپ ان ک
کی جیب میں رکھ دیں اور اپارٹمنٹ میں تالا ڈال کر چلے جائیں۔"

ہم دونوں اپارٹمنٹ سے باہر نکلے تو کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور لفٹ کی طرف
ایک بڑی البیلی اور خوب صورت خاتون تیزی سے ہماری طرف آئیں۔

"مسٹر نیرو کا یہی اپارٹمنٹ ہے؟"

"جی!"

"وہ اندر ہیں؟"

"جی!"

وہ دروازے کی طرف بڑھیں۔ سیکیورٹی افسر نے کہا "آپ اس وقت ان
مل سکتیں۔"

"کیوں؟"

"جی۔ وہ سو رہے ہیں۔"

"میں انہیں جگا لوں گی۔ انہوں نے مجھے آنے کا وقت دیا تھا۔"

"وقت کب دیا تھا؟"

"دوپہر کو۔"

"اب رات آدھی گزر چکی ہے افسوس کہ وہ اٹھنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔"

مس صاحبہ نے ان سنی کر کے اپارٹمنٹ کی کال بیل دبانی شروع کر دی۔ ٹاک بیک
سے بھی بات کرنے کی کوشش کی مگر اندر سے سوائے خراٹوں کے کچھ سنائی نہ دیا۔

"جہنم میں ڈالو۔ میں کوئی فالتو نہیں ہوں" وہ غصے سے مزید بل کھاتی ہوئی چلی گئی۔

میں نے کہا "یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ ان کی گرل فرینڈ واپس چلی گئی۔"

سیکیورٹی افسر مسکرایا اور بولا "فکر نہ کرو۔ یہ بھی روز کا معمول ہے۔"

ڈوگر صاحب کی داستان ختم ہوئی تو سب نے تالیاں بجائیں مگر بٹ صاحب خاموش
رہے۔

ڈوگر نے پوچھا "آپ کو یہ کہانی پسند نہیں آئی؟"

"بولے "سمجھ میں ہی نہیں آئی۔ ایک بات بتائیں گے؟"

"جی پوچھیے؟"

"کیا آپ پہلے جنم میں میمنے تھے؟"

"سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ ان آوازوں میں ڈوگر صاحب کی باریک آواز نمایاں
تھی۔

ان کے بعد ابرار دہلوی کی باری تھی۔

"قبلہ کیا عرض کروں۔ واقعات تو بے شمار ہیں مگر ایک چھوٹا سا قصہ پیش کرتا ہوں۔"

"ارشاد ارشاد" سب نے شور مچا دیا۔

"خاکسار ایک روز دن کے وقت ٹائمز اسکوائر سے گزر رہا تھا کہ ایک عینک والے'
موٹے سے آدمی نے اشارہ دیا۔ میں رک گیا۔ وہ صاحب بغل میں ایک بیگ دبائے ہوئے
تھے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

میں نے پوچھا "کہاں جائیے گا؟"

بولے "کہیں نہیں۔ بس تم ٹیکسی چلاتے رہو۔"

میں نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "کہاں چلوں؟"

"بھئی کہا جو ہے کہ سڑکوں پر ٹیکسی چلاتے رہو اور جب تک میں خود نہ بولوں تم

بالکل خاموش رہو۔"

"مگر" میں بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ انہوں نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اپنا بیگ کھو
اور اس میں سے ایک چھوٹا سا ٹائپ رائٹر نکالا۔ کاغذوں کا ایک پلندہ بھی نکالا اور بو
"دیکھو۔ ٹیکسی آہستہ چلانا اور خراب سڑکوں پر ہرگز نہ جانا۔"

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ چند منٹ بعد آواز آئی "میں یہاں سگریٹ پی سکتا ہوں؟"

"جی بالکل۔"

"تو پھر تمہارے پاس سگریٹ بھی ہوں گے۔ مجھے ایک سگریٹ دے دو اور کسی جگ
سے رک کر سالم سگریٹ کی دس بارہ ڈبیاں خرید کر دے دو۔"

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ دس بارہ ڈبیاں انہوں نے باری باری پھونکنی شروع
دیں۔ مہربانی یہ فرمائی کہ ایک کھڑکی کا شیشہ اتار لیا۔ دوپہر کے ایک بجے سے لے کر شا
کے پانچ بجے تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ میں نے نیویارک کی پر ہجوم سڑکوں سے ہٹ
نواحی علاقوں میں ٹیکسی چلانی شروع کر دی۔ وہ مسلسل ٹائپ کرنے میں مصروف رہے۔
بھی سگریٹ نوشی کرتے رہے اور ہر بار مجھے بھی ہاتھ بڑھا کر سگریٹ پیش کرتے تھے۔
بجے کے قریب انہوں نے ایک شو بزنس کی کمپنی کا پتا بتایا۔ کاغذات سمیٹ کر بیگ
رکھے۔ ٹائپ رائٹر بیگ کے دوسرے خانے میں رکھا اور پچھلی سیٹ سے ٹیک لگا
سگریٹ کے کش پر کش لگانے لگے۔ منزل مقصود پر پہنچ کر انہوں نے مجھے کرایہ دیا۔
کے مساوی ٹپ دی اور کہا "بہت خوب۔ تمہاری ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے ایک پلے مکم
کر لیا ہے۔ تم بہت اچھے آدمی ہو۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنا کارڈ میرے حوالے کیا
بولے "جب میرا پلے تھیٹر چلے گا تو تم یہ کارڈ لے کر ضرور آنا اور پھر مجھے اپنی رائے
دے دینا' اوکے!"

"تو پھر تم نے ڈراما دیکھا؟"

"جی نہیں۔ مجھے ڈرامے کا نام تک تو معلوم نہیں تھا۔ کبھی فون کر کے ان
پوچھوں گا۔"

منظور لاٹ کی داستان سب سے زیادہ دلچسپ تھی۔

"دیکھیے' یہ مغرب ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ نیویارک ہے۔ پیار محبت اور

شرمی یہاں عام ہے۔ لیکن یار ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک دن میرے ساتھ جو واقعہ
پیش آیا وہ بالکل انوکھا ہے۔"

"یعنی بے شرمی کے لحاظ سے؟" خان صاحب نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ بلکہ ہر لحاظ سے ہوا یہ کہ میں رات کے وقت مین ہٹن کی ایک معروف
سڑک سے گزر رہا تھا' یکایک ایک خاتون نے اشارہ کر کے روک لیا اور سوار ہو گئیں۔ کافی
خوب صورت اور بنی سنوری ہوئی تھیں۔ میک اپ کے بعد انہوں نے کہا "سنو۔ وہ سامنے
دوسرے بلاک کے کونے پر ایک منٹ کے لیے ٹیکسی روک دینا۔"

میں نے ایسا ہی کیا وہاں فٹ پاتھ پر ایک صاحب کھڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں ہیٹ تھا
اور کوٹ کے کالر میں پھول لگا ہوا تھا۔ ٹیکسی رکتے ہی وہ اندر داخل ہو گئے اور پچھلی سیٹ
پر بیٹھتے ہی انہوں نے رومانی مکالمے بولنے شروع کر دیے۔ خاتون بھی مسکراتی رہیں اور ان
کے مکالموں کا جواب دیتی رہیں۔ کچھ دیر بعد مکالمے سے گزر کر انہوں نے پیار و محبت کا
آغاز کر دیا۔ اس قسم کے مناظر بھی ہم لوگ ٹیکسی میں دیکھنے کے عادی ہیں اور عام طور پر
انہیں نظر انداز کر دیا کرتے ہیں۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا لیکن ان سے یہ دریافت کرنا
ضروری تھا کہ وہ جائیں گے کہاں؟

میں نے گلا صاف کر کے ان سے دریافت کیا "معاف کیجیے مگر آپ نے ابھی تک بتایا
نہیں کہ کہاں جائیں گے؟"

پہلے تو انہوں نے میری بات ہی نہیں سنی۔ پھر ان کے کانوں تک میری فریاد پہنچی تو
خاتون نے کہا "کہیں بھی چلو۔ کسی لمبی ڈرائیو پر چلو۔"

دو محبت کرنے والوں کو وقت گزارنے کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ ان کے لیے تو لمبی ملاقات
بھی منٹوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ شہر کی پر ہجوم سڑکوں سے ہٹ کر نواحی
علاقے کی طرف چلنا چاہیے۔ ایسے رومانٹک جوڑوں سے میری شناسائی پرانی ہے۔
ریستوران یا ہوٹل کے کمرے کے بجائے وہ چلتی ہوئی ٹیکسی میں ملاقات کرنا زیادہ پسند
کرتے ہیں۔ میں نے ٹیکسی کا رخ نواحی علاقوں کی طرف کر دیا مگر اچانک میری نظر بیک ویو
مرر پر پڑی تو میں ساکت رہ گیا۔ شیشہ ان دونوں کو نیم عریاں دکھا رہا تھا اور شاید وہ اس سے
بھی آگے والی منزل تک جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ان کی باتوں میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو چکی

تھی۔ میرے لیے یہ بالکل انوکھا واقعہ تھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا "معاف کیجیے سر۔ میں اپنی ٹیکسی میں ا
حرکتیں کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

مرد نے کہا "تم اپنے کام سے کام رکھو۔ تمہیں اچھی ٹپ مل جائے گی۔"

مجھے یہ بات سن کر غصہ آگیا۔ میں نے ٹیکسی کو ایک جانب فٹ پاتھ کے برابر روک
اور کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ لوگوں کو اس سے آگے نہیں لے جاسکوں گا۔ آپ
یہاں سے دوسری ٹیکسی لے لیجیے۔"

وہ دونوں حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے پھر انہوں نے اپنا لباس درست کرنا شروع کر دیا۔
خاتون نے کہا "تمہیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ دوسروں کے معاملات میں دخل
دینے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے مادام۔ یہ ٹیکسی ہے کوئی قحبہ خانہ نہیں ہے۔"
یہ کہہ کر میں نے ٹیکسی سے اتر کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔

"تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔ میں تمہاری شکایت کروں گی" خاتون نے غصے میں ا
پرس سنبھالتے ہوئے کہا "میں تمہیں ٹھیک کر دوں گی 'یو پاکی'۔"

میں نے کہا "اگر آپ نے اس کے بعد ایک لفظ بھی کہا تو میں پولیس کو بلا لوں گا۔"

"چھوڑو ڈارلنگ" مرد نے اس کا بازو تھام کر تسلی دی "نیویارک میں ٹیکسیوں کی کمی
نہیں ہے۔"

میرا بل ادا کرنے کے بعد وہ فٹ پاتھ پر کھڑے رہ گئے اور میں خدا کا شکر کرتا ہوا
رخصت ہو گیا۔

ان کی کہانی ختم ہوئی تو سب ایک لمحے کے لیے خاموش رہ گئے پھر من من
"یار۔ قصہ تو تم نے ٹھیک سنایا ہے مگر کچھ تبدیل کر دیا ہے۔"

"وہ کیوں کر؟"

"تم نے کہانی کا اینڈ بدل دیا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم مفت میں فری شو دیکھ
رہے۔"

منظور لاٹ کا چہرہ سرخ ہو گیا "مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے بھی بد

اتنا بے غیرت نہیں ہوں کہ اپنی ٹیکسی کو اس طرح تماشا گاہ بنا دوں۔ مجھے اس بات پر بہت
غصہ آیا کہ آخر ان لوگوں نے سمجھ کیا رکھا ہے۔"

"اور کیا" ابرار دہلوی نے فقرہ مکمل کیا "قبلہ کم از کم آپ سے پہلے اجازت طلب کر
لیتے تو بات اور ہو جاتی۔"

☆ ☆ ☆

اب شمع غفور صاحب کے سامنے پہنچ گئی تھی اور ان کی باری تھی۔ وہ پہلے تو مسکرائے
پھر کہا "ہم سب کو معلوم ہے کہ ٹیکسی چلانے والوں کو کس قسم کی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا
ہے۔ ہم میں سے ہر ایک ایسے واقعات کا نشانہ بن چکا ہو گا۔ دور دراز غیر آباد علاقے میں
لے جا کر ٹیکسی ڈرائیور کو لوٹ لینا۔ زخمی کر دینا۔ گولی مار دینا۔ ٹیکسی لے کر بھاگ جانا اور
ٹیکسی کو کسی خلاف قانون کام کے لیے استعمال کرنا۔ یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے مگر میرے
ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ ان سے ذرا مختلف تھا۔"

"ارشاد ارشاد" ابرار دہلوی صاحب نے دونوں ہاتھ پھیلا کر پہلے ہی سے انہیں داد دینی
شروع کر دی "مگر اس کے ساتھ ساتھ چائے کافی کا دور چل جائے تو زندگی کا لطف
آجائے۔"

غفور صاحب نے یہ سن کر اپنے قدموں میں بیٹھی ہوئی بیوی کو ایک جانب ہٹایا اور اٹھ
کھڑے ہوئے۔ یہ دیکھ کر چان شو بھی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور مسکرا کر بولی "سمجھ گئی۔
آپ لوگوں کو چائے کی ضرورت ہے؟" پھر وہ غفور سے مخاطب ہوئی "تم بیٹھو۔ میں بنا لاتی
ہوں چائے" پھر جاتے جاتے رک کر بولی "مگر میرے واپس آنے تک تم اپنی کہانی نہ سنانا۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو اردو میں سناؤں گا۔"

"تو پھر کیا ہوا؟ میں پھر بھی سننا چاہتی ہوں" یہ کہہ کر وہ تیزی سے کچن کی طرف چلی
گئی۔

"دیکھا آپ نے" منظور لاٹ نے ہمیں مخاطب کیا "ایسی خدمت گزار اور محبت کرنے
والی بیوی تو آج کل پاکستان میں بھی نہیں ملتی ہے۔ کتنا خوش نصیب ہے یہ۔"

"بس رہنے دو یار۔ جب جوڈو کراٹے کے ہاتھ دکھاتی ہے اس وقت سب پتا چل جاتا

ہے۔"

ابرار دہلوی صاحب نے فرمایا "گستاخی معاف قبلہ۔ آپ اپنی حرکتوں سے باز بھی تو نہیں آتے۔ ایک وفا شعار بیوی اپنے شوہر کی بے وفائی اور ہرجائی پن کیسے برداشت کر سکتی ہے۔"

غفور صاحب شرمندہ ہو کر مسکرائے پھر بولے "میری بددعا ہے کہ اللہ ایسی ہی بیوی آپ کو نصیب کرے۔"

وہ کہنے لگے "آپ اپنی بددعا ضائع نہ کریں۔ میری ہونے والی بیوی آپ کے سامنے بیٹھی ہے۔" یہ کہہ کرانہوں نے زنجان کا سر تھپتھپایا۔ وہ بھی مسکرانے لگی۔

بٹ صاحب سے چپ نہ رہا گیا' کہنے لگے "دہلوی صاحب۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟"

"شوق ہے؟"

"آپ ایک ایسی عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں جو کسی اور کی بیوی ہوتے ہوئے بھی آپ کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔"

"وہ تو اس لیے گھومتی ہے کہ اس کے شوہر کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"اور اگر شوہر کو اعتراض ہوتا تو آپ کے ساتھ نہ پھرتی؟"

"جی بالکل نہیں۔ پھر ہم دونوں شادی کے لیے تھوڑا انتظار کر لیتے۔"

"انتظار تو آپ اب بھی شرافت سے کر سکتے ہیں۔ مجھے تو آپ کی ساری کہانی ہی ڈراما لگتی ہے۔"

"سچ فرمایا آپ نے قبلہ یہ ڈراما ہی ہے۔ دراصل زنجان اپنے شوہر کی قرض دار ہے۔ جب تک اس کا قرض ادا نہیں کر دے گی وہ اسے طلاق نہیں دے گا۔ رہی میرے ساتھ گھومنے پھرنے کی آزادی تو یہ اس معاشرے میں کوئی بری بات نہیں ہے۔ میاں بیوی دونوں ہی اپنے کاموں میں آزاد ہوتے ہیں۔"

خان صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولے "اور قبلہ۔ اس کے باوجود آپ ایسی لڑکی سے شادی کر رہے ہیں؟"

دہلوی صاحب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور بڑی سنجیدگی سے بولے "سنئے قبلہ۔ یہ ہمارا

مقدر ہے۔ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم اپنا وطن چھوڑ کر غیر وطن میں آگئے ہیں۔ اگر ہمارے وطن میں ہمیں محنت کے بدلے روٹی اور آرام کی زندگی مل جاتی تو ہم اس سے آدھی پر بھی گزارہ کر لیتے مگر قسمت نے مہلت نہیں دی۔ رہی شادی کی بات، تو ہمارے ہم وطن نہیں چاہتے کہ ہم کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کریں۔ میں جہاں شادی کرنا چاہتا ہوں وہ لوگ راستے میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ اب میرے لیے یہاں پر رہ کر جھک مارنے کے سوا اور کیا باقی رہ گیا ہے قبلہ؟ امریکی بیوی چاہے کسی بھی ملک کی ہو پاکستانی بیویوں کی طرح تو نہیں ہو سکتی۔ ہم بھی یہاں کے دستور کے مطابق ہی زندہ رہنے کے طریقے ڈھونڈ لیں گے قبلہ۔ یہاں وفا اور محبت کا کیا کام ہے۔"

وفا کیسی' کہاں کا عشق' جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟

وہ چپ ہوئے تو محفل میں سناٹا سا چھا گیا۔ ان کی باتوں نے سب کو اداس اور دل گرفتہ کر دیا تھا۔ ان کی داستان عشق کا بھی سب کو علم تھا اور ان کی مجبوریوں کا بھی۔

غفور نے محفل کا رنگ بدلنے کے لیے کہا "قبلہ اتنے مایوس نہ ہوں۔ چان شو جیسی کوئی جاپانی لڑکی ڈھونڈ لیں۔ اس کی محبت اور وفاداری کی تو میں گارنٹی دینے کو تیار ہوں مگر آپ کی ہڈی پسلی بھی سلامت رہ جائے گی۔ یہ گارنٹی نہیں دے سکتا۔"

سب نے ہنسنا شروع کر دیا۔ جب چان شو ٹرے میں چائے کے مگ لے کر آئی تو ہم سب ہنس رہے تھے۔ دہلوی صاحب نے زنجان کے اصرار پر غفور کی باتوں کا ترجمہ زنجان کو بھی سنا دیا تھا اور وہ بھی ہنسی میں شریک ہو گئی تھی۔

چان شو نے ٹرے میز پر رکھی اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر غفور کو گھورنے لگی۔

"لو بھئی" من من صاحب نے کہا "اب آ گئی غفورے کی کم بختی۔"

"کیا تم نے اپنی کہانی سنا دی ہے؟" اس نے غفور سے پوچھا۔

غفور نے کہا "بالکل نہیں' تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ آؤ بیٹھو۔"

وہ دوبارہ غفور کے قدموں میں براجمان ہو گئی۔ سب نے اپنے اپنے مگ اٹھائے۔ چائے مزیدار تھی۔ ماننا پڑے گا کہ غفور نے چان شو کو کھانا پکانے اور چائے بنانے کی اچھی تربیت دی تھی۔

منظور لاٹ نے چان شو سے کہا "غفور تو اردو میں کہانی سنائے گا۔ تمہارے پلے کیا پڑے گا؟"

اس نے اطمینان سے کہا "میں اسے بولتے ہوئے دیکھنا پسند کرتی ہوں۔"

"یہ تو لیلیٰ مجنوں کی جوڑی ہے" ابرار دہلوی بولے۔

خان صاحب نے کہا "فرق صرف یہ ہے کہ لیلیٰ جوڈو کراٹے نہیں جانتی تھی۔"

غفور صاحب نے اپنی آپ بیتی شروع کی۔

"رات کے دس بجے ہوں گے جب ۴۸ ویں اسٹریٹ پر مجھے ایک خاتون نے اشارہ دے کر روکا اور سینٹرل پارک کی طرف چلنے کی ہدایت کی۔ خاتون بہت شائستہ، تعلیم یافتہ اور ویل ڈریس تھیں۔ صورت شکل کے علاوہ میک اپ بھی بہت اچھا تھا۔ انہوں نے ایک بہت اچھی اور قیمتی خوشبو لگا رکھی تھی جس کی وجہ سے ساری ٹیکسی مہک اٹھی تھی۔ میں نے سامنے کا شیشہ گھما کر انہیں دیکھنے کی کوشش کی۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں تو وہ مسکرائیں اور میرے دل میں گدگدی ہونے لگی۔"

"حسب معمول" منظور لاٹ نے کہا۔

"نیویارک میں ٹیکسی ڈرائیور اگر سامنے کا شیشہ گھما کر پیچھے والے مسافروں کو دیکھیں تو اسے برا نہیں سمجھا جاتا بلکہ پولیس کا کہنا ہے کہ اس طرح مسافروں پر نظر رکھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ میں نے بھی پچھلی سواری پر نظر رکھنی شروع کر دی۔ شیشے میں ہماری نظریں جب بھی ملتیں، وہ ضرور مسکراتی تھیں اور اس طرح میری حوصلہ افزائی کر رہی تھیں۔ جیسے جیسے سفر طے ہو رہا تھا میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ عورت جان بوجھ کر میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔"

"یہ بھی تمہارے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی" من من صاحب منمنائے۔

"یار چپ ہو کر سنو۔ درمیان میں کیوں بولتے ہو۔ کی، اس طرح ہمارا سفر گزرتا رہا۔ میرے دل میں آئی کہ اسے اگلی سیٹ پر آنے کی دعوت دے دوں مگر پھر خاموش رہ گیا۔ ہماری نگاہوں کا تبادلہ جاری رہا اور اسی چکر میں ایک دو بار میرا دھیان سڑک پر سے ہٹ گیا۔ ایک بار تو میں سامنے زیبرا کراسنگ پر چڑھاتے رہ گیا۔ ٹیکسی کی رفتار بے قابو ہو گئی تو ایک جگہ سائرن بجانے والے بھی آگئے اور انہوں نے مجھے پچیس ڈالر کا ٹکٹ دے دیا۔

ٹکٹ وصول کرنے کے بعد میں نے شیشے میں دیکھا تو مسافر خاتون شرارت سے مسکرا رہی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ نہ صرف میرے دل اور ہوش و حواس پر گزرنے والی حالت سے واقف تھیں بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہو رہی تھیں۔ اس طرح ہم سینٹرل پارک کے نزدیک پہنچ گئے۔

میں نے دریافت کیا "مس۔ سینٹرل پارک تو آگیا ہے۔"

وہ بولیں "دائیں جانب والی سڑک پر لے لو۔"

بائیں جانب والی سڑک پر عموماً ٹریفک زیادہ نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے وہ خاتون بھی رومانٹک موڈ میں تھیں۔ میری خوشی کی انتہا نہیں رہی اور میں نے سوچا کہ یہ اچھا موقع ہے۔"

"چان شو سے پٹنے کا" ابرار دہلوی نے فقرہ چست کیا اور سب ہنسنے لگے۔

"دیکھا آپ نے!" وہ ہم سے مخاطب ہو کر بولے "ہمارا یار بیوی سے کیوں مار کھاتا رہتا ہے؟ اپنی ان حرکتوں کی وجہ سے۔"

"مگر چان شو کو پتا کیسے لگ جاتا ہے؟" خان صاحب نے پوچھا۔

غفور نے ایک سرد آہ بھری اور کہا "شاید اس کے قبضے میں جنات ہیں۔ تب ہی یہ واقف ہو جاتی ہے۔"

"تو بھائی تم ہی باز آجاؤ" بٹ صاحب نے کہا۔

"یہ باز آنے والوں میں سے نہیں ہیں" منظور نے کہا۔

"چاہے ہڈی پسلی سرمہ ہی کیوں نہ ہو جائے" من من صاحب نے کہا۔ سب ہنسنے لگے۔

چان شو نے بڑی رسان سے کہا "آپ لوگ غفور کی بات تو سن لیجیے ابھی اس کی کہانی باقی ہے۔"

ہم سب نے حیران ہو کر چان شو کو دیکھا۔ اسے اردو بالکل نہیں آتی تھی۔ اس کے باوجود وہ غفور کی زبان سے اس کی آپ بیتی سننے کی خواہش مند تھی۔

غفور نے اپنی داستان جاری رکھی "کچھ دور جانے کے بعد اس نے ٹیکسی روکنے کی ہدایت کی۔ میں نے ٹیکسی روک دی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ پارک میں بہت کم

روشنی تھی۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی سڑک پر کوئی ٹریفک تھی۔

اس کی دیکھا دیکھی میں بھی ٹیکسی سے باہر نکلا۔ وہ میری جانب دیکھ کر بڑی ادا سے مسکرائی اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرا سارا جسم سنسنانے لگا۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر سڑک سے پرے لے گئی اور بڑی لگاوٹ بھرے لہجے میں کہنے لگی "تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟"

میں نے چونک کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا طمنچہ نظر آرہا تھا۔ صورت حال کے اس انقلاب پر میں بالکل بوکھلا گیا۔

"جو کچھ تمہارے پاس جیب میں اور ٹیکسی میں ہے چپکے سے نکال کر میرے حوالے کر دو" وہ بڑی نرمی اور لگاوٹ سے بولی "ورنہ تمہیں نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

میں نے چپکے سے اپنی جیب سے تمام رقم نکال کر اسے دے دی۔ اس نے اشارے سے گھڑی اور انگوٹھی اتارنے کو کہا۔ میں نے وہ دونوں چیزیں بھی اس کے حوالے کر دیں۔

اس نے بڑے اطمینان سے رقم گنی۔ گھڑی اور انگوٹھی کا بغور جائزہ لیا اور پھر پوچھا "اس کے علاوہ تو کچھ نہیں ہے تمہارے پاس؟"

میں نے سر ہلا دیا۔

اس نے کہا "اچھا۔ اب اچھے بچے کی طرح دوبارہ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور گاڑی موڑ لو۔"

میں نے ایسا ہی کیا کچھ دور جانے کے بعد اس نے پھر مجھے ایک جانب کار روکنے کے لیے کہا اور مجھے ٹیکسی سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ میرے ہاتھ پیر پھول گئے اور میں سمجھا کہ اب شاید میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔

"چابی میرے حوالے کرو" اس نے حکم دیا' پستول بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔

میں نے چابی اس کو دے دی۔ اس نے چابی لے کر میرے ہونٹوں کو اپنی انگلیوں سے چھوا اور مسکرا کر بولی "یہاں سے ایک کلو میٹر دور چلو گے تو تمہیں ٹیکسی مل جائے گی۔ شور مچانے کی کوشش نہ کرنا۔ اوکے؟"

میں نے کہا "اوکے!"

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر رخصت ہو گئی اور میں نے پیدل چلنا شروع کر دیا۔ کم و بیش ایک

کلو میٹر چلنے کے بعد دیکھا تو سڑک پر ایک جانب میری ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ چابی بھی اگنیشن میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا اپنے اپارٹمنٹ پر آ گیا۔"

"پھر کیا ہوا؟" منظور لاٹ نے پوچھا۔

"وہی جو ہر بار ہوتا ہے" غفور نے اداس ہو کر کہا "چان شو نے خوشبو سونگھ کر سوالات شروع کر دیے اور پھر وہی...."

"یعنی جوڈو کراٹے؟"

سب ہنسنے لگے چان شو بھی ہنسی میں شامل ہو گئی۔ پھر انگریزی میں کہنے لگی "میرا خیال ہے کہ غفور نے آپ لوگوں کو ٹیکسی ہائی جیک کرنے والی لڑکی کی کہانی سنائی ہے؟"

ہم سب اس کی اندازے پر حیران رہ گئے۔

منظور لاٹ نے کہا "مگر چان شو۔ تمہیں بعد میں جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس میں غفور بے چارے کا کیا قصور تھا۔ تم نے اس کی جان بچنے پر خدا کا شکر نہیں کیا اور جوڈو کراٹے شروع کر دیے؟"

وہ بولی "اگر اس کی نیت خراب نہ ہوتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔"

غفور صاحب کی یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ بیوی کے ہاتھوں مار کھانے کے بعد تمام واقعہ سچ سچ اور من و عن اسے سنا بھی دیا کرتے تھے۔

خان صاحب نے کہا "اسے کہتے ہیں میاں بیوی میں انڈر اسٹینڈنگ!"

رات گئے تک یہ محفل جاری رہی۔ بہت لطف آیا۔ اس کے بعد سب نے رخصت کی اجازت لی۔ ہم نے دہلوی صاحب سے بہت کہا کہ وہ بلاوجہ تکلف نہ کریں۔ ہم خود ہی ٹیکسی لے کر اپنے ہوٹل پہنچ جائیں گے مگر وہ نہ مانے' بولے "قبلہ کوئی اور ٹیکسی لینے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ میری ہی ٹیکسی لے لیں۔ اپنا بھی کچھ بھلا ہو جائے گا۔"

ہوٹل کے سامنے ہم لوگوں کو اتار کر وہ رخصت ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

"دیکھا آپ نے یہ ہے امریکا میں پاکستانیوں کی زندگی" خان صاحب نے کہا۔

"پاکستانیوں کی نہیں۔ پاکستانی ٹیکسی ڈرائیوروں کی۔"

"بڑی ٹریجڈی ہے یار۔ ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی کریں یا ان پر رشک کریں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

ہوٹل کے استقبالیہ پر پہنچے تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔ وہاں مس گارنر پورے کروفر کے ساتھ جلوہ فرما تھیں۔

"ہائی" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"اوہ" خان صاحب کے منہ سے اس خلاف توقع ملاقات پر الفاظ تک نہ نکل سکے۔

ہم نے کہا "مس۔ آپ ابھی تک یہاں موجود ہیں؟ اتنی رات گئے!"

بولیں "میں اوور ٹائم لگا رہی ہوں، پیسوں کی ضرورت ہے۔"

ہم تو اس بات پر حیران ہوا کرتے تھے کہ وہاں اس قدر خوب صورت اور خوش ادا خواتین کو بھی پیسے حاصل کرنے کے لیے کام کرنا پڑتا تھا حالانکہ ہم نے دیکھا کہ ہمارے اپنے ملک میں اس سے گئی گزری خواتین بھی محنت مشقت کیے بغیر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ انہیں کوئی نہ کوئی دولت مند اور دل پھینک شخص مل جاتا ہے اور ان کی باقی زندگی آرام سے گزر جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ شرافت کے پردے میں غیر شریفانہ کام کرتی رہتی ہے۔ کہنے کو ماڈل، اداکارہ، گلوکارہ، فن کارہ ہوتی ہیں مگر یہ سب محض پردہ داری ہوتی ہے۔ ان کے پاس کوٹھی، فرنیچر، کاریں، ملبوسات اور عیش کا سامان کہاں سے اور کس طرح آتا ہے یہ سب کے علم میں ہوتا ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ وہ سب بھی انجان بنے رہتے ہیں۔ شاید یہ بھی ہماری دوغلی معاشرتی زندگی کا ایک المیہ ہے۔

خان صاحب کا خیال تھا کہ ہمارے ملک میں لوگوں کے پاس آسانی سے مفت کی دولت آجاتی ہے۔ انہوں نے اس سے پہلے تصویروں اور فلموں کے سوا عورت دیکھی نہیں ہوتی۔ جب سچ مچ کی جیتی جاگتی، فیشن ایبل عورت انہیں سامنے نظر آتی ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے دولت کی فراوانی بھی ہوتی ہے تو وہ فوراً اپنا دل اور آنکھیں فرش کر دیتے ہیں۔ ادھر ان خاتون کو فیشن ایبل زندگی بسر کرنے کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح انہیں سوسائٹی میں مقام بھی مل جاتا ہے۔ اس طرح جب یہ دو ضرورتیں مل جاتی ہیں تو ہمارے موجودہ جدید فیشن ایبل معاشرے کا وجود عمل میں آتا ہے۔ ہمیں تو

یہ صورت حال افسوس ناک بلکہ شرم ناک ہی لگتی ہے شاید اس لیے کہ پرانے خیالات کے لوگ ہیں۔

مس گارنر کی "پروبلم" یہ تھی کہ انہیں اپنی سالگرہ کے لیے نیا ڈریس خریدنا تھا۔ پھر وہ سالگرہ منانے کے لیے اپنے بوائے فرینڈ کے ہمراہ ایک اچھی شام بھی گزارنا چاہتی تھیں۔ تھیٹر میں ڈرامے کا شو، نائٹ کلب میں تھوڑا سا جوا اور ایک اچھے سے قیمتی ہوٹل میں شاندار کھانا۔ ان تمام چیزوں کے لیے انہیں رقم کی ضرورت تھی کیونکہ دونوں کو اپنا اپنا بل خود ہی ادا کرنا تھا۔ اس لیے وہ اوور ٹائم وغیرہ لگانے پر مجبور تھیں۔ الٹی گنگا شاید اسی کو کہتے ہیں۔

نیند نہیں آرہی تھی، اس لیے ہم لوگ خان صاحب کے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ موضوع گفتگو نیویارک کے ٹیکسی ڈرائیور تھے۔ نیویارک کے علاوہ شکاگو، لاس اینجلس وغیرہ شہروں میں بھی یہی صورتحال ہے جہاں پاکستانی، ہندوستانی اور بنگلہ دیشی بہت زیادہ تعداد میں ٹیکسیاں چلاتے ہیں۔ حالات ان شہروں کے بھی کم و بیش وہی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ نیویارک میں جان کا خطرہ ذرا زیادہ ہے کیونکہ جرائم پیشہ لوگ بھی یہاں زیادہ ہیں۔ پاکستانیوں نے ہمیں بہت سے ایسے پاکستانیوں کے واقعات سنائے تھے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے نیویارک آئے تھے اور اخراجات پورے کرنے کے لیے پارٹ ٹائم ٹیکسی چلاتے تھے مگر موت کا شکار ہو گئے۔ ایک نوجوان ریاض احمد گوجر پنجاب سے آیا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ اور بہنوں کا واحد سہارا تھا۔ یہاں سے کما کر بھیجتا تھا۔ ایک بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ دوسری شادی کی تیاریاں تھیں۔ پاکستان میں ایک گھرانا اس کی طرف آس بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے ماں باپ کے لیے ایک مکان خرید کر دینا تھا، اس لیے دن رات کام کرتا تھا۔ ایک رات کسی مسافر نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا اور اس کے خواب ادھورے رہ گئے۔

نیویارک میں ٹیکسی چلانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ جان ہتھیلی پر رکھنے والا کام ہے۔ اس کے باوجود لوگ کرتے ہیں ــ

ہائے رے انسان کی مجبوریاں!

ٹیکسی ڈرائیوروں کی زندگی محض مصائب اور آنسو ہی نہیں ہوتے۔ لطیفے اور خوشیاں

بھی ہوتی ہیں مثلاً ابرار دہلوی صاحب نے ہمیں ایک واقعہ سنایا تھا۔ آپ بھی سن لیجئے۔

"نیویارک میں ایک بنگلہ دیشی ٹیکسی ڈرائیور کو ایک خاتون مسافر کی شکایت پر پولیس نے پکڑ لیا۔ خاتون نے بتایا کہ انہوں نے ایک آباد علاقے سے ٹیکسی لی اور اپنے گھر پہنچ کر ٹیکسی ڈرائیور کو کرائے کے علاوہ معقول ٹپ بھی دے دی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ڈرائیور کو پوری طرح انگریزی نہیں آتی۔ یہاں تک تو غنیمت تھا مگر ڈرائیور کو سڑکوں مقامات کے بارے میں بھی پوری آگاہی نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے 'لیفٹ' رائٹ بتا کے لیے بتاتی ہوئی وہ اپنے گھر پہنچی تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرائے کے علاوہ ٹپ بھی دے دی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ان سے رقم وصول کرنے کے بعد ان کا ہاتھ تھام لیا اور اپنی زبان میں چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگا۔ خاتون ڈر گئیں اور انہوں نے "پولیس پولیس" کا شور مچا دیا۔ فٹ پاتھ پر آس پاس لوگ رک گئے اور پولیس کار بھی آگئی۔ خاتون کی تکلیف پر پولیس والے نے ٹیکسی ڈرائیور سے حالات دریافت کیے مگر وہ اتنی کم انگریزی جانتا تھا کہ مطلب واضح نہ کر سکا۔ مجبوراً پولیس والے اسے پولیس اسٹیشن لے گئے۔ ایک بنگلہ جاننے والے ہندوستانی کی خدمات حاصل کی گئیں جس نے ٹیکسی ڈرائیور سے بات چیت کرنے کے بعد پولیس افسر کو بتایا کہ دراصل بنگلہ دیشی ٹیکسی ڈرائیور چند ماہ قبل ہی نیویارک آیا تھا اور اپنے عزیزوں کے پاس مقیم تھا۔ اس نے لائسنس کے بغیر ٹیکسی چلانی شروع کر دی تھی اور یہ اس کا پہلا دن تھا۔ جب خاتون مسافر نے اسے کرایہ اور ٹپ پیش کی تو وہ اپنی خوشی اور جذبات پر قابو نہ پا سکا اور مسافر خاتون کا ہاتھ تھام کر بنگالی زبان میں کہنے لگا "میم شاب آپ کا بہت بہت تھینک یو۔ آپ نے ہمارا بوہنی کیا ہے۔ آپ ہمارا فرسٹ پسنجر ہے آپ کا بہت بہت تھینک یو۔"

خاتون نے ڈر کر شور مچا دیا اور پولیس کو بلا لیا۔ یہ سارا واقعہ تھا۔ پولیس نے لائسنس کے بغیر گاڑی چلانے کے الزام میں ڈرائیور کو "بک" کر لیا۔

ایسے واقعات زیادہ ہونے لگے تو اب نیویارک میں ٹیکسی ڈرائیوروں کے لیے قوانین بنائے جا رہے ہیں جن کی رو سے جب تک کوئی شخص انگریزی سے معقول حد تک واقف نہ ہو گا اور نیویارک کی سڑکوں اور تمام علاقوں کے بارے میں معلومات نہ رکھتا ہو گا

اسے لائسنس جاری نہیں کیا جائے گا مگر قانون بنانا ایک بات ہے اور اس پر عمل در آمد کرنا کچھ اور بات ہے۔ نیویارک والے بھی قانون کے بارے میں ہم سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاعدے قانون کے باوجود انگریزی سے نابلد اور نیویارک کے جغرافیہ سے ناواقف لوگ بھی مزے سے ٹیکسیاں چلا رہے ہیں۔ جب پکڑے جاتے ہیں تو جرمانہ ادا کر دیتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

بٹ صاحب کافی دیر سے گم صم تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید ٹیکسی ڈرائیوروں کے واقعات سن کر جذباتی ہو گئے ہیں۔

خان صاحب انہیں تسلی دینے کے لیے بولے "چھوڑ یار بٹ۔ دنیا میں ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ فلمی شاعر نے ٹھیک ہی تو کہا ہے کہ دنیا میں خوشی کے ساتھ غم بھی ہوتے ہیں اور جہاں باجے بجتے ہیں وہیں رونا پیٹنا بھی ہوتا رہتا ہے۔"

بٹ صاحب بولے "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ ہم مس گارنر کی مدد کر دیں۔"

ہم دونوں نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "کیسی مدد؟"

"یار اس غریب کو پیسوں کی ضرورت ہے۔ ہم تھوڑا سا چندہ اکٹھا کر کے اس کو دے دیں۔"

خان صاحب بگڑ گئے "ہوش کرو بٹ۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ وہ کوئی فقیرنی تو نہیں ہے۔ وہ ہم سے بھیک کیوں لے گی۔ یہ پاکستان نہیں' امریکا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کتنی خوبصورت اور تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ بینک میں کام کرتی ہے۔"

ہم نے کہا "سب کچھ ٹھیک ہے مگر وہ لڑکی نہیں ہے' اچھی خاصی عورت ہے۔"

بولے "ہاں' مگر کم عمر عورت ہے اور خوبصورت بھی ہے۔ اگر ہمارے ملک میں ہوتی تو کسی وڈیرے یا صنعت کار کی مہربانی سے عیش کر رہی ہوتی۔ بہت بڑے بنگلے میں رہتی ہوتی۔ شاندار کار میں گھومتی پھرتی۔ نوکر چاکر' عیش و آرام سبھی کچھ حاصل ہو جاتا مگر یہ ایک شریف عورت ہے اس لیے خوب صورت ہونے کے باوجود پریشان ہے۔"

ہم نے کہا "معاف کیجیے۔ وہ شریف عورت نہیں ہے۔ حالات سے مجبور ہے۔ اگر اسے کوئی عیش کرانے والا وڈیرہ مل جائے تو ایک منٹ بھی نہیں سوچے گی' فوراً اس سے شادی کر لے گی۔"

بولے "یہاں وڈیرے نہیں ہوتے۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ پیسے والے دوسرے لوگ بھی ہوتے ہیں مگر وہ ہمارے پیسے والوں کی طرح ترسے ہوئے نہیں ہوتے۔ نہ ہی یہاں خوب صورت لڑکیوں کا کال ہے..... پھر جب مفت میں آجائیں تو پیسے کوئی کیوں خرچ کرے؟"

"پھر بھی کسی کی مدد کرنے میں کیا حرج ہے؟" وہ بدستور اصرار کرتے رہے "اور ہماری خاطر تم لوگ دس پندرہ ڈالر بھی نہیں خرچ کرسکتے؟"

مجبوراً ہم دونوں نے انہیں پندرہ پندرہ ڈالر دے دیے۔ بیس پچیس ڈالر انہوں نے اپنے پاس سے ملا لیے اور دوسرے دن بے چینی سے مس گارنر کا انتظار کرنے لگے۔ وہ دس بجے کے قریب تشریف لائیں تو رات کی ڈیوٹی سرانجام دینے کے باوجود تروتازہ اور شگفتہ نظر آرہی تھیں۔

بٹ صاحب نے کہا "خان صاحب۔ آپ اس سے بات کریں۔"

"نہ بابا۔ مجھے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بٹ صاحب نے التجائی نظروں سے ہمیں دیکھا "آفاقی صاحب۔ آپ یہ پچاس ڈالر ہم لوگوں کی طرف سے مس گارنر کو دے دیں۔"

خان صاحب کہنے لگے "بہت شور مچائے گی وہ۔ ایسا نہ ہو کوئی اور مصیبت پڑ جائے۔"

ہم نے کہا "یار ایسی بھی کیا بات ہے۔ لاؤ مجھے وہ پچاس ڈالر۔"

پچاس ڈالر لے کر ہم مس گارنر کی طرف بڑھے "ہائی!"

"ہائی" وہ مسکرائیں "کیا آپ لوگ چیک آؤٹ ہو رہے ہیں؟"

"نہیں۔ ابھی تو ہم کل صبح تک نیویارک میں ہیں۔"

"ویلکم" وہ پھر مسکرانے لگیں اور بیگ سے کیوٹیکس نکال لی۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنا میک اپ شروع کرتیں، ہم نے ہمت کر کے کہا "مس گارنر آپ برا نہ مانیں تو ہم کچھ پوچھیں؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں؟" وہ ہماری جانب متوجہ ہو گئیں۔

"آپ کی سالگرہ کب ہے؟"

"پرسوں..... مگر یہ نہ پوچھنا کہ کون سی سالگرہ ہے؟" وہ ہنسنے لگیں۔

"ہم ایسی غلطی نہیں کرسکتے۔ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم تو کل صبح یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ آپ کے ملک اور شہر میں آکر ہمیں بہت سی خوشیاں ملی ہیں۔ آپ کی مہمان نوازی بھی ہم کبھی نہ بھول سکیں گے۔"

"شکریہ" انہوں نے ایک ناخن پر کیوٹیکس لگانی شروع کر دی۔

"بات یہ ہے کہ ہم آپ کو سالگرہ کا تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا؟" انہوں نے چونک کر ہمیں دیکھا۔ ہمارے پیچھے کھڑے ہوئے خان صاحب اور بٹ صاحب نے بھی سرہلا کر ہماری تائید کی۔

وہ سوالیہ نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔

ہم نے کہا "یہ ایک ناچیز سا گفٹ قبول کریں تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔" یہ کہہ کر ہم نے پچاس ڈالر ان کی خدمت میں پیش کر دیے۔ انہوں نے ڈالرز دیکھے، پھر بے اعتباری سے ہماری جانب نگاہ کی، اس کے بعد خان صاحب اور بٹ صاحب پر نگاہ ڈالی۔

بٹ صاحب نے کہا "یہ ہم سب کی طرف سے ہے؟"

ہمارا خیال تھا کہ وہ ناراض ہو گی۔ احتجاج کرے گی۔ کہے گی کہ یہ کیا بدتمیزی ہے کہ ایک جوان عورت کو سالگرہ کے تحفے کے لیے ڈالرز دے رہے ہو۔ کیا تمہارے گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں۔ یا پھر کہے گی کہ اس تکلف کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ شکریہ، میں یہ تحفہ قبول کرنے سے قاصر ہوں وغیرہ وغیرہ۔

مگر ہوا یہ کہ مس گارنر نے ایسی کوئی بات بھی نہیں کی۔ انہوں نے ایک کپڑے سے بڑی نزاکت کے ساتھ اپنے ناخن پر سے نیل پالش صاف کی اور ہمارے ہاتھ سے ڈالرز لے کر بولیں "شکریہ بہت سا۔"

"تھینکس اے لاٹ" یہ کہنے کے بعد انہوں نے دوبارہ چھوٹا سا برش سنبھال لیا اور نئے سرے سے ناخن پر پالش لگانی شروع کر دی۔

ہم تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بٹ صاحب کا خیال تھا کہ وہ خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ محبت سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر محبت بھرے مکالمے بولے گی اور کہے گی کہ چھوڑیں، خاک ڈالیں میرے بوائے فرینڈ پر۔ آپ ہی میرے ساتھ سالگرہ منائیں۔ وغیرہ۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اس نے ایک معمول کے مطابق ہم سے پیسے وصول کیے، نہ

زیادہ خوشی کا اظہار کیا' نہ تشکر کا اور بس۔

بٹ صاحب کہنے لگے "یار ان لوگوں کا تو خون ہی سفید ہے۔ کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا ان پر۔"

خان صاحب بولے "کیا آپ نے یہ تحفہ اثر دیکھنے کے لیے دیا تھا؟"

بٹ صاحب خاموش ہو گئے۔ ہمیں شیخ سعدی کی وہ مثل یاد آگئی کہ اول نقصان مال دوئم شماتت ہمسایہ۔ یعنی ایک تو مال گیا' دوسرے ہمسائے کی جلی کٹی باتیں بھی سننی پڑیں معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سعدی کو بھی اسی قسم کے کسی واقعے سے دو چار ہونا پڑا ہو گا۔

☆ ☆ ☆

وہ دن ہم لوگوں نے سڑکوں پر گھومتے ہوئے گزارا۔ جس طرف منہ اٹھا چل پڑے۔ جہاں جی چاہا انڈر گراؤنڈ میں سوار ہو گئے۔ جہاں چاہا نکل کر گھومنے لگے۔ سڑکوں اور علاقوں سے ہمیں کوئی سروکار نہ تھا اور ان کے نام یاد کر کے کرتے بھی کیا۔ ہمیں تو نیویارک دیکھنے سے غرض تھی۔

ہم نے اب تک آپ کے سامنے نیویارک کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ فلک بوس سیمنٹ اور لوہے سے بنی ہوئی عمارتوں کے جنگل جیسا ہے۔ جس میں لاکھوں انسان خونخوار درندوں یا معصوم شکار کے مانند گھومتے پھر رہے ہیں اور موقع پاتے ہی اپنے شکار کو دبوچ لیتے ہیں۔ ایک افراتفری کا عالم ہے۔ جہاں سانس لیتے ہوئے بھی دم گھٹتا ہے۔ اگر آپ اس نتیجے پر پہنچے ہیں تو یہ بھی درست نہیں ہے۔ نیویارک اگر سیمنٹ اور لوہے کا جنگل ہے تو اس میں رنگ و نور بھی ہے۔ روشنیوں کی بہتات بھی ہے۔ پارکوں میں تو پھول کھلتے ہی ہیں' سڑکوں کے کنارے بھی سرسبز درخت موجود ہیں۔ فٹ پاتھوں پر گملوں میں پھول پتے سجے ہوئے ہیں اور تو اور پیدل راہ گیروں کے لیے مخصوص سڑکوں پر پھول والے گلدستے اور رنگ برنگے پھول سجائے بیٹھے ہیں اور گلفروشی میں مصروف ہیں۔ گلفروش مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ بعض جگہ خوش ادا خواتین پھولوں کے درمیان بذات خود ایک شگفتہ پھول کی مانند دکھائی دیتی ہیں۔ سڑکوں کے کنارے فٹ پاتھ پر ریستورانوں میں خوب صورت چہرے اور خوش شکل جوڑے خوردو نوش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ آس پاس گھومنے والوں کا ہجوم ہے۔ بلکہ ہجوم رنگ و بو کہنا زیادہ درست ہو گا۔ ایسی سڑکیں اور گلیاں بھی ہیں جن پر کسی بھی قسم کی سواری کا گزر نہیں ہو سکتا۔ پیدل چلنے والوں کی حکمرانی ہے یا پھر مختلف چھوٹے چھوٹے دکاندار' یا رنگین چھاتوں والے ریستوران ہیں جن کی وجہ سے ماحول میں رنگینی سی پیدا ہو گئی ہے۔ بعض مقامات پر آرٹسٹ حضرات و خواتین

کرسیاں اور اسٹول بچھائے بیٹھے راہ گیروں اور سیاحوں کی تصاویر بنانے میں مصروف نظر
آتے ہیں۔ پندرہ بیس ڈالر میں اسی وقت آپ کا خاکہ بنا کر آپ کے حوالے کر دیں گے
سیاحوں کے علاوہ نوجوان جوڑے بہت شوق سے تصویریں بنواتے ہیں اور یادگار کے طور
ہمراہ لے جاتے ہیں۔ شہر کے بعض علاقے گندے تو بعض نہایت صاف و شفاف بھی ہیں
ہمارے خیال میں نیویارک کی خرابیوں کا ایک سبب کثرت آبادی کے علاوہ یہ بھی ہے
مختلف اقوام کے لوگ بہت بڑی تعداد میں آباد ہو گئے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی
بسر کرنے پر مصر ہیں۔ ایک کروڑ سے بھی زیادہ بھانت بھانت کے لوگوں کو سنبھال کر رکھنا
کوئی مذاق تو نہیں ہے۔

ٹائمز اسکوائر اور براڈوے کی اپنی ہی انفرادیت ہے۔ یہ سڑکیں تھیٹروں، سینما گھروں
نائٹ کلبوں اور سیکس کی دکانوں سے بھرپور ہیں۔ روشنی کا سیلاب ہے۔ انسانوں کا سمندر
ہے کہ موجیں مارتا رہتا ہے پھر اس سمندر میں موٹر کاروں کے مگرمچھ بھی بہت بڑی تعداد
میں موجود ہیں اور موقع پاتے ہی انسانوں کو لقمہ اجل بنا دیتے ہیں۔ ٹائمز اسکوائر اور براڈوے
کی رونقیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ عریانی تو یہاں ایک بے معنی لفظ ہے ان
خوب صورت سینما گھروں کے اوپر عریاں تصاویر دیکھ کر ذرا بھی حیرت نہیں ہوتی۔ دراصل
یہ سب چیزیں ماحول کا حصہ ہوتی ہیں۔ اگر ذرا سی بھی عریانی دیکھ کر لاہور اور کراچی میں
آپ کی آنکھیں پھٹ کر رہ جاتی ہیں تو نیویارک میں بہت سی عریانی دیکھ کر بھی آپ
قسم کی سنسنی یا جذباتیت محسوس نہیں کرتے۔ جب اس چیز کی ہر طرف بہتات ہے تو
سنسنی کیسی اور جذباتیت کس بات کی؟

برائنٹ پارک وہ جگہ ہے جہاں ۱۹۵۳ء میں عالمی میلہ منعقد ہوا تھا۔ یہ عمارتیں
تفریح گاہیں بعد میں مستقل حیثیت اختیار کر گئیں اور یہ سیاحوں کے لیے ایک پرکشش
مقام بن گیا مگر پھر ایک بار یہاں آتشزدگی ہو گئی اور یہ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ برائنٹ
پارک بہت خوب صورت اور قابل دید جگہ ہے لیکن محض دن کے اوقات میں۔ اندھیرا
جانے کے بعد اس طرف جانے کی ممانعت کی جاتی ہے کیونکہ ہر طرح کے جرائم رونما ہوتے
ہیں چوری، ڈاکہ، قتل، آبروریزی، منشیات کا استعمال ہر چیز کی بہتات ہے اس لیے نہ صرف
سیاحوں کو بلکہ مقامی آبادی کو بھی ہدایت کی جاتی ہے کہ اندھیرے کے بعد اس طرف کا رخ

ہرگز نہ کریں۔ ہم وہاں گئے تو سیاحوں اور تفریح کرنے والوں کی ٹولیاں گھوم رہی تھیں۔
خوب صورت روشن چہرے اور قیامت خیز اجسام ہر طرف جلوہ گر تھے۔ ہنسی، قہقہے، تصاویر
اتاری جا رہی تھیں۔ اگر آپ کے پاس کیمرہ نہیں ہے تو باغ میں موجود صاحب آپ کی
تصویر اتار دیں گے اور کھال بھی۔ یعنی اس تصویر کا اتنا معاوضہ طلب کریں گے کہ آپ
سوچیں گے کہ ان میں تھوڑے سے پیسے ڈال کر خود ہی ایک کیمرہ کیوں نہ خرید لیں۔

ایک صاحب نے بے خبری میں ہم تینوں کی تصویر بنالی اور پھر ہمارے پاس لے آئے۔

"تھرٹی ڈالرز سر" انہوں نے تصویر پیش کرتے ہوئے مدعا بیان کیا۔

"یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"تو پھر بیس ڈالر دے دیجئے۔"

"نہ بابا۔ ہمیں تصویر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

"تصویر کی ضرورت کیسے نہیں ہوتی سر" اس کے بعد انہوں نے تصاویر کی ضرورت،
اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالنی شروع کر دی۔

بٹ صاحب نے تنگ آکر اردو میں کہا "بس بابا۔ معاف کر دو۔"

مگر وہ معاف کرنے والے نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے پانچ ڈالر لے کر ٹلے۔

میوزیم اور لائبریریاں اس شہر میں بھی بے شمار ہیں۔ کرسٹل پارک کے عقب میں
نیویارک پبلک لائبریری کی جدید اور شاندار عمارت ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ
لائبریریاں بھی اتنی اتنی بڑی اور شاندار بنا دیتے ہیں۔ یہ جدید آرٹ کے فن تعمیر کا نمونہ
ہے اونچے اونچے ستون اور ان کے ساتھ دیوار نما چیز۔ اونچے چبوتروں پر ان ستونوں کو کچھ
اور اونچائی دے کر بنایا گیا ہے۔ لائبریری تک جانے کے لیے بہت کشادہ سیڑھیاں ہیں جن
پر ہر وقت ایک ہجوم رہتا ہے۔ سیڑھیاں چڑھنے والوں کا نہیں، بیٹھنے والوں کا۔ بقیہ عمارت
کی طرح یہ سیڑھیاں بھی سفید پتھر کی ہیں۔ یہاں کبھی احتجاج کرنے والے بھی آکر قبضہ جما
لیتے ہیں مگر عموماً یہاں سیربین اور سیاحوں کی ٹولیاں ہی نظر آتی ہیں اور کسی قسم کے سنسر کی
پابندی نہیں ہے اس لیے ہر قسم کی حرکتیں جائز اور روا سمجھی جاتی ہیں۔ کسی کو کسی سے
سروکار نہیں ہے اس لیے ہر کوئی بے روک ٹوک اپنی دل پسند حرکتوں میں مصروف رہتا
ہے۔ نیویارک پبلک لائبریری کی وسیع و عریض عمارت کے سامنے پتھر کے دو بڑے بڑے

شیر بنے ہوئے ہیں۔ سیاح ان شیروں کی خوب تصویریں اتارتے ہیں۔ ایک امریکن سے ہم نے پوچھا کہ لائبریری کے سامنے اتنے بڑے بڑے شیر بنانے کی کیا ضرورت ہے۔"

بولے "حفاظت کے لیے۔"

پوچھا "کس کی حفاظت۔ لائبریری کی یا لائبریری میں جانے والوں کی؟"

وہ مسکرانے لگے، بولے "ارے صاحب، بس سجاوٹ کی چیز ہے۔ پتھر کے شیر بھلا کس کی حفاظت کریں گے؟"

نیویارک پبلک لائبریری کے اندر جانے کی ہمیں جرات ہی نہیں ہوئی۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا اور یہ لائبریری دنیا کی عظیم ترین کتب خانوں میں سے ایک ہے۔ اس میں کروڑوں کتابیں ہیں۔ کروڑوں نادر مسودے ہیں اور پڑھنے والوں کے لیے بہت سے بڑے بڑے ہال ہیں۔ یہاں وقفوں سے کتابوں کی نمائشیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ لائبریری کے بیرونی حصے پر ایک جگہ لکھا ہوا ہے کہ اگر آپ علم پھیلانے کے قائل ہیں تو دو ڈالر چندہ مرحمت فرمائیں۔ بے شمار لوگ دو ڈالر ڈال دیتے ہیں۔ لائبریری میں اور نمائشوں میں داخلہ بالکل مفت ہے۔ نیویارک میں بعض مقامات پر عمارتوں کے عقب میں یا دامن میں قبرستان بھی نظر آجاتے ہیں۔ بھئی ظاہر ہے کہ کروڑوں کی آبادی والے اس شہر میں ہزاروں تو ہر روز مرتے ہوں گے۔ آخر ان کی رہائش اور آباد کاری بھی ضروری ہے۔ ہم نے یہاں چند قبرستان گزرتے ہوئے دیکھے اور بہت متاثر ہوئے۔ یہ صحیح معنوں میں پرسکون اور خاموش بستیاں ہیں۔ شہر کے ہنگاموں کے اندر رہ کر بھی ان سے بہت دور۔ یہاں ٹریفک کی آوازیں بھی زیادہ نہیں آتیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نہایت صاف ستھری جگہیں ہیں۔ انگریزوں کے قبرستان میں عام طور پر اونچی قبریں اور قبروں کے چبوترے نہیں بنائے جاتے۔ ہموار سبزہ زار ہوتے ہیں جن کے درمیان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے قبریں بنی ہوئی ہیں۔ پودے، درخت اور پھول بھی لگے ہوتے ہیں۔ قبرستان کاہے کو ہیں، خوب صورت مقامات ہیں۔ ہمارے قبرستانوں کے مقابلے میں تو انہیں سیرگاہیں کہا جا سکتا ہے۔ لاہور کے میانی صاحب کے قبرستان میں تو سنا ہے کہ ایک ایک قبر میں درجنوں افراد باری باری دفن کیے جا چکے ہیں۔ شاید اسی لیے اسلام نے کہا ہے کہ قیامت کے روز ہر قبر میں سے لاتعداد مردے برآمد ہوں گے۔ پتا نہیں کہ نیویارک کے قبرستانوں میں کیا صورت حال ہے۔ فی مردہ ایک

ہی قبر الاٹ کی جاتی ہے یا ایک ہی قبر مختلف لوگوں کو باری باری الاٹ کردی جاتی ہے؟

خان صاحب جب دو تین قبرستان دیکھ چکے تو ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولے "جی چاہتا ہے مر کر یہیں دفن ہو جائیں۔"

بٹ صاحب بگڑ گئے "لاحول ولا قوۃ کیسی باتیں کرتے ہو۔ انگریزوں کے قبرستان میں دفن ہونا چاہتے ہو۔ تم کیسے مسلمان ہو؟"

وہ بولے "جو انسان زندگی میں انہی جگہوں پر رہنا چاہتا ہے وہ مرنے کے بعد بھی اچھا اور پرسکون ماحول چاہتا ہے۔"

"مگر یہ تو فرنگیوں کا قبرستان ہے، عیسائیوں کا۔"

"یار جہالت کی باتیں مت کرو۔ یہ زمین تو اللہ کی ہے نا۔ اس میں جو بھی چاہے دفن ہو سکتا ہے۔ اللہ میاں کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔"

"چیز مین ہٹن بینک" کے اشتہار تو آپ نے بھی دیکھے ہوں گے۔ یہ نیویارک کا مشہور و معروف بینک ہے۔ اس کی عمارت دیکھی تو حیران رہ گئے۔

خان صاحب بولے "اس بلڈنگ کو دیکھنے کے لیے زمین پر لیٹنا پڑے گا ورنہ پوری نظر نہیں آئے گی۔"

ہم نے کہا "جتنی نظر آرہی ہے۔ اسی پر گزارہ کرلو۔ اطمینان رکھو، جو نظر نہیں آرہا وہ بھی اسی عمارت کا حصہ ہے۔"

چیز مین ہٹن کی عمارت ۶۵ منزلہ ہے۔ اس عمارت کو اس انداز سے سجایا گیا ہے کہ اس پر عجائب گھر کا گمان گزرتا ہے۔ جاپانی آرٹ کے نمونے اور مجسمے جابجا استادہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ جاپان اور فرانس کے مشہور ماہرین تعمیرات نے اس عمارت کو ڈیزائن کیا تھا اور اس کی آرائش کا بندوبست کیا تھا۔ ہمارے بینکوں پر تو بینکوں کا گمان بھی نہیں گزرتا۔ ایسا شور وغل اور بدنظمی ہے کہ مچھلی بازار معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یہاں کے بینک بھی میوزم اور عجائب خانے لگتے ہیں۔ ذوق اور سلیقے کی بات ہے ورنہ بینکوں میں پیسے کی کمی تو ہوتی نہیں ہے۔ بینک کی اس عمارت میں پندرہ ہزار کے لگ بھگ لوگ کام کرتے ہیں۔ اچھا خاصا چھوٹا سا شہر سمجھ لیجیے۔

براڈوے اور وال اسٹریٹ دو مختلف دنیاؤں کے نام ہیں۔ براڈوے فنون لطیفہ کا مرکز

ہے۔ جب کہ وال اسٹریٹ پر روپے پیسے کا کاروبار ہوتا ہے اور ان حضرات کو بظاہر فنون لطیفہ سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہوتی۔ ان کی زندگی کا مقصد دو کو چار کرنا ہوتا ہے۔ وال اسٹریٹ پر اسٹاک ایکسچینج کی عمارت انتہائی وسیع و عریض ہے۔ کاروبار کے اوقات میں یہاں وہ شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہر شخص بولنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ سننے کی مہلت کسی کے پاس نہیں ہے۔ پھٹے ہوئے کاغذ فرش پر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

خان صاحب بولے "ذرا اچھی طرح دیکھ لو۔ کہیں ڈالر نہ ہوں۔"

ہم نے کہا "امریکیوں کو آپ کیا سمجھتے ہیں۔ یہ پاگل پن میں بھی ڈالر پھاڑ کر نہیں پھینکتے۔ اگر پھینکتے ہیں تو صرف بینکوں میں پھینکتے ہیں۔"

پرل اور براڈوے اسٹریٹ کے نکڑ پر بھی ایک میوزیم ہے۔ ۱۷۱۹ء میں یہ ایک رہائشی مکان تھا۔ بعد میں اسے سرائے بنا دیا گیا۔ یہ بہت تاریخی جگہ ہے۔ اس کے ایک ہال میں امریکی صدر جارج واشنگٹن صاحب نے دسمبر ۱۷۸۳ء میں بغاوت فرو کرنے کے عزم سے جانے والے فوجیوں کو رخصت کیا تھا۔ اللہ کی مہربانی سے بغاوت کچل دی گئی ورنہ ذرا سوچئے کہ اگر امریکی سول وار کا نتیجہ برعکس نکلتا تو آج امریکا کا کیا حال ہوتا؟ مغرب والوں کو عادت ہے کہ کسی جگہ یا عمارت سے کوئی واقعہ منسوب ہوتا ہے تو اسے سنبھال کر رکھتے ہیں اور میوزیم بنا دیتے ہیں۔ اس عمارت میں بھی ان دنوں میوزیم قائم ہے جسے امریکی تاریخ اور کلچر کے میوزیم کا نام دیا گیا ہے۔ امریکا کی ابتدائی تاریخ کے زمانے کی فلمیں اور تصویریں بھی یہاں دکھائی جاتی ہیں۔ اس طرح یہ لوگ اپنے ماضی کو یاد کرتے رہتے ہیں اور ہم! اس عمارت کی زیریں منزل میں ایک خوب صورت ریستوران بھی ہے۔

ہم آپ کو بتا رہے تھے کہ براڈوے اور وال اسٹریٹ تو اپنی مخصوص قسم کی مصروفیات کے باعث مشہور ہیں مگر ان دونوں کے درمیان میں نیویارک کا مشہور زمانہ "ٹرینٹی چرچ" بھی واقع ہے۔ یہ عمارت ۱۸۴۶ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ خدایا' ان لوگوں کو پرانی تاریخیں کس طرح یاد رہ جاتی ہیں اور یہ اپنی پرانی عمارتوں کو کس طرح سنبھال کر رکھتے ہیں؟ یہ گوتھک طرز کے نمونے پر بنایا گیا ہے اور اس کے دروازے جست کے ہیں۔ یہاں اٹھارویں صدی کا ایک گھنٹا بھی نصب ہے۔ برابر میں ایک قبرستان بھی ہے جس میں نامور لوگ دفن ہیں۔

یہ گرجا تو خیر ہے ہی مگر اس کے آس پاس کا تمام علاقہ دور دور تک اس کی ملکیت ہے۔ ان تمام عمارتوں سے جو کرایہ وصول ہوتا ہے وہ گرجا کی دیکھ بھال پر اور دوسرے رفاہی کاموں پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اس چرچ کے بارے میں سب کا یہی کہنا ہے کہ صاحب' یہ تو بہت مالدار گرجا ہے۔ پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے اس کے پاس۔

☆ ☆ ☆

سارا دن نیویارک میں مارے مارے پھرے۔ شام ڈھلے ہوٹل میں پہنچے تو ارادہ تھا کہ غسل کر کے کچھ دیر آرام کریں گے مگر صرف نصف پروگرام ہی پورا ہو سکا۔ یعنی غسل تو کر لیا مگر آرام نہ کر سکے۔ غفور صاحب اور ابرار دہلوی ہمیں تلاش کرتے ہوئے ہوٹل پر پہنچ گئے۔ ابرار دہلوی کی آمد کا سبب تو ایک اور بھی تھا کہ ان کی محبوبہ کچھ فاصلے پر ایک ریستوران میں ویٹنگ کے فرائض سرانجام دیتی تھیں اور وہ اس طرف سے گزرتے ہوئے چند لمحے ان کے ریستوران کی چھاؤں تلے بھی گزار لیتے تھے اور اپنی محبوبہ کا شربت دیدار نوش کرنے کے ساتھ ساتھ رقیب روسیاہ سے ہیلو ہیلو بھی کر لیتے تھے۔ یہ انوکھا عشق ہم نے صرف نیویارک ہی میں دیکھا تھا۔ نہ اس سے پہلے کہیں دیکھا اور نہ اس کے بعد کبھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

ابرار دہلوی پہلے تو ہمیں سامنے والے ریستوران میں لے گئے " قبلہ۔ تھوڑی دیر بیٹھیں گے۔ کافی پئیں گے' ذرا تازہ دم ہو جائیں گے۔"

بٹ صاحب نے کہا "قبلہ تازہ دم تو آپ ہوں گے اپنی محبوبہ کو دیکھ کر۔ ہم تو "باسی دم" ہی رہیں گے۔"

کہنے لگے "بڑے افسوس کا مقام ہے قبلہ۔ ہماری خوشی میں آپ خوش نہیں ہیں کیا؟ آپ کہیں گے تو کبھی پلٹ کر اس طرف کا رخ نہیں کروں گا۔ محبوبہ آپ سے بڑھ کر تو نہیں ہے۔ دوست یہاں نہیں ملتے۔ محبوبائیں تو قدم قدم پر بے بھاؤ مل جاتی ہیں۔"

زنجان نے ہم لوگوں کو دیکھتے ہی مسکرانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی "پروبلم" ہمیں قبلہ نے بتا دی تھی۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ اس کے ماں باپ کو مکان خریدنے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ ڈاؤن پے منٹ تو وہ کر سکتے تھے مگر کوئی باقاعدہ ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ ادھر

زنجان کا اپنے اطالوی عاشق کے ساتھ رومان چل رہا تھا جو خاصا کھاتا پیتا تھا۔ اس نے فوراً
پیش کش کر دی کہ اگر زنجان اس سے شادی کر لے گی تو وہ یہ رقم قرض کے طور پر دے
دے گا اور آسان قسطوں میں وصول کر لے گا۔ اسے معلوم تھا کہ زنجان صحیح معنوں میں
اس سے محبت نہیں کرتی لیکن مجبور ہے۔ اسی لیے اس نے قرضے کی واپسی کے لیے بڑی
آسان قسطیں رکھی تھیں۔ اس لیے کہ جتنی زیادہ دیر میں رقم ادا ہو گی اتنے ہی عرصے تک
زنجان اس کی بیوی رہے گی۔

زنجان کو اپنا شوہر نہ تو پسند تھا اور نہ ہی ناپسند۔ وہ لاطینی امریکا کے رہنے والوں کی طرح
ایک بدذوق آدمی تھا جس کے ساتھ زنجان جیسی زندہ دل لڑکی کا گزارہ مشکل تھا۔ اس کی
زندگی کا مقصد محض دولت کمانا تھا جب کہ زنجان زندگی کو ہر رنگ میں دیکھنا اور اس سے
لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ کچھ عرصے تک یہ گاڑی ٹھیک ٹھاک چلتی رہی یہاں تک کہ
ایک دن قبلہ ابرار دہلوی زنجان کے ریستوران میں اور اس کے راستے اس کی زندگی میں
داخل ہو گئے۔

ہم نے کہا "قبلہ۔ اتنی محبت ہے تو پھر اپنی محبوبہ کا قرضہ کیوں نہیں اتار دیتے؟"
کہنے لگے "حضور والا۔ اس کا قرضہ اتاروں یا پہلے اپنی ماں بہن کا قرضہ اتاروں؟" ہم
نے یہ جواب سن کر لاجواب ہو گئے۔

زنجان نے لپک جھپک کافی لا کر میز پر رکھ دی۔ شوہر نامدار نے بھی دور بیٹھے بیٹھے ہاتھ
ہلا کر دہلوی صاحب کو اور ان کی معرفت ہم سب کو "ہائی" کہا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹہلتے ہوئے
خود بھی ہماری میز پر آ گئے اور قبلہ سے کہنے لگے "آج زنجان آپ کے ساتھ ڈیٹ پر نہ جا
سکے گی۔"

"کیوں؟"

"اس کی آج میرے ساتھ ڈیٹ ہے۔ یہ تاریخ ہم نے دس دن پہلے مقرر کر لی تھی۔
کیوں زین؟" گویا زنجان کو پیار میں زین کہتے تھے۔

اس نے فوراً گردن ہلا کر ان کی تصدیق کر دی۔ ان کے جانے کے بعد خان صاحب
نے قبلہ سے پوچھا "آپ زنجان کو پیار میں کیا کہتے ہیں؟"

بولے "زنجو۔ دراصل پاکستان میں جس لڑکی سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں اسے میں

منجو کہتا ہوں اس لیے ذرا قافیہ ملا لیا ہے۔"

ہمیں قبلہ ابرار دہلوی پر بہت ترس آیا۔ انسان کی زندگی کس قدر مجبوریوں کے تابع
ہوتی ہے۔ قبلہ اس کی زندہ، چلتی پھرتی مثال تھے۔

منظور لاٹ کا خیال تھا کہ ہم لوگوں کی نیویارک میں آخری رات ہے اس لیے کیوں نہ
نیویارک کی "نائٹ لائف" کا نظارہ کیا جائے؟

بٹ صاحب کہنے لگے "بھائی۔ اگر آخری رات ہے تو عبادت میں گزارنی چاہیے نہ کہ
نائٹ کلبوں اور سینما گھروں میں؟"

خان صاحب بولے "بٹ جی۔ انہوں نے کہا کہ نیویارک میں آخری رات۔ خدا نہ
کرے دنیا میں آخری رات نہیں ہے۔"

"زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا خان صاحب" انہوں نے جواب دیا "کوئی نہیں بتا سکتا
کہ دنیا میں اس کی آخری رات کون سی ہے۔ ہر سانس آخری سانس ہو سکتی ہے۔"

"بے شک علامہ صاحب قبلہ" دہلوی نے کہا "اب بتائیے کہ کیا پروگرام ہے؟"

"پروگرام تو وہی ہے جو آپ نے بتایا تھا" وہ مری ہوئی آواز میں بولے۔

ٹائمز اسکوائر اور براڈوے کے درمیان میں نیویارک کی ساری نائٹ لائف بلکہ ڈے
لائف بھی سمٹ گئی ہے۔ دن بھر یہاں سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ امریکی بھی بہت بڑی تعداد
میں ہوتے ہیں کیونکہ یہ کاروبار کی جگہ بھی ہے۔ ٹائمز اسکوائر کے بارے میں بتایا جا چکا ہے
کہ ۱۹۰۴ء میں یہاں نیویارک ٹائمز کا دفتر تعمیر ہوا تھا جس کے بعد یہ "ٹائمز اسکوائر" مشہور ہو
گیا۔ یہ کوئی ایک سڑک یا چوک نہیں ہے بلکہ بہت سی سڑکوں پر پھیلا ہوا ہے۔ یوں سمجھیے
کہ ۴۲ویں اسٹریٹ سے شروع ہو کر یہ ۴۷ویں اسٹریٹ پر ختم ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا موٹا سا
شہر سمجھ لیجیے۔ اگر زمینی پھیلاؤ کی جگہ آسمان کی جانب پھیلاؤ کا حساب لگایا جائے تو یہ کئی
شہروں سے بھی بڑھ جائے گا۔ ان سڑکوں کے علاوہ چھٹا، ساتواں اور آٹھواں ایونیو بھی اس
کے اندر سمٹ آتا ہے۔ یوں تو نیویارک میں سینکڑوں ہزاروں سینما گھر ہیں جن میں ہر وقت
ہر قسم کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں مگر شہر کے بہترین اور فرسٹ ان سینما اسی علاقے میں واقع
ہیں۔ شوبزنس اور ناقابل شوبزنس کی تمام شاخیں اور اقسام یہاں موجود ہیں۔ سیکس شاپس،
فحش فلموں اور کتابوں کی دکانیں، نائٹ کلب، قحبہ خانے، کیفے، ریستوران، شراب خانے،

ناچ گھر اور خدا جانے کیا کیا الابلا یہاں دیکھ لیجیے۔ اگر گناہوں کی اقسام دیکھنی ہیں تو بقول خان صاحب کے یہاں سبھی موجود ہیں۔ ان لغویات سے قطع نظر اس علاقے میں نہایت شاندار ہوٹل اور ریستوران بھی موجود ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے کہ خراب قسم کے لوگ منہ چھپا کے یہاں جاتے ہیں۔ بڑی بڑی شاندار کاروں میں بڑے بڑے خاندانی لوگ اور امیر و کبیر عورتیں بھی یہاں کے ریستورانوں میں آتی ہیں۔ کیونکہ یہ شہر کے بہترین ریستوران ہیں۔ عجب عجب نظارے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ قیمتی رولس رائس کاروں میں سے باوردی شوفر پرشکوہ اور باوقار عورتوں اور مردوں کے لیے کاروں کے دروازے کھولتے ہوئے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف آوارہ گردوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ نیویارک کے چھٹے ہوئے پاکٹ مار اور اچکے اس علاقے کو زینت بخشتے ہیں اور ہر روز ہزاروں افراد کو کیش اور مال و اسباب سے محروم کر دیتے ہیں۔ ایک طرف کوئی صاحب مدہوش پڑے ہیں یا کھڑے جھوم رہے ہیں تو دوسری طرف منشیات کے مارے ہوئے ایک صاحب لڑکھڑا رہے ہیں۔ مدہوش شرابی، منشیات فروش، سازندے، گلوکار، ہر طرح کے لوگ یہاں فٹ پاتھ پر نظر آجاتے ہیں۔ ایک جگہ کوئی صاحب ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ کھڑے ساز بجا رہے ہیں۔ اور گا رہے ہیں تو دوسری طرف ایک جادوگر اپنی جادوگری کا نمونہ دکھا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اژدہام کے عین درمیان میں ہو رہا ہے۔ لوگ بچنے کے باوجود دھکے کھا رہے ہیں اور دھکے مار رہے ہیں۔ دن کا وقت ہو یا رات۔ یہی تماشے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ رات کے وقت رنگین اور خوبصورت روشنیوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس کے باعث ماحول کی رنگینی اور خواب ناکی میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ رات کے وقت وسیع و عریض علاقوں میں پھیلے ہوئے یہ مناظر خواب کے مانند نظر آتے ہیں۔ نیون سائن جلتی بجھتی ہوئی منظر کی دلفریبی میں کچھ اور اضافہ کر دیتے ہیں۔ زندگی کو اپنے جوبن پر دیکھنا ہو تو نیویارک کے ان علاقوں کو دیکھ لیجیے۔

ٹائمز اسکوائر اور براڈوے کو اگر "جڑواں" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ الگ سے ان کی پہچان مشکل ہے۔ شاندار تھیٹر، عالیشان سینما گھر والا حصہ "براڈوے" کہلاتا ہے۔ ذرا کم درجے کے تھیٹر اور سینما گھر براڈوے کے حصے میں آتے ہیں۔ فحش فلموں اور دوسری بیہودگیوں کے لیے بھی ٹائمز اسکوائر ہی کا نام لیا جا

۔ قحبہ خانوں کے ادھ کھلے دروازوں کے پیچھے سے گوری گوری اور کالی کالی حسینائیں ںکتی اور اپنے حسن کے جلوے بکھیرتی نظر آتی ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاہ ہوں یا سفید فام، ان عورتوں کے حسین ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ یہ کسی سے لب نہیں ہوتیں۔ صرف جھلک دکھاتی ہیں، مسکراتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں۔

قیمتی اور مہنگے ٹکٹوں والے شاندار کامیڈی اور سنجیدہ ڈراموں سے لے کر سستے "پیپ " تک ہر قسم کی تفریح یہاں مل جاتی ہے "پیپ شو" ("Peep Show") تو آپ ہ گئے ہوں گے۔ نہیں سمجھے تو اب سمجھ جائیں۔ بے ہودہ اور ننگی قسم کی فلموں کے ٹے چھوٹے ٹکڑے ایک یا دو ڈالر دے کر دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ بعض مقامات پر اس ، بھی کم قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ چیزیں سیاحوں، خصوصاً مشرقی ملکوں سے آئے ہوئے حوں کے لیے زیادہ توجہ اور دلچسپی کا سبب ہیں۔

بٹ صاحب نے کہا "واقعی۔ انہیں دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ زخموں میں اب پیپ پڑ گئی ہے۔"

"تو یہ ہے نیویارک کی نائٹ لائف!" خان صاحب نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

"جی ہاں" قبلہ نے فرمایا "آپ کو کیسی لگی؟"

"بہت اچھی ہے۔ شکر ہے کہ ہم اپنی جیبیں خالی کر کے آئے تھے ورنہ یہاں سے لٹ ہی جاتے۔ مجھے کئی بار محسوس ہوا جیسے مختلف ہاتھ میری جیبیں اور جسم کو ٹٹول رہے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے وہ نادیدہ لوگ یا آوارہ روحیں ہوں" دہلوی صاحب نے کہا۔

"دل بھر گیا یا ابھی کسر باقی ہے؟" منظور لاٹ نے پوچھا۔

"فی الحال تو بھر گیا مگر یہ سب کچھ صبح تک ہضم ہو جائے گا اور پھر بھوک چمکنے لگے ی۔"

"آپ کے دل میں گنجائش باقی رہ گئی ہو تو ۴۲ ویں اسٹریٹ پر بھی قدم رنجہ فرمایئے۔"

"وہاں کیا ہوتا ہے؟"

"اسے نیویارک کی سن اسٹریٹ (گناہوں کی سڑک) کہا جاتا ہے۔"

خان صاحب چہک کر بولے "پھر تو وہاں ضرور جائیں گے۔"

بٹ صاحب نے کہا "کچھ شرم کرو یار۔ گناہوں کی سڑک کا نام سنتے ہی بے قرار ہو گئے۔"

"بھائی ہم تو ایسی جگہوں پر عبرت حاصل کرنے جاتے ہیں اور آپ کس لیے جا رہے ہیں؟"

بولے "ہم تماشا دیکھتے ہیں وہاں جا کر۔"

"٤٢ویں اسٹریٹ کو دیکھا' جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ تفصیلات بیان کرنے سے معذور ہیں کیونکہ قابل سنسر اور لائق گردن زنی ہے۔ اس لیے تھوڑے لکھے کو بہت جانیے اور یہ سمجھئے کہ گناہ کی جتنی اقسام حضرت انسان نے دریافت کی ہیں وہ سب کی سب بلکہ ان سے زیادہ آپ کو ٤٢ویں اسٹریٹ پر دستیاب ہو جائیں گی۔

ہم لوگ اپنے ہوٹل پر پہنچے تو منظور لاٹ اور ابرار دہلوی باہر ہی سے الوداع کہہ کر رخصت ہو گئے۔ انہیں جا کر کچھ دیر سونا تھا اس کے بعد اتنا وقت نہ تھا کہ وہ ہمیں رخصت کرنے آتے۔ اصرار تو وہ دونوں ہی کر رہے تھے مگر ہم نے ڈانٹ ڈپٹ کر انہیں منع کر دیا کہ ائرپورٹ پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خوب بھینچ بھینچ کر "جھپیاں" ڈالنے کے بعد وہ دونوں بچشم نم رخصت ہو گئے۔ یہ بھی ہم پاکستانیوں کی ایک خوبی یا خامی ہے کہ تھوڑی دیر کی ملاقات کو بھی زندگی بھر کی وابستگی بنا لیتے ہیں۔ خدا جانے یہ جذباتیت اچھی چیز ہے یا ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اکثر حالات میں تو یہ اچھی چیز ہے لیکن بعض اوقات مصیبت بھی بن جاتی ہے یعنی حالات پر منحصر ہے۔

ہوٹل میں داخل ہوئے تو استقبالیہ کی میز خالی نظر آئی مگر جب ہم نزدیک پہنچے تو ایک صاحب ہڑبڑا کر کاؤنٹر کے پیچھے سے نمودار ہوئے اور آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی مسکرا کر "ہائی گڈ مارننگ میڈم" کا نعرہ بلند کر دیا مگر جب آنکھیں ملنے کے بعد ہم لوگوں کو دیکھا تو فوراً غلطی کی تصحیح کر دی اور "ہائی گڈ مارننگ سر" کہہ کر استقبال کیا۔ ہم لوگ اپنی چابیاں لے کر کمروں میں چلے گئے اور دوسرے دن بیدار ہوئے تو سورج نصف النہار پر تھا۔ (ہمیں کھڑکی سے جھانک کر پتا چلا تھا) بڑے آرام سے ہم لوگ تیار ہوئے۔ لنچ کے بجائے آملیٹ اور ٹوسٹ کھائے' استقبالیہ پر مس گارنر کی جگہ ایک اور "یوں ہی" سی صاحبہ تشریف فرما تھیں۔ ہمیں یاد آیا کہ اس روز مس گارنر کی سالگرہ تھی جو وہ رقیب روسیاہ کے ساتھ منانے والی تھیں مگر اس میں ہماری رقم بھی شامل تھی۔

خان صاحب کہنے لگے "سالگرہ مناتے ہوئے اسے ہمارا خیال تو آئے گا؟"

"کیوں نہیں" بٹ صاحب نے کہا "سوچتی ہو گی کہ دنیا میں ایسے بے وقوف بھی موجود ہیں۔ دل ہی دل میں اس نے ہمارا نام "تھری اسٹوجز" رکھ دیا ہو گا۔"

ائرپورٹ پر پہلے ہم نے خان صاحب اور بٹ صاحب کو بڑی گرمجوشی سے رخصت کیا اور اس کے بعد "ڈیلٹا ائرلائنز" کے ٹرمینل پر پہنچ گئے۔ "ڈیلٹا" کے ذریعے ہمیں واشنگٹن جانا تھا۔ فون کر کے لینی کو مطلع کر دیا تھا۔

ڈیلٹا کا دفتر خاصا کشادہ اور خوبصورت تھا مگر کوئی ٹھاٹ باٹ نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ سب لوگ وردیوں تک میں ملبوس نہیں تھے۔ خاص طور پر خواتین اپنے من پسند ملبوسات پہنے پھر رہی تھیں۔ ہم نے روانگی کا وقت پوچھا تھا' ایک اسمارٹ سی خاتون نے شانے ہلائے اور مسکرا کر کہا "یہ تو منحصر ہے۔"

ہم نے کہا "کس چیز پر؟"

بولیں "مسافروں پر۔"

ان کا مطلب یہ تھا کہ جب مسافر اکٹھے ہو جائیں گے تو ہوائی جہاز چل پڑے گا۔

ہمیں اپنے بسوں کے اڈے یاد آ گئے جہاں پر کسی زمانے میں مسافروں کا انتظار کیا جاتا تھا یا پھر لاہور کے تانگوں کے اڈے' جہاں تانگے والے آوازیں لگاتے رہتے تھے۔

"بھاٹی لوہاری بھئی' کلی سواری بھئی۔"

آپ یقین کریں گے کہ بعد میں ہم نے امریکا میں ائر ٹرمینل پر اس سے ملتی جلتی آوازیں بھی سنیں۔

انقلابات ہیں زمانے کے!

☆ ☆ ☆

نیویارک سے واشنگٹن کے مضافاتی سفر میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اور
بھی کیسے جب کہ خان صاحب اور بٹ صاحب جیسے غیر معمولی لوگ ہمراہ سفر نہ
خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے اور آنکھیں بند کرلیں۔ گزشتہ دنوں کے واقعات ایک
کی طرح ذہن کے اسکرین پر چلنے شروع ہو گئے۔ امریکا میں قیام کیے ہوئے ہمیں خاصا
گزر گیا تھا مگر وہ جو چند ایام خان صاحب اور بٹ صاحب کے ساتھ گزارے وہ حاصل
بن گئے تھے۔ محاورہ ہے کہ خدا شکر خورے کو شکر بھی ضرور دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ
دونوں حضرات کے ساتھ بھی تھا۔ وہ خود دلچسپ لوگ ہیں اس لیے ان کے ساتھ ر
ہوئے دوسرے لوگ بھی ملتے رہتے ہیں۔ یا پھر وہ دونوں اپنی باتوں اور حرکتوں سے دو
کو بھی دلچسپ اور لطیف بنا دیتے ہیں۔ پین امریکن کا سفر خاصا خوش گوار تھا۔ نہ
ہوئی نہ کوئی پریشانی لاحق ہوئی۔ ائرہوسٹس کو بار بار بلانے کی ضرورت بھی پیش نہ آ
انہوں نے چائے کے ساتھ جیسے اسنیکس کھانے کو دے دیئے وہ ہم نے خاموشی سے
شکر کرکے کھالیے۔ نہ جھگڑا، نہ فساد۔ سارے کام نارمل انداز میں ہوتے رہے۔ یہاں
کہ ہمارا ہوائی جہاز واشنگٹن پہنچ گیا۔ واشنگٹن کے ڈلس ائرپورٹ پر اکمل علیمی
صاحبزادے، لیلیٰ کے ساتھ موجود تھے۔ بچیاں بھی امریکی انداز کے لباس میں ملبوس
آئیں۔ ہم نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور باہر نکلے تو بچیوں کے سوالات نے گھیر لیا۔ لیلیٰ
خاموش تھیں۔ خدا جانے یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی یا واقعی خاموشی تھی
پہنچے تو پچھلے دنوں کی رپورٹ بھی مل گئی۔ لوسی صاحبہ نے ایک دو بار فون کیا تھا۔ ان
نے ہمارے لیے ایک دو اچھے اچھے ریستوران تلاش کرکے رکھے تھے۔ ایک خاتون
نے دو تین بار فون کیا تھا۔ وہ ریالٹر تھیں اور ہم نے ابتداء میں جن لوگوں کو فون کیے

ان میں وہ بھی شامل تھیں لیکن اس سے پہلے انہوں نے ہماری طرف توجہ نہیں دی تھی۔
اب ایسی متوجہ ہو گئیں کہ رہ رہ کر فون کر رہی تھیں۔ ان کا فون نمبر مختلف کاغذوں پر درج
تھا اور ہر پیغام کے ساتھ یہ تاکید تھی کہ مسٹر علی واپس آتے ہی انہیں فون ضرور کریں۔

گھر پہنچے تو بالکل ایسی ہی خوشی ہوئی جیسی کہ سفر سے واپسی پر اپنے اصل گھر پہنچ کر ہونی چاہیے۔ فی الحال تو یہی ہمارا گھر تھا۔ میامی اور نیویارک تو ہم سیر و تفریح کی غرض سے گئے تھے۔ ابھی شام بھیگی نہیں تھی۔ ہوا میں خنکی تھی اور موسم خاصا دلکش ہو گیا تھا۔ نادیہ نے گھر پہنچتے ہی ایک بار پھر تاکید کی کہ مس کیتھی کو فون کر لیا جائے ورنہ خود ان کا فون آجائے گا۔ نیویارک کی پرہجوم سڑکوں اور پرشور ماحول کے بعد ورجینیا کی یہ پرنس چارلس کاؤنٹی بے حد پرسکون اور مطمئن نظر آرہی تھی۔ نہ وہ ہنگامے تھے، نہ وہ شور و شر۔ نہ آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتیں تھیں اور نہ ہی کاروں کی لامتناہی قطاریں کہ جن کی وجہ سے انسان سڑک کی ایک ہی جانب زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے اور دوسری جانب جانے کی مہلت ہی نہ پائے۔ رات کو اکمل علیمی صاحب دفتر سے لوٹ کر گھر آئے تو ایک بار پھر سب نے ہمارے سفر کا احوال سنا۔ سوالات کیے گئے۔ معلومات کا تبادلہ ہوا۔ لوگوں کے بارے میں تبصرے کیے گئے۔ پھر ہمارے آئندہ پروگراموں کے بارے میں تبادلہ خیال ہوا۔ ہم پاکستان واپس جا کر وہاں سے بزنس ویزا لے کر آنے پر مصر تھے کیونکہ ٹورسٹ ویزا ہمارے نزدیک کاروبار کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ کئی دن کے بعد بہت اچھی چائے کے پیالے پیئے ورنہ نیویارک اور میامی میں تو کافی پر ہی گزارا کرتے رہے تھے کہ چائے پینے اور پلانے کا ڈھنگ امریکیوں کو کم ہی آتا ہے۔

"پاپا۔ اب ہم کہاں جائیں گے؟" نادیہ نے سوال کیا۔

"پاکستان۔"

"واپس؟ کیا پھر وہیں رہیں گے؟"

"نہیں نہیں۔ پھر واپس آئیں گے۔"

"جب واپس آنا ہے تو پھر جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

اس سوال کا جواب نادیہ کو سمجھانا بہت مشکل تھا۔ نادیہ باقاعدگی سے اسکول جاتی رہی تھی۔ اسکول کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسکولوں کا نظام امریکا میں مثالی ہے۔ تمام

اسکولوں کی عمارتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ نصاب تعلیم بھی یکساں ہے اور ماحول بھی۔ اسکول لے جانے کے لیے اسکول کی بسیں آتی ہیں اور گھر کے عین سامنے سے بچوں کو لے کر اسکول پہنچا دیتی ہیں۔ بسیں ائر کنڈیشنڈ ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ہر موسم میں بچوں کو آرام رہتا ہے۔ اسکول میں لنچ کے لیے ہم ۵۶ سینٹ ماہانہ دیا کرتے تھے۔ اسکول میں لنچ کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا تھا اور ایک ٹائم ٹیبل کے مطابق کھانا تیار ہوتا تھا۔ مسلمان بچوں کے لیے ماں باپ کی ہدایات کے مطابق علیحدہ بندوبست تھا لیکن عام طور پر ایسی خوراک ہوا کرتی تھی جو کسی لحاظ سے کسی کے نزدیک بھی قابل اعتراض نہ ہو۔ لنچ کے وقت اسکول کے بڑے ہال میں میزیں اور کرسیاں لگا دی جاتی تھیں اور بچوں کو باقاعدہ چھری کانٹے کے ساتھ پلیٹوں میں کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔ کھانے کے ساتھ میٹھا ضرور ہوتا تھا۔ سلاد اور دودھ بھی لازمی چیزیں تھیں۔ نادیہ نے بتایا کہ اسکول میں یونیفارم نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ بچے اپنی پسند کا لباس پہن کر آتے تھے۔ ٹیچرز کا رعب اور دبدبہ بھی نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں بچے اپنی ٹیچرز سے خاصے بے تکلف اور فرینڈلی تھے۔ کلاس روم سے اٹھ کر باتھ روم جانے کے لیے اجازت لینی بھی ضروری نہیں تھی نہ ہی کوئی اور روک ٹوک تھی۔ پڑھائی برائے نام تھی۔ بچوں کو کتابوں سے نجات حاصل تھی۔ لکھنے پڑھنے کے لیے کاغذ اور پنسل اسکول ہی سے ملتی تھی اور وہیں رکھ لی جاتی تھی۔ ہوم ورک کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اگر دس بارہ دن کی تعطیل بھی ہو جائے تب بھی بچوں کو گھر پر کچھ پڑھنے اور یاد کرنے کے لیے نہیں کہا جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں عیش ہی عیش تھے۔ نادیہ کی زبانی یہ باتیں سن سن کر پارو بھی اسکول میں داخلے کے لیے بے تاب و بے قرار تھیں مگر ساڑھے چار سال کی عمر سے پہلے انہیں داخلہ نہیں مل سکتا تھا۔ جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے انہوں نے بھی گھر کے آس پاس رہنے والے بچوں کی صحبت میں امریکی لب و لہجے میں انگریزی بولنی سیکھ لی تھی۔ اور دونوں بہنیں گھر میں بھی انگریزی ہی بولا کرتی تھیں۔

یہ حالات تھے جب اچانک مس کیتھی ہماری زندگی میں داخل ہوئیں۔

دوسرے دن ہم اخلاقاً مس کیتھی کو ٹیلی فون کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی اور نادیہ نے اطلاع دی کہ مس کیتھی براؤن ٹیلی فون پر موجود ہیں اور ہم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ ہم مس کیتھی کی مستقل مزاجی کے قائل تو ہو چکے تھے جو بڑی

باقاعدگی سے ہمیں تلاش کر رہی تھیں مگر جب فون پر ان سے بات کی تو انہیں سچ مان گئے اور جب وہ ہم سے ملاقات کے لیے تشریف لے آئیں تو ہم ان پر ایمان لے آئے۔ فون پر ہم نے انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ فی الحال ہم واپس پاکستان جا رہے ہیں۔ اور وہاں سے واپس آکر ہی اب کوئی گھر یا بزنس خریدنے کا فیصلہ کریں گے مگر مس کیتھی بضد تھیں کہ ہم ان سے ایک بار ملاقات ضرور کر لیں۔ جب ہم نے ان کا بے پناہ اشتیاق دیکھا تو مجبوراً انہیں گھر آنے کی دعوت دے دی اور ٹھیک دس بجے وہ ہمارے مکان کے سامنے کھڑی کال بیل بجا رہی تھیں۔ دروازہ ہم نے خود ہی کھولا کیونکہ ہم اب خود انہیں دیکھنے کے مشتاق تھے۔ ٹیلی فون پر ان کی آواز کاروباری اور خشک قسم کی تھی اور ہمارا اندازہ تھا کہ وہ خاصی بدمزاج اور خشک طبیعت کی مالک ہوں گی مگر جب انہیں دیکھا تو آواز کے بالکل برعکس پایا۔ طبیعت ان کی بالکل خشک نہیں تھی۔ بلکہ بہت زیادہ تروتازہ تھی۔ اگر ان کے اندر کوئی چیز خشک تھی تو وہ ان کا سراپا تھا۔ قد تو ان کا ہم سے بھی تھوڑا سا نکلتا ہوا تھا لیکن جسم خشک ٹہنی کے مانند سوکھا ہوا پایا۔ ذرا بھی تیز ہوا چلے تو دیکھنے والوں کو ان کی فکر پڑ جاتی ہو گی ہوئی کہ کہیں اڑ نہ جائیں۔ اس قدر منحنی' دھان پان بلکہ کمزور عورت کی اس قدر مضبوط اور کراری آواز اور پھر اس پر اتنا مضبوط عزم و ارادہ! واقعی دیکھ کر حیران ہی رہ گئے ہم بھی۔ اپنے اس خزاں رسیدہ جسم پر وہ بالکل بھی شرمندہ نہیں تھیں بلکہ سراپا غرور تھیں۔ ان کا بیان تھا کہ بڑی مشقت اور کوشش کے بعد انہوں نے خود کو اسمارٹ بنایا ہے۔ اور ان کا حلقہ احباب ان کی نازکی پر رشک کیا کرتا تھا۔ خاص طور پر سہیلیاں تو حسد کرنے لگی تھیں کہ وہ خود اتنی اسمارٹ کیوں نہیں ہیں۔

ہم نے کہا "اس میں مشکل کون سی ہے۔ آپ کی سہیلیاں اگر کھانا پینا چھوڑ دیں تو وہ بھی آپ کی طرح ہو جائیں گی۔"

وہ مسکرانے لگیں' ان کی مسکراہٹ خاصی ثقیل تھی۔ کیونکہ چہرہ پتلا بلکہ بے حد دبلا پتلا تھا اس لیے جب وہ ہنستی تھیں تو چہرے پر کئی لکیریں اور جھریاں پڑ جاتی تھیں۔ آواز بھی خاصی کپکپانے لگتی تھی۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ ان کی ہنسی اتنی دلکش ہے کہ جو بھی سنتا ہے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ خیر' یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔ اگر کوئی کپکپی کی آواز سن کر لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے تو اس پر کسی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

بہرحال انہیں اپنے سامنے دیکھ کر پہلے تو ہم حیران رہ گئے مگر جب انہوں نے تعارف کرایا تو بڑے خلوص اور اخلاق سے ان کی مزاج پرسی کی اور انہیں اندر لے گئے۔ وہ بھی اس اثناء میں ہمارا جائزہ لیتی رہیں اور کچھ دیر بعد اس بات پر اظہار مسرت کیا کہ ہم بھی دبلے رہنے کے لیے ان کی طرح محنت مشقت کرتے ہیں تب ہی آج کے دور میں موٹاپے سے دور ہیں۔ وہ کچھ دیر دبلے ہونے کے فوائد پر روشنی ڈالتی رہیں اور ہم دل ہی دل میں ہنستے رہے۔ اب انہیں کیا بتاتے کہ دبلے رہنے کی خاطر ہم کچھ بھی نہیں کرتے۔ یہ ایک قدرتی وصف ہے جو دوسرے اوصاف کی طرح ہمارے اندر پایا جاتا ہے اور دیکھنے والے ہم پر رشک کرتے رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہی وہ آمدم برسر مطلب ہوئیں اور فرمایا "آپ کا پیغام مجھے مل گیا تھا مگر میں واشنگٹن سے باہر گئی ہوئی تھی اس لیے پہلے رابطہ قائم نہ کر سکی۔ اب تعطیلات منا کر یورپ سے واپس پہنچی ہوں تو آپ کا ریکارڈ شدہ پیغام سن کر آپ سے ملنے کی مشتاق تھی مگر سنا کہ آپ میامی گئے ہوئے ہیں۔ اوہ کس قدر حسین اور رومانٹک مقام ہے اور آپ کس قدر خوش قسمت ہیں کہ میامی سے ہو کر آئے ہیں۔" وہ آنکھیں گھما گھما کر سرد آہیں بھرنے لگیں۔

ہم نے کہا "مگر فی الحال تو ہم نیویارک سے آئے ہیں۔"

"نیویارک!" وہ بات کاٹ کر بولیں "اف خدایا۔ وہ بھی کوئی جگہ ہے۔ اگر مجھے سزائے موت اور نیویارک میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنے کے لیے کہا جائے تو میں بلا تامل سزائے موت قبول کر لوں گی مگر نیویارک جانا پسند نہیں کروں گی" اس کے بعد انہوں نے نیویارک کی ہجو شروع کر دی اور گن گن کر اتنی خرابیاں بیان کیں کہ ہم خود حیران رہ گئے کہ ہم اتنے دن تک نیویارک میں رہ کر آئے ہیں مگر اس شہر کے اتنے بہت سے عیوب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہی رہے۔ یقین جانئے اگر نیویارک جانے سے پہلے ہماری مس کیتھی سے ملاقات ہو گئی ہوتی تو ہم کسی قیمت پر بھی نیویارک جانا پسند نہ کرتے اور خان صاحب اور بٹ صاحب کو کسی اور معقول سے شہر کی طرف لے جاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ دونوں حضرات ہم سفر ہوں تو نیویارک تو کیا دنیا کا بدترین مقام بھی اتنا زیادہ برا نہیں لگتا کیونکہ زیادہ تر توجہ تو ان دونوں حضرات کی طرف مرکوز رہتی ہے۔ دوسری چیزوں کا کسے ہوش رہتا ہے؟

ہم نے قصہ مختصر کرنے کے لیے ایک بار پھر "منہ زبانی" انہیں سمجھانے کی کوشش کی، ہم اس وقت پاکستان واپس جانے کے لیے کمربستہ ہیں اور کسی قسم کی خرید و فروخت میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتے۔

وہ بولیں "فروخت کی تو ابھی نوبت ہی نظر نہیں آتی البتہ خریدنے کے بارے میں یہ عرض کروں کہ انسان کو ہر چیز کے لیے پہلے سے منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ مانا کہ آپ چند دن کے لیے واپس جا رہے ہیں مگر واپس پھر لوٹ کر یہیں آئیں گے اس لیے کیوں نہ پہلے ہی سے یہ امور طے کر جائیں۔"

ہم نے قصہ مختصر کرنے کی غرض سے انہیں بتایا کہ ہم بہت سے ریستوران، دکانیں اور بزنس وغیرہ دیکھ چکے ہیں۔ ہوٹل اور موٹیل بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ گوگو بار اور نائٹ کلب بھی جا چکے ہیں مگر مطلب کی کوئی چیز اب تک نہیں ملی۔

وہ بولیں "دیکھیے پسند ناپسند تو انسان کی نگاہ میں ہوتی ہے۔ چیزیں وہی ہوتی ہیں مگر نگاہیں بدلتی رہتی ہیں۔ آپ نے جن چیزوں کو مسترد کر دیا ہے آخر ایسے لوگ بھی تو ہوں گے جو انہیں پسند کرتے ہوں گے۔"

ہم ان کی منطق سے کچھ مرعوب سے ہو گئے۔ وہ بھی بھانپ گئیں اور بولیں "آپ ایسا کیجیے کہ کچھ گھر اور بزنس چلتے چلتے دیکھ جائیے۔ ہو سکتا ہے، آپ کو پسند آ جائیں اور جب آپ پاکستان سے واپس آئیں تو ڈھونڈنے کی زحمت سے بچ جائیں اور فوراً سیٹل ڈاؤن ہو جائیں" بات تو بس اتنی سی تھی مگر انہوں نے اتنے مختلف انداز سے اور میں کی کہ بالآخر ہم بھی سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

لبنیٰ بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں اور مس کیتھی کی باتوں سے خاصی قائل و معقول ہو چکی تھیں۔ انہوں نے بھی مس کیتھی کے بیان سے اتفاق کیا اور کہا "ٹھیک ہی تو کہتی ہے بے چاری۔ کیا حرج ہے اگر آپ کو پسند اور مطلب کی چیز مل جائے۔ بزنس مل جائے گا تو پھر گھر بھی تلاش کرنا آسان ہو جائے گا کہ کہاں لینا چاہیے۔"

مس کیتھی اردو سے مطلق ناواقف تھیں مگر انسانی نفسیات سے پوری طرح آگاہ تھیں۔ وہ یہ بھانپ گئیں کہ لبنیٰ اپنی زبان سے ہم سے کیا کہہ رہی ہیں اس لیے انہوں نے اپنی توجہ لبنیٰ کی طرف منعطف کر دی اور لگیں ان کی تعریف کرنے۔ جس گفتگو کا آغاز ہی

کسی خاتون کی تعریف سے ہو اس کا انجام بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس گفتگو کا وہی انجام ہوا۔ یعنی مس کیتھی کی تجویز منظور کر لی گئی۔ ہمارے لیے ان کے پاس "بزنس" موجود تھے ان میں ایک گروسری اسٹور تھا۔ ایک اسکورٹ ایجنسی تھی اور ایک "بولنگ ایلی" تھی۔ گروسری اسٹور تو خیر ہم جانتے تھے مگر یہ اسکورٹ ایجنسی کیا ہوتی ہے اور بولنگ ایلی کس چڑیا کا نام ہے؟ یہ قطعی علم نہ تھا مگر سوچا کہ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ کیوں نہ خود ہی چل کر دیکھ لیا جائے۔ مس کیتھی کی شاندار پیکارڈ کار ہمیں لے جانے کے لیے تیار تھی۔ انہوں نے تو لبنیٰ کو بھی بہت خلوص سے دعوت دی تھی کیونکہ وہ جان گئی تھیں کہ لبنیٰ کو متاثر کرنا ان کے لیے آسان ہو گا مگر انہوں نے گھریلو مصروفیات کے باعث معذرت کر لی۔

☆ ☆ ☆

جب ہم ان کی کار میں بیٹھ گئے تو انہوں نے کن انکھیوں سے ہماری جانب دیکھا اور بولیں "سیٹ بیلٹ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

ہم نے کہا "بہت اچھی چیز ہے۔ ہم تو جب تک ہوائی جہاز میں بیٹھتے ہیں، سیٹ بیلٹ باندھتے رہتے ہیں۔"

انہوں نے کہا "مگر کار میں بیٹھ کر بھی سیٹ بیلٹ باندھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔"

ہم ان کا اشارہ سمجھ گئے اور فوراً سیٹ بیلٹ باندھ لیا۔ انہوں نے کار اسٹارٹ کی اور فرمایا "آپ کی مسز مجھے بہت اچھی لگیں۔"

ہم نے کہا "شکریہ۔"

کہنے لگیں "وہ بہت سمجھدار اور کشادہ دل خاتون ہیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مشرقی بیویاں بھی اس قدر روشن خیال ہوتی ہیں۔"

ہم سمجھ گئے کہ ان کا اشارہ ہمیں تنہا ان کے ساتھ جانے کی اجازت دینے کی طرف تھا۔ اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ لبنیٰ کی روشن خیالی میں تھوڑا سا دخل خود مس کیتھی کی شکل و صورت کا بھی تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ تنگ دل سے تنگ دل بیوی بھی بلاخوف و خطر اپنے شوہر کے ان کے ہمراہ جانے پر رضامند ہو جاتی۔

کہنے لگیں "پہلے ہم "بولنگ" پہ چلیں گے۔"

ہم نے بھی کئی جگہ جلی حروف میں "بولنگ" لکھا ہوا دیکھا تھا مگر پتا نہیں تھا کہ یہ کیا چیز ہوتی ہے۔ مصلحتاً خاموش بیٹھے رہے کہ جو کچھ بھی ہے تھوڑی دیر بعد سامنے آ جائے گا۔

انہوں نے ہم سے نیویارک کے بارے میں ایک دو سوالات کیے پھر ہمارے بارے میں پوچھتی رہیں۔ فلم سازی کا سن کر وہ خاصی جوش میں آ گئیں اور پوچھنے لگیں کہ آخر ہم یہاں امریکا میں کوئی فلم کیوں نہیں بناتے۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ ہم اپنے ملک میں اپنی زبان میں فلمیں بناتے رہے ہیں جو امریکی فلموں سے مختلف ہوتی ہیں پھر امریکا میں فلم سازی کے لیے سرمایہ بھی بہت زیادہ درکار ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ "ہوں ہاں" کرتی رہیں اور سرہلاتی رہیں۔

بولیں "ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ فلم بناتے رہے ہیں۔ وہ ایک یکسر مختلف کام ہے۔ یہاں والے کام فلم سازی سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کاموں کا تو آپ کو تجربہ بھی نہیں ہے۔ آخر آپ یہاں آئے کیوں ہیں؟"

اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہمارے ملک میں فلم سازی کے لیے ماحول اور حالات کس قدر بدل چکے ہیں کہ پرانے فلم ساز کوئی دوسرا دھندا اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔

ہم نے کہا "دراصل ہم یہاں ٹی وی فلمیں بنانے کے ارادے سے آئے تھے مگر یہ ممکن نہیں ہوا۔ اب سوچا کہ آئے ہیں تو کچھ عرصے یہاں بھی رہ لیں۔ اور رہنے کے لیے کچھ کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ آپ جانتی ہیں کہ یہاں کتنی مہنگائی ہے۔"

"ہے تو مگر آپ نے یہ غور نہیں فرمایا کہ امریکا اب بھی کافی سستا ہے۔"

ہم نے کہا "یہ تو درست ہے لیکن سستی چیزیں خریدنے کے لیے بھی ڈالرز کی ضرورت پڑتی ہے۔"

وہ ہنسنے لگیں "آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ کیوں نہ ہوں فلم ساز ہیں۔ حالانکہ دیکھنے میں بالکل فلم ساز نہیں لگتے۔"

"وہ کیوں؟"

"دراصل یہاں فلم والوں کا ایک اور ہی امیج بنا ہوا ہے۔ رنگین مزاج، پلے بوائے، ہلا گلا کرنے والے ناچ گانے اور شراب کے شوقین۔ مگر آپ تو ایسے نہیں لگتے۔ آپ کے

ملک میں فلم ساز مختلف ہوتے ہیں۔"

ہم نے کہا "یہ بات نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں بھی فلم والے عموماً ایسے ہی ہوتے ہیں مگر ہر جگہ کچھ گندے انڈے بھی ہوتے ہیں۔"

وہ بے ساختہ ہنسنے لگیں۔

ہم نے کہا "آپ نے اپنا نام بہت مناسب رکھا ہے۔ کیتھی براؤن' آپ کے بال اور آنکھیں بھی بالکل براؤن ہیں' اگر آپ کے بالوں اور آنکھوں کی رنگت نیلی ہوتی تو کیا آپ "کیتھی بلیو" ہوتیں؟"

وہ پھر ہنسیں اور کہا "اچھا مذاق ہے مگر میں براؤن اس لیے ہوں کہ میرے شوہر کا نام براؤن ہے۔"

ہم نے سوچا انہیں ذرا خوش کر دیا جائے اس لیے کہا "اوہ۔ تو آپ شادی شدہ ہیں۔ حالانکہ دیکھنے میں نہیں لگتیں؟"

بولیں "دیکھنے میں کیا لگتی ہوں بیوہ؟" اور یہ کہہ کر خود ہی قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں۔ ان کی حس مزاح خاصی بڑھی ہوئی تھی۔ اتنی کہ خود کو بیوہ کہہ کر بھی ہنس پڑیں۔ پھر پوچھا "آپ نے کیسے جانا کہ میں شادی شدہ نہیں ہوں۔ کیا شادی شدہ عورتوں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں؟"

ہم نے کہا "کم سے کم ہمارے ملک میں تو نہیں ہوتے۔"

کہنے لگیں "میری تو یہ دوسری شادی ہے مگر سب مجھے یہی کہتے ہیں کہ میں بہت کم عمر نظر آتی ہوں۔"

ہم نے کہا "ہمارا بھی یہی خیال تھا۔"

"دیکھا!" وہ خوش ہو کر بولیں "سب اسی طرح دھوکا کھا جاتے ہیں۔"

راستے میں اسی قسم کی بے معنی گفتگو ہوتی رہی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم ان کے ساتھ جانے پر ہی آمادہ نہیں تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ پاکستان جا کر واپس آئیں گے تو پھر کوئی بزنس تلاش کریں گے۔ اتنے عرصے پہلے تلاش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور نہ ہی فی الحال خریدنے کا کوئی ارادہ تھا مگر انہوں نے اتنا اصرار کیا کہ مجبور ہو گئے۔

"لیجیے' ہم پہنچ گئے۔" انہوں نے ایک شاپنگ سینٹر کے نزدیک جا کر اعلان کیا۔ ایک

جانب دیوار پر ہمیں نمایاں جلی حروف میں "بولنگ" لکھا ہوا نظر آگیا۔ انہوں نے کار پارک کی اور ہمیں ساتھ لے کر چل پڑیں۔ یوں تو وہ ساری کی ساری لمبی تھیں مگر شاید ان کی ٹانگیں باقی جسم کے مقابلے میں زیادہ ہی لمبی تھیں۔ وہ اتنی تیزی سے چل رہی تھیں کہ ان کے ساتھ قدم ملا کر چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ طویل القامتی کے باوجود وہ اونچی ایڑی کی جوتی پہنے ہوئے تھیں۔ ہم اگر ان کی جگہ ہوتے تو ہرگز ایسا نہ کرتے۔

ایک بڑے دروازے سے گزر کر ایک ہال نما کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ خاصا وسیع و عریض ہال تھا۔ پورا میدان سمجھ لیجیے۔ اس میں ایک کونے میں ریستوران تھا۔ باقی ہال کھلا ہوا تھا۔ ایک جگہ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور ان کے سامنے "بولنگ ایلی" تھی۔ یہ قریباً دو فٹ اونچا ایک بہت لمبا سا چبوترہ ہوتا ہے جس کے ایک کونے پر کھلاڑی کھڑا ہو جاتا ہے۔ دوسرے کنارے پر چند پلاسٹک کی قریب قریب ایک ایک فٹ کی بوتل نما چند چیزیں کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ چبوترہ غالباً اٹھارہ یا بیس فٹ لمبا ہوتا ہے۔ ایک جانب سے کھلاڑی بڑی سی گیند لڑھکاتا ہے جو تیزی سے جا کر ان بوتل نما چیزوں سے ٹکرا جاتی ہے' گیند لگنے سے وہ سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ گیند سامنے ایک خانے کے اندر چلی جاتی ہے۔ یہ گیند کرکٹ اور ہاکی کی گیند سے ڈھائی گناہ بڑی ہوتی ہے۔ چھوٹے سائز کی فٹ بال سمجھ لیجیے مگر خاصی وزنی ہوتی ہے اور اس کے وزن کے باعث ہی سامنے والی بوتل نما چیزیں زمین بوس ہو جاتی ہیں۔

کھیل کا طریقہ یہ ہے کہ ہر کھلاڑی تین گیندیں لڑھکاتا ہے اور ضروری ہے کہ تمام بوتل نما چیزیں ایک ہی بار گر جائیں۔ اس طرح ایک پوائنٹ اسکور ہو جاتا ہے۔ سامنے والی کرسیوں پر کھلاڑی اور ان کے ساتھی بیٹھ جاتے ہیں اور گپ شپ کے ساتھ کافی وغیرہ پینے پلانے میں مصروف رہتے ہیں۔ مختصراً اور آسان لفظوں میں یہ "بولنگ" کا تعارف سمجھ لیجیے۔

ہم نے دیکھا کہ مختلف پلیٹ فارموں کے آگے مختلف خواتین و حضرات کھڑے گیند نما گولے لڑھکانے میں مصروف تھے۔ جب ساری کی ساری بوتلیں (یہ درحقیقت بوتلیں نہیں ہوتیں۔ صرف صورت شکل میں بڑی بوتل سے مشابہ سمجھ لیجیے) گر جاتیں تو کامیاب ہونے والے شور سا مچا دیتے تھے۔ یہ کھیل بعض لوگ تفریح کے طور پر تنہا بھی کھیلتے ہیں اور بعض اوقات دوسرے کھلاڑی سے مقابلہ بھی ہو جاتا ہے۔

مس کیتھی نے کہا "دیکھ لیا آپ نے۔ ایسی ہوتی ہے۔ بولنگ۔"

ہم نے پوچھا۔ "مگر یہ کس قسم کا کاروبار ہے' یہ تو کھیل ہے۔"

بولیں "کھیلنے والوں کے لیے کھیل ہے مگر کھلانے والوں کے لیے کاروبار ہے۔ ہر کھیلنے والا ٹوکن خریدنے کے بعد ہی کھیل سکتا ہے۔ یہ سب آمدنی مالک کے پاس جاتی ہے۔ یہ کھیل رات اور دن میں ہر وقت جاری رہتا ہے پھر ریستوران چلا کر یا کرائے پر دے کر بھی معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔ آپ بھی ذرا بولنگ کر کے دیکھیے" یہ کہہ کر انہوں نے ایک گولا ہمارے ہاتھ میں بھی پکڑا دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہلکا سا ہو گا مگر جب ہاتھ میں لیا تو اندازہ ہوا کہ خاصا بھاری بھرکم ہے۔ کم سے کم ایک کلو وزن تو ہو گا۔ وہ کچھ ٹوکن بھی خرید کر لے آئیں اور ایک خالی پلیٹ فارم کے سامنے کھڑے ہو کر ہم نے بھی گولے لڑھکانے شروع کر دیے۔ اس کھیل میں ایک تو صحیح نشانہ لینا ضروری ہے مگر اس سے بھی زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ بوتلوں کو صحیح جگہ پر نشانہ بنایا جائے ورنہ وہ گرنے کے بعد دوبارہ اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور اس طرح پوائنٹ نہیں ملتا۔ ہمارے خیال میں تو یہ ایک بچکانہ کھیل تھا مگر دیکھا کہ کھیلنے والے خواتین و حضرات میں کوئی بچہ نہ تھا۔ بچے ایک طرف بیٹھے آئس کریم وغیرہ سے شغل فرما رہے تھے اور بڑوں کو یہ بچکانہ حرکتیں کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ہم نے دو تین گولے لڑھکائے' مگر ایک پوائنٹ بھی اسکور نہ ہو سکا اس کے بعد مس کیتھی نے گولا سنبھالا نہ جانے کیوں ان کے ہاتھوں میں یہ گولے دیکھ کر ہمیں اردو کے مشہور ادیب و شاعر میراجی یاد آ گئے۔ جہاں تک دبلے پن اور لمبائی کا تعلق ہے مس کیتھی بھی میراجی سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ بال بھی دونوں کے لمبے لمبے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید مس کیتھی وہ بھاری بھرکم گولے نہ اٹھا سکیں گی مگر انہوں نے نہ صرف گولے لڑھکائے' بلکہ صحیح صحیح نشانے بھی لگائے۔ ہم تو ان کی مہارت پر حیران رہ گئے اس کے بعد انہوں نے گھوم پھر کر ہمیں سارا ہال دکھایا۔ لکڑی کا بہت چمکدار فرش تھا۔ یہ عمارت باہر سے تو بھونڈی اور سادہ سی نظر آتی تھی مگر اندر سے خوب صورت اور شاندار تھی۔ خاصی رونق والی جگہ تھی۔ بولنگ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہاں لوگ تنہا نہیں آتے بلکہ سارے خاندان کے ساتھ آتے ہیں یا پھر اپنے بوائے فرینڈ یا گرل فرینڈ کو ہمراہ ضرور لاتے ہیں۔ بچے کھانے پینے اور دوسرے کھیلوں میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ بھی آمدنی کا ایک ذریعہ ہے۔ ان کے خیال میں اس بولنگ سے پندرہ بیس ہزار ڈالر مہینے کی آمدنی تھی۔

"کیا خیال ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

ہم نے کہا "سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمیں تو یہ سرے سے کاروبار ہی نہیں لگتا۔"

وہ ہنسنے لگیں "یہی تو خوبی ہے اس کاروبار میں۔ کھیل کا کھیل' کاروبار کا کاروبار۔ بہت منافع بخش بزنس ہے۔ آئیے' مالک سے بھی مل لیجیے۔"

اس کی مالکہ ایک لکڑی کے دروازے کے اندر مختصر سے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے ایک بڑی سی میز تھی جس پر لکھنے پڑھنے کے سوا ہر طرح کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ایک موٹی سی سیاہ اور سفید رنگ کی بلی بھی سو رہی تھی۔ یہ ایک چالیس اور پچاس سال کی درمیانی عمر کی خاتون تھیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ قریباً ساٹھ سال کی ہیں' کھلتی ہوئی گندمی رنگت تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ان کا تعلق برازیل یا میکسیکو سے تھا اور وہ سفید فام نہیں تھیں۔

مس کیتھی نے ہمارے بارے میں بتایا تو انہوں نے ہسپانوی زبان میں ایک لمبی سی تقریر کر دی۔ وہ ہمیں بھی لاطینی امریکا کے کسی ملک کا رہنے والا سمجھ رہی تھیں۔ بعد میں جب انگریزی میں پورا تعارف ہوا تو انہوں نے توتلے انداز میں انگریزی بولنی شروع کر دی۔ لاطینی امریکی عام طور پر اسی لب و لہجے میں انگریزی بولتے ہیں۔ انہوں نے ہم سے انٹرویو شروع کر دیا۔

"پاکستان سے کب آئے ہیں؟ "بولنگ" کے کاروبار کا کوئی تجربہ ہے یا نہیں؟ یہ کاروبار کیوں خریدنا چاہتے ہیں؟"

ہم نے پوچھا "آپ یہ بزنس کیوں فروخت کرنا چاہتی ہیں؟"

وہ کچھ بوکھلا سی گئیں۔ پھر بتایا کہ وہ ایک موٹیل خرید رہی ہیں اس لیے "بولنگ" سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ جب ہم نے انہیں بتایا کہ ہم نے تو "بولنگ" آج زندگی میں پہلی بار ہی دیکھی ہے تو وہ حیران رہ گئیں۔ پھر انہوں نے ہمیں اطلاع دی کہ وہ جوانی میں بولنگ کی چیمپئن رہ چکی ہیں اور یہ کھیل انہیں بہت پسند رہا ہے۔ اسی لیے انہوں نے یہ بزنس خریدا تھا۔

انہوں نے کہا "میرا مشورہ ہے کہ یہ بزنس تمہیں نہیں خریدنا چاہیے۔"

ہم نے کہا "ہمارا بھی یہی خیال ہے۔"

مس کیتھی مسکرانے لگیں اور بولیں "اب تو میرا بھی یہی خیال ہے۔"

واپسی میں انہوں نے ہمیں سمجھایا کہ بعض کاروبار ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے لیے تجربہ ضروری نہیں سمجھا جاتا' کہنے لگیں "اب بولنگ کو ہی دیکھ لیجیے۔ اس میں کسی تجربہ کی کیا ضرورت ہے' بھئی کھیلنے والے آکر ٹکٹ خریدتے ہیں اور کھیلتے رہتے ہیں۔ مالک کو جاننے یا نہ جاننے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔"

ہم نے پوچھا "اب ہم کہاں جائیں گے۔"

بولیں "اسکورٹ ایجنسی چل رہے ہیں۔ بہت اچھا بزنس ہے اور دلچسپ بھی ہے۔"

ہم نے مزید دریافت کرنا ضروری نہ سمجھا کہ کچھ دیر بعد خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

☆ ☆ ☆

"اسکورٹ ایجنسی" ایک چار منزلہ عمارت کی دوسری منزل پر تھی۔ خوب سجا ہوا شاندار دفتر تھا۔ وال ٹو وال کارپٹ۔ نازک اور خوشنما فرنیچر' خوش رنگ پردے' دیواروں پر تصاویر اور پینٹنگز' استقبالیہ پر ایک بہت اسمارٹ خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھا تو سوچ میں پڑ گئیں۔ مس کیتھی نے اپنا تعارف کرایا تو وہ مسکرانے لگیں' بولیں "میں خود حیران تھی کہ اسکورٹ تو ہم فراہم کرتے ہیں' آپ دونوں تو ایک ساتھ آ گئے۔"

انہوں نے ہمیں ادارے کی مالکہ کے پاس پہنچا دیا۔ یہ بھی ایک خوب صورت اور اسمارٹ خاتون تھیں۔ باتونی بھی بہت زیادہ تھی۔

انہوں نے ابتدائی علیک سلیک کے بعد پوچھا "آپ کو ایجنسی کا تجربہ ہے؟"

"جی نہیں۔"

"جانتے ہیں کہ اسکورٹ ایجنسی کیا ہوتی ہے؟"

"جی نہیں۔"

انہوں نے فکر مند انداز میں کیتھی کی طرف دیکھا اور کہا "پھر تو بہت مشکل ہو جائے گی۔" اس کے بعد پوچھا "کیا آپ کی مسز اس ایجنسی کو چلائیں گی؟"

"جی نہیں۔ ہماری مسز ہاؤس وائف ہیں' کام ہم خود کریں گے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئیں پھر کہا "میں نہیں سمجھتی کہ آپ کے لیے یہ بزنس موزوں ہو گا۔ ویسے بھی عام طور پر یہ کام عورتیں ہی کرتی ہیں۔"

ہم نے پوچھا "مگر یہ کام ہے کیا؟"

بولیں "یہ بھی ایک طرح سے خدمت خلق ہے۔ بیزار انسانوں کو ہم خوشیاں فراہم کرتے ہیں۔"

ہم نے چاروں طرف دیکھا۔ کمرا بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔ ہم نے کہا "مگر یہاں تو ہمیں خوشیاں نظر نہیں آئیں؟"

وہ بولیں "آپ بہت فنی ہیں۔"

ہم نے کہا "اور آپ کے دفتر میں ہمیں کارکن بھی نظر نہیں آتے۔"

بولیں "کارکن ہمارے دفتر میں نہیں ہوتے' باہر سے آتے ہیں۔"

ہم نے قدرے حیران ہو کر انہیں اور پھر مس کیتھی کو دیکھا۔

ہم نے کہا "آپ پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہیں' ایک ہی بار میں کیوں نہیں بتا دیتیں۔"

کہنے لگیں "یوں سمجھیے کہ ہم اکتائے ہوئے تنہا لوگوں کو رفاقت فراہم کرتے ہیں۔"

ہم نے چونک کر انہیں دیکھا۔ اب ہمیں کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا "کن لوگوں کو؟ مردوں کو یا عورتوں کو؟"

کہنے لگیں "یہ تو اس پر منحصر ہے کہ بیزار اور تنہا کون ہے؟ جو بھی تنہا ہوتا ہے اور تھوڑی دیر کی رفاقت چاہتا ہے اور ایک اچھے رفیق کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا ہے' وہ ہم سے رابطہ کرتا ہے ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ انہیں کتنی دیر کی رفاقت درکار ہے۔ جس قسم کی ضرورت ہوتی ہے ہم اسی طرح کا رفیق مہیا کر دیتے ہیں۔ عورتوں کو مرد اور مردوں کو عورتیں۔"

ہم نے کہا "مردوں کو کمپنی کے لیے مرد اور عورتوں کو عورتیں کیوں نہیں؟"

اس سوال سے وہ کچھ گھبرا سی گئیں' کہنے لگیں "ایسا کبھی ہوا تو نہیں۔ دراصل ہر شخص صنف مخالف کے ساتھ وقت گزارنا زیادہ پسند کرتا ہے۔"

ہم نے کہا "آپ نے شاید انگریزی کا وہ محاورہ نہیں سنا کہ ایک قسم کے پرندے ایک ساتھ ہی اڑنا پسند کرتے ہیں۔ فارسی زبان میں بھی ایک شعر ہے کہ....."

وہ بڑے اخلاق سے بات کاٹ کر بولیں "بہرحال، ہم تو لوگوں کی خواہش کے پابند ہوتے ہیں۔ جو وہ چاہتے ہیں وہی انہیں فراہم کر دیتے ہیں لیکن آپ کو تو اس کام کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہے بلکہ آپ تو اس کی نوعیت سے بھی ناواقف ہیں۔"

ہم نے کہا "مگر اب ہم واقف ہو گئے ہیں۔ دراصل اس قسم کا بزنس ہمارے ملک میں شرفاء نہیں کرتے بلکہ جہاں تک ہمیں علم ہے اس ملک میں بھی معقول اور شریف لوگ ایسا دھندا کرنا پسند نہیں کرتے۔ البتہ اسکینڈل باز لوگوں کی بات اور ہے۔"

انہوں نے مس کیتھی کی طرف دیکھا اور نرم لہجے میں بولیں "آپ کو ان کا عندیہ پہلے ہی معلوم کر لینا چاہیے تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم دونوں کو اس ملاقات سے خوشی حاصل نہیں ہوئی۔"

ہم نے کہا "آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے۔ میں اجازت چاہتا ہوں" یہ کہہ کر ہم کرسی سے اٹھ کھڑے ہو گئے۔ رخصت کرتے وقت انہوں نے اتنے برفیلے انداز میں "بائی" کہا کہ ہم تو سردی کے مارے ٹھٹھر کر رہ گئے۔

ہم مس کیتھی کی کار میں بیٹھ کر رخصت ہوئے تو وہ مسکرا کر بولیں "ابھی میرے پاس کچھ اور بزنس بھی ہیں۔"

ہم نے کہا "مس کیتھی، میرا خیال ہے کہ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ دراصل مجھے پاکستان جانے کے لیے کچھ تیاری بھی کرنی ہے۔ اس لیے آپ کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکوں گا۔ اب بقیہ کام آپ ہماری واپسی تک ملتوی کر دیجیے۔"

"جیسی آپ کی مرضی" وہ سنجیدگی سے بولیں۔

ہمیں مس کیتھی پر باقاعدہ غصہ آ رہا تھا کہ وہ ہمیں "ایسکورٹ ایجنسی" کیوں لے کر گئیں۔ وہ جو بزنس ہمیں دکھانے لے گئی تھیں شائستہ سے شائستہ الفاظ میں اسے "کال گرل سپلائی کمپنی" ہی کہا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں تو شریف اس کے نام سے ہی کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ یورپ اور امریکا میں بھی یہ کوئی شریفانہ دھندا نہیں سمجھا جاتا کیونکہ اس کے پردے میں مخرب اخلاق سرگرمیاں جاری رہتی ہیں اور گاہے بگاہے مختلف قسم کے اسکینڈلز بھی اس حوالے سے سامنے آتے رہتے ہیں۔ دراصل یہ دولت مند اور عیش پسند لوگوں کی دل بستگی کا بہانہ ہوتا ہے۔ اس کی آڑ میں وہ رنگینیوں کو دامن میں سمیٹ لیتے

ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی مرد یا عورت ایسکورٹ ایجنسی سے رابطہ قائم کرتا ہے تو وہ باتوں باتوں میں دریافت کر لیتے ہیں کہ انہیں کس قسم کا رفیق درکار ہے اور کتنی دیر کے لیے درکار ہے۔ ایک گھنٹے سے لے کر چوبیس گھنٹے تک کے لیے رفقاء فراہم کیے جا سکتے ہیں اور ضروریات اور مزاج کے اعتبار سے ان کی فیس بھی کم اور بیش ہوتی رہتی ہے۔ مس کیتھی نے ہمیں بتایا کہ بعض ایجنسیاں مخصوص قسم کے افراد کے لیے دو ہزار ڈالر تک فیس وصول کرتی ہیں۔ ان ایجنسیوں سے زیادہ تر خواتین منسلک ہوتی ہیں۔ ان میں کال گرلز سے لے کر شریف گھرانے کی عورتیں تک شامل ہوتی ہیں۔ شادی شدہ خواتین کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ مگر وہ صرف دن کے وقت ہی دستیاب ہو سکتی ہیں۔ شاید وہ اس بات کو اپنے شوہروں سے بھی چھپاتی ہیں۔ یہ سبھی پیشہ ور نہیں ہوتیں۔ بعض عورتیں محض تھرل کے لیے ایسا کرتی ہیں۔ بعض کی جذباتی اور نفسیاتی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ کچھ مالی اعتبار سے ضرورت مند بھی ہوتی ہیں۔ ان کے زیادہ تر کلائنٹ تو مرد ہوتے ہیں مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی خواتین کو بھی رفیق کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ان کی مرضی اور مزاج کے مطابق رفیق فراہم کر دیا جاتا ہے۔ مس کیتھی نے بتایا کہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں محض ذہنی مصروفیت کے لیے پڑھی لکھی، دانش ور قسم کی خواتین کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب کے سب حسن و شباب کے متلاشی نہیں ہوتے مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں بھی یہ دھندا ہوتا رہتا ہے مگر کیونکہ ابھی ہمارا معاشرہ زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہوا ہے اس لیے اسے کوئی معقول نام نہیں دیا جا سکا اور بدنام زمانہ اور رسوا لوگ ہی ایسے کاموں سے وابستہ ہوتے ہیں یا پھر بازار حسن سے تعلق رکھنے والے یہ دھندا کرتے ہیں۔ جس وقت ایسکورٹ ایجنسی کی مالکہ نے ہمیں اپنے بزنس کے بارے میں بتانا شروع کیا تھا اگر بٹ صاحب ہمارے ہمراہ ہوتے تو بہت زور دار اور بلند آواز میں "لاحول ولا قوۃ" کا نعرہ لگاتے اور پھر خدا جانے کب تک ہمارا ریکارڈ لگاتے رہتے۔

☆ ☆ ☆

واپسی پر ہم نے پین امریکن سے اپنی سیٹیں بک کرائیں۔ دراصل یہ چھٹیوں کا موسم
تھا اس لیے ہر فضائی کمپنی بے حد مصروف تھی اور سیٹ ملنا دشوار تھا۔ ہمیں واپس جانے کی
جلدی تھی تاکہ جلد سے جلد واپس آئیں اور باقاعدہ زندگی کا آغاز کریں۔ واشنگٹن سے
ہمیں نیویارک جانا تھا اور پھر وہاں سے لندن۔ حسب معمول لندن میں ہمیں چند روز قیام
کرنا تھا اور پھر وہاں سے کراچی اور لاہور جانے کا پروگرام تھا۔

واشنگٹن میں ہمیں ائرپورٹ پر پہنچانے کے لیے ابو الحسن نغمی صاحب اپنے صاحب
زادے نور نغمی کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے ہم نے اکمل علیمی صاحب
کو گھر پر ہی الوداع کہہ دیا تھا۔ نغمی صاحب بار بار اس بات پر حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ
ہمیں اتنا ڈھیر سارا روپیہ خرچ کر کے واپس جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن ہمارے
دماغ میں تو واپسی کا خیال بیٹھ چکا تھا اس لیے ان کی ایک نہ سنی۔ واشنگٹن ائرپورٹ پر دیو
جہازی سائز کی مکان نما بس ہماری منتظر تھی جس میں سوار ہو کر ہم ہوائی جہاز کی جانب گئے
تو یوں لگا جیسے ہم گھر میں بیٹھے ہیں اور وہ حرکت میں آگیا ہے۔ یہ بس اتنی بڑی تھی کہ بچے
بڑے آرام سے اس میں کھیلتے اور دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے۔ فرش پر سبز رنگ کا قالین
بچھا ہوا تھا اور بس کا فرش بھی نشیب و فراز میں تھا یعنی پچھلے حصے کے مقابلے میں اگلا حصہ
قدرے نیچا تھا۔ اس طرح کی ائرپورٹ بس ہم نے کسی اور جگہ نہیں دیکھی۔ یہ نام
واشنگٹن والوں نے اپنے لیے مخصوص کر رکھی ہے۔

نیویارک کی فلائٹ زیادہ طویل نہیں تھی اس لیے کافی پیتے پیتے وہاں پہنچ گئے
نیویارک میں ہمارے ساتھ دوبارہ وہی حرکت کی گئی۔ یعنی پہلے ہوائی جہاز سے باہر نکلے
ائرپورٹ سے باہر نکلے اور ایک بس میں سوار ہو کر نیویارک ائرپورٹ کے دوسرے حصے میں
پہنچ گئے۔ نیویارک کے کینیڈی ائرپورٹ کے باہر کا علاقہ خاصا مایوس کن ہے۔ سڑک بھی

خاصی شکستہ نظر آئی۔ کچھ دیر پہلے بارش ہو چکی تھی جس کی وجہ سے گڑھوں میں پانی جمع ہو
گیا تھا۔ وہی پاکستان والا نقشہ تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی جاری تھی اور موسم خاصا خوشگوار
تھا۔

نیویارک ائرپورٹ کے دوسرے حصے میں پہنچے تو وہاں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ ہر
طرف چہل پہل نظر آرہی تھی۔ مختلف نسلوں، شکلوں اور رنگوں کے مرد و خواتین حرکت
میں تھے۔ امریکا ایسا ملک ہے جہاں محض سفید فام لوگ ہی نظر نہیں آتے ہیں۔ گندمی، پیلے
اور سرخ و سفید رنگت کے علاوہ کالی رنگت کے لوگ بھی خاصی تعداد میں نظر آجاتے ہیں
لیکن خاص بات یہ ہے کہ زبان سب کی انگریزی ہے اور وہ بھی خالص امریکی لب و لہجے
میں۔ لاطینی امریکن اور کالے اپنے مخصوص انداز میں بولتے ہیں مگر ان کے سوا سبھی لوگ
ایک ہی انداز سے انگریزی بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ امریکیوں کی امریکی انگریزوں کی
انگریزی سے قدرے مختلف ہے اور بولنے کا انداز تو بالکل ہی مختلف ہے۔ انگریزوں کی
انگریزی سمجھنے میں اگر دس دن لگتے ہیں تو امریکیوں کی بات سمجھنے کے لیے اور زیادہ وقت
لگتا ہے۔ برطانوی لب و لہجے کو وہاں وہی حیثیت حاصل ہے جو یوپی اور دہلی کے رہنے
والوں کو پاکستان میں حاصل ہے۔ یعنی اہل زبان سمجھے جاتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ اہل
زبان کی بات سمجھنے میں امریکیوں کو اور امریکیوں کی بات چیت سمجھنے میں اہل زبان لوگوں کو
مشکل پیش آتی ہے مگر یہ اس لحاظ سے انگلستان سے مختلف ہے کہ یہاں لوگ ہنس مکھ ہیں
اور بولتے چالتے ہیں، یہ نہیں کہ منہ پھلائے ہوئے اور اس طرح خاموش بیٹھے ہوں جیسے
کہ ایک دوسرے سے خفا اور بیزار ہیں۔ انگریزوں کے بارے میں تو ساری دنیا کو معلوم ہی
ہے کہ وہ باقاعدہ تعارف کے بغیر تو علیک سلیک تک نہیں کرتے۔ بولنا چالنا اور ہنسنا بولنا تو
دور کی بات ہے۔

ہم نے اس سے پہلے جن ملکوں کے سفر کیے تھے وہاں آمد و رفت کے موقع پر پاسپورٹ
میں اندراج ضرور ہوتا ہے۔ لیکن امریکا اس معاملے میں بالکل انوکھا اور نرالا ملک ہے۔ ہم
لہٰذا پاسپورٹ ہاتھ میں تھامے بیٹھے رہے کہ خدا جانے کس وقت اس پر ٹھپا لگوانا پڑ جائے۔
آمد کے ساتھ ساتھ "اخراج" کا درج ہونا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے مگر یہاں نہیں۔ ہم نے
ایک صاحب سے پوچھا کہ بھائی۔ امریکا سے رخصت ہوتے وقت کسی نے ہم سے کچھ نہیں

پوچھا۔ نہ پاسپورٹ پر کوئی مہر لگائی نہ کوئی اور تحریر لکھوائی۔ آخر اس کا کیا مطلب ہے؟
وہ بولے "دیکھیے بھائی صاحب۔ امریکا والے صرف اس بات سے پریشان ہیں کہ باہر
کے ملکوں سے لوگ ان کے ملک میں آ کر غیر قانونی طور پر رہنے لگیں اور ان کی معیشت
اور معاشرے پر بوجھ بن جائیں۔ جو لوگ امریکا سے رخصت ہونا چاہتے ہیں ان سے امریکی
حکومت کو کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ تو خوش ہوتی ہے کہ چلو "خس کم' جہاں پاک" جو جاتا
ہے شوق سے جائے' ہماری بلا سے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ امریکی اپنے ملک
سے باہر جانے والے غیر ملکیوں کے چلے جانے پر بہت خوش اور مسرور ہوتے ہیں۔

ہم ڈیپارچر لاؤنج میں جا کر بیٹھ گئے۔ کرسیاں اور فرنیچر بہت عمدہ تھا۔ فرش اور در
دیوار بھی خوب چمک رہے تھے۔ آخر نیویارک کا ائرپورٹ تھا کوئی مذاق تو نہیں تھا
نیویارک وہ شہر ہے۔ جس کے پسند کرنے والے اور ناپسند کرنے والے دونوں ہی بہت بڑی
تعداد میں پائے جاتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں انتہا پسند ہیں۔ جو نیویارک
پسند کرتا ہے وہ اس کے اتنے گن گاتا ہے کہ کان پک جاتے ہیں۔ ناپسند کرنے والے
نیویارک کو ایک ایسے شہر سے تشبیہ دیتے ہیں جو انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں ہے
گویا جو نیویارک چلا گیا وہ جیتے جی جہنم میں پہنچ گیا۔

ہمارے پاس والے صوفے پر ایک کالے صاحب اپنی بیگم کے ساتھ آ کر تشریف فرما
گئے۔ ان کی بیگم حسب معمول کالوں کے لباس اور میک اپ میں تھیں۔ ان خواتین کی
خوبی ہے کہ فیشن اور ملبوسات و میک اپ میں سفید فام خواتین سے بالکل مختلف نظر آتی
ہیں۔ ان کے میک اپ میں ایک عجیب دیہاتی قسم کا انداز ہوتا ہے۔ بالوں کا اسٹائل بھی
سفید فام عورتوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ لباس کے رنگ اور تراش خراش میں بھی
انفرادیت ہوتی ہے۔ مرد بھی اسی وضع کی پیروی کرتے ہیں اور اپنی انفرادیت برقرار رکھتے
ہیں۔ خدا جانے یہ ان کی خوبی ہے یا احساس کمتری۔ بہرحال جو بھی ہے۔ قابل تعریف ہے۔

ہم امریکا کے دوران قیام میں جن سیاہ فام لوگوں سے ملے ان میں کسی ایک کو بھی
امریکی حکومت یا گوروں کا ثناء خواں نہیں پایا۔ ہر ایک کو ان سے شاکی ہی دیکھا اور یہ اپنی
ناپسندیدگی اور نفرت چھپانا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ کھلم کھلا نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ لوگ
کالوں کی تمام پستی اور پسماندگی کی ذمے داری گوروں اور ان کی حکومت پر ڈال دیتے ہیں۔

یہ لوگ باتونی بھی ہوتے ہیں۔ کیا مرد اور کیا عورتیں' سبھی گفتگو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے
ہیں اور اپنی رائے کے بے محابا اظہار کرتے ہیں۔

ہم لوگ کوک کا گلاس لینے اٹھے تو کالے صاحب بھی سامنے والی مشین میں سے بیئر کا
ایک ڈبا نکال کر لے آئے۔ ہم سے نگاہیں ملیں تو مسکرائے اور پوچھا "انڈین؟"

ہم نے کہا "نہیں۔ پاکستانی"

"سیاحت کے لیے آئے تھے؟"

"آئے تو اسی لیے تھے مگر اب یہاں کوئی کام یا کاروبار کرنے کا ارادہ ہے۔"

ان کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی' بولے "تم بھی ڈالر کمانے کی مشین بننا
چاہتے ہو۔"

ہم خاموش رہے' وہ کہنے لگے "امریکا میں لوگوں کو پیسہ تو مل جاتا ہے مگر ان کی آدمیت
ختم ہو جاتی ہے۔ انسان روبوٹ بن کر رہ جاتے ہیں۔"

ہم نے کہا "اسی لیے تو یہاں خوش حالی ہے۔"

"خاک خوشحالی ہے" وہ بے زاری سے بولے "اکثریت تو غریب ہے اور کالوں کی تو
بات ہی نہ پوچھیے۔ انہیں تو امریکی حکومت حیوان سمجھتی ہے۔ تم نے تو کالوں کا حال زار
دیکھا ہو گا؟" پھر انہوں نے جلدی سے کہا "میری بات اور ہے۔ مجھ ایسے خوش نصیب
کالے تو پانچ فیصد بھی نہیں ہیں۔ انہیں نہ تعلیم ملتی ہے نہ روزگار اور اچھی ملازمتیں دی
جاتی ہیں' کہنے کو یہ "آزاد معاشرہ" ہے مگر کالوں کا حال غلاموں سے بھی بدتر ہے۔ کوئی
مساوات وغیرہ نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کبھی کوئی کالا بھی امریکا کا صدر بن سکے گا؟"

ہم نے کہا "ہو سکتا ہے۔"

زوردار لہجے میں کہا "کبھی نہیں۔ ایسا قیامت تک نہیں ہو گا مین۔ جیسے جیسے وقت
گزر رہا ہے کالوں کی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ یہ ساری دنیا کو
مساوات اور جمہوریت کا درس دیتے ہیں مگر خود اپنے ملک میں ان پر عمل نہیں کرتے۔
یہاں نہ جمہوریت ہے اور نہ مساوات۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ کیوں سوئٹی؟" انہوں نے
تصدیق کے لیے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

انہوں نے ان کے ہاتھ سے بیئر کا ڈبا لے لیا اور ایک گھونٹ لے کر بولیں "تم ٹھیک

کہتے ہو فریڈ' مجھے تم پر پورا بھروسا ہے" اتنا کہنے کے بعد انہوں نے ڈبے کو ہلا جلا کر دیکھا اور خالی پایا تو دوسرا بیئر کا ڈبا لینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور گنگناتی ہوئی مشین کی طرف چلی گئیں۔

ان کے شوہر نے ہماری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے "رونا اور گانا کسے نہیں آتا۔"

ہم نے کہا "ٹھیک کہا آپ نے۔ کچھ لوگوں کے گانے۔" پر لوگ رونے لگتے ہیں۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسے اور بولے۔ "لیکن میری بیوی ان گانے والوں میں سے نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے ایک موٹا اور لمبا سا سگار نکال کر اسے سونگھا اور پھر سلگا لیا۔ ہم نے بھی کوٹ کی بالائی جیب سے ایک دبلا پتلا سا سگار نکال کر سلگا لیا۔ وہ حیرت سے ہمیں دیکھ کر پوچھنے لگے "کیا آپ کے ملک میں بھی سگار پیتے ہیں؟"

ہم نے کہا "سگار پینے کے لیے امریکی ہونا تو ضروری نہیں ہے۔"

"میرا مطلب تھا کہ کیا آپ کے ملک میں بھی سگار بنائے جاتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ ایسے سگار تو نہیں ہوتے۔ چھوٹے اور پتلے سے ہوتے ہیں۔ انہیں ہم لوگ "بیڑی" کہتے ہیں۔"

"بیڑی سگار" انہوں نے دہرایا "میں نے کبھی یہاں نہیں دیکھے۔"

ہم نے کہا "دراصل ہم انہیں برآمد نہیں کرتے۔ خود ہی پی کر ختم کر دیتے ہیں۔"

"یہ بہترین پالیسی ہوتی ہے۔ یاد آیا' میں نے سنا ہے کہ آپ کے ملک میں بہت سی سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں اور ان سب کی پالیسی الگ الگ ہوتی ہے۔"

ہم نے کہا "ظاہر ہے' مختلف پارٹیوں کی پالیسی مختلف تو ہو گی۔"

بولے "ضروری نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں تو صرف دو ہی سیاسی پارٹیاں ہیں اور ان دونوں کی پالیسی ایک ہے۔ بس آدمیوں کے بدلنے سے تھوڑا سا فرق پڑ جاتا ہے ورنہ ویسے دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔"

ہم نے پوچھا "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

بولے "پیرس۔ جب یہاں بہت زیادہ بور ہو جاتا ہوں تو تبدیلی کے لیے یورپ چلا جاتا ہوں۔ ویسے کیا بات ہے یورپ کی۔ ان امریکیوں سے تو ہر لحاظ سے بہتر ہیں۔ کلچر' اخلاق' تہذیب و تمدن۔ یہ سب چیزیں تو وہیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے پاس تو ڈالرز کے سوا کچھ

ہی نہیں ہے۔ اللہ رحم کرے۔"

وہ شاید کچھ دیر اور امریکا کی برائیاں کرتے مگر فلائٹ کا اعلان ہونے لگا تھا اس لیے یہ گفتگو اختتام پذیر ہو گئی۔ پیرس تک وہ ہمارے ہم سفر رہے مگر اتنے بڑے ہوائی جہاز میں نظر نہیں آئے۔ البتہ جب نادیہ اور پارو نے ہوائی جہاز میں ایک طرف سے دوسری طرف تک بھاگ دوڑ شروع کی تو ہمیں آکر بتایا کہ "پاپا وہ کالے والے انکل اور آنٹی اس کونے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور بیٹھے بیٹھے ہی سو گئے ہیں۔"

ہم نے کہا "تو کیا کھڑے ہو کر سوتے؟"

کہا "کم از کم لیٹ ہی جاتے۔ جہاز کی کرسیاں تو کھل جاتی ہیں۔"

کچھ دیر بعد جب کھانے وغیرہ سے فراغت ہوئی تو ہوائی جہاز میں ایک فلم شروع ہو گئی۔ یہ ہالی ووڈ کی ایک مشہور فلم تھی جس میں ایک سیاہ فام لڑکے اور سفید فام لڑکی کی محبت کی داستان بیان کی گئی تھی اور یہ دکھایا گیا تھا کہ انتہائی' ترقی پسند اور روشن خیال ہونے کے باوجود لڑکی اور لڑکے کے والدین اس شادی کے حق میں نہیں تھے لیکن آخر میں دونوں کی ثابت قدمی اور ضد کے آگے والدین نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ اپنے زمانے کی بہت مشہور و معروف فلم تھی اور موضوع کے اعتبار سے اسے بہت سراہا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے موضوعات پر ہالی ووڈ میں کبھی کبھار فلمیں بنتی رہتی ہیں۔ جس سے غالباً ساری دنیا پر یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ امریکی بہت انصاف پسند اور روشن خیال ہوتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ ایسی فلموں کا معاشرے پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا اور نسل و رنگ کا تعصب نہ صرف بدستور موجود ہے بلکہ اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے غیر منقسم ہندوستان میں بعض فلم ساز "ہندو مسلم اتحاد" کے موضوع پر فلمیں بنا کر خوش ہو جایا کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ فلم دیکھتے ہی ہندو اور مسلمان تعصب سے آزاد ہو جائیں گے مگر ان فلموں کا معاشرے نے کبھی کوئی اثر قبول نہیں کیا اور دونوں قوموں کے مابین فاصلہ بڑھتا ہی رہا یہاں تک کہ پاکستان بنانے کی ضرورت پیش آگئی۔ ہالی ووڈ کے فلم ساز بھی کالے گورے کے موضوع پر فلمیں بناتے رہتے ہیں لیکن ان کا اثر یہ ہوا ہے کہ وہاں کالوں اور گوروں کے درمیان فاصلے کچھ اور بڑھ گئے ہیں۔ یہ دونوں دریا کے دو کناروں کی طرح ساتھ ساتھ تو چل رہے ہیں مگر کبھی آپس میں ایک نہیں ہو سکتے۔ ہم نے امریکا میں

بیشتر کالوں کو سفید فاموں سے بیزار اور شاکی ہی پایا۔ اس کے مقابلے میں گورے لوگ عام طور پر کالوں پر تبصرہ کرنے سے احتراز کرتے ہیں لیکن اگر ذرا کریدو تو پھر دل کے پھپھولے پھوڑنے بیٹھ جاتے ہیں اور ان کے حال زار کے لیے خود کالوں کو ہی مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ کالوں سے انہیں سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ امریکی معاشرے کا ایک حصہ نہیں بنتے بلکہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے خود کو ہر اعتبار سے امریکی معاشرے سے مختلف اور الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔

"دیکھیے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ کام نہیں کرنا چاہتے" ایک گورے نے ہم سے شکایتی انداز میں کہ "پڑھنا لکھنا نہیں چاہتے۔ کوئی ذمے داری مول لینا پسند نہیں کرتے۔ بچے بے محابا پیدا کرتے ہیں اور ان کی ذمے داری قبول نہیں کرتے۔ امریکا میں سب سے زیادہ اولاد ان کالوں کی ہوتی ہے۔ یہ لوگ انہیں اسکول میں داخل نہیں کرتے۔ ناجائز بچوں کی زیادہ تعداد بھی ان ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ گھر کی دیکھ بھال کرنے والا باپ نہیں ہوتا اگر ہوتا بھی ہے تو وہ گھر کے مسائل سے سروکار نہیں رکھتا اور بچوں کے پالنے اور گھر کے چلانے کی ذمے داری ماں کے حصے میں آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے آوارہ ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں بے راہ رو ہو جاتی ہیں۔ غیر قانونی بچے پیدا کرتی رہتی ہیں اور اس طرح معاشرے میں خرابی پیدا ہو رہی ہے جو آئے دن بڑھتی جا رہی ہے۔"

گوروں کے مسائل اپنی جگہ مگر کالوں کا نقطہ نظر بھی سن لیجیے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ہمیشہ ہم پر ظلم کیے ہیں۔ ناانصافی اور دھاندلی کی ہے۔ ہمارے حقوق غصب کیے ہیں۔ ہمیں ذہنی، نفسیاتی اور جسمانی طور پر موجودہ حال تک پہنچانے کے یہی لوگ ذمے دار ہیں۔

اس تمام مسئلے کا نچوڑ خان صاحب نے بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ "کالے دراصل گوروں کے اعمال کی سزا ہیں۔ امریکی ساری دنیا کے ساتھ جو ظلم و ناانصافی کر رہے ہیں یہ اس کا رد عمل ہے۔ دنیا بھر کی طرف سے کالے ان لوگوں سے انتقام لے رہے ہیں۔"

امریکا جانے اور وہاں رہنے والے بھی اس تجزیے سے ضرور اتفاق کریں گے کہ کالوں

کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے امریکا پر ایک عذاب نازل کیا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس سے کیوں کر نجات حاصل کریں؟

نیویارک سے لندن اور چند روزہ قیام کے بعد وہاں سے پاکستان پہنچ کر ہم نے پہلی فرصت میں امریکا کے لیے بزنس ویزا حاصل کیا مگر وہاں کئی مہینے تک رہنا پڑا۔ اپنا ملک پھر اپنا ملک ہے۔ وہاں جا کر واپسی کو دل نہیں چاہتا اور پھر وہاں کی دلچسپیاں اور رشتے داریاں بھی دامن گیر ہوتی ہیں۔ لاہور پہنچ کر ہم نے نادیہ کو ایک بار پھر کانوینٹ میں داخل کر دیا جہاں امریکی اسکول سے اس کے بارے میں کاغذات پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ یہ کاغذات امریکی اسکول والوں نے تصدیق کی غرض سے لاہور بھیجے تھے۔ ہم امریکیوں کی چالاکی کو مان گئے۔ ہم سے انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا۔ ہم نے فارم میں جو کچھ لکھا اسے قبول کر لیا مگر تصدیق کے لیے وہ تمام کاغذات پاکستان ارسال کر دیے اب اسے آپ چالاکی کہہ لیں یا حسن کارکردگی۔

پاکستان سے اپنے مسائل کو نمٹانے کے بعد ہم نے دوبارہ امریکا کا رخ کیا۔

لاہور میں ہمیں امریکی رجسٹریشن کارڈ بھی موصول ہو گیا تھا جو اکمل علیمی صاحب نے امریکا سے بھیجا تھا۔ مطلب یہ کہ ہم امریکا میں رجسٹر ہو چکے تھے۔ رجسٹریشن کارڈ بھی ایک اہم ضرورت ہے۔ امریکا میں کسی شخص کی شناخت کے لیے عام طور پر دو علامتیں استعمال کی جاتی ہیں۔ ایک رجسٹریشن کارڈ اور دوسری ڈرائیونگ لائسنس۔ آپ کسی بینک میں حساب کھولنے جائیں۔ چیک کیش کرانے جائیں، خرید و فروخت کریں، مکان یا دکان کرائے پر لیں، کوئی کاروبار کریں، ہر کام میں آپ کو اپنی شناخت کرانی پڑتی ہے اور یہ شناخت رجسٹریشن کارڈ اور لائسنس کے ذریعے ہوتی ہے۔ شناخت کے اور طریقے بھی ہیں مگر زیادہ مستند یہی دو ہوتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

ہم لاہور سے واپس امریکا پہنچے تو ہماری نصف شناخت ہو چکی تھی۔ یعنی ہمارے پاس رجسٹریشن کارڈ موجود تھا۔ لیکن باقی آدھی شناخت کے لیے ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنا ضروری تھا۔ امریکا میں ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنا اس لحاظ سے تو مشکل نہیں ہے کہ

آپ دفتر میں جا کر ڈرائیونگ کا امتحان دے دیں مگر اس امتحان کا پاس کرنا واقعی مشکل ہو
ہے۔ ہم نے امریکا میں ڈرائیونگ لائسنس کیوں کر حاصل کیا؟ یہ بھی ایک داستان ہے۔

دوسری بار ہم امریکا پہنچے تو یہ مصمم ارادہ کر کے گئے تھے کہ اپنے لیے ایک کار ضرو
خریدیں گے کیونکہ کار کے بغیر امریکا میں زندہ رہنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ہم ا
سے پہلے وہاں جتنے عرصے بھی رہے، نیم مردہ اور نیم زندہ رہے تھے۔ ہم جس علاقے م
علمی صاحب کے پاس مقیم تھے وہ واشنگٹن سے چالیس پینتالیس میل دور تھا۔ نواحی علاقو
میں ٹیکسیاں بھی عام دستیاب نہیں ہوتیں۔ ٹیکسی منگانے کے لیے فون کرنا پڑتا ہے۔ علم
صاحب کے گھر میں ہمیں یوں تو سبھی طرح کی آسائش حاصل تھی مگر اپنی کار نہ ہونے ک
باعث خاصی پریشانی اور مشکل پیش آتی تھی۔ اس لیے سوچا کہ سب سے پہلے کار خرید
جائے مگر امریکا میں کار خریدنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس اعتبار سے کہ اگر آپ کے پا
ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہے تو آپ کو کار نہیں فروخت کی جائے گی اور اگر آپ کے پا
کار نہیں ہے تو پھر ڈرائیونگ نہیں سیکھ سکتے۔ دوسرے لفظوں میں "مرغی اور انڈے" ا
معاملہ تھا۔ یعنی کار کے بغیر ڈرائیونگ نہیں سیکھ سکتے اور ڈرائیونگ لائسنس کے بغیر ا
نہیں خرید سکتے تو پھر کیا کریں؟ ہم نے جو کیا وہ ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

یہ ہم بتا چکے ہیں کہ کار اور ڈرائیونگ لائسنس کے بغیر امریکا میں زندہ رہنے کا تص
بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ امریکا میں کسی کسی کو سخت ترین سزا دینی ہو تو اس کا ڈرائیو
لائسنس چھین لیجیے۔ جن لوگوں کے لائسنس ضبط کر لیے جاتے ہیں ان کا عبرت ناک
بھی ہم دیکھتے رہے ہیں۔ لائسنس کے بغیر کار چلانا وہاں کافی سنگین جرم ہے اس لیے
طور پر لوگ ڈرائیونگ لائسنس کی عدم موجودگی میں کار چلانے کی جرات ہی نہیں کرتے
ہم جب امریکا گئے تھے تو پاکستان سے انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس بنوا کر لے گئے۔

یہ لائسنس عارضی طور پر یورپ کے چند ملکوں میں تو تسلیم کیا جاتا ہے مگر امریکا والے ا
کیا سمجھتے ہیں، یہ جاننے کے لیے ہم نے ٹریفک کے ایک سپاہی سے دریافت کیا کہ
پاکستانی لائسنس سے امریکا میں کار چلا سکتے ہیں۔ انہوں نے بڑی ہمدردی اور خلوص
ساتھ ہماری بات سنی۔ پھر لائسنس کو الٹ پلٹ کر اور سونگھ کر دیکھا۔ اس کے بعد
میں پڑ گئے۔ ہم خاموش کھڑے ان کی صورت دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد وہ مسکرائے اور بولے "آپ کا لائسنس پاکستان کا ہے؟"

"جی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں تو آپ ایک دو ماہ یہاں کار چلا سکتے ہیں۔"

"ہم آپ کا خیال نہیں، قانونی پوزیشن دریافت کر رہے ہیں۔"

بولے "وہ تو میں وثوق سے نہیں بتا سکتا" پھر ہنس کر بولے "بہت سے لوگ تو لائسنس کے بغیر ہی کار چلاتے رہتے ہیں اور جب تک پکڑے نہ جائیں کوئی مسئلہ بھی نہیں ہوتا۔"

ہم نے پوچھا "پکڑے کیوں جاتے ہیں؟"

"بس۔ کوئی ایکسیڈنٹ کر دیتے ہیں یا ٹریفک کے اصول کی خلاف ورزی کر دیتے ہیں تو لائسنس دیکھنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور ایسے موقعوں پر انہیں قابو کر لیا جاتا ہے۔ میری مانیں تو دو باتوں کا خیال رکھیں۔"

"وہ کیا؟" ہم نے پوچھا۔

ایک یہ کہ ایکسیڈنٹ نہ کریں۔ اور دوسری یہ کہ ٹریفک اصول کی خلاف ورزی نہ کریں۔"

"لیکن قانونی پوزیشن کیا ہے؟"

وہ سر کھجانے لگے پھر کہا "یہ تو میں نہیں جانتا۔ آپ یوں کریں کہ وھیکلز ڈیپارٹمنٹ کے دفتر چلے جائیں" پھر انہوں نے ہمیں دفتر کا پتا سمجھا دیا۔ یہ واشنگٹن ڈی سی کا واقعہ ہے۔ وھیکلز ڈیپارٹمنٹ زیادہ دور نہ تھا۔ بڑا خوب صورت اور صاف ستھرا دفتر تھا۔ اپنے پولیس کے تھانوں کے مقابلے میں تو جنت ہی تھا۔ ہم نے ایک کاؤنٹر پر بہت لمبے سے صاحب کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ پولیس کی وردی میں تھے اور بہت شاندار نظر آ رہے تھے۔ ہم ان کے پاس چلے گئے۔ ان کو صورت حال بتائی اور اپنا سوال دہرایا پھر ہم نے ان کی جیب پر لگے ہوئے میڈل کو دیکھنا شروع کر دیا جس پر ان کا نام لکھا ہوا تھا۔

بولے "میرا نام کافی مشکل ہے۔ آپ ٹونفٹ کہہ سکتے ہیں۔"

"شکریہ" ہم نے کہا "تو پھر مسٹر ٹونفٹ آپ نے کیا سوچا؟"

کہنے لگے "میرے خیال میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ دیکھیں اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو اس جھگڑے میں بالکل نہ پڑتا۔ چپکے سے کار چلانا شروع کر دیتا اور ایکسیڈنٹ کرنے سے

پرہیز کرتا۔ نہ ہی کوئی ٹریفک کا اصول توڑتا۔"

ہم نے کہا "اور اس کے باوجود' اگر پکڑے جاتے تو آپ کیا کرتے؟"

کہا "میں بالکل پکڑا نہیں جاتا کیونکہ بہت ہوشیار ہوں۔"

"پھر بھی۔"

وہ قدرے سوچ میں پڑ گئے۔ انگلیوں سے میز پر طبلہ بجاتے رہے۔ پھر کہا "آپ کا سوال خاصا مشکل ہے۔ آپ ایسا کیجیے کہ وہ سامنے والے ہال کمرے میں چلے جائیں۔ وہ لوگ آپ کی مشکل آسان کر دیں گے۔"

ہم ان کے بتائے ہوئے کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرا کیا تھا' خاصا بڑا ہال تھا۔ ایک جانب ایک طرح دار خاتون عینک لگائے بیٹھی ہوئی تھیں۔ پولیس کی وردی میں ملبوس تھیں شاید اس لیے یا شاید اس کے باوجود بہت اسمارٹ اور اچھی لگ رہی تھیں۔

ہم نے کہا "سنیے ہم ڈرائیونگ لائسنس کے بارے میں دریافت کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ لگاوٹ سے مسکرائیں "کہیے۔"

ہم نے کہا "ہمارے پاس امریکی لائسنس نہیں ہے۔"

انہوں نے بات کاٹ کر کہا "آپ لائسنس بنوانا چاہتے ہیں' آیئے میرے ساتھ۔"

ہم نے کہا "چاہتے تو ہیں مگر...."

انہوں نے ہماری ایک نہ سنی' ہمیں لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ وہاں ایک لمبی تڑنگی کالی خاتون تشریف فرما تھیں۔ وہ بھی باوردی تھیں اور خاصی رعب دار لگ رہی تھیں۔

"ٹنکل تمہارے لیے ایک اور کیس لائی ہوں' اوکے بائی۔" وہ ہمیں آنکھ سے اشارہ کر کے رخصت ہو گئیں مگر ان کا اشارہ ہمیں حیران کر گیا۔ ہم مڑ مڑ کر انہیں جاتے دیکھتے رہے۔

ہائی" ٹنکل نے ہمیں مخاطب کیا اور مسکرائیں "آپ کا مسئلہ میں حل کروں گی' [illegible] نہیں۔"

ہم کچھ جھینپ سے گئے۔

"آپ کو ڈرائیونگ لائسنس بنوانا ہے۔"

"بنوانا تو ہے مگر بات یہ ہے کہ..."

"بہت صحیح وقت پر آئے ہو۔ امتحان شروع ہونے ہی والا ہے۔ وہ سامنے والا ہال کمرا دیکھ رہے ہو؟" ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک ہال نما کمرے میں بہت سی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور ہر کرسی کے ہتھے کے ساتھ ایک میز نما چیز بھی لگی ہوئی تھی۔ ان کرسیوں پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

"وہاں امتحان ہو رہا ہے' یہ لو" انہوں نے دراز میں سے ایک بڑا سا کاغذ نکال کر ہمارے حوالے کر دیا "یہ پیپر ہے' وہاں بیٹھ کر حل کر دو' اوکے؟"

"اوکے" ہم نے کہا "مگر"

"مگر کی گنجائش نہیں ہے۔ وقت بہت کم ہے۔"

ہم نے پرچہ تھام لیا اور ہال کمرے کی طرف چلے گئے۔ وہاں ایک بزرگ خاتون نے بڑی شفیق مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ ہم ایک خالی کرسی پر براجمان ہو گئے۔ ہمارے آس پاس بہت سی خواتین و حضرات تشریف فرما تھے اور پرچہ حل کرنے میں مصروف تھے۔ کسی نے ہماری جانب مطلق توجہ نہیں دی۔

اب جو پرچے کا مطالعہ کیا تو ہمارے ہوش اڑ گئے۔ بات یہ تھی کہ ٹریفک کے قوانین تو ہمیں پاکستان کے بھی پورے معلوم نہیں تھے کیونکہ وہاں کون پوچھتا ہے۔ ڈرائیونگ لائسنس بھی گھر بیٹھے ہی مل جاتا ہے۔ اگر ٹیسٹ ہو تو زیادہ سے زیادہ گاڑی ریورس کرا کے دیکھ لیتے ہیں۔ اللہ اللہ' خیر صلا۔ نشانات کیا ہوتے ہیں۔ کن اشاروں کا کیا مطلب ہوتا ہے اور کن اصولوں کی پاسداری کرنی چاہیے ایسا کوئی مسئلہ یہاں درپیش نہیں ہوتا۔ مگر ہمارے سامنے جو پیپر تھا اس میں ٹریفک کے مختلف اصولوں کے بارے میں سوالات کیے گئے تھے۔ امریکا میں کم سے کم یہ آرام ہے کہ امتحان میں آپ کو لکھنا نہیں پڑتا۔ ایک سوال کے تین جوابات کاغذ پر درج ہوتے ہیں۔ آپ ان میں سے کسی ایک جواب پر نشان لگا دیں اور عیش کریں...... مگر سوال یہ تھا کہ نشان کہاں لگائیں؟ جواب تو ہمیں معلوم ہی نہیں تھے۔

سوال کچھ اس قسم کے تھے۔

۱۔ ذیل کے اشارے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟

پھر تین جوابات درج تھے۔

۲۔ ہائی وے پر ایک کار کی زیادہ سے زیادہ رفتار کیا ہوتی ہے؟

۳۔ ہائی وے پر ایک گاڑی اور دوسری گاڑی کے درمیان کتنا فاصلہ لازماً ہونا چاہیے؟

۴۔ اسکول بس کھڑی ہو جائے تو آپ کیا کریں گے؟ وغیرہ وغیرہ۔

کل پندرہ سوالات اور ۴۵ جوابات تھے۔ ہمیں ان میں سے دس سوالات کے جواب دینے تھے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے فرشتوں کو بھی جواب کا علم نہیں تھا۔ ہم نے اپنے آس پاس والوں کو دیکھا کہ شاید نقل کا کوئی امکان پیدا ہو جائے۔ مگر توبہ کیجیے۔ ہر کوئی انہماک کے ساتھ اپنے پرچے میں مصروف تھا۔ کسی نے ہماری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ایک بھی سوال کے بارے میں وثوق کے ساتھ علم نہیں تھا۔ پرچہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پڑھنے کے بعد ہم نے نظر اٹھا کر ممتحن کی جانب دیکھا تو بڑی بی بڑے اطمینان سے اپنی میز کرسی پر تشریف فرما تھیں۔ ہم سے نظریں ملیں تو بڑی شفقت کے ساتھ مسکرائیں۔ اتنی دیر میں ہم نے دیکھا کہ ہمارے برابر بیٹھی ہوئی ایک خاتون اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور پرچہ لے کر ہال سے باہر چلی گئیں۔ رفتہ رفتہ کمرا امتحان خالی ہونے لگا مگر ہمارا مسئلہ حل نہ ہوا۔ ہمارے سامنے اب دو ہی راستے رہ گئے تھے۔ یا تو ہم پرچہ حل کیے بغیر ہی اٹھ کر چلے جاتے یا پھر اپنی عقل کے مطابق پرچہ حل کر دیتے۔ ہم نے دوسرے طریقے کو زیادہ مناسب سمجھا اور محض اٹکل سے جوابات پر نشان لگانا شروع کر دیے۔ دوسرے لفظوں میں ہم نے ٹریفک کے قواعد خود ہی بنانا شروع کر دیے۔ مشکل سے پندرہ منٹ بھی نہیں لگے ہوں گے کہ ہم نے سارا پرچہ حل کر دیا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اپنا پرچا لے کر بزرگ خاتون کے پاس پہنچے تو انہوں نے اشارے سے باہر جانے کے لیے کہا۔ باہر وہی سیاہ فام خاتون تشریف فرما تھیں۔ ہم مسکراتے ہوئے بڑے فاتحانہ انداز میں پرچہ لے کر ان کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے پرچہ ہمارے ہاتھ سے لے لیا اور بال پین اٹھا کر اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور ہمارے ہر جواب پر انہوں نے سا کانٹا ڈال دیا' یہاں تک کہ دس کانٹے پورے ہو گئے۔

جب سارا پرچہ دیکھ چکیں تو انہوں نے بڑی حیرت سے ہمیں دیکھا اور سر سے پیر تک جائزہ لیا۔

یہ تو ہم دیکھ ہی چکے تھے کہ ہمارا کوئی ایک جواب بھی انہیں پسند نہیں آیا تھا اس لیے جواب میں مسکراہٹ پیش کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔

انہوں نے پوچھا "تم نے ٹریفک کے اصولوں کا مطالعہ کیا ہے یا نہیں؟"

ہم نے کہا "نہیں۔ دراصل ہم پاکستان سے آئے ہیں۔"

"وہاں کار چلاتے تھے؟"

"بالکل۔"

"کتنے عرصے سے؟"

"پندرہ سولہ سال سے۔"

"ڈرائیونگ لائسنس تھا تمہارے پاس؟"

"بالکل تھا۔ بلکہ اس وقت بھی ہے" ہم نے پرس میں سے اپنا لائسنس نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے ڈرائیونگ لائسنس کو اور پھر ہمیں دیکھا پھر پوچھا "کیا تمہارے ملک کے ٹریفک قوانین یہاں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں؟"

ہم نے کہا "کسی حد تک۔"

"لیکن تمہارا تو ایک جواب بھی درست نہیں ہے۔"

ہم نے کہا "اتفاق ہے یہ بھی۔"

انہوں نے ہمارا پرچہ پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ پھر ایک پمفلٹ اٹھا کر ہمیں دیا اور بولیں "اگر مناسب سمجھو تو اس کا مطالعہ کر لینا۔ اس کے بعد ہی امتحان دینے کے لیے آنا ورنہ زحمت گوارا نہ کرنا۔"

ہم ٹریفک کے قوانین کا پمفلٹ سنبھال کر چلے آئے۔

یہ ہماری پہلی کوشش تھی۔ بلکہ سرے سے کوشش تھی ہی نہیں۔ ہم تو معلومات حاصل کرنے کے لیے گئے تھے۔ اب اگر کوئی ہمیں امتحان لینے کے لیے بٹھا دے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟

جب ہم نے یہ واقعہ گھر آ کر سب کو سنایا تو سب نے بہت مذاق اڑایا۔ مذاق اڑانے والی بات بھی تھی کہ آپ کوئی ایک سوال بھی درست حل نہ کر پائیں۔ بلکہ شرم کا مقام تھا۔ مگر ہمارے پاس یہ عذر تھا کہ صاحب امریکا ایک نیا ملک ہے۔ ہمیں یہاں کے قوانین کا

کوئی علم نہیں ہے۔ ہم بائیں ہاتھ ٹریفک کے عادی ہیں' یہاں ٹریفک دائیں ہاتھ چلتا ہے
اس لیے سارا نظام ہی الٹا ہے۔

اکمل علیمی صاحب نے ہمیں یہ مشورہ دیا کہ اگر آپ کو ٹریفک کی مشق کرنی ہے تو اس کے لیے آپ کے پاس ایک عدد کار ہونا ضروری ہے۔ کار کی ضرورت تو ہم پہلے ہی محسوس کر رہے تھے اور یہ فیصلہ کر کے گئے تھے کہ اس بار امریکا پہنچتے ہی کار ضرور خریدیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب تک ہم خود وہاں کار نہ چلائیں' ہمارا ہاتھ "صاف" نہیں ہو سکتا تھا۔ امریکا میں ڈرائیونگ۔ لائسنس حاصل کرنے کے لیے دو قسم کے امتحان دینے پڑتے ہیں۔ ایک تحریری اور دوسرا عملی۔ یعنی وہ باقاعدہ کار چلوا کر دیکھتے ہیں اور خاصی چھان بین کرنے کے بعد لائسنس دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے لیے ایک عدد کار خریدنا لازم ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسی شام ہمیں نغمی صاحب کا فون موصول ہوا۔ اب تک تمام مقامی معاملات اور امور میں ہمارے دو مشیر تھے۔ ایک اکمل علیمی صاحب اور دوسرے ابوالحسن نغمی۔ علیمی صاحب کیونکہ وائس آف امریکا میں کام کرتے تھے اس لیے ان کی جنرل نالج بہت عمدہ تھی۔ ابو الحسن نغمی صاحب انشورنس ایجنٹ تھے اس لیے بہت سے معاملات میں ان کی راہنمائی بہت کار آمد ثابت ہو سکتی تھی۔ نغمی صاحب نے یہ خبر سنائی کہ رات کو نیر زیدی صاحب کے گھر کھانے کی دعوت ہے۔ اکمل علیمی اور آپ سب کے سب وہاں پہنچ جائیں' راستہ علیمی صاحب کو معلوم تھا۔

رات کو نیر زیدی کے گھر پاکستانی دوستوں کا مجمع تھا۔ پاکستانی کھانوں کی خوشبو سے ان کا گھر مہک رہا تھا۔ ان کی بیگم شاہین کھانا پکانے کے اہتمام میں مصروف تھیں جب کہ مرد حضرات گپ شپ اور تاش بازی میں مصروف تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چائے کافی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ہر کوئی ہم سے یہ دریافت کر رہا تھا کہ جب اللہ نے ہمیں پاکستان میں سب کچھ دے رکھا تھا تو ہمیں امریکا میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟

تنگ آ کر ہم نے کہا "ہماری شامت آئی تھی۔"

شوکت صاحب بولے "وہ تو ظاہر ہے۔ ورنہ پاکستان سے وہی لوگ ادھر کا رخ کرتے

ہیں اور اس میں کسی حد تک حق بجانب بھی ہیں۔ جنہیں وہاں معاشی خوشحالی میسر نہیں ہوتی۔ نہ گھر' نہ کار اور نہ اچھا ذریعہ روزگار۔ وہ یہاں آ کر قرضوں پر یہ سب چیزیں حاصل کر لیتے ہیں مگر جن لوگوں کو اللہ نے یہ تمام چیزیں پاکستان ہی میں عطا کر رکھی ہیں انہیں یہ کشٹ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟"

اسی موضوع پر کافی دیر تک بات چیت جاری رہی۔ ہمارا کہنا تھا کہ ہم تو چند سال کے بعد واپس چلے جائیں گے۔

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں" زیدی صاحب بولے "بھائی سب لوگ اسی ارادے سے آتے ہیں مگر بعد میں ایسے پھنستے ہیں کہ واپس جانے کا خیال ہی چھوڑ دیتے ہیں۔"

ہمارا خیال تھا کہ شاید امریکی آسائشوں میں پھنس کر رہ جاتے ہوں گے مگر زیدی صاحب نے بتایا کہ ایسا نہیں ہے۔

"تو پھر؟"

"دراصل یہ سب کے سب قرضے کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔ زندگی کی ہر سہولت انہیں قرضاً مل جاتی ہے۔ اس کے بعد باقی زندگی قرض اور سود ادا کرنے میں گزر جاتی ہے۔ کبھی اتنی توفیق ہی نہیں ہوتی کہ یکمشت تمام قرضے ادا کر سکیں۔ اسی لیے واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

نیر زیدی اور ان کے چند دوست بیس بال کا میچ دیکھنے میں مصروف تھے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ جس طرح ہندوستان اور پاکستان کے کرکٹ میچ کے موقع پر پاکستانی ٹی وی پر ٹوٹ پڑتے ہیں اسی طرح امریکی بیس بال کے دیوانے ہیں۔ یہ ان کا قومی کھیل سمجھ لیجیے۔ جب یہ میچ شروع ہوتے ہیں تو دیکھنے والے دنیا و مافیہا سے بے گانے ہو جاتے ہیں۔ جو حضرات تاشوں اور بیس بال سے بچے ہوئے تھے وہ ہمیں قیمتی مشورے دینے میں مصروف تھے۔ ہم کیا کریں' کیا نہ کریں' کیسے کریں' کیسے نہ کریں؟ مثال کے طور پر ایک مشورہ یہ تھا کہ ہمیں ڈرائیونگ لائسنس فوراً لینا چاہیے۔ اس طرح ہم جب صاحب کار ہوں گے تو بزنس اور مکان تلاش کرنے میں بھی آسانی رہے گی مگر امریکا میں کار خریدنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے پاس کار کا ڈرائیونگ لائسنس ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر کوئی آپ کو کار نہیں فروخت کرے گا۔ ہماری مشکل یہ تھی کہ جب تک کار چلائیں گے نہیں ہم امریکا میں

ڈرائیونگ کے رموز سے آگاہ نہیں ہوں گے اور اس کے لیے ڈرائیونگ لائسنس ضروری تھا مگر ڈرائیونگ لائسنس اس وقت تک نہیں مل سکتا تھا جب تک ہمارے پاس کار نہ ہو۔ مختصر یہ کہ وہی مرغی اور انڈے والا قصہ تھا۔

ورجینیا میں سردی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اکثر حضرات گرم لباس پہنے ہوئے تھے مگر ایک صاحب محض پتلون اور قمیص میں ملبوس تھے۔ البتہ انہوں نے گلے میں ایک مفلر ڈال رکھا تھا۔

زیدی صاحب نے پوچھا "بھائی۔ آپ نے سوئٹر کیوں نہیں پہنا؟"

جواب دیا "سردی نہیں لگ رہی۔"

دریافت کیا "تو پھر مفلر کیوں گلے میں ڈالا ہے؟"

بولے "اس خیال سے کہ شاید سردی لگ جائے۔"

ان کی اس بات پر ہمیں سردار جی کا لطیفہ یاد آگیا۔

ایک سردار جی کے بے تکلف دوست ان سے ملنے ان کے پاس گئے تو دیکھا کہ سردار جی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں مگر اس حلیے میں کہ محض بنیان اور انڈر ویئر پہن رکھا ہے اور سر پر ہیٹ رکھا ہوا ہے۔

دوست نے پوچھا "سردار جی۔ یہ آپ نے کپڑے کیوں نہیں پہنے؟"

سردار جی نے کہا "اس لیے کہ آج چھٹی کا دن ہے۔ سوچا آج کون ملنے آئے گا۔"

"اور یہ ہیٹ سر پر کیوں پہن رکھا ہے؟"

کہنے لگے "اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے کوئی آہی جائے۔"

سب اس لطیفے سے بہت لطف اندوز ہوئے اور اس کے بعد سردار جی کے لطیفوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سردار جی ایک ایسی شخصیت ہیں کہ دنیا کا ہر لطیفہ ان کے نام سے منسوب کر دیا جاتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ سننے والوں کو لطف بھی آتا ہے اور یقین بھی آجاتا ہے۔

نغمی صاحب نے ہمیں ایک طرف لے جا کر یہ مشورہ دیا کہ آپ کل صبح سب سے پہلا کام یہ کریں کہ ایک کار خرید لیں۔

"مگر کیسے؟ ہمارے پاس تو ڈرائیونگ لائسنس ہی نہیں ہے۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ کل آپ میرے ساتھ چل کر کار تو پسند کریں۔"

اس طرح کار کی خریداری کا آپریشن شروع ہوا۔

دوسرے روز نغمی صاحب ہمیں اپنی لمبی سی کار میں بٹھا کر ایک شو روم میں لے گئے۔ یہاں منیجر ایک یہودی تھا اور اس کا نائب بھارتی ہندو' یعنی یہود و ہنود کا گٹھ جوڑ تھا۔ کسی اور ملک میں ہوتے تو بات اور تھی مگر یہ امریکا تھا جہاں یہودی کے بغیر گزارا ہی نہیں ہوتا۔ آپ یہودی کی مدد کے بغیر سانس تک نہیں لے سکتے۔ ہر کاروبار پر اس کا قبضہ ہے یا پھر وہ کسی نہ کسی صورت میں وہاں موجود ہے۔ اب ہندوؤں کی آبادی بڑھ رہی ہے اس لیے ان دونوں قوموں سے مفر ممکن نہیں ہے۔

منیجر ایک گول مٹول' چھوٹے قد کے سرخ و سفید آدمی تھے۔ نغمی صاحب کے واقف بھی تھے۔ نغمی صاحب نے ان سے ہمارا تعارف کرایا اور پھر بتایا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں۔ ایک عدد کار خریدنا چاہتے ہیں۔ منیجر صاحب فوراً ریشہ خطمی ہو گئے۔ سراپا مدارات بن گئے۔ سب سے پہلے تو مشین سے نکال کر ایک کوک ہمیں پیش کیا۔ پھر بذات خود ہمیں کاریں دکھانے کے لیے شو روم میں لے گئے جہاں درجنوں بلکہ سینکڑوں کاریں کھڑی چمک رہی تھیں۔ ہم نے بیک وقت اتنی بہت سی برائے فروخت نئی کاریں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں اس لیے کچھ بوکھلا سے گئے۔ نغمی صاحب نے ہمیں مشورہ دیا کہ زیادہ بڑی کار نہ خریدیں اور دوسرے یہ کہ نقد ادائی نہ کریں بلکہ دستور کے مطابق قرضے پر خریدیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمیں مکان اور کاروبار کے لیے بھی رقم کی ضرورت ہو گی۔ اس لیے رسم دنیا کے مطابق قرضے پر خریداری کریں۔ منیجر نے ایک فارم پر کرنے کے لیے ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس میں حسب معمول نام' پتا' کاروبار' بینک کا نام۔ کتنا قرضہ لے رکھا ہے وغیرہ کے خانے بنے ہوئے تھے۔ ہم نے جھٹ پٹ فارم پر کر کے منیجر کے حوالے کیا انہوں نے ایک نظر ڈالی اور کہا

"ارے۔ آپ نے کسی سے قرضہ نہیں لیا؟"

ہم نے فخریہ کہا "جی نہیں۔"

"کوئی بھی چیز ادھار نہیں خریدی؟"

"بالکل نہیں۔"

انہوں نے پریشانی اور بے یقینی سے ہمیں اور پھر نغمی صاحب کو دیکھا۔
نغمی صاحب بولے ''دراصل یہ ابھی نئے نئے آئے ہیں نا۔''
''تو پھر ان کی گارنٹی کیا ہو گی؟''
ہم نے کہا ''ہمارا بینک میں اکاؤنٹ ہے۔''
بولے ''یہ تو کافی نہیں ہے۔ آپ کا قرض دار ہونا ضروری ہے۔''
ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا یعنی جو چیز ہماری تعریف تھی وہی برائی بن گئی تھی۔ ہ
نے نغمی صاحب کو دیکھا' وہ بولے ''آفاقی صاحب۔ یہ امریکا ہے۔ یہاں وہ شخص سب
زیادہ قابل اعتماد ہے جو زیادہ سے زیادہ قرض دار ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ قرض اور س
کی ادائیگی باقاعدگی سے کرتا ہو ورنہ کوئی اس پر بھروسا نہیں کرتا۔''
ہم نے پریشان ہو کر پوچھا ''تو پھر ہم قرض دار کیسے ہوں؟''
بولے ''یہ تو سوچنا پڑے گا۔ دیکھئے' چلئے چل کر آپ کے بینک والوں سے بات کر
ہیں۔''

ہمارا بینک واشنگٹن ڈی سی میں وائس آف امریکا کے دفتر کے نزدیک ہی تھا۔ ہم ن
صاحب کی کار میں بیٹھے اور سیدھے اپنے بینک پہنچ گئے۔ بینک کی سیاہ فام منیجر ہمیں دیکھ
مسکرائیں مگر ہماری مشکل کا حل ان کے پاس نہ تھا۔ انہوں نے ہمیں ایک سفید فام وائس
پریذیڈنٹ صاحب کے حوالے کر دیا۔ یہ بہت با اخلاق اور ہنس مکھ انسان تھے۔ گفتگو م
اتنی مٹھاس کہ الفاظ سے شیرہ ٹپکتا تھا۔ نغمی صاحب نے انہیں ہمارا مسئلہ بتایا اور کہا کہ آ
کے بینک میں ان کا معقول اکاؤنٹ موجود ہے۔ اگر آپ ان کی گارنٹی لکھ کر دے دیں
انہیں کار خریدنے میں آسانی ہو جائے گی۔
''ان کی گارنٹی؟'' وہ پریشان ہو کر بولے ''مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''
ہم نے کہا ''کیوں نہیں ہو سکتا''
کہنے لگے ''دیکھیں مسٹر علی۔ آپ کا اکاؤنٹ ہمارے پاس ضرور ہے مگر آپ کی سا
بالکل نہیں ہے۔''
''وہ کیسے ہو گی؟''
''جب تک آپ قرض دار نہیں ہوں گے۔ اس وقت تک آپ کی ساکھ نہیں

نی'' ہمارے لیے یہ انوکھی بات تھی۔ ہمارے ملک میں تو ہم نے اس کے برعکس ہوتے
ئے دیکھا تھا۔ قرض دار کو لوگ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے مگر امریکا میں الٹا راج تھا۔
مسٹر بارڈر نے ہم سے کہا ''آپ مائنڈ نہ کریں تو آپ کو سمجھاؤں؟''
ہم نے کہا ''بے شک بڑے شوق سے۔''
بولے ''دیکھیے آپ کی رقم ہمارے پاس موجود ہے مگر آپ جب چاہیں یہ رقم بینک
ے نکلوا سکتے ہیں۔ ہم آپ کو روک نہیں سکتے۔ تو پھر آپ کی گارنٹی ہم کس برتے پر دے
یں؟''
ہم لاجواب سے ہو گئے۔ وائس پریذیڈنٹ صاحب نے ہمیں نہایت عمدہ کافی پلائی۔
ہ جانے اس میں عمدگی کیا تھی۔ نہ چینی تھی' نہ دودھ تھا۔ نہ ہی بلیک کافی تھی اس کی
دگی کیا اور خرابی کیا۔ گرم پانی میں پکی ہوئی کافی کا مزہ تو ہر حال میں ایک ہی جیسا ہوتا ہے
ر امریکی اس کافی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔
ہم نے بارڈر صاحب سے پوچھا ''آخر ہمیں مشورہ تو دیجئے' ہم کیا کریں؟''
بولے ''آپ کے لیے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔''
''وہ کیا؟''
''آپ قرضہ لیں اور باقاعدگی سے ادا کریں۔''
''یعنی قرض دار ہو جائیں؟''
''اب سمجھے ہیں آپ'' وہ مسکرائے ''امریکی معیشت کا یہ راز جس شخص پر کھل جاتا
ہے اس کی زندگی بہتر ہو جاتی ہے۔''
اکمل علیمی صاحب کا دفتر نزدیک ہی تھا۔ ہم نغمی صاحب کے ہمراہ وہاں پہنچ گئے۔
انہیں مسئلہ بتایا اور حل دریافت کیا۔ وہ کہنے لگے ''حل تو آپ کو بارڈر نے بتا دیا ہے۔ آپ
قرضہ لیں' خوب دل کھول کر قرضہ لیں۔''
''مگر کس لیے۔ فی الحال تو ہم کوئی کاروبار بھی نہیں کر رہے۔ نہ مکان خریدا ہے؟''
''ہاں۔ یہ بات تو ہے۔ یہ ذرا سوچنے والی بات ہے۔''
ہم تینوں سر جوڑ کر قرضہ لینے کے اسباب پر اور وجوہات پر سوچنے بیٹھ گئے۔ آخر نغمی
صاحب کے ذہن میں ایک ترکیب آگئی۔ ''بس آگئی ترکیب۔ اٹھئے' میرے ساتھ آیئے۔''

ہم ان کے ساتھ بینک آف ورجینیا میں پہنچ گئے۔ یہ بینک ان کے دفتر کی عمارت کے نچلے حصے میں واقع تھا اور اس کی وائس پریذیڈنٹ سے ان کی خاصی اچھی واقفیت تھی۔ نغمی صاحب نے ان کے پاس جانے سے پہلے ہمیں مختصراً ایک لیکچر دیا اور پھر اللہ کا نام لے کر ہم دونوں وائس پریذیڈنٹ صاحبہ کے پاس پہنچ گئے۔ ان کا نام مسز جیفرسن یا اسی قسم کا تھا۔ وہ ایک شاندار شخصیت کی مالک تھیں۔ دراز قد' سنہرے بال' متناسب جسم' بھوری آنکھیں' سنہری رنگت' بہت اچھا میک اپ اور اس سے بھی زیادہ دلکش لباس۔ ہم تو انہیں دیکھتے ہی رہ گئے۔

نغمی صاحب نے ان سے ہمارا تعارف کرایا کہ پاکستان سے آئے ہیں اور فلم پروڈیوسر ہیں۔ ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ فلم امریکا میں ایک طلسماتی لفظ ہے جس کے ادا کرتے ہی بہت سے دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے فوراً اپنی سیکرٹری کو کافی لانے کی ہدایت کی اور ہمہ تن گوش ہو گئیں۔ پاکستان سے کب آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ کیا فلم بنا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ہم ان کے حسن اور شخصیت سے مرعوب ہو چکے تھے اور وہ ہماری فلم سازی سے مرعوب تھیں۔ نغمی صاحب نے کچھ سچ اور کچھ جھوٹ بول کر معاملہ رفع دفع کیا اور کہا کہ یہ فی الحال یہاں کوئی بزنس تلاش کر رہے ہیں۔ ان کی مسز جیفرسن سے خاصی بے تکلفی تھی بلکہ قریب قریب روز کا آنا جانا تھا کیونکہ ان کا بینک بھی وہی تھا اور ان کے دفتر کے عین نیچے' اس لیے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

نغمی صاحب نے انہیں ہماری پرابلم بتائی اور کہا کہ یہ قرضہ لینا نہیں چاہتے۔

”مگر کیوں؟ اس میں کیا برائی ہے؟“

ہم نے کہا ”ہمارے ملک میں قرضہ لینے کو اچھا نہیں سمجھتے۔“

”واقعی!“ وہ حیران رہ گئیں ”تو پھر لوگ اپنی ساکھ کیسے بناتے ہیں؟“

ہم نے کہا ”بینکوں میں اکاؤنٹ رکھتے ہیں اور خرید و فروخت نقد کرتے ہیں۔“

وہ مسکرانے لگیں ”کتنی عجیب بات ہے مگر ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا' یہاں تو جو شخص جتنا زیادہ قرضہ لیتا ہے اتنا ہی زیادہ قابل اعتبار ہوتا ہے۔“

نغمی صاحب نے ان کے سامنے ایک تجویز پیش کی ”سنئے مسز جیفرسن۔ اس کا ایک حل

ہے ہمارے پاس۔“

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ مسٹر آفاقی آپ کے بینک میں دو ہزار ڈالر فکس ڈیپازٹ میں رکھ دیتے ہیں۔ اس کے عوض آپ انہیں دو ہزار ڈالر کا قرضہ دے دیں۔ اس طرح ان کی ساکھ بن جائے گی اور مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

وہ سوچ میں پڑ گئیں پھر معذرت کر کے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ہم نے نغمی صاحب سے کہا ”یہ کتنی خوب صورت ہیں۔ بالکل ہالی ووڈ کی ایکٹریسوں کی طرح“

وہ بولے ”واقعی۔ یہ تعریف ان کے سامنے بھی کرنی چاہیے۔ آپ کا کام بن جائے گا۔“

چند لمحے بعد وہ لہراتی ہوئی واپس آئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت شاندار اور پرکشش شخصیت کی مالک تھیں۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتیں' نغمی صاحب نے کہا ”مسز جیفرسن۔ مسٹر آفاقی کا خیال ہے کہ آپ ہالی ووڈ کی ایکٹریس لگتی ہیں۔“

”کیا۔ واقعی!“ انہوں نے اپنی حسین آنکھیں پھیلا کر ہمیں دیکھا۔

”واقعی۔ بلکہ آپ کو دیکھتے ہی ہمیں ڈیبورہ کی یاد آ گئی ہے۔“

”اوہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مسٹر آفاقی۔ کہاں ڈیبورہ اور کہاں میں؟“

ہم نے کہا ”آپ واقعی ان کے مشابہ ہیں۔ بلکہ وہ تو محض فلموں میں ہی ایسی لگتی ہیں جب کہ آپ کیمرے وغیرہ کی مدد کے بغیر ہی اتنی دلکش اور پرکشش ہیں۔“

”اوہ نو“ وہ بے یقینی سے مسکرائیں ”یہ تو بہت بڑی تعریف ہے۔“

نغمی صاحب نے کہا ”اور وہ بھی ایک فلم پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کی زبان سے۔“

”سچ کہا آپ نے۔ میں گھر جا کر یہ اپنے شوہر کو بتاؤں گی تو وہ بھی حیران رہ جائیں گے۔“

اس طرح ان کے دل میں ہمارے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔

”دیکھیے علی“ وہ بے تکلفی پر اتر آئیں ”یہ تجویز تو عجیب سی ہے مگر میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا ہے۔ اس میں بینک کا کوئی رسک نہیں ہے اور آپ کی مشکل بھی

آسان ہو جائے گی۔"

نغمی صاحب نے مطمئن ہو کر ہمیں دیکھا اور بولے "دو ہزار ڈالر کا چیک کاٹ کر مسز جیفر سن کے حوالے کر دیں۔"

ہم نے فوراً تعمیل ارشاد کر دی۔ اس طرح ہمارا فکس اکاؤنٹ کھل گیا اور پھر فوراً ہی ہمارے نام قرضہ بھی جاری ہو گیا۔

"مبارک ہو" نغمی صاحب نے ہم سے کہا "آپ قرض دار ہو گئے۔ اب فوراً قرضے کی ادائیگی کی پہلی قسط بھی انہیں دے دیں۔"

ہم نے فوراً ایک اور چیک بھی کاٹ دیا۔

مسز جیفر سن نے ہمیں کافی کے ساتھ کوکیز (بسکٹ) بھی پیش کیے اور پھر پاکستان کی فلموں کے بارے میں سوالات کرتی رہیں۔

"کیا آپ کی ہیروئنیں بھی بہت خوب صورت ہوتی ہیں؟"

"بہت زیادہ۔ ہمارے ہاں ہیروئن کی خوبصورتی کا کیا معیار ہے اس کا اندازہ یوں لگائیے کہ اتنے بڑے ملک کی فلم انڈسٹری میں ایک وقت میں چار پانچ سے زیادہ ہیروئنیں دستیاب نہیں ہوتیں۔"

"اف خدایا۔ اتنا اونچا معیار ہے؟"

"اور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ہر ہیروئن بیک وقت دس بارہ فلموں میں کام کرتی ہے۔"

"بیک وقت!" ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "مگر یہ کیسے ممکن ہے؟"

ہم نے کہا "ہم لوگ بہت زیادہ محنتی ہوتے ہیں۔ ہمارے ہیرو بیک وقت میں بائیس فلموں میں کام کرتے ہیں۔ جو ہیرو جتنا زیادہ مقبول ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ فلموں میں کام کرتا ہے۔"

ان کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ حیرانی کی بات بھی تھی۔ وہ ایک ایسے ملک سے تعلق رکھتی تھیں جہاں ایک اداکار ایک وقت میں صرف ایک ہی فلم میں کام کرتا ہے۔ ذرا غور فرمائیے کس قدر سست اور پسماندہ لوگ ہیں!

نغمی صاحب نے ہم سے اردو میں کہا "آفاقی صاحب۔ یہ آپ کے رعب میں آگئی

ہے۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیے؟" ہم نے پوچھا۔

بولے "آپ کا کم سے کم دو جگہ قرض دار ہونا ضروری ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں۔ شاید ہماری کچھ مدد کر دے" یہ کہہ کر وہ مسز جیفر سن کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا "مسز جیفر سن۔ آپ نے ہمارے ساتھ قابل تعریف تعاون کیا ہے مگر مسٹر آفاقی کو ابھی ایک اور قرض خواہ کی ضرورت ہے۔"

"ہاں۔ وہ تو ہے' زیادہ سے زیادہ قرض دار ہوئے بغیر یہ اپنی ساکھ نہیں بنا سکتے۔"

"تو پھر آپ ان کی مدد کیجیے۔ کسی اور بینک سے بھی ان ہی شرائط پر انہیں قرضہ دلا دیجیے۔"

"مسز جیفسن سوچ میں پڑ گئیں۔

ہم نے کہا "معاف کیجیے مسز جیفر سن۔ ہم آپ سے ایک ذاتی سا سوال پوچھ سکتے ہیں؟"

"ہاں ہاں' پوچھیے۔"

"کیا آپ کو کبھی کسی نے فلم میں کام کرنے کی پیش کش نہیں کی؟ دیکھیے سچ سچ بتائیے گا۔"

ان کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا' بولیں "جی نہیں۔ کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔"

ہم نے کہا "اگر اب کوئی کہے تو آپ فلم میں کام کریں گی؟"

کہنے لگیں "اب کیا ہو سکتا ہے' وقت گزر گیا۔ میں تو اب دو بچوں کی ماں ہوں۔"

ہم نے حیران ہو کر پوچھا "کیا سچ۔ ویسے دیکھنے میں تو پتا ہی نہیں چلتا۔"

وہ کچھ شرما سی گئیں پھر کہا "دراصل میں نے ہائی اسکول پاس کرنے سے پہلے ہی شادی کر لی تھی۔ کم عمری میں شادی ہو گئی اور ماں بھی بن گئی۔"

"تب ہی تو....." ہم نے کہا۔

"نغمی صاحب نے موقع غنیمت جان کر فوراً کہا "آپ کو یاد آیا کوئی رابطہ؟"

"ہاں۔ فرسٹ ورجینیا بینک میں میری ایک دوست ہے۔ وہ آپ کی مدد کرے گی۔"

"مسز جیفر سن سے رخصت ہو کر اور ان کے قرض دار ہونے کے بعد ہم نغمی صاحب

کے ساتھ فرسٹ ورجینیا بینک پہنچ گئے۔ مسز جیفرسن کی سہیلی ڈیبی وہاں انچارج تھیں۔ اپنی سہیلی کے برعکس وہ خاصی موٹی تازی اور بھدی تھیں لیکن ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہنس مکھ، تعارف کے بعد انہوں نے ہنس کر بتایا کہ مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ میں بہت بے چینی سے آپ کی منتظر تھی۔ پھر انہوں نے ہم سے کہا "مسٹر آفاقی۔ ذرا غور سے میری طرف دیکھیے۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

"آپ کی کسی فلم میں مجھے کوئی رول مل سکتا ہے؟" وہ مسکرا کر پوچھنے لگیں "میں اتنی اسمارٹ تو نہیں ہوں مگر فلموں میں ایسے کردار بھی تو ہوتے ہیں جو اسمارٹ نہیں ہوتے۔"

ہم سمجھ گئے کہ ان کا موڈ خوشگوار ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیں قرضہ دینے پر آمادہ تھیں۔ ڈیبی نے ہمارے ساتھ پورا تعاون کیا۔ اس بینک میں بھی وہی تمام کارروائی دہرائی گئی جو مسز جیفرسن کے بینک میں پیش آئی تھی۔ ہم نے ان کی خدمت میں دو ہزار ڈالر کا چیک پیش کیا۔ جواب میں انہوں نے ہمیں دو ہزار ڈالر کا قرضہ پیش کر دیا۔ دستور کے مطابق ہم نے قرضے کی ادائی کی پہلی قسط کا چیک کاٹ کر ان کے حوالے کر دیا، اس طرح یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے پا گیا۔

☆ ☆ ☆

منت سماجت اور سفارش کے ساتھ قرض داروں کی فہرست میں شامل ہونے کے بعد ہم نے نغمی صاحب کے ہمراہ کاروں کے شوروم کا رخ کیا جہاں گول مٹول منیجر صاحب اپنی کرسی پر بیٹھے جھولا جھول رہے تھے۔ امریکا میں ایک آسانی یہ ہے کہ اگر آپ کو کسی کا نام معلوم نہیں ہے یا بھول گئے ہیں تو بڑے اطمینان سے اسے مائیک، ٹام یا ہیری کہہ سکتے ہیں۔ چارلی بھی ایک مقبول نام ہے۔ یہ نام ایسے ہیں کہ مسلمان بھی اختیار کر لیتے ہیں۔

نغمی صاحب نے بڑے فخر کے ساتھ ہمیں مسٹر مائیک کی خدمت میں پیش کر دیا اور خوشی سے دمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا "مائیک۔ مسٹر آفاقی معقول حد تک قرض دار ہو چکے ہیں اور دو بینکوں میں بحیثیت قرض دار ان کی ساکھ بھی بن چکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب آپ کو انہیں قرض پر کار دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

مائیک نے بہت مسرور ہو کر ہم سے ہاتھ ملایا اور بہت بہت مبارک باد پیش کی۔ ہم دل میں سوچ رہے تھے کہ ہماری زندگی میں یہ دن بھی آنا تھا کہ جب ہم نہ صرف قرض دار ہوں گے بلکہ اس پر ناز بھی کریں گے۔

"آپ نے کون سی کار پسند کی تھی؟" انہوں نے پوچھا "میرا خیال ہے کہ آپ سرخ رنگ کی کھلی کار لیجیے۔ بچوں کے ساتھ ہوا خوری میں بھی لطف آئے گا۔"

ہم نے عرض کیا "ہمیں ایک درمیانہ سائز کی بند کار درکار ہے۔"

انہوں نے فوراً پکار کر "چارلی" کو بلایا۔ یہ ان کے انڈین اسسٹنٹ تھے۔ نام تو ان کا رام چندرن یا کچھ اسی قسم کا تھا مگر آسانی کے لیے "چارلی" بن گئے تھے۔

"چارلی۔ مسٹر آفاقی کو کار پسند کرا دو اور انہیں فوراً ڈیلیور بھی کر دو۔"

ہم نے بڑی مشکل سے ایک سلیٹی رنگ کی شیولٹ کار پسند کر لی۔ چارلی صاحب کا اصرار تھا کہ آپ کوئی آٹومیٹک گیئر والی کار لیں۔ ہینڈ گیئر کے چکر میں نہ پڑیں۔

"مگر وجہ؟" ہم نے پوچھا۔

بولے "آپ کی گرل فرینڈ بھی آسانی کے ساتھ یہ کار چلا لے گی ورنہ عام طور پر اب امریکا میں گیئر والی کاریں ناپسند کی جاتی ہیں۔"

ہم نے کہا "مگر ہماری گرل فرینڈ بھی گیئر والی کار ہی چلاتی ہے۔"

بولے "وہ تو آج کل کی بات ہے۔ ظاہر ہے، آپ ایک ہی گرل فرینڈ پر تو اکتفا نہیں کریں گے۔ گرل فرینڈ تو بدلتے ہی رہیں گے۔ ایسی صورت میں آپ کو کار بھی تبدیل کرنا ہو گی۔"

ہم نے کہا "ہماری گرل فرینڈ نے ہمارے ساتھ زندگی بھر کا معاہدہ کیا ہے۔"

وہ حیران ہو کر ہمیں دیکھنے لگے "اور آپ رضامند ہو گئے؟" اوہ نو۔ کس قدر غلط حرکت کی ہے آپ نے۔"

نغمی صاحب بڑی دیر سے زیر لب مسکرا رہے تھے، کہنے لگے "چارلی۔ بات دراصل یہ ہے کہ مسٹر آفاقی شادی شدہ ہیں۔ ان کی ایک بیوی اور دو بچیاں ہیں۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ بیویاں تو گرل فرینڈز کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بدل جاتی ہیں۔ میری مانیئے تو خود کار گاڑی لیجیے۔"

مگر ہم نے وہی "اسٹک والی" شیورلٹ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ جس مشکل سے کیا اس کا
اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ ذرا خود ہی غور فرمائیے کہ اگر آپ کو سینکڑوں رنگ برنگی اور
قسم قسم کی کاروں میں سے محض ایک کار پسند کرنے کا موقع دیا جائے تو آپ پر کیا کیا
گزرے گی۔ قیمت کی بھی کوئی پرابلم نہ تھی اس لیے کہ جب کار قرض ہی لینی ہے تو مہنگی
کیا اور سستی کیا۔ آپ کو تو بس قسطیں ادا کرنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا میں لوگ عموماً
مہنگی چیزیں خریدتے ہیں کیونکہ انہیں نقد تو کچھ دینا نہیں پڑتا اور قرضے کی قسطیں ان کے
معمول میں داخل ہو جاتی ہیں۔

مائیک ہمیں کار دینے پر تو آمادہ ہو گئے تھے مگر ابھی تک اور مسئلہ بھی درپیش تھا۔ وہ یہ
کہ امریکی ڈرائیونگ لائسنس کے بغیر کسی کو کار فروخت نہیں کی جا سکتی تھی۔ نغمی صاحب
نے فوراً اپنی انشورنس ایجنٹ والی خصوصیت کا مظاہرہ کیا اور بڑی دردمندی سے انہیں یہ
سمجھایا کہ جب تک یہ خود کار چلانے کی مشق نہیں کریں گے، ڈرائیونگ لائسنس کیسے
حاصل کر سکتے ہیں چنانچہ مائیک صاحب نے مہربان ہو کر ہمارے لیے یہ رعایت کر دی کہ ہم
اگر تین دن کے اندر انہیں ڈرائیونگ لائسنس بنوا کر لا دیں گے تو کار ہماری ہو جائے گی
ورنہ وہ اپنی کار واپس لے لیں گے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اس شرط کو منظور کرنے کے سوا کوئی
چارہ بھی نہ تھا اس لیے ہم راضی برضا ہو گئے۔ کار تو ہم نے شوروم سے نکلوا لی مگر اسے شہر
کی سڑکوں پر چلاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ نغمی صاحب نے ہمیں بہت حوصلہ دلایا مگر ہمارا
دل نہ مانا۔ مجبوراً انہوں نے گھر فون کر کے اپنے بیٹے نور نغمی کو بلایا اور اس طرح ہم کار
لے کر گھر پہنچ گئے۔

اب سوال یہ تھا کہ ہم محض تین دن کے اندر ڈرائیونگ لائسنس کیوں کر حاصل
کریں؟ ٹریفک کے اصولوں کا پمفلٹ ہم اپنے ساتھ واشنگٹن سے لے آئے تھے، اب مسئلہ
صرف مشق کا تھا۔ اکمل علیمی کے بیٹے عاطف نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں اور کہا کہ
انکل، آس پاس کی سڑکیں عام طور پر سنسان پڑی رہتی ہیں۔ آپ یہاں گاڑی چلا کر اپنا
ہاتھ رواں کر سکتے ہیں۔ اس طرح دائیں بائیں ٹریفک کا فرق بھی محسوس ہو جائے گا اور
دائیں ہاتھ کار چلانے کی عادت پڑ جائے گی۔ اس طرح عاطف نے ہماری استادی کا شرف
حاصل کر لیا۔

ہم نے دیکھا کہ عاطف واقعی "استاد" تھا۔ ایک تو وہ باتوں باتوں میں ہمیں بہت سے
اصول بتاتا جا رہا تھا۔ مثلاً ہم نے کار میں بیٹھتے ہی سوئچ آن کیا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے
ریورس کرنی شروع کر دی۔ عاطف نے فوراً ہمیں ٹوک دیا۔

"انکل رکیے، خدا کے لیے رکیے" وہ چلایا۔

ہم ڈر کر رک گئے "کیوں، کیا ہوا؟ کوئی بندہ ہماری کار کے نیچے آ گیا؟"

کہنے لگا "اس سے بھی زیادہ برا ہوا۔ پیچھے ایک کار گزر رہی ہے اور آپ نے کار
ریورس کر دی، یہ بہت بڑا جرم ہے۔"

"اوکے" ہم نے کار روک دی۔

"دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے سیفٹی بیلٹ نہیں باندھا۔"

ہم نے فوراً سیفٹی بیلٹ اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اس کے بعد ڈرائیونگ شروع ہو گئی،
ہمیں اپنے دائیں ہاتھ پر کار چلاتے ہوئے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ سڑک اور
چوراہوں پر مڑنے کے لیے بھی مشکل پیش آ رہی تھی مگر رفتہ رفتہ ہم اپنی گھبراہٹ پر قابو
پانے میں کامیاب ہو گئے اور ایک گھنٹے بعد تو خاصے رواں ہو گئے۔ اسکے بعد ٹریفک کے
اصولوں کا مسئلہ تھا۔ ہم جب کوئی غلطی کرتے وہ ہمیں ٹوک دیتے۔ ایک خرابی یہ ہے کہ ہم
لوگ کسی چوراہے پر کار بالکل روکنا پسند نہیں کرتے حالانکہ ٹریفک کے اصولوں کے تحت یہ
لازم ہے۔

شام تک ہم اسی طرح کار چلاتے رہے اور کافی حد تک حالات سے آشنا ہو گئے۔

شام کو گھر پہنچے تو ٹریفک کے پمفلٹ کو لے کر بیٹھ گئے اور اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔
ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ دوسرے ہی دن ہمیں امتحان کے لیے پیش ہونا تھا۔ عاطف
نے ہمیں اسی دوران میں وہیکلز ڈیپارٹمنٹ کا دفتر بھی دکھا دیا جہاں ہمارا امتحان ہونے والا
تھا۔ اس نے ہمیں وہ سڑکیں بھی دکھائیں جن پر عموماً آزمائش کے طور پر نئے ڈرائیور کو
لے جایا جاتا ہے۔ اس طرح ہم امتحان کے لیے کافی حد تک تیار ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

دوسرے دن صبح منہ اندھیرے سے ہی ہم کار لے کر گھر سے نکل گئے۔ لبنیٰ ہمارے ساتھ تھیں۔ ہمارے بعد انہیں بھی امتحان کا مرحلہ پیش آنے والا تھا اس لیے مشکل وقت میں ہم نے انہیں ساتھ رکھنا بھی ضروری سمجھا۔ راستے میں انہیں مختلف ہدایات دیتے رہے جو گزشتہ روز عاطف نے ہمیں فراہم کی تھیں۔ اس طرح اپنی دانست میں امتحان کی خوب اچھی طرح تیاری کرنے کے بعد ہم متعلقہ محکمے میں پہنچ گئے۔ پہلے ہم جس دفتر میں گئے تو وہ واشنگٹن ڈی سی میں واقع تھا جب کہ یہ دفتر ورجینیا کے علاقے میں تھا اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس کے آس پاس ٹریفک کا زیادہ ہجوم اور ہنگامہ بھی نہیں تھا۔

دفتر کی عمارت اور آرائش قریب قریب ویسی ہی تھی جیسی کہ واشنگٹن والے دفتر میں تھی۔ امریکا میں ایک دستور یہ دیکھا کہ سرکاری دفاتر اور عمارتوں کی سجاوٹ وغیرہ بالکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ اس طرح ایک تو عام لوگوں کو اجنبیت محسوس نہیں ہوتی دوسرے ڈیکوریشن وغیرہ پر بھی زیادہ خرچ نہیں ہوتا۔ تمام سرکاری عمارتیں محکموں کی اپنی ملکیت ہوتی ہیں۔ کرائے کی عمارت میں ہم نے وہاں کسی سرکاری دفتر کو مصروف عمل نہیں دیکھا جب کہ پاکستان میں سرکاری دفاتر عموماً پرائیویٹ مالکوں کے کرائے دار ہوتے ہیں جو خوب فراخ دلی سے سرکار کی کھال اتارتے ہیں۔

ہم عمارت میں داخل ہو کر استقبالیہ پر پہنچ گئے۔ ایک سیاہ فام وردی پوش وہاں تشریف فرما تھے بلکہ کھڑے ہوئے تھے۔ جب ہم نے بتایا کہ امتحان دینے آئے ہیں تو بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے اور ہمیں ضروری معلومات فراہم کیں۔ انہوں نے یہ بتایا کہ جس روز تحریری امتحان ہوتا ہے اسی روز عملی امتحان بھی ہو جاتا ہے اور پاس ہونے والوں کو وہیں کھڑے کھڑے ڈرائیونگ لائسنس مل جاتا ہے۔ یہ اطلاع ہمارے لیے بہت حوصلہ افزا تھی۔ پھر انہوں نے ہمیں اشارے سے ایک دوسرے کمرے کی طرف جانے کو کہا جہاں

ایک کاؤنٹر پر بہت ہنس مکھ گوری خاتون کھڑی ہوئی تھیں۔ ہماری خواہش کا علم ہوتے ہی انہوں نے ایک پرچہ ہمارے حوالے کیا اور سامنے والے ہال کمرے کی طرف جانے کی ہدایت فرمائی۔ یہ ہال کمرا بالکل اسی انداز کا تھا جہاں ہم صفر نمبر حاصل کر کے نہایت کامیابی سے فیل ہوئے تھے۔ اس بار ہم خوب یاد کر کے بلکہ رٹا لگا کر آئے تھے اور امید تھی کہ چھ سات سوالوں کے صحیح جوابات ضرور دے دیں گے۔ پرچے پر نظر ڈالی تو اکثر سوالات وہی تھے جو ہم یاد کر کے آئے تھے چنانچہ تیزی سے جوابوں پر نشانات لگانے شروع کر دیے۔ ہم نے اتنی پھرتی دکھائی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ جب ہم اپنا پرچہ مکمل کر کے کرسی سے اٹھے تو باقی سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں حیرت اور رشک سے دیکھا۔ اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ بھئی ہم ایک بار فیل ہو چکے ہیں اس لیے زیادہ تیزی دکھا رہے ہیں۔

ہنس مکھ خاتون نے ہمارا پرچہ لے کر اس پر نظر ڈالی اور پہلے ہی جواب کو اوکے کر دیا۔ اس کے بعد کانٹا مارنے کی باری تھی مگر زیادہ تر جواب اوکے تھے۔ اس طرح ہمیں تحریری امتحان میں پاس کر دیا گیا۔ انہوں نے مسکرا کر ہمیں تعریفی نظروں سے دیکھا اور کہا "مسٹر علی! آپ نے تیزی سے پرچہ حل کرنے کا جو ریکارڈ قائم کیا ہے اس میں آپ دوسرے نمبر پر ہیں۔"

ہم نے پوچھا "اور پہلے نمبر پر کون ہیں؟"

بولیں "سامنے والے پتلے سے کمرے میں جائیے۔ وہاں آپ کی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ انہوں نے صرف تین چار منٹ میں پرچہ حل کر دیا ہے۔"

"اچھا!" ہم نے حیرت سے پوچھا "اور پاس بھی ہو گئیں؟"

"یقیناً۔"

ہم اس عجوبہ روزگار شخصیت کو دیکھنے کی تمنا دل میں لے کر اس لمبوترے کمرے میں پہنچ گئے جہاں دیوار کے ساتھ ایک لمبی سی سیٹ بچھی ہوئی تھی۔ اس سیٹ پر ایک ماہ پارہ تشریف فرما تھیں۔ چندے آفتاب، چندے ماہتاب تھیں بلکہ مکمل آفتاب و ماہتاب تھیں۔ بالوں سے لے کر آنکھوں تک سبھی چیزیں، سنہری رنگ کی تھیں اور ان کا سراپا واقعی دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ ایک لمبا سا اسکرٹ اور چھوٹا سا بلاؤز پہنے ہوئے تھیں۔ لباس کا رنگ گہرا

سرخ تھا۔ بس چمک دار قسم کی بیر بہوٹی بنی ہوئی تھیں۔ ہم نے سوچا کہ اس قدر خو
صورت لڑکی سے تو امتحان لینا ہی بداخلاقی کی بات ہے۔ ایسی حسیناؤں کو تو اعزازی طو
پاس کر دینا چاہیے۔ پھر خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ اپنے حسن و جمال کے زور پر پاس ہو کر
تشریف لائی ہیں۔ لیڈی ایک دوسرے کمرے میں ہماری منتظر تھیں اس لیے فی الحال کر
میں ہم دونوں ہی موجود تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر وہ ہم سے مخاطب نہ ہوتیں تو ش
ہم رعب حسن کے باعث ان سے بات ہی نہ کرتے۔ چپ چاپ بیٹھے رہتے مگر وہ ناز
اندام غرور حسن سے مطلق ناآشنا تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی بولیں "آپ بھی اتنی جلد
آ گئے؟"

ہم نے حیران ہو کر پوچھا "آپ بھی" سے کیا مراد ہے۔ آپ کی؟"
فرمایا "مطلب یہ کہ میں تو خیر چند منٹ میں پرچہ حل کر آئی ہوں او [illegible] بھی ہو
ہوں" یہ کہہ کر انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور ایک لمبی سرد آہ بھری۔ ان ک
انکسار۔ دیکھ کر ہم تو ان کے معتقد ہو گئے۔ گویا اس پر بھی وہ بذات خود کوئی کریڈٹ لینے
تیار نہیں تھیں۔ کس قدر سادہ طبیعت پائی تھی انہوں نے۔
اس سے قبل کہ ہم ان سے اس قدر عجلت میں پرچہ حل کرنے کا راز دریافت کر
انہوں نے ہم سے پوچھا "آپ پہلے کتنی بار فیل ہو چکے ہیں؟"
ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ گویا حسن کے ساتھ ساتھ علم نجوم کی دولت بھی ا
کے حصے میں آئی تھی۔
ہم نے شرمندہ ہو کر جواب دیا "صرف ایک بار۔"
کہنے لگیں "واقعی؟ مجھے یقین نہیں آتا۔"
ہم نے کہا "یقین کیسے آئے گا۔ آپ نے تو تین منٹ میں امتحان پاس کر لیا ہے۔
جیسے لوگ تو آپ کو کند ذہن نظر آتے ہوں گے۔"
بولیں "تین منٹ میں امتحان ضرور پاس کیا ہے مگر اس سے پہلے سترہ بار فیل بھی
چکی ہوں۔"
ہمیں ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے سترہ حملے یاد آ گئے۔ ان خاتون نے بھی اس
اعتبار سے شاہانہ طبیعت پائی تھی کہ سترہ بار حملے کرنے کے بعد بھی ہار نہ مانی۔ ان کے

میں پرچہ حل کر دینے کا راز بھی یہی تھا کہ بیشتر سوالات اور جوابات تو ان کو ازبر ہو گئے
تھے۔ اس کے باوجود ان کے پندرہ میں سے صرف آٹھ سوال ہی درست تھے۔ یہ انہوں
نے خود ہمیں بتایا تھا۔ تعریف کی بات یہ تھی کہ بلاتکلف انہوں نے سچ بول دیا تھا۔ یہ
لڑکیوں کی ایک خوبی ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں عام طور پر یہ جھوٹ نہیں بولتے۔ یہ
کام انہوں نے اپنی حکومت اور لیڈروں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔
انہوں نے بتایا کہ اب وہ عملی امتحان دینے کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔
ہم نے کہا "یہ امتحان کتنی بار فیل ہو کر پاس کریں گے؟"
وہ ہنسنے لگیں اور چہرے پر شفق پھول گئی کہا "اس میں فیل ہونے کا کوئی امکان نہیں
ہے۔ میں ذرا یاد کرنے کے معاملے میں کمزور ہوں۔ ورنہ جہاں تک کار ڈرائیو کرنے کا
تعلق ہے' اس قدر مہارت سے کار چلاتی ہوں کہ دنیا حیران رہ جاتی ہے۔"
"کبھی پولیس نے لائسنس نہیں دیکھا؟"
کہنے لگیں "لائسنس دیکھنے کا ہوش کسے ہوتا ہے۔ وہ بے چارے تو بس مجھے دیکھتے
رہتے ہیں۔ ویسے میں ٹریفک سگنلز کی پابندی کرتی ہوں اور قوانین کی خلاف ورزی بھی
نہیں کرتی ہوں۔"
"بہت خوب" ہم نے کہا اور پھر پوچھا "اعتراض نہ ہو تو آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"
"ہاں ہاں' پوچھیے۔"
"تو اپنا نام بتا دیجیے۔"
"مجھے سوئٹی کہتے ہیں۔ آپ بھی مجھے یہی کہہ سکتے ہیں۔"
"کتنا مناسب نام رکھا ہے آپ کے والدین نے۔"
بولیں "ماں باپ نے تو کچھ اور نام رکھا تھا۔ یہ نام تو میں نے خود ہی رکھ لیا ہے۔
لیکن' کیسا ہے؟"
"بہت اچھا اور میٹھا ہے۔"
کہنے لگیں "میٹھا تو ضرور ہے مگر اچھائی کوئی نہیں ہے اس میں۔ کسی مٹھائی کا نام لگتا
ہے۔"

خدا جانے یہ ان کا انکسار تھا یا نادانی۔ بہرحال خاصی صاف گو تھیں۔

اچانک کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور ایک کشیدہ قامت پولیس والی اندر داخل ہوئی۔ اگر سوئٹی کمرے میں نہ ہوتی تو انہیں بھی باقاعدہ حسین کہا جا سکتا تھا مگر ان کے حسن میں ایک حاکمانہ شان تھی یا کم سے کم ہم کو محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے ہم دونوں پر نظر ڈالی۔ ہم سے پہلے سوئٹی کی باری تھی اس لیے انہوں نے سوئٹی کو مخاطب کیا "میرے ساتھ آیئے" اور اپنی وردی کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر باہر چل پڑیں۔ سوئٹی بھی اٹھ کر چلی گئی۔

"یہ کون ہیں؟" ہم نے سرگوشی میں پوچھا۔

"ممتحن۔ یہی امتحان لیں گی۔ خاصی بدمزاج لگتی ہیں۔"

ان دونوں کے جانے کے بعد ہم کمرے میں تنہا رہ گئے۔ لبنیٰ نے شیشے کی دیوار کے سامنے آکر ہم سے اشاروں میں باتیں شروع کر دیں اور ہم بھی اسی انداز میں جواب دیتے رہے۔ ہمیں محسوس ہی نہ ہوا مگر آس پاس سے گزرنے والے سنجیدگی سے یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید ہم دونوں گونگے بہرے ہیں ورنہ ہمارے کمرے سے باہر جانے یا لبنیٰ کے کمرے میں آنے پر کوئی پابندی نہیں تھی جب ہم نے غور کیا کہ سامنے سے گزرنے والے ہم دونوں کو بہت ہمدردی اور ترس بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں تو ہم نے اشاروں میں گفتگو ختم کرنے کی ہدایت کی اور لبنیٰ اپنی جگہ پر واپس چلی گئیں۔

کافی دیر گزر گئی مگر سوئٹی واپس نہ آئی۔ اس اثناء میں دو تین دیگر حضرات و خواتین کمرے میں آکر اپنی باری کے حساب سے بیٹھ گئے۔ ایک گوری خاتون نے بیٹھے بیٹھے ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانی شروع کر دیں۔ ہم نے اس سے پہلے کبھی کسی عورت کو انگلیاں چٹخاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا مگر انہوں نے نہ صرف انگلیاں چٹخائیں بلکہ ہاتھ کے جوڑ بھی چٹخانا شروع کر دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اس کے بعد وہ شاید کہنیاں اور مونڈھے چٹخائیں گی۔ مگر انہوں نے یہ پروگرام ملتوی کر دیا اور نئے سرے سے دوبارہ انگلیاں چٹخانا شروع کر دیں۔

قریباً نصف گھنٹے کے بعد پولیس وومن اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے تشریف لائیں۔ ان کے ساتھ سوئٹی نہ تھی۔ خدا جانے اس لمبی چوڑی عورت نے نازک اندام عورت کا کیا حشر کیا ہو گا؟ اب ان کا رخ ہماری جانب تھا۔

"سر۔ آپ آیئے" انہوں نے ہم سے کہا اور ہم سہم کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کمرے سے اور پھر عمارت سے باہر نکل کر ہم باہر پارکنگ میں پہنچ گئے۔

"آپ کی کار کون سی ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

ہم نے جھٹ اپنی کار کی طرف اشارہ کر دیا اور دل میں ڈرے کہ کہیں یہ مزید سوالات کر بیٹھیں اور پتا چل جائے کہ ہم غیر قانونی طور پر کار خرید کر لائے ہیں مگر انہوں نے ایسا ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ ہماری کار کے نزدیک پہنچ کر وہ رک گئیں۔

"کار کھولیے۔"

ہم نے کار کے دروازے کھول دیے۔

"اندر بیٹھ جایئے" اور ہمارے بیٹھنے سے پہلے وہ خود ہی اگلی سیٹ کا دوسرا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئیں۔ خاصی لحیم شحیم خاتون تھیں۔ نزاکت تو ان میں نہ تھی مگر حسن ضرور تھا۔ ہمیں شاعر صاحب کا وہ شعر غلط معلوم ہونے لگا جس میں انہوں نے فرمایا تھا۔ خدا جب حسن دیتا ہے' نزاکت آ ہی جاتی ہے۔

حسن کی تو ان کے پاس کمی نہ تھی مگر نزاکت ان سے میلوں دور سے ہو کر گزر گئی تھی۔

ہم اپنی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔

"اب کدھر چلیں؟" ہم نے پوچھا۔

"سوال نہ کریں۔ جو میں کہتی جاؤں وہی کریں" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

ہم خاموش بیٹھ گئے۔

"آپ تیار ہیں؟"

"ظاہر ہے" ہم نے جل کر کہا۔

"تو پھر کار ریورس کریں اور باہر نکالیں۔"

ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً کار اسٹارٹ کر دی اور ریورس بھی کر لی۔

"اب سامنے والے گیٹ سے باہر چلیں۔"

ہم نے حکم کی تعمیل کی۔

"سڑک پر ہمیں دائیں ہاتھ پر مڑنا ہے۔"

ہم نے گیٹ کے باہر کار کی رفتار ہلکی کی۔ سڑک کا جائزہ لیا اور پھر کار سڑک پر دائیں طرف موڑ لی۔ کافی دیر تک وہ ہمیں ہدایات دیتی رہیں اور ہم ان کی تعمیل کرتے رہے۔ ایک جگہ پہنچ کر انہوں نے کہا "کار اندر والے میدان میں لے چلیے۔"

ہم نے فوراً کار اندر موڑ دی۔ ایک جگہ جا کر میدان ختم ہو رہا تھا۔ انہوں نے کہا "کار واپس موڑ لیں۔"

ہم نے بجائے بریک لگا کر ریورس کرنے کے کار کو گول دائرے میں موڑ لیا۔

"اب دفتر واپس چلیں۔"

ہم جوش میں آکر خوب تیزی سے کار چلاتے ہوئے دفتر واپس پہنچ گئے۔

"کار پارک کر دیں" انہوں نے فرمایا۔ ہم نے کار روک دی۔

انہوں نے ہماری طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور کہا "آپ فیل ہو گئے ہیں۔"

ہم پر تو جیسے بجلی گر گئی "مگر وجہ؟"

"وجہ نہیں، وجوہات۔"

اس کے بعد انہوں نے وجوہات گنوانی شروع کیں تو ہمیں پتا چلا کہ ہم نے ایک بھی کام درست نہیں کیا تھا۔

"آپ نے کار میں بیٹھ کر سیفٹی بیلٹ نہیں پہنا۔"

"اوہ سوری۔ دراصل ہمیں عادت نہیں ہے۔ ہم پاکستان سے نئے نئے آئے ہیں اور وہاں سیفٹی بیلٹ کا رواج نہیں ہے۔"

"آپ نے پیچھے کے شیشے میں دیکھے بغیر کار ریورس کر لی۔ عقب میں آنے والے کے لیے بریک تک نہ لگایا۔ پھر گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے موڑنے سے پہلے کار نہیں روکی۔ بس ہلکی رفتار کی اور نکل کھڑے ہوئے۔ کار چلاتے ہوئے آپ نے کبھی مرر کے اندر جھانک کر نہیں دیکھا۔ آپ کو دائیں ہاتھ مڑنا تھا مگر آپ سڑک پر دائیں ہاتھ پر چلتے رہے۔ آپ نے لین تبدیل کرتے ہوئے ایک بار بھی اشارہ نہیں دیا۔ آپ مقررہ رفتار کی حد سے زیادہ تیز کار چلاتے رہے۔"

"مگر مقررہ حد کیا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"وہ پمفلٹ میں لکھی ہوئی ہے اور سڑکوں پر بھی ہر جگہ بورڈ لگے ہوئے ہیں کہ کس

مقام پر مقررہ حد کیا ہے؟"

مختصر یہ کہ ہمیں یوں لگا جیسے ہمیں کار چلانی آتی ہی نہیں ہے۔ کوئی ایک مہذب طریقہ یا اصول بھی ہم نے پیش نظر نہیں رکھا تھا۔ بس ہمیں کار چلانے سے سروکار تھا۔ ہم نہ صرف فیل ہو گئے تھے بلکہ بہت بری طرح فیل ہوئے تھے اور اس میں ہماری ڈرائیونگ کی خرابی کا نہیں بلکہ بے پروائی کا دخل تھا۔

"اور ہاں" انہوں نے کار سے باہر نکلتے ہوئے فرمایا "ایک جگہ آپ نے ہارن بھی بجا دیا تھا جو کہ ناقابل معافی جرم ہے۔"

ہم شرمندگی سے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

"اب کیا ہو گا؟"

"اب آپ چاہیں تو کل پھر امتحان دے سکتے ہیں۔"

"تو کیا تحریری امتحان بھی ہو گا؟"

"نہیں۔ صرف کار ڈرائیونگ ہو گی۔ وہ امتحان تو آپ پاس کر چکے ہیں۔"

ہم ندامت سے چلتے ہوئے لبنیٰ کے پاس پہنچے تو وہ ایک اچھی اور خوش فہم بیوی کی طرح خوش ہو کر کھڑی ہو گئی "پاس ہو گئے؟"

"نہیں۔ فیل اور بہت بری طرح۔"

"کیا کیا آپ نے؟"

"کچھ بھی نہیں کیا۔ جو کچھ کرنا چاہیے تھا وہ نہیں کیا۔"

"اب کیا ہو گا؟"

"کل پھر آئیں گے۔"

☆ ☆ ☆

کار میں بیٹھ کر ہم نے سب سے پہلے سیفٹی بیلٹ پہنا۔ پھر لبنیٰ کو بھی بیلٹ لگانے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد شیشے میں جھانک کر دیکھا اور پیچھے سے گزرنے والے کے لیے کار روک دی۔ اپنے ہاتھ پر کار چلاتے رہے۔ کسی چوراہے سے گزرنے سے پہلے کار کو بالکل بریک لگا دیتے تھے۔ اپنے پچھلے شیشے میں بار بار جھانک کر دیکھتے تھے۔ رفتار کی حد کا بھی پورا

خیال کر رہے تھے۔

"آپ اتنا آہستہ کیوں چل رہے ہیں؟" لیلیٰ نے پوچھا۔

"جانتی ہو' یہاں رفتار کی حد کیا ہے؟ وہ دیکھو' سامنے بورڈ پر لکھا ہے۔"

"مگر آپ بار بار شیشہ کیوں دیکھ رہے ہیں۔ یہ کیا نیا شوق ہوا ہے؟"

"یہ ٹریفک اصولوں کا تقاضا ہے اور دیکھو' تم بھی بار بار شیشہ ضرور دیکھنا۔ ممتحن ان باتوں سے بہت خوش ہوتے ہیں۔"

ہم گھر پہنچے اور سب کو یہ اطلاع دی تو عاطف نے خوش ہو کر مبارک باد دی اور کہا "انکل! آپ نے فیل ہونے کی ہیٹ ٹرک مکمل کر لی ہے۔"

لیلیٰ نے کھانے کے بعد کافی کی پیالی دیتے ہوئے ہمیں مشورے دینے شروع کر دیے۔ پہلا مشورہ یہ تھا کہ دو چار دن اور اچھی طرح پریکٹس کر لیں تا کہ ہاتھ صاف ہو جائے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ اگر کل ہم پاس نہ ہوئے اور ڈرائیونگ لائسنس نہ ملا تو ہم سے کار واپس چھین لی جائے گی اور ہمارا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر یہ کہ ہم کل دوبارہ جائیں گے۔ شکر کرو کہ کل تحریری امتحان نہیں دینا پڑے گا ورنہ اس بار اس میں بھی فیل ہو سکتے تھے۔"

رات کو اکمل علیمی صاحب آئے اور یہ روداد سن کر بہت ہنسے۔

"ارے آفاقی صاحب۔ آپ اتنے اچھے ڈرائیور ہیں۔ بس ذرا اصولوں کا خیال رکھیے۔ میم نے جو غلطیاں نکالی ہیں وہ دوبارہ نہ کیجیے تو پاس ہو جائیں گے۔"

ہم نے کہا "مگر ہم پر نفسیاتی دباؤ بہت زیادہ ہے۔"

"میری مانئے تو صبح نماز پڑھ کر چاروں قل اور آیت الکرسی ضرور پڑھیے۔"

"بلکہ موقع پا کر اس ممتحن پر بھی پڑھ کر پھونک دیجیے" لیلیٰ نے مشورہ دیا۔

"اس کے علاوہ ایک عدد امام ضامن بھی بندھوا لیجیے۔" اکمل علیمی صاحب نے کہا۔

"مگر امام ضامن آئے گا کہاں سے؟"

"میرے پاس پڑا ہوا ہے۔ پاکستان سے آتے ہوئے ڈھیر سارے امام ضامن مجھے باندھے جاتے ہیں۔ ایک آپ بھی لے لیں۔"

"مگر وہ تو سفر کی خیریت سے گزرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ حفاظت کے لیے ہوتے ہیں۔"

"ارے آپ بھی تو سفر کریں گے نا۔ سڑک پر کار چلائیں گے تو وہ کیا ہے؟ سفرا حفاظت کی بھی آپ کو ضرورت ہے۔ امام ضامن آپ کو میم کے شر سے محفوظ رکھے گا۔"

عاطف نے کہا "انکل۔ دیکھیے' آپ کا فیل ہونے کا ہیٹ ٹرک مکمل ہو گیا ہے۔ اب مزید فیل ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔"

نغمی صاحب کو ہم نے فون پر یہ روداد سنائی تو انہوں نے کہا "آپ کی خود اعتمادی گھائل ہو گئی ہے۔ ٹھہرئے' میں اس کا علاج کرتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"میرے بزرگوں نے ایک وظیفہ بتایا ہے جو مشکل وقت میں پڑھا جاتا ہے۔ آپ کے اندر اتنی خود اعتمادی آجائے گی کہ آپ ہوائی جہاز چلانے کا امتحان بھی پاس کر لیں گے۔ اب ذرا چپ بیٹھ جائیے اور اپنا چہرہ ریسیور کے سامنے رکھیے۔ میں وظیفہ پڑھ کر پھونک ماروں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ہم خاموشی سے فون کے سامنے بیٹھ گئے۔ دوسروں کو بھی چپ ہونے کی ہدایت کر دی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ریسیور ہم نے اس طرح اپنے منہ کے سامنے رکھ لیا تھا جس طرح ہزماسٹرزوائس کی تصویر میں کتا باجے کے سامنے بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ کچھ دیر بعد ہمیں پھونکوں کی آواز سنائی دی۔

"کیوں۔ پھونک آئی؟" نغمی صاحب نے پوچھا۔

"آواز تو آئی ہے' ہوا نہیں آئی۔"

"ہوا فون پر کیسے آئے گی۔ بس آواز ہی آ گئی' یہ کافی ہے۔ اب کل دنیا کی کوئی طاقت آپ کو نہیں روک سکتی پاس ہونے سے۔ اور ہاں' کار میں بیٹھ کر "نصر من اللہ" ضرور پڑھ لینا' اوکے؟"

"اوکے۔"

ہم نے حاضرین محفل کو تمام کارروائی سے آگاہ کر دیا۔ عاطف نے کہا "انکل' ایک کام اور ضرور کریں۔"

"وہ کیا؟"

"کار چلانے سے پہلے لاحول پڑھ کر ممتحن پر پھونک مار دیں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ بھئی یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ کیا سوچے گی؟"

"جہنم میں جائے۔ جو چاہے سوچے۔"

"اور جو اس نے پوچھ لیا کہ یہ کیا کر رہے ہو تو؟"

"تو کہہ دینا لاحول پڑھ رہے ہیں۔ شیطان کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے۔ ٹھیک ہے نا؟ اس کی کیا سمجھ میں آئے گا۔"

"ٹھیک ہے" ہم نے مریل سی آواز میں کہا۔

دوسرے دن ہم پھر اس لمبوترے سے کمرے میں جا کر تشریف فرما ہو گئے۔ ہم سے پہلے ایک اور صاحب تھے۔ یہ کورین' جاپانی' چینی' تھائی یا اسی قسم کے کچھ تھے۔ ہمیں ان کو غور سے دیکھنے کی فرصت نہیں تھی کیونکہ ہم دعائیں پڑھنے میں مصروف تھے۔ اکمل علیمی صاحب کا دیا ہوا امام ضامن ہمارے بازو پر بندھا ہوا تھا۔ چاروں قل اور آیت الکرسی ہم کئی بار پڑھ کر آس پاس پھونکیں مار چکے تھے۔ یہاں تک کہ جوش میں آ کر ممتحن کو دیکھے بغیر ہی کئی بار "لاحول" بھی پڑھ چکے تھے۔

کچھ دیر بعد کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی اور کمرے میں ایک نئی صاحبہ داخل ہوئیں۔ یہ متوسط قامت کی قبول صورت خاتون تھیں۔ جسم قدرے موٹاپے کی طرف مائل تھا مگر ابھی صرف مائل ہی ہو سکا تھا۔ موٹا نہیں ہوا تھا۔ کل والی خاتون کے مقابلے میں قدرے خوش مزاج بھی نظر آئیں۔ انہوں نے ہم سے پہلے بیٹھے ہوئے صاحب کو مسکرا کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا اور وہ دونوں رخصت ہو گئے۔ ہم نے اطمینان کی لمبی سانس لی۔ گویا دعاؤں کے طفیل یا نغمی صاحب کے وظیفے کی بدولت ہماری سب سے بڑی مشکل تو آسان ہو چکی تھی اور وہ خاتون آج موجود نہ تھیں جن سے نفسیاتی طور پر ہم مرعوب ہو چکے تھے۔ پھر یہ کہ نئی ممتحن قدرے خوش مزاج اور ہنس مکھ بھی نظر آ رہی تھیں۔ آخر دعاؤں اور وظیفوں کا کچھ تو اثر ہونا ہی چاہیے تھا۔ امام ضامن کی برکت اس کے علاوہ تھی اور ابھی تو ہم نے لاحول بھی پڑھ کر نہیں پھونکی تھی۔ بہرحال ہمارے دل نے ہم سے کہا کہ بھائی' پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے راستے کے کانٹے صاف ہو رہے ہیں۔ اللہ پر بھروسا

رکھو اور اپنی باری کا انتظار کرو۔

نصف گھنٹے کے بعد ہماری ممتحن دوبارہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ اسی دوران میں ہمارے علاوہ تین چار اور امیدوار بھی آ کر کمرے میں بیٹھ گئے تھے۔ ان میں اکثریت مردوں کی تھی' ایک خاتون بھی تھیں جو خاصی گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہ بھی جنوب مشرقی ایشیا کے کسی ملک سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے برابر میں بیٹھے ہوئے ایک چینی نے ہم سے سرگوشی میں کہا "شی اپ سیٹ۔ شی ناٹ نو انگلش" (ترجمہ یہ اس لیے پریشان ہے کہ بے چاری انگریزی نہیں جانتی) وہ خود جتنی انگریزی جانتے تھے وہ اس جملے سے واضح تھی مگر خود اعتمادی بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے اور یہ صاحب خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال تھے۔

ممتحن نے اندر آ کر حاضرین کا جائزہ لیا پھر ہمارے پاس آ گئیں "اب تمہاری باری ہے۔"

ہم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ پہلے لاحول پڑھیں یا چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ کر پھونکیں۔ اسی کشمکش میں مبتلا ہم باہر نکل گئے۔

انہوں نے پوچھا "آپ کی کار کون سی ہے؟"

ہم نے اشارے سے بتا دیا۔ انہوں نے کہا "آئیے" اور اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئیں۔ اندر بیٹھتے ہی انہوں نے بیلٹ باندھ لیا۔ مطلب یہ کہ ہمیں یاد دلا رہی تھیں کہ تم بھی بیلٹ باندھ لو۔ ہم تو پہلے ہی تیار تھے۔ بڑے خشوع و خضوع سے ہم نے بیلٹ لگایا پھر منہ ہی منہ میں لاحول پڑھ کر ان کی طرف دیکھا تو وہ ہماری طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔ اس کے باوجود ہم نے ایک دبی سی پھونک ماری۔

"کار باہر نکالیں" انہوں نے حکم دیا۔ ہم نے فوراً اگلے پچھلے شیشوں میں جھانکنا شروع کیا۔ اس کے بعد جب اطمینان کر لیا کہ پیچھے کوئی نہیں ہے تو بڑے آرام سے کار کو ریورس کر لیا۔

"باہر کی طرف چلیے" انہوں نے کہا اور ہم نے بڑی احتیاط سے کار کا رخ باہر کے گیٹ کی طرف کر دیا مگر یہ خیال رکھا کہ اپنے دائیں ہاتھ ہی رہیں۔ گیٹ کے پاس پہنچ کر انہوں نے کہا "ہم دائیں جانب جائیں گے۔"

ہم نے سڑک پر نکلنے سے پہلے کار روک دی۔ پہلے دائیں دیکھا پھر بائیں دیکھا اور پھر

بڑی رسان سے کار دائیں جانب موڑ لی۔ یہ وہی کل والا راستہ تھا مگر حالات کافی مختلف تھے۔ اول تو یہ کہ کل والی نک چڑھی اور بدمزاج ممتحن ہمارے ساتھ نہیں تھیں۔ دوئم یہ کہ راستہ کل والا ہی تھا جو ہمارا دیکھا بھالا تھا اور ہم بڑے اطمینان سے گاڑی چلا رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً" آگے پیچھے....... اور دائیں بائیں بھی دیکھ لیتے تھے۔ ان کی ہدایات پر ہم بڑی چابک دستی سے عمل کر رہے تھے اور وہ خاصی متاثر معلوم ہو رہی تھیں۔ ابھی تک چاروں قل پڑھنے کی نوبت تو نہیں آئی تھی مگر ہمارے بازو میں بندھا ہوا امام ضامن اپنا رنگ دکھا رہا تھا اور پھر نغمی صاحب کی روحانی پھونکوں کا بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور تھا۔ وہ ہمیں ہدایات دیتی رہیں اور ہم بڑی خوش اسلوبی سے ڈرائیونگ کرتے رہے۔ جہاں تک ہمیں اندازہ تھا ہم نے ایک بھی غلطی نہیں کی تھی۔ غلطی تو ہم نے گزشتہ روز بھی نہیں کی تھی مگر اس آفت کی پرکالا نے بلاوجہ بے شمار غلطیاں نکال دی تھیں۔ آج ہم پاکستانی ڈرائیونگ کو بالکل بھول چکے تھے اور نہایت احتیاط کے ساتھ امتحان دے رہے تھے۔ آخر ہم اسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے ہمیں کار موڑ کر واپس آنا تھا۔ اندر داخل ہو کر ہم نے پہلے تو بریک لگا کر کار روکی۔ پھر اسے ریورس کیا اور نہایت صفائی سے ریورس کر لیا۔

وہ بولیں "بہت محتاط ڈرائیور ہیں آپ۔"

ہم نے کہا "ہم تو اتنی احتیاط کرتے ہیں کہ کئی بار کار چلاتے ہی نہیں ہیں۔"

"کرتے کیا ہیں آپ؟"

"ابھی تو کچھ نہیں کرتے۔"

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

ہم نے انہیں بتایا کہ پاکستان سے آئے ہیں اور وہاں فلمیں بناتے ہیں۔

یہ سنتے ہی ان کا موڈ بدل گیا۔ فلم ایک ایسا جادو ہے جو ہر دروازہ کھول دیتا ہے۔ اب انہوں نے ہماری محتاط ڈرائیونگ کا مظاہرہ دیکھ لیا تھا اور خاصی مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ واپسی میں انہوں نے ہم سے پاکستانی فلموں کے بارے میں کچھ سوالات پوچھے اور ہم واپس دفتر پہنچ گئے۔

انہوں نے ایک ادھیڑ عمر خاتون کے پاس پہنچ کر ایک سلپ پر دستخط کر کے انہیں دے دی اور کہا "ان کا پراسیس شروع کریں۔ ڈرائیونگ میں پاس ہو گئے ہیں۔"

ہیں مسکرا کر انہوں نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور رخصت ہو گئیں۔

ادھیڑ عمر خاتون نے سر سے پیر تک نہایت بیزار نظروں سے دیکھا اور پھر فرمایا "اکیس ڈالرز" ہم نے اکیس ڈالر نکال کر ان کے حوالے کر دیے۔ انہوں نے ایک رسید بنا کر ہمارے حوالے کی اور پھر کہا "وہ سامنے دیکھ رہے ہو؟"

ہم نے اس سمت میں دیکھا "جی ہاں۔"

"کیا ہے وہاں پر؟"

"تصویر بنائی جا رہی ہے۔"

"بس وہیں جا کر ایک تصویر بنوا لو اور تصویر لے کر میرے پاس آ جاؤ۔"

ہم اس کاؤنٹر کے پاس چلے گئے جس کے سامنے ایک صاحب کیمرا نصب کیے بیٹھے تھے۔ ہم نے رسید نما کاغذ ان کے حوالے کر دیا۔

"سامنے آئیے" انہوں نے ہمیں اشارے سے کیمرے کے سامنے آنے کی ہدایت کی۔ ہم چپ چاپ کیمرے کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔

"ریڈی" انہوں نے کہا۔ ہمارے ریڈی ہونے سے پہلے ایک جھماکا ہوا اور ہماری تصویر بن گئی۔ انہوں نے کیمرے میں کچھ کیا اور ایک چھوٹی سی تصویر باہر نکال لی۔

"یہ رہی تصویر۔ واپس ان ہی خاتون کے پاس لے جائیے۔"

ادھیڑ عمر خاتون نے ہماری تصویر پر ایک نظر ڈالی۔ پھر ہم کو دیکھا اور مطمئن ہو کر انہوں نے ایک لمبی سانس لی اور پھر کہا "پانچ منٹ انتظار کریں۔ آپ کا لائسنس آپ کو مل جائے گا۔"

پانچ منٹ بعد واقعی ہمارا ڈرائیونگ لائسنس ہمارے ہاتھ میں تھا۔

☆ ☆ ☆

ہم نے لبنیٰ کو جا کر یہ خوش خبری سنائی۔ سب سے بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ اب ہم سچ مچ اپنی کار کے مالک بن گئے تھے۔ ورنہ فیل ہونے کی صورت میں ہمیں کار واپس کرنی پڑتی۔ اگلے دن نغمی صاحب کے پاس جا کر ہم نے اپنا ڈرائیونگ لائسنس مائیک کو دکھایا تو

انہوں نے ہمیں بڑی گرم جوشی سے مبارک باد دی۔ ہمارے لائسنس کی ایک کاپی بنوا کر اپنے پاس رکھی اور کار کے تمام کاغذات ہمارے سپرد کر دیے۔ یہ امریکا میں کار خریدنے اور کار ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنے کی تفصیل ہے۔ وہاں یہ اصول بہت اچھا ہے کہ آپ جب چاہیں امتحان دینے کے لیے محکمے کے پاس پہنچ جائیں۔ اگر آپ تحریری اور عملی امتحان میں پاس ہو گئے تو وہیں کھڑے کھڑے آپ کو ڈرائیونگ لائسنس مل جائے گا۔ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنے کے لیے جو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ اس کا سبھی کو علم ہے یا پھر کوئی پاپڑ نہیں بیلنا پڑتا صرف ایک بڑا سا "پاپا" متعلقہ افراد کے حوالے کرنا پڑتا ہے اور گھر بیٹھے بٹھائے آپ کا لائسنس بن جاتا ہے۔ یعنی ہمارے ملک میں معمولی سے معمولی کام بھی بہت مشکل ہے لیکن اگر آپ کے پاس سفارش یا رشوت ہے تو پھر سارے کام آسان ہو جاتے ہیں۔

اگلے دن لبنیٰ کے امتحان دینے کی باری تھی۔ پہلے تو ہم انہیں بہت غور سے ٹریفک کے اصول یاد کرنے کی تلقین کرتے رہے اور وہ ہمیں یقین دلاتی رہیں کہ انہیں سب کچھ یاد ہو چکا ہے پھر ہم نے اپنے تجربات کی روشنی میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ جب وہ ڈرائیونگ کے امتحان کے لیے جائیں تو کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ کس طرح بار بار شیشے میں دیکھیں، سیفٹی بیلٹ کا استعمال بڑے اہتمام سے کریں اور ڈرائیونگ کرتے ہوئے ممتحن کو یہ باور کرا دیں کہ آپ نہایت محتاط ڈرائیور ہیں پھر ہم نے انہیں اس راستے کے بارے میں بھی بتا دیا جس پر عام طور پر امتحان دینے والوں کو لے جایا جاتا ہے۔

پہلا مرحلہ تحریری امتحان کا تھا۔ ہم نے بہت سی دعائیں وغیرہ پڑھ کر لبنیٰ پر پھونکیں اور خود انہیں بھی دعائیں پڑھنے کی ہدایت کی۔ ہم تو ان کے بازو پر امام ضامن بھی باندھنا چاہتے تھے مگر وہ رضامند نہ ہوئیں۔ ان کا خیال تھا کہ امام ضامن صرف اسی شخص کو اپنے مخصوص مقصد کے لیے باندھنا چاہیے جس کے لیے وہ امام ضامن بنایا گیا ہو۔

"بھئی امام ضامن پر کسی کا نام تھوڑا ہی لکھا ہوتا ہے۔ تم باندھ لو اللہ کا نام لے کر۔"

بولیں "میں کسی کی اترن کیوں باندھوں؟"

ہم نے کہا "یہ کوئی لباس تو نہیں ہے۔ امام ضامن ہے۔ یہ تو تعویذ کی طرح ہوتا ہے۔"

بولیں "تعویذ بھی بدلا نہیں جا سکتا۔ جس آدمی کو کسی خاص کام کے لیے تعویذ دیا جاتا ہے وہی اسے استعمال کر سکتا ہے۔"

"ارے بھئی یہ تو اللہ کا کلام ہوتا ہے۔ بڑی تاثیر ہوتی ہے اس میں۔" مگر توبہ کیجیے۔ عورتوں کی ہٹ کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔ انہوں نے امام ضامن باندھنے سے صاف انکار کر دیا۔ البتہ دعائیں ضرور پڑھتی رہیں۔ ہم نے "نصر من اللہ" پڑھ کر ان پر پھونک ماری اور وہ کمرہ امتحان میں داخل ہو گئیں۔ ہم باہر کے ہال کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے رہے۔ ہمیں یقین تھا کہ انہوں نے دل لگا کر قواعد کو یاد نہیں کیا ہے اس لیے ان کا اللہ ہی مالک ہے مگر جب وہ اپنا پرچا دینے کے بعد لمبوترے کمرے کی طرف روانہ ہوئیں تو ہم سمجھ گئے کہ وہ تحریری امتحان میں پاس ہو گئی ہیں۔ آخر ہماری دعائیں کچھ تو رنگ لائیں۔

وہ لمبوترے کمرے میں بیٹھ گئیں اور ہم نے بے چینی سے سامنے والے ہال میں چہل قدمی شروع کر دی۔ جس وقت ہم امتحان دے رہے تھے اس وقت لبنیٰ بالکل مطمئن تھیں بلکہ وہ احتیاطاً اپنے ساتھ چند میگزین بھی لے گئی تھیں اور تمام وقت بڑے آرام سے کرسی پر بیٹھی میگزین پڑھنے میں مصروف رہی تھیں۔ پتا نہیں انہیں معاملے کی سنگینی کا پوری طرح احساس نہیں تھا یا پھر وہ ہم سے زیادہ صابر و شاکر تھیں۔ انہوں نے تحریری امتحان تو ایک ہی حملے میں پاس کر لیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ عملی امتحان میں ان پر کیا گزرتی ہے۔ ہم نے انہیں بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ انہیں کن راستوں سے امتحان کے لیے لے جایا جائے گا اور ممتحن ان سے کیا توقعات وابستہ کرے گی۔ ہم یہ بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کی ممتحن کون ہے؟

ہماری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے ہی رہ گئی جب ہم نے لمبی تڑنگی ممتحن کو کھٹ کھٹ کرتے ہوئے ان کے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا۔ یہ وہی خاتون تھیں جنہوں نے بڑی بے رحمی سے ہمیں فیل کر دیا تھا۔ بلکہ یہ فرمایا تھا کہ ہم صفر کے سوا کوئی نمبر حاصل نہیں کر سکے۔ ایسی سنگدل خاتون سے بھلا کسی بھلائی کی کیا توقع رکھی جا سکتی تھی؟ ہم نے جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو پڑھنا شروع کر دیا۔ ممتحن نے لبنیٰ کو اپنے ساتھ آنے کے لیے کہا اور وہ ان کے ساتھ چل پڑیں۔ ہم بہت پچھتائے کہ ہم نے لبنیٰ کو "لاحول" پڑھنے کا مشورہ کیوں نہیں دیا کیونکہ وہ ممتحن واقعی لاحول کی مستحق تھیں لیکن ہمیں زیادہ پریشانی

اس وقت لاحق ہوئی جب کار میں بیٹھنے کے بعد دفتر کے گیٹ سے باہر نکل کر انہوں نے لبنیٰ کو ایک مختلف راستے پر چلنے کو کہا اور ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اب لبنیٰ کے پاس ہونے کا کوئی ہلکا سا امکان بھی باقی نہیں رہا تھا۔

ہم سر پکڑے بیٹھے تھے کہ برابر والے صوفے پر کوئی آکر بیٹھ گیا اور ہمیں ایک نرم مردانہ آواز سنائی دی "میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟"

دیکھا تو ایک ہنس مکھ درمیانہ عمر یورپین ہمارے برابر تشریف فرما تھے۔

"آپ ٹھیک تو ہیں؟" انہوں نے پوچھا "میں کافی دیر سے آپ کو بے چینی سے گھورتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔"

ہم نے کہا "شکریہ۔ ہم ٹھیک ہیں۔ دراصل ہماری وائف ڈرائیونگ کا امتحان دینے کے لیے جا رہی ہیں اور ہمیں ڈر ہے کہ وہ فیل ہو جائیں گی۔"

وہ مسکرائے، کہا "وہ شیشے کے پیچھے آپ ایک خاتون کو دیکھ رہے ہیں؟" ان کا اشارہ اسی لبوترے کمرے کی طرف تھا۔

ہم نے دیکھا تو ایک اسمارٹ سی نوجوان خاتون بہت فیشن ایبل لباس پہنے ہوئے تشریف فرما تھیں، کہنے لگے "وہ میری وائف ہیں اور آپ کی وائف کے بعد میری وائف کی باری ہے۔"

ہم نے کہا "اللہ مدد کرے گا۔"

بولے "میں تو دعا کر رہا ہوں کہ وہ فیل ہو جائے۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "وہ کیوں؟"

"آپ میری بیوی کو نہیں جانتے، وہ دنیا کی بدترین ڈرائیور ہے۔ ابھی اسے لائسنس نہیں ملا ہے مگر سیکھتے سیکھتے وہ دس بارہ ایکسیڈنٹ کر بیٹھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تمام ایکسیڈنٹ سنسان اور تنہا مقامات پر تھے اور درختوں کے سوا کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔"

"تو پھر آپ انہیں یہاں لے کر کیوں آگئے؟"

کہنے لگے "نہ لاتا تو لڑائی ہوتی۔ جب اسے فیل ہی ہو جانا ہے تو مجھے بلاوجہ ا[illegible] شکایت کا موقع فراہم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ کے پاس لائسنس ہے؟"

ہم نے کہا "دو دن پہلے یہیں سے لیا ہے۔ یہ ممتحن بہت ظالم ہے۔ اس نے ہمیں

زیرو نمبر دیا تھا۔"

بولے "کاش یہ میری بیوی کو بھی زیرو کر دے" یہ کہہ کر انہوں نے اپنی جیب سے ایک تہہ کیا ہوا اخبار نکالا اور اپنے گھٹنے پر پھیلا کر معما حل کرنے میں مصروف ہو گئے۔

کافی دیر ہو گئی یہاں تک کہ روشنیاں جل گئیں مگر لبنیٰ اور ہماری کار کا کوئی سراغ نظر نہ آیا۔ ہم یہ تو جانتے تھے کہ ٹریفک ڈیپارٹمنٹ کی ایک ذمے دار خاتون ان کے ہمراہ ہے لیکن اس کے باوجود عجیب عجیب سے خیالات ہمارے ذہن میں آ رہے تھے۔ اس بار ہم نے سچ مچ خلوص سے دل سے دعائیں کرنی شروع کر دیں۔

چند لمحے بعد ہماری کار گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو ہم بے اختیار تیزی سے باہر نکل گئے۔ لبنیٰ نے کار ایک جگہ پارک کی اور ممتحن نے ان سے گفتگو شروع کر دی۔ ہم سمجھ گئے کہ ڈانٹ ڈپٹ کر رہی ہو گی۔ مگر یہ گفتگو زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی۔ وہ دونوں کار سے باہر نکلیں تو ہم تیزی سے لبنیٰ کی طرف بڑھے۔ "لبنیٰ۔ خیریت تو ہے نا؟"

"جی بالکل" وہ مسکرائیں۔

ممتحن نے ہمیں اور پھر لبنیٰ کو دیکھا اور ان سے پوچھا "یہ آپ کے شوہر ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"حیرت ہے!" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے چلی گئیں۔

ہم نے لبنیٰ سے پوچھا "فیل ہو گئیں؟ کتنے نمبر ملے؟"

وہ بولیں "پاس ہو گئی ہوں۔ دس میں سے دس نمبر ملے ہیں مجھے۔"

ہم حیران کھڑے ان کی شکل دیکھتے رہے۔ ایک ایسے شخص کی بیوی جس نے ڈرائیونگ ٹیسٹ میں فیل ہونے کا "ہیٹ ٹرک" کیا تھا پہلی ہی کوشش میں پاس ہو گئی تھی۔

کون کہتا ہے کہ معجزے آج کل رونما نہیں ہوتے؟

لبنیٰ نے کہا "میں نے اس قدر احتیاط سے کار چلائی کہ وہ بے اختیار تعریف کرنے پر مجبور ہو گئی اور مجھ سے پوچھا کہ تم نے ڈرائیونگ کہاں سیکھی ہے؟ جب میں نے بتایا کہ پاکستان میں سیکھی ہے تو وہ بہت متاثر ہوئی اور کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستانی بہت اچھے ڈرائیور ہوتے ہیں۔"

مگر ہم پر نظر پڑنے کے بعد یقیناً اس کی رائے بدل گئی ہو گی۔

☆ ☆ ☆

امریکا میں باقاعدہ "لائسنس یافتہ" اور صاحب کار ہونے کے بعد ہمارے چند دن سیرو تفریح میں گزرے۔ ہم صبح گھر سے کار لے کر نکلتے اور رات گئے تک ورجینیا کی مختلف سڑکوں پر گھومتے رہتے۔ کبھی واشنگٹن کی طرف بھی جا نکلتے لیکن اس طویل عرصے کے دوران میں زیادہ وقت بھٹکنے اور راستہ بھولنے میں گزر جاتا۔ امریکا میں سڑکوں کا نظام دنیا میں بہترین ہے۔ اس قدر باقاعدہ اور فہم ہے کہ محض سڑکوں اور شاہراہوں کے نمبر یاد کر کے ہی بالکل انجان ڈرائیور منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہے۔ ہم انجان ڈرائیور تو تھے ہی مگر راستہ بھولنے والے ڈرائیور بھی تھے۔ جن راستوں سے روزانہ گزر ہوتا ہے ان کی تو خیر ہے لیکن جن جگہوں پر وقفوں کے بعد جانا ہوتا ہے وہاں تک پہنچنے کے لئے راستہ بھولنا اور بھٹک جانا ہماری عادت میں شامل ہے۔ سڑکوں کے نام اور نمبر ہمیں یاد نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ گھروں کے نمبر بھی یاد نہیں رہتے۔ جب ایک دو نمبر یاد نہیں رہتے تو پھر ایسے مکانوں کے نمبر کیوں کر یاد رہ سکتے ہیں جو سینکڑوں اور ہزاروں میں تھے اور جہاں سڑکوں کے نام بھی ہمارے لئے بالکل نئے اور نامانوس تھے اس لئے یہ ہمارے معمول میں داخل تھا کہ ہم کسی سے ملنے کے لئے اس کے گھر جاتے تو ہمیشہ وقت مقررہ سے نصف یا ایک گھنٹے بعد وہاں پہنچتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک بھٹکنے کے بعد منزل پر پہنچ گئے اور ایسا بھی ہوا کہ جب کسی طور پر صحیح راستہ یا منزل نہ ملی تو واپس گھر کی طرف چل پڑے اور وہاں پہنچنے کے لئے بھی بار بار راستہ بھولے۔ ہم پاکستانی لوگ راستوں کی پہچان کے لئے عموماً نشانیاں مقرر کر لیتے ہیں۔ امریکا جب نئے نئے ڈرائیور بنے تو نشانیاں مقرر کرنا خاصا مشکل کام تھا چنانچہ یہ ہوا کہ راستہ بھولتے رہے۔ وہاں سڑکیں اور شاہراہیں بہت لمبی لمبی اور طویل ہوتی ہیں۔ اگر ایک بار آپ غلط سڑک پر نکل گئے تو فوری طور پر مڑنا بھی ممکن نہیں پھر اس کے لئے بہت لمبا راستہ طے کرنا پڑتا ہے کیونکہ اکثر سڑکیں "ون وے" ہوتی

ہیں۔ پھر ہمیں وہاں کی سڑکوں کے نظام سے بھی واقفیت نہیں تھی اس لئے کہیں کے کہیں پہنچ جاتے تھے۔ جب سسٹم سے واقفیت ہوئی تو پتا چلا کہ اس سے زیادہ سہل اور آسان نظام ہی کوئی نہیں ہے اور ایک بچہ بھی بڑی آسانی سے منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہے مگر یہ بعد کی بات ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم غلط ایگزٹ (باہر نکلنے کے راستے) سے باہر نکل گئے اور صحیح راہ پانے کے لئے بہت لمبا چوڑا سفر طے کیا۔ حالانکہ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ایک غلط ایگزٹ سے باہر نکلنے کے بعد آپ آسانی سے اگلی سڑک سے دوبارہ اسی راستے پر پہنچ سکتے ہیں۔ جگہ جگہ سڑکوں کے نمبر، نام اور علاقوں کے نام لکھے ہوتے ہیں۔ کسی موڑ کے آنے سے پہلے ہی آپ کو مطلع کر دیا جاتا ہے کہ اب آپ فلاں مقام سے فلاں جگہ کے لئے بائیں یا دائیں مڑیں گے مگر ہم ان طریقوں کے عادی نہیں تھے۔ ہمارے ہاں اول تو سڑکوں پر نشانات اور ہدایات لکھنے کا رواج ہی نہیں ہے۔ دوسرے اگر کہیں لکھا بھی ہوتا ہے تو اس مقام سے عین پہلے لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ جب کہ امریکا میں رواج یہ ہے کہ دو تین کلومیٹر آپ کو پتا نشان وغیرہ سے مطلع کر دیا جاتا ہے اور عین جس جگہ سے آپ کو مڑنا ہے وہاں کچھ بھی لکھا نہیں ہوتا۔ اب ہماری مشکل یہ تھی کہ ہم دو تین کلومیٹر پہلے والے نشان کو یا تو دیکھتے ہی نہیں تھے یا پھر اگر دیکھ بھی لیتے تھے تو یاد رکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہم غلط سڑکوں پر نکل جاتے تھے اور بھٹکتے پھرتے تھے۔ لبنیٰ ہماری اس عادت سے بہت نالاں تھیں۔

مگر ہم نے انہیں سمجھایا کہ ہمارا مقصد تو دراصل سیر و تفریح ہے۔ راستہ بھول کر بھی تو ہم سیر کرتے ہیں تو پھر بلاوجہ یہ سوچ کر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے کہ ہم بھٹک رہے ہیں۔ اگر آپ بھٹکنے سے بھی لطف اندوز ہونے لگیں تو پھر ذرا سی بھی کوفت نہیں ہوتی۔

ہم نے بتایا ہے کہ امریکا میں غبی سے غبی اور کند ذہن سے کند ذہن ڈرائیور بھی راستہ نہیں بھول سکتا۔ سڑکوں پر نشانات درج ہیں۔ جہاں آپ جا رہے ہیں اس کے لئے آپ کو متعلقہ شخص نے مکمل "ہدایات" دے دی ہیں۔ اس کے علاوہ سڑکوں کے نقشے بھی عام مل جاتے ہیں۔ ان نقشوں کی مدد سے ایک اندھا بھی راستہ تلاش کر سکتا ہے لیکن اگر ان سب سہولتوں کے باوجود کوئی شخص راستہ بھول جائے اور بار بار بھٹکنے لگے تو آپ اسے کیا کہیں

گے؟ بہرحال جو بھی کہیں وہ حق بجانب ہو گا۔ ہمیں کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ ان آسانیوں کی بدولت امریکا میں نہ تو راستہ پوچھنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ ہی ایسا کوئی رواج ہے۔ اور پھر راستہ پوچھیں بھی تو کس سے۔ لمبی لمبی سڑکیں ہیں جن پر ٹریفک ہر وقت رواں دواں رہتا ہے۔ اب پتا پوچھیں تو کس سے اور کیونکر پوچھیں؟ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے ہم نے یہ آسان طریقہ اختیار کیا تھا کہ گیس اسٹیشن (پٹرول پمپ) والے سے پوچھ لیا کرتے تھے جو عموماً" صحیح راستہ بتا دیتا تھا۔ اب یہ قصور ہمارا تھا کہ ہم اس کے بتائے ہوئے نمبر اور نام یاد نہیں رکھ سکتے تھے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ہاتھ کے اشارے سے کسی کار کو روکئے اور اپنی مشکل بیان کیجئے۔ یہ طریقہ خاصا معیوب سا لگتا ہے کہ کوئی سفر پر جا رہا ہے کہ اچانک آپ نے اشارہ دے کر اسے روک لیا اور "ایکسکیوزمی" کہہ کر پتا دریافت کرنے لگے۔

ایک روز ہمیں بھٹکتے ہوئے ایک گھنٹا گزر گیا تھا۔ کافی لمبا راستہ طے کرنے کے بعد جب کسی جگہ پہنچتے تو احساس ہوتا کہ

یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ گیت مرحوم شیون رضوی نے ہمارے تجربات سے متاثر ہو کر ہی لکھا ہو گا۔ بہرحال، حسب حال تھا مگر کسی نہ کسی ٹھکانے پر پہنچنا بھی ضروری تھا۔ لبنیٰ اور بچوں کو سیر کرنے میں تو لطف آ رہا تھا مگر بار بار ان ہی مقامات کی سیر میں بھلا کون دلچسپی لے سکتا ہے جہاں سے آپ بار بار گزر چکے ہیں۔ چنانچہ جب ہمراہیوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تو سب نے پرزور احتجاج شروع کر دیا۔ آخر کار ہم نے سڑک کے شولڈر پر اپنی کار کھڑی کر دی اور خود باہر نکل کر کھڑے ہو گئے۔ دیکھا کہ جتنی بھی کاریں گزر رہی ہیں وہ یوں بھاگی جا رہی ہیں جیسے کسی کے تعاقب میں ہیں یا پھر ایک دوسرے کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اتنی تیز رفتار کاروں کو روکنے کے لئے بھی دل گردے کی ضرورت ہے۔ آخر کچھ دیر کے بعد ہم نے مطلوبہ دل گردہ پیدا کر ہی لیا اور ایک کار کو ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ دیا مگر وہ گزرتی چلی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے پیچھے بھی کئی کاریں افتاں و خیزاں بھاگی چلی آ رہی تھیں۔ ایسے میں کون بے وقوف ہو گا جو اچانک کسی کے اشارے پر اپنی کار روکے گا؟

مگر کچھ دیر بعد ہی ایک ایسا "بے وقوف" بھی دستیاب ہو گیا دراصل اس کار کے پیچھے کافی فاصلے تک کوئی اور کار نہیں تھی اس لئے کار والے نے اشارہ دیا اور شولڈر پر اپنی کار کھڑی کر لی۔ شولڈر امریکی سڑکوں پر ایک سرائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ سڑکوں کے کنارے ایک سڑک کے برابر چوڑائی میں جگہ چھوڑ دی جاتی ہے۔ اگر ڈرائیور تھک گیا ہے اور سونا چاہتا ہے یا ستانے کا خواہش مند ہے تو شولڈر پر اپنی کار کھڑی کر کے آرام سے سو سکتا ہے۔ کار میں خرابی یا کسی اور پریشانی کی صورت میں بھی "شولڈر" حاضر ہے۔ اطمینان سے کار کھڑی کر لیجئے۔ کوئی چالان نہیں کرے گا۔ البتہ پولیس کار یہ دریافت کرنے ضرور پہنچ جائے گی۔ کہ "خیر تو ہے" کبھی کبھار کوئی کار والا بھی رُک کر آپ کی خیریت دریافت کر لے گا اور آپ کی حالت زار سننے کے بعد اگلے قریبی پبلک کال آفس سے پولیس کے محکمے کو مطلع کر دے گا۔ "شولڈر" کا ترجمہ اردو میں کندھا یا شانہ ہے اور یہ نام اختیار کرنے کا سبب شاید یہی ہے کہ اس شانے پر کار رکھ کر آپ اپنا برا وقت گزار سکتے ہیں۔

جو کار ہمارے اشارے پر رکی تھی ہم تیزی سے اس کی جانب بڑھے۔ اسی وقت ایک لمبے چوڑے امریکی نے اپنی کار سے قدم باہر نکالا اور ہماری طرف بڑھا۔ اس کی کار میں بیٹھی ہوئی ایک سنہرے بالوں والی گوری چٹی خاتون نے بھی کھڑکی میں سے جھانکنا شروع کر دیا۔ ہمارے نزدیک پہنچ کر وہ سراپا تشویش بن گئے۔

پوچھا "خیر تو ہے، بات کیا ہے؟"

ہم نے کہا "خیریت ہے، بس ذرا سا مسئلہ ہے۔"

"کیا مسئلہ ہے؟"

"دراصل ہم راستہ بھول گئے ہیں۔"

"اوہ" انہوں نے اطمینان کا سانس لیا "تو پھر کیا ہوا، نقشہ دیکھ لو۔"

کہا "ہمیں نقشہ دیکھنا نہیں آتا۔"

امریکی نے سر سے پیر تک ہمیں گھور کر دیکھا۔ پہلے تو سمجھا کہ شاید ہم مذاق کر رہے ہیں مگر ہماری سنجیدہ صورت دیکھ کر اسے یقین آ گیا۔

پوچھنے لگا "کیا غیر ملکی ہو؟ یہاں نئے آئے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"اوہ!" اس نے پھر اظہار ہمدردی کیا "نقشہ نکالو۔ میں سمجھا دوں گا۔"

ہم نے کہا "ہمارے پاس نقشہ نہیں ہے۔"

وہ پھر حیران رہ گیا۔ ایسے ڈرائیور سے شاید اسے زندگی میں پہلی بار واسطہ پڑا ہو گا جو سڑکوں کے نقشے کے بغیر کار چلا رہا تھا اور راستہ بھی بھول بیٹھا تھا۔ اس نے کہا "کوئی بات نہیں، میرے ساتھ آؤ۔"

وہ اپنی کار کی طرف بڑھا تو ہم بھی پیچھے پیچھے چل پڑے۔ سنہری بالوں والی خاتون نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا "ہنی۔ کیا بات ہے؟"

"یہ راستہ بھول گئے ہیں۔ ذرا نقشہ تو دینا۔"

خاتون نے کہا "نقشہ تو نہیں ہے۔"

اس بار ہمارے حیران ہونے کی باری تھی۔ ہم نے بڑے فخریہ انداز میں امریکی کو دیکھا۔ بے چارہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ پھر خاتون سے (جو شاید اس کی بیوی تھیں) پوچھا "کیا بات ہے، نقشہ کہاں گیا؟"

"ہنی۔ وہ تو دوسری کار میں رہ گیا۔ ویسے بھی ہمیں نقشہ دیکھنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی ہے اس لئے بھی میں نے تردد نہیں کیا۔"

"اوہ" وہ صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ہمدردی سے بولے "اب آپ کو کسی اور کا انتظار کرنا ہو گا۔"

"مگر آپ سن تو لیں۔ کیا زبانی نہیں بتا سکتے؟"

بولے "بتا تو سکتا ہوں مگر وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا ذمے دار کون ہو گا؟ او کے۔"

یہ کہا اور اپنی کار میں بیٹھ کر ہوا ہو گئے۔ ہم شولڈر پر حیران و پریشان کھڑے رہ گئے۔ مشکل یہ ہے کہ بڑی سڑکوں پر ٹریفک نہ صرف زیادہ ہوتی ہے بلکہ تیز رفتار بھی ہوتی ہے۔ یہ تو ویسے بھی انٹراسٹیٹ تھی یعنی ایسی سڑک جو تمام ریاستوں میں سے گزرتی ہے۔ اسے شاہراہ اعظم یا موٹر وے بھی کہہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی سڑکوں پر گزرنے والوں کے لئے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ یکایک کار روک لیں۔ اس طرح شدید حادثے رونما ہو جاتے ہیں۔ ہم شولڈر پہ کھڑے ہوئے اس انتظار میں تھے کہ کوئی اللہ کا نیک بندہ مناسب حالات دیکھ کر ہماری مدد پر تل جائے تو ہماری مشکل بھی حل ہو ورنہ میل ہا میل تک غلط

راستوں پہ کار چلانے کا کوئی مقصد نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد ہماری مشکل آسان ہوتی ہوئی نظر آنے لگی جب ایک شخص نے اشارہ دیتے ہوئے اپنی کار کو شولڈر کی جانب موڑ دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کارروائی ہماری مدد کے لئے کی گئی تھی کیونکہ دور دور تک کوئی اور کار یا انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم پرامید نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کار کی جانب بڑھے۔ کار میں سے دو سفید، پتلی اور مخروطی ٹانگوں نے باہر قدم رکھا اور پھر "صاحبہ کار" پوری کی پوری کار سے برآمد ہوئیں۔ گویا اللہ کا بندہ نہیں بلکہ بندی تھیں۔ خاصی معقول اور جوان العمر خاتون تھیں۔ محض ٹانگیں دیکھ کر تو یہ اندازہ ہوا تھا کہ شاید پری پیکر ہوں گی مگر ٹانگوں کے علاوہ باقی جسم دیکھا تو بس یوں ہی سی نکلیں۔ گویا صرف نچلا جسم ہی پریوں جیسا تھا۔ اوپر سے محض انسان تھیں۔ ہمیں اس وقت پری یا انسان سے کوئی غرض نہیں تھا۔ ہمارا مقصد تو یہ تھا کہ کوئی ہمیں بھٹکنے سے بچالے اور سیدھی راہ دکھا دے۔

ہم ان کی طرف اور وہ ہماری طرف بڑھیں۔ انہوں نے کہا "ہائی" اور مسکرائیں۔

"ہائی" ہم نے بھی مسکرا کر کہا حالانکہ مسکرانے کا کوئی موقع نہ تھا۔

پوچھا "میں تمہارے لئے کچھ کر سکتی ہوں؟"

"جی ہاں۔ شاید" ہم نے کہا "دراصل ہم راستہ بھول گئے ہیں۔"

انہوں نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا۔ پھر ہماری کار میں سوار لبنیٰ اور بچیوں پر نظر ڈالی۔ شاید انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے بہت سے لوگ بھی راستہ بھول سکتے ہیں۔

پوچھا "آپ کو کہاں جانا ہے؟"

ہم نے انہیں اپنی منزل مقصود کا پتا نشان سمجھایا۔ یہ بھی ہمارا اناڑی پن تھا کیونکہ ہمارے ملک میں تو پتا ایسے ہی پوچھتے ہیں۔ دراصل ہمیں ان سے کسی بڑی جگہ یا سڑک کا پتا معلوم کرنا چاہئے تھا اور ہم تفصیلات لے بیٹھے تھے۔ دراصل یہ سب تجربے کی باتیں ہوتی ہیں۔ شروع شروع میں ناتجربہ کاری ایسے ہی تماشے دکھاتی ہے۔

"بات یہ ہے کہ میں تو خود اس جگہ اجنبی ہوں۔ میں فلاڈلفیا سے آ رہی ہوں اور کیلی فورنیا جا رہی ہوں۔ ان علاقوں کے بارے میں میری زیادہ معلومات نہیں ہیں۔"

یہ جواب سن کر ہمیں وہ صاحب یاد آ گئے جن سے کسی نے پوچھا کہ سامنے آسمان پر

جو چیز نظر آ رہی ہے، چاند ہے یا سورج تو وہ سوچ میں پڑ گئے اور پھر کہا "میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں تو اس شہر میں اجنبی ہوں۔" خیر ہم نے اتنا مشکل سوال تو نہیں پوچھا تھا اس لئے ان کا جواب بھی زیادہ پریشان کن نہ تھا۔

ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا پھر مڑ کر ان کی کار کو دیکھا کہ اتنے لمبے سفر پر وہ کن تیاریوں کے ساتھ جا رہی ہیں اور کتنے ہم سفر ساتھ ہیں مگر سوائے ایک عدد انتہائی نازک اندام کتے کے وہ بالکل تنہا تھیں اور کار میں سامان بھی نظر نہ آیا۔ گویا جو بھی تھوڑا بہت سامان تھا وہ محض ڈگی تک محدود تھا فلاڈلفیا سے کیلی فورنیا کا فاصلہ ہزاروں میل ہے مگر یہ صاحبہ یا تو اس سے مطلق بے خبر تھیں (جو کہ ناممکن تھا) یا پھر بے پروا اور بے نیاز تھیں۔ جب وہ اپنی کار کی جانب بڑھیں تو ان کے کتے نے بھی کھڑکی سے باہر سر نکالا اور نہایت باریک سی آواز میں "پخ پخ" کیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ہم سے مخاطب تھے یا اپنی مالکہ سے کچھ دریافت کر رہے تھے۔

خاتون نے اچانک مڑ کر ہمیں دیکھا اور بولیں "اب آپ کیا کریں گے؟" وہ خاصی فکر مند نظر آ رہی تھیں۔

"کسی اور کا انتظار کریں گے" ہم نے جواب دیا۔

کہنے لگیں "اس طرح وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

"کیا مطلب؟" ہم نے کہا "تو پھر اور کیا کریں۔ کیا غلط راستے پر چلتے رہیں؟"

وہ مسکرانے لگیں "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے وہ اب آپ کسی راہ چلتے سے پتا دریافت نہ کریں بلکہ پولیس کا انتظار کریں۔ کچھ دیر بعد کوئی پولیس والا خود ہی اس طرف سے گزرے گا تو آپ کا احوال پوچھ لے گا یا پھر آپ خود ہی تکلیف گوارا کریں اور کسی اگلے پبلک کال آفس سے پولیس کو مطلع کر دیں۔ یا پھر "ٹرپل اے" والوں کو خبر کر دیں۔"

ٹرپل اے دراصل امریکن آٹو موبیل ایسوسی ایشن کا مخفف ہے۔ امریکا میں تقریباً ہر کار چلانے والا اس ایسوسی ایشن کا نمبر ہوتا ہے۔ ایک معمولی سی فیس کے عوض یہ ادارہ کار والوں کے بے شمار مسائل حل کر دیتا ہے۔ ہم ابھی تک اس کے ممبر نہیں بنے تھے نہ ہی ہمارے پاس ان کا فون نمبر تھا مگر خاتون نے مطلع کیا کہ پبلک کال آفس پر آپ کو ٹرپل اے

کا فون نمبر بھی مل جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ ہاتھ ہلا کر رخصت ہو گئیں۔ جب کار میں سوار ہونے لگیں تو کتے نے ایک دو بار پھر "بخ" کی آواز نکالی۔ شاید دریافت کر رہا ہو گا کہ کوئی پرابلم تو پیدا نہیں ہوئی۔

اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ پبلک کال آفس کی جانب چل پڑتے اور کسی کو اپنا حال زار بتاتے مگر خوش قسمتی سے ایک پولیس پٹرول کار آ نکلی۔ اس کار میں دو افراد سوار تھے۔ ایک مرد اور ایک خاتون۔ کوئی اور مطلب نہ نکالئے گا۔ یہ دونوں باوردی پولیس والے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ "اجناس" میں فرق تھا۔ یعنی بجائے دو مردوں کے ایک خاتون اور ایک مرد اس پٹرول کار میں سوار تھے۔

مرد پولیس مین ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ اس نے بڑی مہارت کے ساتھ اپنی کار کو شولڈر کی جانب موڑا اور پارک کر دیا۔ پھر وہ تیزی سے ہماری طرف آیا۔

"گڈ آفٹر نون سر!"

"گڈ آفٹر نون۔"

"کسی مسئلے سے دو چار ہیں؟ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

ہم نے انہیں اپنا مسئلہ بتایا کہ اس طولانی سڑک پر آ کر پچھتا رہے ہیں۔ اب واپس جائیں تو کیسے۔

"آپ کو جانا کہاں ہے؟"

ہم نے اکمل علیمی کا پتا نشان بتا دیا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔

وہ مسکرانے لگا' کہا "دیکھئے سر۔ یہ جو انٹر اسٹیٹ ہوتی ہے نا' اس پر آ جانے کے بعد اگر باہر نکلنا چاہیں یا مڑ کر واپس جانا چاہیں تو اس کا طریقہ نہایت آسان ہے۔ آپ جہاں سے چاہیں اگلا "ایگزٹ" لے لیں۔ اس طرح آپ بڑی شاہراہ سے نیچے اتر جائیں گے۔ اس کے بعد اگر دوبارہ اسی سڑک پر مخالف سمت جانا ہے تو اگلے نشان سے اسی سڑک پر ہو لیں اور واپس چل پڑیں۔ ہر جگہ آپ کو نشانات اور ہدایات نظر آئیں گی۔"

"مگر ہم کون سے نمبر والی انٹر اسٹیٹ سے واپس جائیں؟"

"سر۔ سڑک تو یہی ہو گی اس لئے نمبر بھی یہی ہو گا۔ یوں سمجھئے کہ آپ اسی سڑک پر مخالف سمت میں چل پڑیں گے۔"

بات دراصل یہ ہے کہ انٹر اسٹیٹ پر دو رویہ ٹریفک نہیں ہوتا ورنہ یہ بات ہم خود سمجھ جاتے۔ یہ کئی کئی لین والی یک طرفہ سڑکیں ہوتی ہیں۔ دوسری جانب جانے کے لئے سڑک ہی دوسری ہے۔ سڑکوں کا اہتمام امریکا میں انتہائی قابل تعریف ہے۔ ہم تو شاید اگلے پچاس برس میں بھی سڑکوں کا ایسا نظام قائم نہ کر پائیں گے جو امریکا میں پچھلے دو سال سے قائم ہے۔ اس کے باوجود ہم ترقی کے دعوے کرتے ہیں۔ امریکا میں اگر آپ سڑکوں کے نظام سے واقف ہو جائیں تو پھر اس سے زیادہ آسان اور عام فہم کوئی اور طریقہ نہیں ہے اور پتا بھول جانے یا بھٹکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

موٹر وے یا انٹر اسٹیٹ تو خیر بنیادی اور خصوصی سڑک ہے جو ہر ریاست سے گزرتی ہے مگر اس کے علاوہ بھی بے شمار سڑکیں ہیں جو بہت وسیع' کشادہ اور خوب صورت ہوتی ہیں۔ ایک خاص بات ہم نے یہ دیکھی کہ ایک ہی سڑک مختلف علاقوں سے گزرتی ہے تو اس کا نام بھی تبدیل ہو جاتا ہے لیکن ایک سڑک "لی ہائی وے" ایسی ہے جو شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہے۔ یہ موٹر وے تو نہیں ہے مگر ہائی وے ضرور ہے۔ یہ شہروں کے درمیان سے بھی گزرتی ہے اور سنسان راستوں سے بھی نکل کر جاتی ہے۔ بعض مقامات پر اس کا نام بھی تبدیل ہو جاتا ہے مگر آگے جا کر پھر "لی ہائی وے" ہو جاتی ہے۔ ہم نے امریکی سڑکوں کا نام بارہا راستہ بھول بھول کر سیکھا تھا۔

ہم کیونکہ بائیں ہاتھ کار چلانے کے عادی تھے اس لئے شروع شروع میں کئی بار غلط فہمی بھی ہو جایا کرتی تھی اور ہم دائیں کے بجائے بائیں ہاتھ پر چل پڑتے تھے جو کہ انتہائی سنگین غلطی اور جرم ہے۔ ایک بار تو ایسا کرتے ہوئے ہم پولیس کی حراست میں جاتے جاتے بچ گئے۔ وہ تو شکر ہے کہ ہمارا نیا لائسنس اور پاسپورٹ دیکھنے کے بعد پولیس والے نے محض ٹکٹ دینے پر ہی اکتفا کیا۔ ورنہ حوالات میں پہنچ جاتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم لوگوں کو اپنے ملک میں قانون کی خلاف ورزی کرنے اور ہر معاملے میں بے پروائی برتنے کی جو عادتیں پڑ جاتی ہیں وہ دوسرے ملکوں میں جا کر کافی تکلیف اور پریشانی کا باعث بنتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

پارکنگ ہمارے ملک میں تو ایک مذاق اور کھیل ہی ہے۔ جب چاہے جہاں چاہے کار

کھڑی کر دیں اور کسی طرح بھی کھڑی کر دیں۔ سیدھی، ٹیڑھی، آڑی، کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ شخص احتجاج کرتا ہے جس کی کار کا آپ نے راستہ روک دیا ہے لیکن ترقی یافتہ اور قاعدہ قانون والے ملکوں میں پارکنگ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ غلط جگہ اور غلط پارکنگ کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔ ہم نے امریکا کے دوران قیام میں بلا مبالغہ ہزاروں ڈالر غلط پارکنگ کے جرمانے کے طور پر ادا کیے۔ غلط پارکنگ امریکی بھی کرتے ہیں اور خوب جرمانے ادا کرتے ہیں مگر وہ ایسا بے پروائی کے باعث نہیں کرتے بلکہ مجبوراً ایسا کرتے ہیں اور انہیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ وہ جرمانہ ضرور ادا کریں گے۔ اکثر اوقات وقت نہیں ہوتا اور کہیں نہ کہیں تو کار پارک کرنی ہی پڑتی ہے۔ ایسے میں جانتے بوجھتے ایسی جگہ پارکنگ کر دی جاتی ہے جہاں ممانعت ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ بعض سڑکوں پر پارکنگ بعض اوقات میں تو فری ہوتی لیکن مقررہ وقت کے بعد وہاں کار کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ آپ کو اس کا بھی حساب رکھنا پڑتا ہے اور اگر بھول جائیں تو ٹکٹ کار پر لگا ہوا ملتا ہے۔ مختلف مقامات پر جرمانوں کی رقوم بھی مختلف ہیں۔ بعض مقامات پر پارکنگ کافی مہنگی پڑتی ہے۔ مثلاً چوراہوں کے آس پاس یا پھر آگ بجھانے والے پائپ کے نزدیک کار پارک کرنے کا جرمانہ اس زمانہ میں ۲۵ ڈالر تھا۔ حالانکہ عام خلاف ورزی کرنے پر دس ڈالر کا ٹکٹ ملتا ہے۔

ٹکٹ لینا بھی ایک آرٹ ہے جس کا تجربے کے بعد ہی علم ہوتا ہے۔ مثلاً اگر آپ نے کسی جگہ مقررہ وقت سے زیادہ کار کھڑی کر دی تو اس پر دس ڈالر کا ٹکٹ مل جائے گا۔ ہم جیسا اناڑی تو پریشان ہو کر فوراً وہاں سے کار ہٹانے کی کوشش کرنے لگتا ہے مگر تجربہ کار لوگوں کو پتا ہے کہ جس طرح موت ایک ہی بار آتی ہے اس طرح ٹکٹ بھی ایک بار ملتا ہے۔ ایک بار اگر پولیس والا آپ کی کار پر ٹکٹ لگا گیا ہے تو بہتر ہے کہ کار وہیں کھڑی رہنے دیں کیونکہ دوبارہ دوسرا ٹکٹ تو لگے گا نہیں۔ یہ سب گر کی باتیں ہیں جو رفتہ رفتہ ہی سمجھ میں آتی ہیں۔

پارکنگ اور دوسری خلاف ورزیوں کے جرمانے کے سلسلے میں ہم نے یہ دیکھا کہ وہاں پولیس کا مقصد لوگوں کو تنگ کرنا نہیں ہوتا۔ محض قانون شکنی پر اصول کے مطابق سزا دینا ہوتا ہے۔ ہم نے جب اپنا ریستوران لے لیا تو اس کی ایک جانب سے ۳۱ ویں سڑک

گزرتی تھی اور سامنے پی اسٹریٹ تھی۔ ۳۱ ویں اسٹریٹ پر کیونکہ رہائشی مکانات تھے اس لئے دن کے اوقات میں وہاں کار پارکنگ کی جا سکتی تھی اور رات کے وقت تو وہاں پارکنگ کی عام اجازت ہوتی ہے کیونکہ گھروں میں رہنے والے وہیں تو پارکنگ کرتے ہیں۔ بعض رہائشی مکانوں والے ایک مخصوص رقم کے عوض دن کے اوقات میں بھی پارکنگ کی اجازت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی مخصوص جگہ پر کوئی دوسرا اس وقت اپنی کار پارک نہیں کر سکتا ورنہ ٹکٹ پائے گا لیکن سامنے پی اسٹریٹ پر کیونکہ کمرشل ادارے تھے اس لئے وہاں صرف دن کے گیارہ بجے سے شام چار بجے تک پارکنگ کی اجازت تھی۔ اس کے بعد ٹریفک کا دباؤ بڑھ جاتا تھا اس لئے کسی قیمت پر بھی وہاں کار پارک کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہمیں یہ "راز" پتا نہیں تھا اس لئے ہر روز چار بجے کے بعد ہمیں ٹکٹ مل جایا کرتا تھا۔ ہم بہت حیران تھے کہ آخر ہمارا قصور کیا ہے۔ پھر ایک دن کسی نے ہمیں یہ راز بتا دیا اور ہم چار بجے سے پہلے ہی کار وہاں سے ہٹانے کے پابند ہو گئے۔

ہمارے چیف باورچی اور مینیجر کا نام تو بسام تھا کیونکہ وہ فلسطینی تھا مگر امریکا میں سترہ سال رہنے کے بعد وہ "سام" ہو گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک دن ہماری جگہ پر سام نے اپنی لمبی سی کار کھڑی کر دی اور کوئی پک اپ وغیرہ والا اسے مار کر بھاگ گیا۔ (جی ہاں، ایسے کام امریکا میں بھی ہوتے ہیں) سام نے انگریزی میں اس شخص کو بہت موٹی موٹی گالیاں دیں جو ہمارے لئے بالکل نئی بات تھی۔ اس شخص کی زبان سے ہم نے کبھی کوئی گالی نہیں سنی تھی مگر اس دن وہ ایسی ایسی بامحاورہ گالیاں دے رہا تھا کہ ہم حیران رہ گئے۔ سبب یہ تھا کہ اس کی قیمتی کار کو نہ صرف کسی نے مار دیا تھا بلکہ بھاگ بھی گیا تھا۔

"ضرور کوئی ملعون کالا ہو گا" اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد سام نے کہا اور اس مختصر سے وقفے کے بعد دوبارہ گالیوں کا سلسلہ جوڑ دیا۔ اس روز ہمیں پتا چلا کہ کار کو زخمی کر کے بھاگ جانے والے امریکا میں بھی پائے جاتے ہیں مگر ایسا کرنے والے واقعی عام طور پر کالے ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امریکا میں بیشتر قانون شکنی، جرائم، خلاف ورزیاں اور خلاف قاعدہ حرکتیں کالے ہی کرتے ہیں۔ ایسا کرنے والے گوروں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ اس نقصان عظیم کے باوجود سام نے اپنی کار وہاں پارک کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ پارکنگ کے یہ مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں کوئی بھی شخص خالی جگہ دیکھ کر

پارکنگ کر سکتا ہے۔ سام عموماً" نو بجے ریستوران پہنچتا تھا اس لئے اسے اکثر یہ جگہ خالی مل جاتی تھی۔ چار بجے سے پہلے وہ اپنا سب کام چھوڑ کر اپنی کار کو کسی اور جگہ منتقل کرنے نکل جاتا تھا۔

ایک دن سام کے ذہن سے یہ بات نکل گئی۔ اسے خیال آیا تو دو منٹ اوپر گزر چکے تھے۔ وہ فوراً باہر کی طرف لپکا تو دیکھا کہ ایک پولیس والا کار کے پاس کھڑا ہے اور ٹکٹ کاٹنے کے لئے قلم جیب سے نکال رہا ہے۔ سام نے وہیں سے چلا کر کہا "ہے۔ رک جاؤ' میں آگیا ہوں۔"

یہ شور سن کر پولیس والا رک گیا۔ سام بھاگا ہوا گیا تو پولیس مین نے پوچھا۔

"یہ کار تمہاری ہے؟"

"ہاں۔ مگر میں اسے ہٹا رہا ہوں۔ تم فی الحال ٹکٹ نہ کاٹنا۔"

ہمارا پولیس والا ہوتا تو ضرور ٹکٹ کاٹ دیتا مگر وہ امریکی پولیس والا تھا۔ بولا "ٹھیک ہے۔ تم میرے سامنے ہی کار ہٹالو تو ٹکٹ نہیں دوں گا۔"

مطلب یہ ہے کہ پولیس والے محض قانون پر عمل کراتے ہیں۔ ہر قیمت پر لوگوں کو سزا دینا ان کا محبوب مشغلہ نہیں ہے۔

پی اسٹریٹ کی پارکنگ پر ہمیں بھی اکثر دس ڈالر کا ٹکٹ مل جایا کرتا تھا اور ہم چپکے سے دس ڈالر کا چیک کاٹ کر بذریعہ ڈاک بھیج دیا کرتے تھے۔ نہ عدالت کا چکر نہ جرمانے کا قصہ' گھر بیٹھے رقم بھیج دیں اور اللہ اللہ خیر صلا۔ لیکن اس ٹکٹ پر یہ عبارت بھی درج ہوتی ہے کہ اگر آپ جرمانہ نہ دینا چاہیں اور بذات خود عدالت میں پیش ہو کر اپنا دفاع کرنا چاہیں تو ایسا کرنے کے مجاز ہیں۔ ہمارے ریستوران کا دروازہ تو پی اسٹریٹ پر تھا۔ ریستوران کے لئے جو سامان وغیرہ آتا تھا اس کے لیے گاڑیاں عقبی جانب والے دروازے پر ہی کھڑی کی جاتی تھیں۔ اور وہ اپنا سامان اتارنے کے بعد چلے جاتے تھے۔ اس جانب ریستوران کے ساتھ جو فٹ پاتھ تھا وہ بھی کافی کشادہ تھا۔ یوں سمجھئے کہ ایک عام فٹ پاتھ سے ڈھائی گنا تھا۔ اس فٹ پاتھ پر بعد میں ہم نے کرسیاں اور میزیں رکھ کر آؤٹ ڈور سروس کی سہولت بھی فراہم کر دی تھی۔

ایک روز ہمیں خیال آیا کہ ہمارے ریستوران کے عقب میں یہ چوڑا سا فٹ پاتھ آخر

کس مرض کی دوا ہے۔ کیوں نہ وہاں ہم اپنی کار پارک کر دیا کریں۔ یہ سوچ کر ہم نے ایک روز وہاں کار پارک کر دی۔ جب وہ دن بخیر و عافیت گزر گیا تو ہم نے یہ ترکیب سام کو بھی بتا دی۔

وہ سوچ میں پڑ گیا' بولا "مگر مسٹر آفاقی۔ یہ تو فٹ پاتھ ہے۔ فٹ پاتھ پر کار پارک کرنے پر تو ٹکٹ مل جائے گا۔"

ہم نے کہا "ہمیں تو ٹکٹ نہیں ملا۔ دوسری بات یہ کہ اتنا چوڑا فٹ پاتھ کہاں ہوتا ہے۔ ہم فٹ پاتھ کے لئے جگہ چھوڑ کر کار پارک کر دیں تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ آخر یہ جگہ ہمارے ریستوران کے ساتھ ہے تو کیوں نہ ہم اس سے فائدہ اٹھائیں۔"

وہ کچھ دیر فٹ پاتھ کا جائزہ لیتا رہا پھر بولا "آپ کہتے تو ٹھیک ہیں مگر میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ یہ درست نہیں ہے۔"

ہم نے امریکی دستور کے مطابق کہا "تمہاری مرضی۔ جیسا پسند کرو ویسا ہی کرو۔ مگر ہم تو اب اپنی کار یہیں پارک کریں گے۔"

سام نے فوراً کسی "دانا" سے مشورہ کیا اور اس نے سام کو بتایا کہ فٹ پاتھ کی تعریف یہ ہے کہ وہ بارہ یا تیرہ فٹ کشادہ ہوتا ہے جب کہ ہمارا فٹ پاتھ ۳۰ فٹ کے لگ بھگ چوڑا تھا۔ ان ٹیکنیکل معلومات سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد سام نے بھی اپنی کار اسی فٹ پاتھ پر پارک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح ہم دونوں نے بلا خوف و خطر اپنی کاریں اپنے ریستوران کے برابر میں پارک کرنی شروع کر دیں اور اطمینان کا سانس لیا کہ پارکنگ کا بہت بڑا مسئلہ یوں حل ہو گیا۔

مگر فلک کج رفتار کب کسی کو آرام سے بیٹھنے دیتا ہے۔ تین چار دن ہی گزرے ہوں گے کہ ایک روز سام باہر گیا اور دو عدد ٹکٹ لے کر ہمارے پاس آگیا۔

"مسٹر آفاقی۔ میں نہ کہتا تھا کہ یہاں پارکنگ جرم ہے۔"

"کیوں۔ کیا ہوا؟" ہم نے پوچھا۔

"ہم دونوں کو دس دس ڈالر کا ٹکٹ مل گیا ہے۔"

"مگر اتنے دنوں تک ٹکٹ کیوں نہ ملا تھا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں' پولیس والوں کی ذہنیت کوئی نہیں جان سکتا۔"

ہم نے کہا "مگر یہ تو خلاف قاعدہ حرکت ہے۔ اگر یہ جرم تھا تو اتنے دن سے ہمیں ٹکٹ کیوں نہ دیا گیا۔ لاؤ، تم یہ ٹکٹ دکھاؤ۔"

ہم نے ٹکٹ دیکھا۔ اس پر خلاف ورزیوں کی ایک فہرست درج ہوتی ہے اور جس خلاف ورزی پر ٹکٹ دیا جاتا ہے اس کے سامنے نشان بنا دیا جاتا ہے۔ ہم دونوں کا جرم یہ تھا کہ ہم نے فٹ پاتھ پر کار پارک کر کے لوگوں کی آمدورفت میں خلل ڈالا تھا۔

ہم نے کہا "اتنے چوڑے فٹ پاتھ پر ہماری پارکنگ سے کیا خلل پڑ سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ بقول تمہارے، یہ فٹ پاتھ کی تعریف کے تحت نہیں آتا۔ فٹ پاتھ تو بارہ فٹ چوڑا ہوتا ہے۔"

سامنے دیکھا تو سڑک پر ایک سیاہ فام پولیس والا ٹہلتا ہوا نظر آگیا۔ ہم نے سام سے کہا "معلوم ہوتا ہے۔ یہی ہے جس نے یہ حرکت کی ہے۔"

"ہاں۔ لگتا ہے نیا آیا ہے۔"

"تو پھر اس سے بات تو کرو۔"

سام ہنسنے لگا۔ "مسٹر آفاقی۔ بات کرنے کا کیا سوال ہے۔ اس نے ہمیں ٹکٹ دے دیا ہے۔ بس اس کا کام ختم ہو گیا۔ اب ہمارا کام ہے کہ ٹکٹ کی رقم ارسال کر دیں یا پھر عدالت میں جا کر اپنا دفاع کریں۔"

ہم نے کہا "مگر اسے قائل تو کر سکتے ہیں تاکہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے۔"

بولا "میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ یہ بتائیں کہ اب آپ کیا کریں گے؟"

ہم نے کہا "ہم تو کورٹ میں پیش ہو جائیں گے اور اس ناانصافی کے خلاف احتجاج کریں گے۔"

کہنے لگا "پتا ہے کورٹ کتنی دور ہے اور وہاں آنے جانے میں کتنی دیر لگے گی؟"

ہم نے کہا "ہم نے کورٹ دیکھ رکھی ہے۔ دو تین گھنٹے ضائع بھی ہو جائیں گے مگر سام، یہ اصول کا سوال ہے اور ہم اصولوں پر سودے بازی نہیں کر سکتے۔"

سام بڑے غور سے ہمیں دیکھتا رہا پھر اس نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور کہا "مسٹر آفاقی۔ آپ کی بات میرے دل کو لگتی تو ہے مگر میں اتنا زیادہ وقت برباد کرنے کے مقابلے میں دس ڈالر ڈاک کے ذریعے ارسال کر دینا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔ ویسے میری نیک

خواہشات آپ کے ساتھ ہیں" ہم نے دل میں سوچا کہ آخر نکلا نا امریکی جو وقت کو ہر چیز پر ترجیح دیتے ہیں۔

ہم نے کہا "سام۔ کل صبح ہم ریستوران آنے کے بجائے سیدھے کورٹ جائیں گے۔"

"او کے مسٹر آفاقی۔ خدا آپ کی مدد کرے۔ یہ کہہ کر وہ اس واقعہ کی اطلاع عملے کے دوسرے لوگوں کو پہنچانے کے لئے رخصت ہو گیا۔

دوسرے دن صبح ہم گھر سے نکلے جو اس وقت ہمارے ریستوران سے چالیس پینتالیس میل کے فاصلے پر تھا کیونکہ ہم ان دنوں اکمل علیمی صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ واشنگٹن ڈی سی پہنچ کر ہم نے اپنی کار کا رخ سٹی کورٹس کی طرف کر دیا۔ اس وقت تک ہم واشنگٹن کے بہت سے مقامات سے واقف ہو چکے تھے کیونکہ ریستوران کی خریداری اور دوسرے کاموں کے سلسلے میں ہر جگہ مارے مارے پھرتے تھے۔ یہ تفصیل آپ کو آگے چل کر بتائی جائے گی۔

گھر سے چلنے کے لگ بھگ دو گھنٹے بعد ہم سٹی کورٹس پہنچ گئے۔ خاصی شاندار عمارت تھی اور صاف ستھری بھی تھی۔ ہماری عدالتوں کے مقابلے میں تو کہیں بہتر تھی۔ کئی منزلہ تھی اور آمدورفت کے لئے لفٹ بھی لگی ہوئی تھیں۔ ہماری عدالتوں کے مقابلے میں وہاں ہجوم نہیں تھا اور نہ ہی بھانت بھانت کے لوگ نظر آتے تھے۔ آخر واشنگٹن جو ہوا۔ یہ فرق تو ہونا ہی چاہئے تھا۔

ہم نے ایک میٹر والی پارکنگ تلاش کی اور وہاں کار پارک کر کے ایک گھنٹے کی پارکنگ کے حساب سے رقم اس کے اندر ڈال دی۔ میٹروں کا حساب یہ ہے کہ اس پر گھڑی کی طرح نشان بنے ہوتے ہیں اور سوئی بھی چلتی رہتی ہے۔ آپ جتنی دیر کے لئے سکے میٹر میں ڈال دیں تو میٹر چلنا شروع ہو جائے گا اور جب تک آپ کے سکوں کا وقت ختم نہ ہو گا یہ میٹر چلتا رہے گا۔ اس میں یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی اپنی کار لے کر پہلے ہی چلا گیا تب بھی میٹر تو چلتا ہی رہتا ہے اور بعد میں آنے والا اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے

کورٹس میں قابل ذکر بات یہ تھی کہ ہر جگہ کے مانند یہاں بھی خواتین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کورٹس کا یہ حصہ ٹریفک کی عدالتوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس لئے سنگین قسم

کے مجرم یہاں نظر نہیں آتے۔ بلکہ مجرم تو سرے سے کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ مرد اور عورتیں بازو میں بازو ڈالے ٹہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رومانی سین بھی بکثرت نظر آجاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی تفریح گاہ یا رومانٹک مقام ہے۔ بے فکرے جوڑے خوش گپیوں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ کورٹس کے سامنے کافی کشادہ اور اونچی سی سیڑھیاں تھیں۔ ان سیڑھیوں پر جگہ بہ جگہ رومانی جوڑے مصروف کلام و طعام نظر آئے۔ یعنی کھانے پینے میں بھی مصروف تھے اور پیار و محبت سے بھی باز نہیں رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں بیئر یا کوک کا ڈبا یا اسنیک کا پیکٹ اور دوسرے ہاتھ میں اپنے ساتھی کا ہاتھ۔ گاہے گاہے پیار کرنے کا سلسلہ بھی جاری۔ ہنسی مذاق بھی بجا۔ بھئی ہم تو ششدر رہ گئے۔ یہ مناظر دیکھ کر۔ ہم تو اپنی عدالتوں میں گندے سندے لوگوں' ہتھکڑی لگے ہوئے مجرموں اور سہمے ہوئے ملزموں کو دیکھنے کے عادی تھے مگر وہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی سیر گاہ میں آگئے ہیں جہاں رومان پرست جوڑے دنیا کو نظر انداز کر کے پناہ گزیں ہیں اور رنگین لمحات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ یہ سیڑھیاں کافی چوڑی اور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر ہمیں روم کا مشہور مقام اسپینش اسٹیپس یاد آگیا۔ یہ بھی سیڑھیاں ہیں جو قدیم زمانے میں ایک نچلی سڑک کو اوپر کی سڑک سے ملانے کے لئے بنائی گئی تھیں مگر اب سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی ہیں اور ساری دنیا میں ان کی دھوم مچی ہوئی ہے۔

یوں تو جگہ جگہ ہدایات درج تھیں مگر ہم پاکستانی کیونکہ ان کے عادی نہیں ہیں اس لئے پوچھ گچھ ضرور کرتے ہیں۔ ہم نے پہلے تو کسی تنہا شخص کو تلاش کیا تاکہ خواہ مخواہ کسی کے رنگ میں بھنگ نہ ڈالی جائے۔ ایک سیاہ فام خاصے لمبے مگر عجیب بے ڈھنگے جسم کے مالک ہمیں تنہا نظر آئے۔ وہ سیڑھیوں پر تنہا بیٹھے سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ہاتھ میں ایک عریاں تصاویر والا میگزین تھا جس کے وہ نیم دلی سے ورق الٹ رہے تھے۔

ہم نے ان کے پاس جا کر دریافت کیا "دیکھئے۔ یہ ٹریفک کے جج کس طرف بیٹھتے ہیں۔؟"

انہوں نے بے نیازی سے ہمیں دیکھا پھر کہا "یہ کورٹس ہیں۔ یہاں جج ہی ہوتے ہیں! پھر ملزم۔"

ہم نے انہیں اپنا ٹکٹ دکھایا۔

بولے "اوہ۔ ٹکٹ مل گیا ہے۔ کیا بات ہے' رقم کیوں نہیں بھیجی؟"

ہم نے کہا "ٹکٹ غلط ملا ہے۔ ہم اپنا مقدمہ لڑنا چاہتے ہیں۔"

انہوں نے اس بار ہمیں ذرا غور سے دیکھا "بہت خوب۔ کافی فالتو وقت ہے تمہارے پاس۔ بہرحال" انہوں نے شانے اچکائے۔ "یہ تمہارا درد سر ہے۔ وہ سامنے لفٹ دیکھ رہے ہو؟ اس کے ذریعے تیسری منزل پر چلے جاؤ۔"

ہم ان کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے مگر حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ وہ خود اور دوسرے بظاہر بے فکر لوگ آخر سیڑھیوں پر بیٹھ کر کیا کر رہے تھے۔ عدالت کے اندر کیوں نہیں جاتے؟ مگر اس سوال کا جواب بھی کچھ دیر بعد ہمیں مل گیا۔ بات یہ ہے کہ وہاں ہماری عدالتوں کی طرح کا سسٹم نہیں تھا کہ مقدمات کی فہرست آویزاں ہے اور ایک چوکیدار تھوڑی تھوڑی دیر بعد کمرے سے باہر نکل کر آواز مارتا ہے کہ فلاں بنام فلاں حاضر ہو جائے۔ اس کے برعکس وہاں یہ سسٹم تھا کہ آپ جب بھی جج کے پاس پہنچ جائیں گے وہ آپ کی باری پر آپ کا مقدمہ سن لے گا۔

لفٹ میں ایک بہت موٹا تازہ کالا نوجوان تھا۔ وہ مسلسل چیونگم چبا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسی کام پر ملازم ہے کیونکہ اور کسی کی طرف وہ مطلق توجہ نہیں دے رہا تھا۔ ہمارے ساتھ لفٹ میں چار دیگر افراد بھی تھے۔ ان میں سے ایک تو جوڑا تھا۔ وہ یک جان دو قالب بنے ہوئے تھے اس لئے چاہیں تو آپ انہیں ایک ہی گن لیں۔ ایک گوری چٹی خاتون تھیں۔ ان کی صورت تو واجبی سی تھی مگر لباس سخت ہیجان انگیز تھا۔ ہمارے ملک کی کسی عدالت میں اگر یہ لباس پہن کر پہنچ جاتیں تو یقیناً توہین عدالت کے جرم میں پکڑی جاتیں۔ ان کے منہ میں ایک لمبا سا سگریٹ ہولڈر لگا ہوا تھا جس میں ایک سگریٹ بھی سلگ رہا تھا۔

لفٹ میں داخل ہوتے ہی انہوں نے دوسرے لوگوں سے پوچھا "آپ لوگوں کو میری تمباکو نوشی پر اعتراض تو نہیں ہے؟"

ہم تو چپ رہے' بھلا ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہم تو اس ملک کے رہنے والے تھے جہاں "تمباکو نوشی منع ہے' خلاف ورزی کرنے والا حوالہ پولیس کیا جائے گا۔" لکھے ہونے کے باوجود یار لوگ ریلوے انجن کی طرح منہ سے دھواں نکالتے رہتے ہیں اور

دوسرے سے تمباکو نوشی کی اجازت لینا تو ایک طرف اگر کوئی دبی زبان میں اعتراض کردے تو لڑنے مرنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ مگر لفٹ میں موجود چوتھے صاحب نے فوراً کہا "مجھے اعتراض ہے۔"

ہم نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ درمیانی عمر کے ایک سفید فام تھے۔ خاصے معقول آدمی تھے سوائے اپنے لباس کے جو انتہائی نامعقول تھا۔ یوں سمجھئے کہ وہ ایک جانگیہ اور بنیان نما چیز پہنے ہوئے تھے۔ پیروں میں ربڑ کی چپل تھی۔ سر سے ننگے تھے۔ بظاہر تو کوئی ہپی نظر آ رہے تھے مگر تھے نہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی کالج میں پروفیسر تھے۔ ہماری طرح چالان کے خلاف احتجاج کرنے عدالت میں آئے تھے۔

حلیہ تو ان کا نہایت فضول تھا مگر ان کا اعتراض سنتے ہی سگریٹ نوشی کرنے والی خاتون نے "سوری" کہہ کر اپنا سگریٹ بجھا دیا اور سگریٹ ہولڈر کو اپنے پرس میں رکھ لیا۔ ایسی شائستگی اور خوش اخلاقی مغربی ملکوں میں ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ ہمارے ہاں تو ایسی باتوں پر چھری چاقو چل جاتے ہیں۔ کہاں کا اخلاق، کیسی شائستگی۔ یہاں تو ہر شخص اپنی من مانی کرتا ہے۔

تیسری منزل پر ایک بڑا سا برآمدہ اور اس کے بعد بڑا سا ہال تھا جس میں صوفے رکھے ہوئے تھے۔ ان پر مختلف قسم کے لوگ بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی دوست کے گھر سب اکٹھے ہیں یا پھر کسی ہوٹل کے لاؤنج میں مسافر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ یہ سب خواتین و حضرات عدالتوں میں مقدمے بھگتانے آئے ہوئے تھے۔ ایسے زندہ دل اور بے فکرے ملزم ہم نے پہلے کہاں دیکھے تھے اس لئے حیران ہو کر دیکھتے رہے۔ یہاں بھی مختلف جوڑے ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے، مگن بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس ہال کے اندر چار اور دروازے بھی تھے۔ یہ چاروں دروازے دراصل ججوں کے کمرے تھے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ہمیں کس جج کے پاس جانا ہے۔ ہماری یہ مشکل ایک پولیس وومن کو دیکھ کر آسان ہو گئی۔ وہ خاصی خوش وضع اور خوش شکل تھیں۔ وردی پہن کر اور زیادہ جامہ زیب لگ رہی تھیں۔ قمیص کی جیب پر ان کا نام بھی درج تھا جو کیتھرین یا اسی قسم کا تھا۔ وہ ایک کمرے سے باہر نکلیں تو ہم نے فوراً ان کا راستہ روک لیا۔

"ایکسکیوزمی۔ کیا آپ ہماری راہنمائی کر سکتی ہیں؟"

وہ بڑی لگاوٹ سے مسکرائیں جیسے کہ آپ نے بھی ٹی وی فلموں میں دیکھا ہو گا۔ پتا نہیں یہاں ٹی وی والے سچ مچ کے لوگوں کی نقل کرتے ہیں یا سچ مچ کے لوگ ٹی وی والوں کے انداز اختیار کرتے ہیں۔ بات کچھ بھی ہو مگر اصل اور نقل میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکی فلموں میں مبالغہ اور مفروضے کم ہوتے ہیں اور وہاں روزمرہ کی حقیقی زندگی پیش کی جاتی ہے جبکہ ہماری فلموں اور حقیقی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

"کہئے، کیا مسئلہ ہے؟" انہوں نے بہت اہتمام سے پوچھا۔

ہم نے انہیں مسئلہ بتایا۔ انہوں نے ہمارا ٹکٹ دیکھا اور پھر بولیں "وہ سامنے دوسرا دروازہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ آپ کے علاقے کے جج کا کمرہ ہے۔ جب اندر سے بلاوا آئے تو آپ بھی اندر چلے جایئے۔ باقی جو ہوتا ہے وہ اندر ہی ہو جائے گا۔"

ہم کو قدرے اطمینان ہوا تو ہم بھی ایک گدے دار صوفے پر بیٹھ گئے اور آس پاس کا نظارہ دیکھنے لگے۔ خاص دلچسپ اور رنگین منظر تھا۔ سب لوگ اس طرح باتوں اور ہنسی مذاق میں مصروف تھے جیسے محض اسی مقصد سے یہاں آئے ہیں۔ ہم نے نہ صرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان لوگوں کو دیکھنا شروع کر دیا بلکہ کان لگا کر ان کی باتیں سننے کی کوشش بھی کرنے لگے جو کہ خاصی بداخلاقی کی بات تھی۔

یکایک ہمارے پہلو میں کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی اور کسی نے ہمیں متوجہ کیا۔ "ایکسکیوزمی!"

مڑ کر دیکھا تو وہی نیم عریاں حضرت برابر والے صوفے پر براجمان تھے جو کہ توہین عدالت کے ارتکاب میں پکڑے بھی جا سکتے تھے۔

ہمیں اپنی طرف متوجہ دیکھا تو مسکرا کر کہا "ہائی؟"

"ہائی!" ہم نے بھی جواب میں کہہ دیا۔

پوچھا۔ "آپ انڈین ہیں یا لاطینی امریکن؟"

ہم نے کہا "ہم پاکستانی ہیں" پھر جلدی سے پوچھا "آپ جانتے ہیں پاکستان کہاں ہے؟"

وہ ہنس پڑے "کیوں نہ جانوں گا آخر کالج میں پروفیسر ہوں۔"

ہم نے حیران ہو کر سر سے پیر تک ان کا جائزہ لیا۔ یا اللہ' پروفیسر ایسے بھی ہوتے ہیں! اور پھر اس حلئے میں عدالت میں بھی چلے آئے؟

مگر جب بات چیت ہوئی تو ہم ان کی قابلیت کو مان گئے۔ وہ یوں تو تاریخ کے پروفیسر تھے مگر جغرافیہ اور سیاست حاضرہ سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ عام امریکنوں کے برعکس وہ پاکستان کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے۔

کہنے لگے "میں اخبار ساتھ لانا بھول گیا ہوں اور خاموش بیٹھنے کی مجھے عادت نہیں ہے۔ اگر اعتراض نہ ہو تو کچھ دیر آپ سے باتیں کرلوں؟"

ہم نے دل میں کہا کہ لے بھئی' اب یہ شخص اپنا لیکچر شروع کردے گا۔ مگر بظاہر بہت اخلاق سے جواب دیا "بخوشی۔ ہمیں بہت خوشی ہوگی۔"

کہنے لگے "آپ بھی ٹکٹ کے خلاف لڑنے آئے ہیں؟"

ہم نے کہا "آپ ٹھیک سمجھے۔"

بولے "میں بھی اسی لئے آیا ہوں مگر بے کار ہے۔ یہ پولیس والے ہم لوگوں سے زیادہ قانون جانتے ہیں۔ میں تو جب بھی آیا اپنا مقدمہ ہار کر ہی گیا۔ وقت الگ برباد ہوا۔ خرچہ الگ ہوا اور دس ڈالر پھر بھی ادا کرنے پڑے۔"

"کیا آج کل آپ کی چھٹیاں ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"نہیں۔ خاص طور پر چھٹی لے کر آیا ہوں۔ دراصل میں شہری حقوق کا قائل ہوں۔ شہریوں کو چاہئے کہ کبھی کبھی اپنے حق کے لئے لڑ بھی لیا کریں۔ یہ کیا کہ چپ چاپ قانون کے آگے سر جھکاتے رہیں۔ قانون انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے' انسان قانون کے لئے نہیں بنائے گئے ہیں۔"

ہم نے ان کی تائید میں سر ہلا دیا اور کہا "آپ کی طرح یہ سب لوگ بھی اپنے حقوق استعمال کرنے کے شوقین نظر آتے ہیں۔"

کہنے لگے "ان کی بات چھوڑیئے' یہ تو شاید "ڈیٹ" پر نکلے ہیں۔ کہیں اور جانے کے بجائے عدالت میں چلے آئے۔ آپ یہاں رہتے ہیں یا عارضی طور پر آئے ہیں؟"

ہم نے انہیں صورت حال بتائی۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ہمارے جج کے کمرے سے ایک پولیس مین قسم کا آدمی باہر نکلا اور کہا "چار افراد اندر آسکتے ہیں۔"

ہم تو فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے مگر زیادہ تر خواتین و حضرات نے کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ یہاں تک کہ پروفیسر صاحب نے بھی اٹھنے سے انکار کر دیا بلکہ ہم سے کہنے لگے "ارے بیٹھو۔ جلدی کیا ہے۔ تھوڑی دیر گپ شپ کریں گے۔ کالج میں تو طلبہ دماغ چاٹ جاتے ہیں۔"

ہم نے معذرت کی اور بتایا کہ ہمیں جلدی واپس جانا ہے اس لئے اجازت چاہتے ہیں۔ ہمارے علاوہ ایک اور صاحب اور دو جوڑے بڑی بے زاری سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

جج صاحب کا کمرا خاصا لمبا سا تھا۔ جس دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے اس کے سامنے عمودی شکل میں ایک بڑی سی میز رکھی ہوئی تھی جس کے دوسرے سرے پر ایک سیاہ فام مگر نہایت خوب صورت اور باوقار درمیانی عمر کی خاتون تشریف فرما تھیں۔ یہی جج تھیں۔ ان کے سامنے میز کے دوسرے کنارے پر ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ اس کرسی کے پیچھے ایک لمبا سا صوفہ تھا جس پر ہم چاروں افراد بیٹھ گئے۔

جج نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذات کی طرف دیکھا اور پھر ہم لوگوں سے مخاطب ہوئیں۔ "ایک معزز شخص سامنے والی کرسی پر آجائے۔"

وہ دونوں جوڑے تو صوفے پر بیٹھتے ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے تھے۔ صرف ہم اور ایک اور صاحب اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے تیار تھے۔ دوسرے صاحب فوراً صوفے سے اٹھے اور کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔

"آپ کا نام؟" جج نے پوچھا۔

انہوں نے اپنا نام بتا دیا۔ جج نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذات کو دیکھا اور تلاش کر کے ایک چالان نکال لیا۔

"آپ پر غلط پارکنگ کا الزام ہے۔ آپ اعتراف جرم کرتے ہیں یا انکار؟"

"انکار یور آنر۔"

"اوکے۔ اپنا کیس پیش کریں۔" جج نے کہا اور ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

ان صاحب نے مختصر الفاظ میں اپنا کیس بیان کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ وہ کار کا انجن چلتا چھوڑ کر ایک لمحے کے لئے کار سے اترے تھے مگر پولیس والے نے انہیں ٹکٹ دے دیا۔

"یہ تو ظلم ہے یور آنر۔ میں نے کار پارک ہی نہیں کی تھی تو پھر غلط پارکنگ کا ٹکٹ

کیا معنی؟"

جج نے کہا۔ "کار کا انجن کھلا چھوڑنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ جہاں چاہیں کار سے اتر جائیں۔ اسے پارکنگ ہی کہا جائے گا۔ آپ کی دلیل مسترد کی جاتی ہے۔ آپ کو دس ڈالر کا جرمانہ ادا کرنا ہو گا۔"

لیجئے' ایک منٹ میں فیصلہ ہو گیا۔ وہ صاحب "تھینک یو۔ یور آنر" کہہ کر اٹھ گئے۔ دونوں "لو برڈز" ابھی تک ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے اس لئے ہم اٹھ کر خالی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"آپ کا نام؟" جج نے پوچھا۔

ہم نے اپنا نام بتا دیا۔ جج نے فوراً کاغذات کے ڈھیر میں سے ہمارے کاغذات تلاش کر کے نکالے۔ ان پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔

"پیومنٹ (فٹ پاتھ) پر پارکنگ کی تھی۔ اقرار جرم کرتے ہیں یا انکار؟"

"انکار یور آنر" ہم نے کہا۔

"اوکے۔ کیس بیان کریں۔"

ہم نے گلا صاف کیا اور کہا "یور آنر۔ تیکنیکی طور پر یہ غلط الزام ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

"ایک تو یہ کہ یہ فٹ پاتھ ہمارے ریستوران کے عقب میں ہے جہاں سامان لانے لے جانے والی گاڑیاں بھی کھڑی ہوتی ہیں اس لئے اگر ہم نے وہاں اپنی کار پارک کر دی تو ٹریفک میں بالکل خلل نہیں پڑا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسے پیومنٹ کہنا غلط ہے۔ کیونکہ پیومنٹ کی تعریف یہ ہے کہ وہ بارہ فٹ چوڑی ہوتی ہے جبکہ یہ جگہ تیس فٹ کے قریب چوڑی ہے۔"

جج نے ایک لمحہ سوچا پھر مسکرا کر ہم سے کہا "کیا آپ نے اس کی پیمائش کی ہے؟"

"جی نہیں۔ مگر یہ ہمارا اندازہ ہے۔"

"اوکے۔ آپ کے خلاف الزام خارج کیا جاتا ہے۔"

ہم نے خوش ہو کر جج کو دیکھا۔ یہ خاتون اس وقت ہمیں اور بھی زیادہ خوب صورت نظر آئیں۔

جج نے کہا "مگر ایک بار آپ کو بتانا ضروری ہے۔ آپ کو ٹکٹ غلط دیا گیا ہے ورنہ جرم تو آپ سے سرزد ہو چکا ہے۔ اگر جرم کی نوعیت درست ہوتی تو آپ پر ۵۰ ڈالر جرمانہ ہو سکتا تھا۔ آئندہ وہاں کار پارک نہ کریں ورنہ کوئی پولیس مین صحیح دفعہ لگا دے گا تو آپ کو پچاس ڈالر ادا کرنے پڑیں گے۔ اوکے۔ کیس ڈسمس۔ اگلا کیس سامنے آئے؟"

ہم شکریہ ادا کر کے کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے مگر صوفے پر بیٹھے ہوئے دونوں جوڑے گھل مل کر آپس میں باتیں کرنے میں مصروف رہے۔ جج نے چھوٹا سا نازک ہتھوڑا میز پر مارا اور کہا "آرڈر۔ آرڈر۔"

یہ سن کر دونوں جوڑے چونکے اور ان میں سے ایک خاتون اٹھ کر کرسی پر تشریف فرما ہو گئیں۔ اس اثنا میں ہم دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے۔ خدا جانے ان محبت کے ماروں کا کیا انجام ہوا۔

باہر نکلنے کا راستہ دوسرا تھا اس لئے ہمارا نیم عریاں پروفیسر صاحب سے آمنا سامنا نہیں ہو سکا۔ برآمدے سے گزر کر ہم لفٹ کے پاس پہنچے۔ دروازہ کھلا اور وہی سیاہ فام لفٹ مین چیونگم چباتے ہوئے نظر آئے جنہوں نے ہمیں ایک لفظ کہے بغیر گراؤنڈ فلور پر پہنچا دیا۔ عمارت کی لابی کے باہر سیڑھیوں پر وہی رونق میلہ لگا ہوا تھا۔ کچھ لوگ اندر عدالت میں چلے گئے تھے مگر ان کی جگہ دوسرے محبت زدہ لوگوں نے لے لی تھی۔

ہم اپنی کار کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ مقررہ وقت سے زیادہ تک پارکنگ میٹر پہ کار کھڑی کرنے کی پاداش میں ہمیں دس ڈالر کا ایک اور ٹکٹ مل چکا ہے۔

☆ ☆ ☆

امریکا میں "ٹکٹوں" یعنی چالانوں سے بلامبالغہ کروڑوں ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے لیکن ہمارے علم میں کوئی ایک بھی ایسا واقعہ نہیں آیا جب پولیس والے نے "ٹک مکا" کر لیا ہو ورنہ یہ ترکیب ہمارے پولیس والے بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ چالان کے عوض نقدی وصول کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ امریکی بے ایمان' بدعنوان اور رشوت خور نہیں ہوتے مگر ایسا عام طور پر بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے۔ روزمرہ کی عام زندگی میں اس قسم کا رواج نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزمرہ کی زندگی معمول کے مطابق سکون اور اطمینان کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔

یہ ٹریفک ٹکٹ کا قصہ تو یوں ہی برسرِ تذکرہ آگیا تھا۔ ہم نے آپ کو یہ بتایا ہی نہیں کہ ہم نے کاروبار کیوں کر اور کیا تلاش کیا۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مختلف خواتین و حضرات نے اس مسئلے کو حل کرنے کے سلسلے میں ہمارا ہاتھ بٹانا چاہا مگر اللہ کو منظور نہ تھا۔ ہم نے چند ہفتوں میں بلامبالغہ درجنوں بزنس دیکھ ڈالے مگر گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ جو کام ہمیں پسند آتا تھا وہ عموماً ہمیں ملتا نہ تھا یا پھر ہماری استطاعت سے باہر ہوتا تھا مگر ریالٹر خواتین و حضرات ان تھک طریقے پر اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ کا احوال تو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ مل کر بہت پاپڑ بیلے مگر قدرت کو منظور نہ تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس بہانے ہمیں امریکی بزنس اور طریقہ کار کا پتا چل گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہاں بھی لوگ خرید و فروخت کے لئے جھوٹ بولتے ہیں۔ ہم تو اپنے ہاں کے پراپرٹی ڈیلرز سے نالاں تھے کہ مبالغہ آرائی کرتے ہیں مگر امریکا میں دیکھا کہ وہاں بھی یہ کاروبار کرنے والے بڑے وثوق کے ساتھ جھوٹ کے گولے لڑھکاتے رہتے ہیں اور خدا کا خوف نہیں کرتے۔ ہمیں کئی بار کوئی بزنس دکھایا گیا کہ اس سے ہزاروں ڈالر ماہانہ کی آمدنی ہوتی ہے مگر بعد میں

حقیقت اس کے برعکس نکلی۔

کئی ہفتے کی بھاگ دوڑ اور تگ و دو کے باوجود ہمیں کوئی مناسب اور معقول کاروبار نہ مل سکا تھا۔ آخر تنگ آ کر ہم نے دوبارہ ٹیلی فون ڈائریکٹری کی مدد لی۔ ورجینیا کی ٹیلی فون ڈائریکٹری کا سائز ہماری ٹیلی فون ڈائریکٹری سے کئی گنا موٹا تھا لیکن ہم نے بڑی مشکل سے اپنے مطلوبہ نمبر تلاش کر ہی لئے۔ سب سے پہلے ہمیں ایک نام نظر آیا جو کسی مسلمان کا تھا۔ محمد علی۔۔۔۔۔ اس کے نیچے محمد ﷺ کے اسم مبارک سے شروع ہونے والے درجنوں نام درج تھے۔ ان میں اکثریت عربوں اور فلسطینیوں کی تھی۔ دیار غیر میں مسلمانوں کے نام دیکھ کر ہمارے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اب آئندہ ہم مسلمانوں کی خدمات حاصل کریں گے۔

سب سے پہلے ہم نے محمد علی کا نمبر ملایا۔ دوسری گھنٹی پر ایک سریلی آواز نے ٹیلی فون اٹھایا اور انگریزی میں کہا۔

"ہیلو" لب و لہجہ مشرقی تھا۔

ہم نے کہا "مسٹر محمد علی سے بات کر سکتا ہوں۔"

"ہولڈ پلیز" انہوں نے توتلا کر انگریزی میں کہا اور ہم سمجھ گئے کہ یہ خاتون یا تو لاطینی امریکا سے تعلق رکھتی ہیں یا پھر عرب ہیں۔ چند لمحے بعد ایک بھاری بھرکم مردانہ آواز سنائی دی۔

"ہیلو۔ میں محمد علی بول رہا ہوں" لب و لہجہ امریکن تھا مگر آواز خالص دیسی۔

ہم اتنے بوکھلائے کہ پوچھ بیٹھے "کیا آپ مسلمان ہیں؟"

عربی اور انگریزی میں بولے "الحمد للہ۔ آپ نے کبھی محمد علی نام کا کوئی انگریز دیکھا ہے؟"

ہم شرمندہ ہو گئے۔ "معافی چاہتا ہوں۔"

"معاف کر دیا۔" انہوں نے شاہانہ انداز میں کہا۔ آواز میں بھی ایک وقار تھا۔ "اب اپنا مسئلہ بیان کریں۔"

ہم نے مختصراً انہیں بتایا کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔ کسی کام کا تجربہ نہیں ہے مگر کوئی اچھا سا ریستوران خریدنا چاہتے ہیں۔

محمد علی نے زوردار آواز میں کہا "نو پرابلم مسٹر اوفوقی۔ یہ سمجھئے کہ ریستوران آپ کو مل گیا۔"

"کیا واقعی!"

"واقعی۔ میرا کام ہی ریستوران بنانا اور فروخت کرنا ہے یا پھر بنے بنائے ریستوران خرید کر فروخت کر دیتا ہوں۔ دس بارہ سال پہلے میں خود بھی ریستوران چلایا کرتا تھا۔ آپ یہ بتائیے کہ میں آپ سے کہاں مل سکتا ہوں؟"

ہم نے انہیں اکمل علیمی کا پتا بتا دیا' بولے "بس سمجھئے کہ میں وہاں پہنچ گیا ہوں۔ اوکے 'اللہ حافظ۔"

انہوں نے تو فون بند کر دیا مگر ہم بہت دیر تک ان کے اللہ حافظ اور الحمد اللہ کہنے کا لطف لیتے رہے ورنہ اب تک ہمارا جن حضرات و خواتین سے واسطہ پڑا تھا وہ سب کے سب انگریز تھے اور ان میں کافی بڑی تعداد یہودیوں کی بھی تھی۔

ہم نے لبنیٰ سے کہا کہ اچھی سی کافی بنانے کے لے تیار ہو جاؤ۔ ایک مسلمان بھائی ہم سے ملاقات کے لئے آ رہا ہے۔

پوچھنے لگیں "کیا مطلب ہے۔ کیا آپ نے کسی کو تبلیغ کے سلسلے میں بلایا ہے؟"

"ارے نہیں بھئی۔ ایک مسلمان ریالٹر سے بات ہوئی ہے وہ ہمارے تمام مسائل حل کر دے گا۔"

وہ ہنسنے لگیں "اب تک تو کسی نے مسئلہ حل کیا نہیں ہے حالانکہ اس بہانے آپ عورتوں کے ساتھ خوب گھومتے پھرے ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔ مردوں کے ساتھ بھی تو گھومے ہیں۔"

"مگر زیادہ تعداد تو عورتوں کی ہی نکلی ہے۔ اب یہ کون ہے۔ صاحب یا صاحبہ؟"

ہم نے کہا "بہت مبارک نام ہے ان کا۔ محمد علی' مجھے تو کوئی عرب لگتا ہے۔"

"چلئے' اب عرب کو بھی آزما لیجئے" انہوں نے کہا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر کال بیل بجی اور ہم نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک درمیانہ قد اور تندرست جسم کے نہایت گورے چٹے صاحب کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی عمر ۳۵ سال کے قریب ہو گی۔ ناک ستواں' پتلے ہونٹ' بڑی بڑی براؤن آنکھیں اور براؤن گھونگریالے

ل۔ جب ہنسے تو ان کی موتیوں جیسی بتیسی بھی نظر آ گئی۔

"مسٹر اوفوقی؟" انہوں نے گونج دار آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں۔ آپ محمد علی ہیں؟"

"الحمد اللہ۔" انہوں نے حلق کی گہرائیوں سے آواز نکالی جو قرات کے انداز سے ملتی ی تھی۔ ہمیں یقین آ گیا کہ ہو نہ ہو یہ شخص ضرور عرب ہے۔

"آیئے' بیٹھئے" ہم نے انہیں بڑے صوفے پر بٹھا دیا اور پھر پوچھا "کیا آپ عرب ں؟"

"الحمد اللہ" انہوں نے پھر قرات فرمائی "میں فلسطینی ہوں' ارض فلسطین کا فرزند۔"

لیجئے ایک تو کریلا اوپر سے نیم چڑھا۔ یعنی وہ عرب بھی تھے اور فلسطینی بھی تھے۔ ہم یہ ن کر فوراً جذباتی ہو گئے اور ان سے دوبارہ مصافحہ کیا۔ "آپ سے مل کر واقعی بہت خوشی ئی مسٹر محمد علی۔"

انہوں نے اپنے موتیوں جیسے دانتوں کی جھلک دکھائی اور بولے "مجھے بھی۔" پھر پوچھا یا آپ انڈین ہیں؟"

"نہیں۔ ہم پاکستانی ہیں۔"

"سبحان اللہ" انہوں نے لہک کر کہا اور ہم سے ایک بار پھر ہاتھ ملایا "پوکستان اسلامی ور ملک ہے۔ فلسطینیوں کا دوست ہے۔ ماشاء اللہ۔"

ہم نے کہا "اور آئندہ بھی دوست رہے گا۔ انشاء اللہ۔"

"واللہ دل خوش ہو گیا آپ سے مل کر۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کا پروبلم کیا ہے؟"

الف کو عموماً" واؤ میں تبدیل کرنے کے عادی تھے اسی لئے ہمارے نام کو انہوں نے وفوقی" بنا دیا تھا۔

ہم نے انہیں شروع سے آخر تک ساری داستان سنائی۔ ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے یس میں کوئی اپنا مل گیا ہے۔ ان سے یہ شکایت بھی کی کہ ہمیں بعض امریکیوں نے دھوکا ینے کی کوشش بھی کی۔

"آپ نہیں جانتے۔ یہ امریکی بہت اچھی قوم ہے مگر سخت خبیث قوم ہے۔ آپ کا سطہ ضرور یہودیوں سے پڑا ہو گا۔ بڑے لعنتی لوگ ہیں' اللہ بچائے ان سے۔"

اتنی دیر میں لبنیٰ کافی لے کر آ گئیں۔

"یہ ہماری بیگم ہیں لبنیٰ" ہم نے تعارف کرایا۔

وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "سبحان اللہ۔ کس قدر پیارا عربی نام ہے۔ آپ سے مل کر بہت ہی خوش ہوا بہن۔ آج سے مجھے اپنا بھائی تصور فرمائیں۔"

کچھ دیر بعد دونوں بچیاں بھی آ گئیں۔ جب انہیں بتایا گیا کہ ان میں سے ایک کا نام نادیہ اور دوسری کا سارہ عرف پارو ہے تو وہ مارے خوشی کے صوفے سے دوبارہ اٹھ کھڑے ہوئے "واللہ۔ دل خوش کر دیا مسٹر اوفوقی۔ آپ کا تو سارا گھرانا عرب ہے۔ آپ علی سفیان۔ آپ کی مسز لبنیٰ۔ بچیاں نادیہ اور سارہ۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی فلسطینی گھر میں آ گیا ہوں۔ سبحان اللہ۔"

کافی دیر تک وہ خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ اتنی دیر میں کافی سے بھی لطف اندوز ہوئے اور بولے "میں آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گا اپنی ماں، بیوی اور بیٹی سے ملواؤں گا اور فلسطینی قہوہ پلاؤں گا۔"

ان رسمی باتوں کے بعد وہ مطلب کی طرف آئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ سولہ سترہ سال پہلے فلسطین سے آئے تھے۔ وہ ان کا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ ریستورانوں میں کام کرتے رہے پھر خود بھی ریستوران چلاتے رہے۔ بعد میں ریستوران خریدنے کا بزنس شروع کر دیا۔ انہوں نے ایک امریکی لڑکی سے شادی بھی کی تھی مگر چند سال بعد علیحدگی ہو گئی۔ ان دونوں کی ایک آٹھ نو سال کی بچی مریم بھی ہے جو عموماً ماں کے پاس اور کبھی باپ کے پاس رہتی ہے۔

"مسٹر اوفوقی" انہوں نے فخریہ انداز میں کہا "میں نے مریم کو دو سال کے لئے فلسطین بھی بھیجا تھا تاکہ وہ عربوں کے لب و لہجے میں عربی بولنا سیکھ لے اور اپنی اصلیت سے بھی واقف ہو جائے۔"

ہم نے کہا "مسٹر محمد علی۔ ہم بہت تنگ آ گئے ہیں بزنس اور گھر ڈھونڈتے ہوئے۔"

بولے "اب آپ یہ فکر مجھ پر چھوڑ دیں علی۔ سمجھئے کہ آپ کی دونوں پرابلمز حل ہو گئی ہیں۔ آیئے میرے ساتھ۔"

ہم ان کی پک اپ کار میں سوار ہو گئے۔ امریکا میں عام طور پر لوگوں کے پاس ایک پک

اپ بھی ضرور ہوتی ہے تاکہ اپنا سامان آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکیں کیونکہ یہی کام اگر کرایہ دے کر کرائیں تو ان کا دیوالیہ نکل جائے۔ محمد علی ان دنوں ایک ریستوران بھی بنوا رہے تھے اور اس کے لئے سامان وغیرہ اسی پک اپ میں لے کر جاتے تھے۔

سب سے پہلے وہ ہمیں ورجینیا کے ایک فلسطینی ریستوران میں لے گئے۔ یہ ایک شاپنگ سینٹر کے اندر تھا، خاصی بارونق جگہ تھی۔ باہر ایک عقاب کا مجسمہ بنا ہوا تھا جس پر ریستوران کا نام "ایگل" درج تھا۔

"یہ میرے جاننے والے ہیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ الحمد اللہ مسلم ہیں۔" مگر اس تعارف کے بعد جب اندر قدم رکھا تو ہوش اڑ گئے۔ اس ریستوران میں سجاوٹ تو مشرقی اور عربی انداز کی تھی اور حاضرین بھی عرب تھے لیکن اس کے سوا کوئی اور چیز مشرقی نہیں تھی۔ خوش شکل لڑکیاں ادھر ادھر گھومتی پھر رہی تھیں۔ ایک غنچہ دہن کاؤنٹر پر بھی تشریف فرما تھیں۔ معلوم ہوا کہ سب ریستوران کے مالک کی صاحب زادیاں ہیں۔ گورے اور سانولے رنگ، متناسب جسم، سیاہ آنکھیں، سیاہ بال مگر لباس اسکرٹ یا جینز اور وہ بھی خالص امریکن انداز کا۔ اگر بٹ صاحب ہمارے ساتھ ہوتے تو ان کا لباس دیکھ کر بلند آواز میں لاحول ضرور پڑھتے۔ محمد علی کی ان سب سے واقفیت تھی۔ انہیں دیکھتے ہی سب شہد کی مکھیوں کی طرح ان کے آس پاس منڈلانے لگیں۔ یہ گفتگو تمام تر عربی میں ہو رہی تھی جو ہماری سمجھ سے بالاتر تھی۔ البتہ زبان اور کلام کی مٹھاس ہمارے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ محمد علی نے ہمارا مفصل تعارف کرایا۔ راستے میں ہم فلموں کے بارے میں جو باتیں کرتے آ رہے تھے۔ اس کا خلاصہ بھی لڑکیوں کو سنایا جس کی وجہ سے وہ سب ہمارے آس پاس بھی بھن بھنانے لگیں۔ وہ سب اداکارہ بننے کی خواہش مند تھیں۔ اگر ہم واقعی کوئی فلم بنا رہے ہوتے تو ان کی بدولت ہماری ہیروئن اور دوسری لڑکیوں کی پرابلم لازماً دور ہو جاتی۔ سب لڑکیوں کے تیکھے نقش و نگار اور گورے رنگ تھے۔ سوائے ایک کے جس کا رنگ کھلتا ہوا سانولا تھا۔ ان کے ہوتے ہوئے کم از کم ہیروئن کا مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ انہیں ڈھنگ کا لباس پہنانا پڑتا۔

ہم نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر منتظمین میں لڑکیوں کے علاوہ کوئی مرد نظر نہ

آیا۔ ہماری بات سنی تو محمد علی نے کہا "وہ آپ تلاش کرنے کی کوشش بھی نہ کریں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ ان لڑکیوں کا باپ مرچکا ہے مگر ماں زندہ ہے اور یہ سب مل کر اس ریستوران کو چلاتی ہیں۔"

کچھ دیر بعد والدہ صاحبہ بھی ہانپتی کانپتی تشریف لے آئیں۔ لڑکیاں اگر پری پیکر تھیں تو والدہ صاحبہ دیو پیکر تھیں۔ گہرا سانولا رنگ' لمبا قد' بھاری جسم' بال تراشیدہ مگر لباس نہایت معقول عربی نما۔ لڑکیاں جس قدر عریاں تھیں' بڑی بی اتنی ہی زیادہ ڈھکی ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے سر پر بھی ایک رومال باندھ رکھا تھا۔ انہوں نے بھی آتے ہی محمد علی کے ساتھ گاڑھی عربی میں بات چیت شروع کر دی جس کی شیرینی سے ہم لطف اندوز ہوتے رہے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ دونوں ہمارے ہی بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ والدہ صاحبہ کو انگریزی کا ایک لفظ بھی بولنا نہیں آتا تھا اس لئے ان کی ترجمانی کے فرائض ایک نہایت دلکش اور ہنس مکھ لڑکی نے سرانجام دیئے۔ اس کی ترجمانی کا یہ عالم تھا کہ والدہ صاحبہ بے تکان دو تین منٹ تک بولتی رہتی تھیں اور صاحب زادی محض ایک فقرے میں اس کا ترجمہ کر کے بیٹھ رہتی تھیں۔ ہم نے محمد علی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو وہ ہنسنے لگا' بولا "آپ جانتے ہیں کہ عربی ایک فصیح اور شستہ زبان ہے۔ انگریزی میں اس کے برابر الفاظ اور اظہار کا ذخیرہ نہیں ہے۔"

ہم نے کہا "ان کی والدہ نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب لڑکی کو بولنے دیں۔ یہ ترجمے والی بات بہت بورنگ ہے۔ کیوں نہ ہم آپس میں ہی بات چیت کر لیں۔"

کہنے لگے "ماں برا مانے گی۔"

لڑکی یہ سن کر بولی "کوئی بات نہیں ہے۔ آپ ممی کو چھوڑیئے۔ مجھ سے براہ راست بات کیجئے۔"

ایگل ریستوران خاصا معقول ریستوران تھا۔ شام اور رات کے وقت وہاں زیادہ ہجوم ہوتا تھا اور آنے والوں میں بڑی تعداد لڑکوں اور مردوں کی ہوتی تھی۔ اس ریستوران میں ہفتے میں دو روز رقص بھی ہوتا تھا مگر رقص کرنے کے لئے خاص طور پر رقاصائیں بلائی جاتی تھیں جو عام طور پر بیلے ڈانس کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں۔ چار پانچ مالک لڑکیوں کا حصہ

کی ساقی گری تک رہتا تھا۔ اس ریستوران میں مختلف ویڈیو گیم بھی تھے۔ بار بھی تھی۔ کھانا تو خیر تھا ہی۔

محمد علی نے کہا "ریستوران اچھا چلتا ہے۔ اچھے داموں میں مل جائے گا۔"

ہم نے دل ہی دل میں حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ یہ ریستوران جو کچھ بھی چلتا ہو گا' لڑکیوں کے بل بوتے پر چلتا ہو گا۔ ہم نے سوچا کہ اگر ہم نے یہ ریستوران خرید لیا اور رقص و شراب کا سلسلہ بھی بند کر دیا تو اس کا کیا حال ہو گا؟ محمد علی نے بتایا کہ یہ علاقہ ابھی زیر تعمیر ہے۔ تھوڑے دنوں میں آباد ہو جائے گا تو یہ ریستوران سونے کے بھاؤ بھی نہیں ملے گا۔

ہم نے پوچھا۔ "برادر' یہ لوگ اتنی اچھی جگہ اور چلتا ہوا کاروبار کیوں چھوڑ رہے ہیں؟"

محمد علی نے ادھر ادھر دیکھا پھر ہمارے کان کے نزدیک منہ لا کر کہا "مسٹر اوفوقی۔ ان لڑکیوں کو دولت کی چاٹ پڑ گئی ہے۔ یہ زیادہ مغربی ہو گئے ہیں۔ اس ریستوران میں انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ مردوں کو کیسے بے وقوف بنایا جاتا ہے اس لئے اب مزید بے وقوف بنانے کے لئے انہوں نے ایک نائٹ کلب خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"نائٹ کلب؟" ہم حیران رہ گئے۔ "اور یہ عورتیں چلائیں گی؟"

"نائٹ کلب بھی چلائیں گی اور ان میں سے دو لڑکیاں وہاں کیبرے ڈانس بھی کیا کریں گی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ کیبرے ڈانسرز کو کافی رقم دینی پڑتی ہے۔ انہوں نے سوچا ہے کہ کیوں نہ یہ رقم بھی بچا لیں۔"

ہم نے کہا "پھر ہمارے بارے میں کیا مشورہ ہے؟"

محمد علی ہنسنے لگا "یہ کام آپ کے بس کا نہیں ہے اور چار پانچ لڑکیاں آپ لائیں گے کہاں سے۔ ان کے لیے تو یہ گھر کی بات ہے۔"

"تو پھر آپ نے ہمیں یہ ریستوران دکھایا کس لئے؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ ہنسنے لگے "ابھی میں آپ کو اور بھی دکھاؤں گا۔ آپ کو اس کاروبار کا کچھ اندازہ تو ہونا چاہئے تاکہ یہاں ریستوران کیسے چلائے جاتے ہیں۔"

اس کے بعد مزید بات چیت کی گنجائش ہی نہیں تھی اس لئے وہاں سے رخصت ہو

گئے۔ محمد علی نے ہمیں چند اور ریسترران بھی دکھائے۔ ان میں بیشتر عربوں یا فلسطینیوں کے تھے۔

ایک یونانی تھا اور ایک کا مالک کوریائی تھا۔ عربوں کے ریستوران تو معمولی سے فرق کے ساتھ عموماً" ایک ہی جیسے تھے مگر یونانی اور کوریائی ریستورانوں میں کچھ امتیاز تھا۔

یونانی ریستوران کا نام "کیوپڈ" تھا۔ ہم نے کسی ریستوران کا ایسا نام پہلی بار دیکھا اور سنا تھا اسلئے کہ کہاں عشق کا دیوتا کیوپڈ اور کہاں کھانے پینے کا سامان مگر "کیوپڈ" میں حسن و عشق کی جھلک صاف نمایاں تھی۔ عشق تو اس ریستوران کے مال مسٹر ٹولیڈو تھے۔ یہ خاصے خوش وضع اور خوبرو آدمی تھے۔ عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہو گی مگر محمد علی نے بتایا کہ وہ ساٹھ سال سے بھی زیادہ عمر کے تھے لیکن کاٹھی مضبوط تھی اس لئے عمر کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ ناک نقشہ ان کا یونانیوں کی طرح تھا۔ کھڑی ستواں ناک' پتلے پتلے ہونٹ' چمکدار اور بڑی بڑی آنکھیں' نوکیلے نقش و نگار' گورا رنگ' لمبا قد' متناسب جسم۔ یونانی حسن کا جو ایک تصور عام ہے وہ اس پر بالکل پورا اترتا تھا لیکن جب ان کی بیگم کو دیکھا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مبالغے کی حد تک حسین یعنی حقیقت یہ ہے کہ اس عورت کے حسن و جمال کے بارے میں جتنا بھی جھوٹ بولا جائے وہ سچ ہو گا۔ بوٹا سا قد اور باقی سب کچھ یونانی دیویوں کی مانند۔ سرخ بال' سنہری رنگ بس یوں سمجھئے جیسے یونانی دیومالا کی کوئی خاتون کتابوں میں سے نکل کر چلی آئی ہو۔ نام ان کا فیدل یا فیدونہ تھا۔ عمر مشکل سے بیس بائیس سال ہو گی۔ گویا مسٹر ٹولیڈو عمر میں ان سے دگنے تھے۔ ہم تو یہ سوچ کر حیران رہ گئے کہ اس قدر خوش جمال اور خوش اندام لڑکی کو ٹولیڈو جیسے معمولی آدمی کے سوا کوئی اور کیوں نہ مل سکا۔ اس کے حسن کے حضور میں تو بڑے بڑے مودب کھڑے ہو سکتے تھے مگر آپ نے سنا ہو گا کہ دل آنے کے رنگ نرالے ہوتے ہیں۔ یہ صاحب زادی ٹولیڈو کے عشق میں ایسی گرفتار ہوئیں کہ سب کچھ چھوڑ کر ان ہی کی ہو کر رہ گئیں۔ ٹولیڈو صاحب نے ان کی یہ قدر کی کہ اپنے ساتھ ریستوران میں کام پر لگا لیا۔ اب ٹولیڈو صاحب کھانا پکاتے تھے اور ریستوران کے دوسرے کام فیدونہ کے سپرد تھے۔ ویٹریس سے لے کر کیشئیر تک کے فرائض ان کی جان نازک کے ذمے تھے۔

محمد علی نے بتایا کہ اس ریستوران میں یونانی کھانا تیار ہوتا ہے اور بہت اچھا اور لذیذ

ہوتا ہے۔

ہم نے کہا "مگر ہم یونانی کھانا پکانے والے کہاں سے ڈھونڈیں گے؟"

بولے "یہاں سب طرح کے لوگ مل جاتے ہیں۔ اگر یونانی کھانا پسند نہ ہو تو کسی اور قسم کا کھانا منتخب کر لیں۔ اگرچہ یہ ریستوران اپنے یونانی کھانوں کی وجہ سے ہی مشہور ہے۔"

ہم نے کہا "کھانوں کی وجہ سے یا یونانی حسن کی وجہ سے؟"

بولے "وہ بھی تو ریستوان کا ہی ایک حصہ ہے" پھر کہا "مسٹر آفاقی۔ اگر تم چاہو تو ریستوان کے ساتھ یہ لڑکی بھی تمہیں مل سکتی ہے۔"

"وہ کیسے۔ کیا یہ اپنے شوہر سے طلاق لے رہی ہے؟"

وہ بہت زور سے ہنسے "ارے طلاق کیسے لے گی۔ جب کہ شادی ہی نہیں ہو۔ بس دوستی ہے۔ اگر تم چاہو تو اسے اپنا دوست بنا لو۔"

ہم نے کہا "مسٹر علی' ایک تو آپ جانتے ہیں کہ ہم شادی شدہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس قدر خوب صورت اور شاندار آدمی کو چھوڑ کر وہ بھلا ہمیں کیوں گھاس ڈالے گی؟"

کہنے لگے "یہ بات نہ کریں۔ شاید اس لڑکی کی آنکھوں میں کوئی خرابی ہے یا پھر دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہے۔ شکل و صورت' پیسہ دولت' جائیداد' شان بان اسے کسی چیز سے بھی دلچسپی نہیں ہے۔ بس جس پر مہربان ہو جائے اس کی ہو جاتی ہے۔ ٹولیڈو سے پہلے یہ ایک لڑکے کے ساتھ رہا کرتی تھی جو کوئی ڈھنگ کا کام بھی نہیں کرتا تھا۔ ایک میکڈ انلڈ میں کام کرتا تھا اور وہاں سے بھی چوری کے الزام میں نکالا گیا تھا۔ اس کے باوجود یہ اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ وہ تو اتفاق سے ایک دکان لوٹنے کے الزام میں پکڑا گیا تو اس عورت نے اس کی جان چھوڑی۔"

اتنی دیر میں فیدونہ کافی کی پیالیاں لے کر آ گئی۔ ہم دونوں کو دیکھ کر مسکرائی۔ اب ہم اس کے حسن کی کیا تعریف بیان کریں۔ اسے ملکوتی حسن کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ کیا کوئی ہالی وڈ کی ہیروئن اس کے سامنے مقابلے کے لئے کھڑی ہو گی۔ وہ صحیح معنوں میں حسن و صحت کا مجسمہ اور نمونہ تھی۔ جب وہ ہمارے سامنے کافی کی ٹرے میز پر رکھنے کے لئے جھکی تو ہماری تو سانس رک گئی۔ ایسا حسن اور اتنے قریب سے کم ہی دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ وہ

ایک بار پھر ہم دونوں کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور پلٹ کر چلی گئی۔ اس کی چال میں تیزی تھی مگر یوں لگتا تھا جیسے خراماں خراماں جا رہی ہے۔ بہت عجیب و غریب عورت تھی۔

"کیوں۔ کیا خیال ہے، کوشش کر دیکھئے۔" محمد علی نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کو چلتا ہوا ریستوران مل جائے گا اور ساتھ میں چلانے والی بھی ہو گی۔"

"فضول باتیں مت کرو" ہم نے ڈانٹا "جانتے ہو کہ ہم شادی شدہ ہیں"

محمد علی نے کہا "مسٹر اوفوقی۔ اب امریکا میں آ گئے ہو تو امریکنوں کی طرح رہنا سیکھو۔ یہاں ہر باس کی دو بیویاں ہوتی ہیں۔"

"دو بیویاں؟"

"ہاں۔ ایک باقاعدہ بیوی۔ جو گھر میں ہوتی ہے اور دوسری کاروباری بیوی یعنی سیکریٹری جو کام کی جگہ پر ہوتی ہے۔ امریکن بیویاں ویسے تو مسلمانوں کی دوسری شادی کے خلاف بہت شور مچاتی ہیں مگر ایسی غیر سرکاری شادیوں پر صبر کر لیتی ہے۔"

ہم نے دور بیٹھے تولیڈو کی جانب دیکھا جو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف تھا اور اسے یہ علم نہ تھا کہ اس کی شریک کار اور شریک حیات کسی لمحے بھی اسے چھوڑ کر رخصت ہو سکتی ہے۔ بظاہر دونوں میں بہت سلوک اور پیار نظر آتا تھا مگر مغرب میں انسانی جذبات دیرپا نہیں ہوتے۔ بلکہ اہل مغرب تو سرے سے جذبات کے قائل ہی نہیں ہوتے۔ ان کے تمام کام کیمیائی اور مکینیکل ہوتے ہیں۔

ہم نے محمد علی سے کہا "ہمیں مشورہ دینے کے بجائے تم خود اسے اپنی سیکرٹری کیوں نہیں بنا لیتے؟"

بولے "میری بیوی بہت زبردست ہے۔ دوسرے یہ کہ میرے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ میں اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔"

اتنی دیر میں ٹولیڈو صاحب کچھ وقت نکال کر ہمارے پاس آ گئے اور انہوں نے یونانی زبان میں ایک طولانی تقریر شروع کر دی۔ محمد علی نے فوراً فیدونہ کو امداد کے لئے طلب کیا جس نے ان کی گفتگو کا ترجمہ بلکہ خلاصہ ہمارے سامنے پیش کیا۔ خلاصہ اتنا تھا کہ وہ اپنا ریستوران فروخت کر کے نیویارک شفٹ ہونا چاہتے تھے۔

ہم نے کہا "اس شخص نے اتنی لمبی تقریر کی ہے اور تم نے دو لفظوں میں ترجمہ کر دیا۔"

فیدونہ ہنسی، کہنے لگی "ہم یونانی بہت باتونی ہوتے ہیں۔ بہت لچھے دار باتیں کرتے ہیں جن میں کام کی باتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اطمینان رکھو۔ میں نے کوئی قابل ذکر بات نہیں چھوڑی ہے۔"

اب محمد علی نے فیدونہ سے انگریزی میں کاروباری گفتگو شروع کر دی۔ وہ ایک صاف گو آدمی تھا۔ صاف صاف سوال کیا کہ "اگر مسٹر اوفوقی نے یہ ریستوران خرید لیا تو کیا تم ان کے ساتھ رہو گی؟"

فیدونہ نے بھی صاف جواب دے دیا، بولی "میں ریستوران کے بزنس سے تنگ آ چکی ہوں۔ اب میں تھیٹر یا نائٹ کلب میں کام کروں گی۔"

"تمہیں اداکاری یا ڈانس کرنا آتا ہے؟"

"نہیں۔ مگر میرا سب سے بڑا آرٹ میرا خوب صورت جسم ہے۔ یہی میری سفارش ہے۔"

محمد علی نے کہا "مسٹر اوفوقی۔ اب تو یہاں وقت ضائع کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر فیدونہ نہیں ملے گی تو ریستوران خریدنا بے کار ہے۔"

فیدونہ اور ٹولیڈو کو حیران چھوڑ کر ہم دونوں وہاں سے چلے آئے۔

محمد علی نے ہمیں چند ریستوران اور دکھائے جن میں سے کوئی ایک بھی ہمیں پسند نہیں آیا۔ سہ پہر کے قریب محمد علی نے کہا "مسٹر اوفوقی۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تمہیں کیسی جگہ کی ضرورت ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

ہم اس کی پک اپ میں بیٹھ کر ورجینیا سے واشنگٹن ڈی سی کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستہ خاصا طویل تھا اس لئے ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ محمد علی نے اپنی پہلی امریکن بیوی کے بارے میں بتایا۔ ہم نے پوچھا "تم نے اسے طلاق کیوں دے دی؟"

کہا "مجبوری تھی۔ حالانکہ اسے طلاق دینا اسے ساتھ رکھنے کے مقابلے میں زیادہ مہنگا ثابت ہوا مگر اس کے ساتھ چلنا ممکن نہیں رہا تھا۔"

پھر اس نے اپنی بیوی کی برائیاں شروع کر دیں۔ آزاد خیال تھی، شراب بہت زیادہ پیتی تھی۔ دوستوں کے ساتھ گھومتی رہتی تھی۔ بے حد فضول خرچ تھی۔ کمائی تو کیا اس نے تو

میری جمع پونجی تک خرچ کرا دی تھی۔ پھر کہا "مسٹر اوفوقی۔ میری ایک نصیحت یاد رکھنا کریڈٹ کارڈ کبھی استعمال نہ کرنا ورنہ برباد ہو جاؤ گے۔"

کریڈٹ کارڈ ایسی چیز ہے جس کے ہوتے ہوئے ہر شخص بے فکر ہو کر خریداری کرتا ہے کیونکہ نقد تو ادا نہیں کرنا پڑتا اس لئے خریداری کا اندازہ نہیں ہوتا۔ بعد میں جب بل آتا ہے تو پوری رقم ادا نہیں ہوتی جس کی وجہ سے سود در سود شروع ہو جاتا ہے اور نتیجہ پھر وہی نکلتا ہے جو مرزا غالب نے نکالا تھا کہ ؎

قرض کی پیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

کیونکہ پھر ایک دن ایسا آتا ہے جب بال بال قرض میں بندھ جاتا ہے اور یہیں سے بربادی کا آغاز ہوتا ہے۔ محمد علی نے تو طلاق کے بعد ایک فلسطینی لڑکی سے شادی کر لی مگر اس کی امریکن بیوی کا کیا ہوا؟

"اس نے بھی شادی کر لی" جواب ملا۔

"کسی امریکن سے؟"

"ہاں۔ یہ بس نہ پوچھو تو بہتر ہے۔"

"مگر تمہاری بچی اس کے ساتھ رہتی ہے۔"

"یہ یہاں کا دستور ہے۔ حالانکہ میں لڑکی کی طرف سے بہت پریشان رہتا ہوں۔ باہمی معاہدے کے مطابق اسے اپنے گھر میں بھی لے آتا ہوں مگر مسٹر اوفوقی' وہ لڑکی بالکل تباہ و برباد ہو رہی ہے مگر میں چپ چاپ دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔"

بچی کی تباہی کا تو ہمیں کچھ دن بعد علم ہو گیا جب محمد علی نو سالہ مریم کو لے کر ہمارے گھر آیا۔ بہت خوب صورت اور پیاری معصوم صورت بچی تھی۔ دراز قد تھی اور عمر کے لحاظ سے بڑی نظر آتی تھی۔ محمد علی نے اس کا نام مریم رکھا تھا۔ وہ امریکی لب و لہجے میں انگریزی تو بولتی ہی تھی' خالص عرب انداز میں عربی بھی بولتی تھی۔ نادیہ کی ہم عمر تھی اس لئے دونوں کی دوستی ہو گئی۔ شام کو ہم گھر گئے تو نادیہ نے بہت حیران ہو کر ہم سے کہا "پاپا۔ پتا ہے آپ کو۔ مریم کی ممی نے ایک عورت سے شادی کی ہے۔"

لبنیٰ ہنسے لگیں۔ "بے وقوفی کی باتیں مت کرو نادیہ۔ اس نے تم سے مذاق کیا ہو گا۔"

"نہیں ماما۔ سچی۔ مریم کی ممی نے ایک عورت سے شادی کی ہے اور مریم اپنے گھر میں بہت پریشان رہتی ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ کہتی ہے کہ ممی کے دوست ہر وقت گھر میں گھسے رہتے ہیں اور پاپا' اس کی ممی ڈوپ ڈرنک کرتی ہے۔"

نادیہ کے لئے مریم کی ماں کا ایک عورت سے شادی کرنا حیرت انگیز اور ناقابل یقین تھا حالانکہ یہ بالکل درست تھا۔ امریکا میں اب قانون کے تحت عورتیں اور مرد آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خرافات ہوتی ہیں۔ آخر دنیا کا سب سے ترقی یافتہ ملک ہے اور اس کی ترقیوں کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ڈیونٹ سرکل دارالحکومت واشنگٹن کا ایک بہت بارونق' مشہور اور شاندار چوک ہے۔ اسی کے ساتھ ۳۱ ویں اور پی اسٹریٹ کے نکڑ پر محمد علی نے اپنی پک اپ روک دی اور ہمیں ایک اجاڑ سی عمارت کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

"یہ ہے آپ کا ریستوران" محمد علی نے مطلع کیا۔

ہم نے دیکھا تو وہاں کاٹھ کباڑ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس عمارت کی واحد خوبی یہ تھی کہ اس کا جائے وقوع بہت مثالی تھا۔

"یہ ایک آرٹ شاپ ہوا کرتی تھی مگر آپ تو جانتے ہیں کہ آرٹ کا دھندا گھاٹے کا سودا ہوتا ہے۔ بس اس کا بھی دیوالیہ نکل گیا۔ اب میں یہاں ایک ریستوران بنا رہا ہوں۔ بہترین لوکیشن ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ریستوران تم خرید لو۔"

"مگر پہلے اسے ریستوران تو بناؤ۔"

"وہ تو بن جائے گا۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

ہم سوچ میں پڑ گئے۔ محمد علی نے ہمیں ایک خیالی ریستوران کا نقشہ دکھایا تھا اور ایک معقول رقم کے عوض وہ ہمارے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا تھا۔

ہم نے کہا "مگر اس چھوٹی سی جگہ کی اتنی بڑی قیمت کچھ زیادہ نہیں ہے؟"

وہ ہنسنے لگا "مسٹر اوفوقی۔ جب ریستوران بن جائے گا تو یہی جگہ آپ کو بہت بڑی نظر آئے گی۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ آپ کے لئے آئیڈیل ہے۔"

ہم سوچ میں پڑ گئے۔

"آپ کو اس کام کا کوئی تجربہ نہیں ہے اس لئے سوچ میں پڑ گئے ورنہ درجنوں لوگ اس کے لئے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ایسا کریں کہ اس کی شکل و صورت ذرا نکلنے دیں پھر بات کریں گے۔"

چند دن بعد محمد علی کا پھر فون آ گیا "مسٹر اوفوقی۔ مصروف تو نہیں ہو؟"

"کیا بات ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"میں آپ کو نیا ریستوران دکھانا چاہتا ہوں۔ کہو تو ایک گھنٹے بعد آ جاؤں؟"

ایک گھنٹے بعد اس کی پک اپ گھر کے سامنے کھڑی تھی۔

"کیا تمہارے پاس دوسری گاڑی نہیں ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"گاڑی تو ہے مگر وہ مسز کے استعمال میں رہتی ہے اور پھر آج کل ریستوران میں کام ہو رہا ہے۔ مجھے سامان لانے اور لے جانے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔"

ہم نے اندازہ لگایا کہ محمد علی نے جب بھی اپنی بیگم کا تذکرہ کیا نہایت احترام اور اہتمام کے ساتھ کیا۔

ہم نے پوچھا "ایک بات تو بتاؤ۔"

"پوچھیں۔"

"لگتا ہے کہ تم اپنی مسز سے بہت ڈرتے ہو؟"

محمد علی سنجیدہ ہو گیا' بولا "مسٹر اوفوقی۔ اس کی قدر تو کرنی ہی چاہئے۔ دیکھئے نا اس کے ماں باپ نے ایک طلاق یافتہ شخص کے ساتھ اپنی نوعمر اور خوب صورت بیٹی بیاہ دی۔ یہ عزت افزائی نہیں تو اور کیا ہے؟"

معلوم ہوا کہ بیوی محمد علی صاحب سے عمر میں پندرہ سال چھوٹی تھی۔ کہا "اس کی مہربانی دیکھئے کہ وہ مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی۔"

ہم سوچنے لگے کہ ہمارے اور عربوں کے معاشرے میں کتنا فرق ہے۔ ہمارے ہاں اگر ساٹھ سال کی عمر کا آدمی بھی سترہ سالہ دوشیزہ سے شادی کرتا ہے تو گویا اس پر اور اس کے

ہمارے خاندان پر احسان کرتا ہے اور پھر اس شادی کے عوض جہیز بھی وصول کرتا ہے جب کہ عربوں میں اس کے برعکس رواج ہے۔ وہ لوگ شادی کے موقعے پر لڑکی کے باپ کی خدمت میں حسب توفیق کچھ نہ کچھ پیش کرتے ہیں اور پھر ساری زندگی بیوی کے احسان مند بھی رہتے ہیں۔ شادی بیاہ کے معاملے میں وہاں شہروں میں لوگ کافی ماڈرن ہو گئے ہیں اور دولہا دلہن قریب قریب مغربی انداز میں ہی تیار ہوتے ہیں۔ محمد علی نے فوراً اپنے بٹوے میں سے اپنی اور اپنی بیوی کی ایک تصویر نکال کر دکھا دی جس میں علی صاحب سوٹ بوٹ پہنے اور بو ٹائی لگائے ہوئے کھڑے تھے اور بیوی نے مغربی انداز کی دلہنوں کا لباس پہنا ہوا تھا۔

"کیوں' خوب صورت ہے کہ نہیں؟"

"کیوں نہیں مگر تم بھی کچھ کم تو نہیں ہو۔ بالکل انگریز یا اطالوی لگ رہے ہو۔ تمہاری مسز کا نام کیا ہے؟"

"عمل۔"

"عمل!" ہم نے پوچھا "عین سے عمل یعنی کام۔"

کہا "نہیں۔ الف سے امل۔"

ہم نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ پوچھا "کیا اس کا کوئی مطلب بھی ہے؟"

"ہاں ہاں۔ اس کا مطلب ہے ہوپ۔ امید' یہ عورت میری زندگی میں امید بن کر ہی داخل ہوئی ہے۔ سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ یہ میرے بچے کی ماں بھی ہے۔"

پہلے ہمارا خیال تھا کہ شاید محمد علی صاحب ہی بیوی کے معاملے میں کچھ زیادہ جذباتی ہیں مگر بعد میں پتا چلا کہ سبھی فلسطینیوں اور عربوں کا یہ حال ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورتوں کی جو حیثیت بنا دی گئی ہے عربوں کے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

"لو" اچانک محمد علی نے کہا "تمہارا ریستوران آ گیا۔"

دیکھا تو سامنے ریستوران کی چھوٹی سی' خوب صورت سی عمارت جگمگا رہی تھی۔ دس بارہ دن کے اندر ہی محمد علی نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو فرنیچر کے سوا سبھی کچھ موجود تھا۔ دیوار سے دیوار تک قالین' ائرکنڈیشنڈ' سامان آرائش' ہر چیز چمک رہی تھی۔ دل خوش ہو گیا دیکھ کر۔

"اب بولئے۔ ریستوران پسند آیا کہ نہیں؟"

"بہت اچھا ہے۔"

"تو پھر اس کا اچھا سا نام بھی رکھ دو۔ میرا تو خیال ہے کہ تمہاری بڑی بیٹی کے نام پر رکھ دیتے ہیں۔ اس کا نام نیڈو "نادو" ہے نا؟ اس ریستوران کا نام "نیڈوز" رکھے دیتے ہیں کیوں کیسا نام ہے؟"

"بہت اچھا ہے۔"

"تو پھر طے ہو گیا کہ اس کا نام "نیڈوز" نادوز ہو گا۔"

لیجئے' ریستوران ابھی ہم نے خریدا نہیں اور اس کا نام ہماری بیٹی کے نام پر رکھ دیا گیا۔

ریستوران میں بجلی کی فٹنگ اور کچن کے علاوہ پچھلے اسٹور میں کام ابھی جاری تھا۔ ہم دونوں ایک طرف قالین پر بیٹھ گئے اور خریداری کی باتیں شروع ہو گئیں۔ دس منٹ بعد فیصلہ ہو گیا کہ ڈاؤن پے منٹ کتنی ہو گی اور بقیہ رقم کس طرح ادا کی جائے گی۔

"مبارک ہو" محمد علی نے ہم سے مصافحہ کیا "یہ بہت اچھی جگہ ہے۔ ایک تو رہائشی علاقہ ہے پھر آس پاس دفاتر اور دکانیں بھی ہیں اور نزدیک کوئی اور ریستوران بھی نہیں ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دور دور تک کالوں کی آبادی نہیں ہے جو بہت بڑی نعمت ہے۔"

اتنی دیر میں بجلی فٹ کرنے والا امریکی نوجوان آ گیا اور ہم نے امریکا میں محنت کشوں کا طریقہ کار بھی دیکھ لیا۔

"ہائی مائیک۔ کچن اور اسٹور تم نے دیکھ لیا۔ کتنے دن میں کام مکمل ہو جائے گا۔"

"پانچ دن میں۔"

"اور مجھے جرمانہ کتنا ادا کرنا ہو گا؟"

"ساڑھے تین ہزار ڈالر۔"

"کیا خیال ہے۔ یہ کچھ زیادہ نہیں ہے؟"

"بالکل مناسب ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ کل سے کام شروع کر دو۔ پانچ سو ڈالر ایڈوانس لے لو۔ باقی رقم کام ختم کرنے کے بعد مل جائے گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل نہیں" مائیکل نے کورا جواب دے دیا۔

"کیا مطلب۔ تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے کیا؟" محمد علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"بالکل نہیں" مائیک نے ٹکا سا جواب دیا۔

پاکستان میں یہ گفتگو ہو رہی ہوتی تو نوبت مار کٹائی تک پہنچ جاتی۔ مگر محمد علی نے بجائے غصہ کرنے کے نرمی سے دریافت کیا "مگر اس کی وجہ؟"

"وجہ صاف ظاہر ہے۔ میں نے پہلے کبھی تمہارے ساتھ کام نہیں کیا اس لئے بھروسا نہیں کر سکتا۔"

محمد علی نے اسے گھور کر دیکھا۔ ہم تو سمجھے کہ بس اب جھگڑا شروع ہو جائے گا مگر پھر اچانک ہی محمد علی ہنس پڑا اور کہنے لگا "ٹھیک کہتے ہو۔ یہ ہمارا پہلا واسطہ ہے۔ میں تمہیں پیشگی ادائیگی کر دوں گا۔ اگلی بار تم میرے ساتھ کام کرو گے تو پھر اعتبار بھی ہو جائے گا۔ او کے؟"

"او کے" مائیک نے مسکرا کر کہا۔

"پھر بات طے ہو گئی۔ دونوں نے مصافحہ کیا اور محمد علی نے گن کر روپیہ مائیک کے حوالے کر دیا۔

"یہ تو ہو گیا۔" محمد علی نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے ہم سے کہا "اب ہمیں کاغذات بھی لکھوا لینے چاہئیں۔"

ہم سمجھے کسی وثیقہ نویس کے پاس جانا ہو گا مگر وہ ہمیں اپنی پک اپ میں بٹھا کر ورجینیا میں ایک بہت اونچی اور شاندار عمارت میں لے گیا۔

"یہاں میرا وکیل رہتا ہے۔ یاد رکھو۔ اگر امریکا میں رہنا ہے تو تمہیں اپنا ایک وکیل بھی رکھنا ہو گا۔"

"وکیل کا کیا کرنا ہے؟"

"ارے بھائی وکیل کے بغیر یہاں گزارہ نہیں ہوتا۔ خرید و فروخت۔ کاروبار' لین دین' سبھی کچھ وکیل کے ذریعے ہوتا ہے اور پھر جب وصیت وغیرہ لکھوانی پڑے تو بھی وکیل ہی کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"وصیت!" ہم پریشان ہو گئے "مگر ہمیں تو فی الحال وصیت لکھوانے کی جلدی نہیں ہے۔"

"جلدی یا دیر کی بات نہیں ہے۔ وصیت تو ہر ایک کو لکھوانی پڑتی ہے۔ خیر' یہ بعد کی بات ہے۔ اب اوپر چلتے ہیں۔ مسٹر پشکی کے پاس۔ یہ پہلے جج ہوا کرتے تھے۔ اب ریٹائر ہو کر وکالت کرتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

نہایت خوب صورت عمارت کی لابی میں سے گزر کر ہم لفٹ کے پاس پہنچ گئے۔ یہ کئی منزلہ خوب صورت عمارت تھی۔ جگہ جگہ شیشے کی دیواریں۔ سجاوٹ کے لئے پھولوں کے خوب صورت گملے جابجا رکھے ہوئے تھے۔ اس عمارت میں بہت سے لوگوں کے دفاتر تھے۔ مسٹر پشکی کا دفتر پانچویں منزل پر تھا۔ ان کے دفتر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے ڈرائنگ روم نما کمرے سے واسطہ پڑا۔ بے حد قیمتی فرنیچر' اعلیٰ قسم کی سجاوٹ۔ فرش پر قیمتی قالین' چھت پر خوش نما فانوس۔ بھئی واہ۔ یہ وکیل کا دفتر ہے یا کسی بڑے آدمی کا ڈرائنگ روم؟ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ سائڈ میں ایک دروازہ کھلا اور ایک انتہائی دلربا صورت نظر آئی۔ نیلا اسکرٹ' سفید بلاؤز' بھورے بال' بوٹا سا قد۔ یہ مسٹر پشکی کی سیکریٹری میرین تھی۔ ہم تو اپنے ملک میں وکیلوں کے نہایت کھردرے' بدحال اور مریل سے منشیوں کو دیکھنے کے عادی تھے۔ یہاں وکیل کی سیکریٹری کو دیکھا تو یوں لگا جیسے ہالی ووڈ کی کوئی فلم دیکھ رہے ہیں۔ ایسے منشی تو ہمارے ہاں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں بھی نہیں ہوتے۔

"اوہ ہائی علی" وہ مسکرائیں اور کمرا روشن سا ہو گا "مسٹر پشکی دو منٹ میں فارغ ہو جائیں گے۔ تم بیٹھو' میگزین وغیرہ دیکھو یا ٹی وی کھول دوں؟"

"نہیں میرین۔ شکریہ۔ یہ میرے دوست مسٹر اوفوقی ہیں۔ انہوں نے ہی مجھ سے ریستوران خریدا ہے۔"

"اوہ مسٹر اوفوقی۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ ہمارے نئے کلائنٹ ہیں" انہوں نے فوراً اپنا پھولوں جیسا ہاتھ مصافحے کے لئے ہماری طرف بڑھا دیا۔ ہم نے بھی فوراً ان کا ہاتھ تھام لیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ پھولوں جیسے نرم و گداز ہاتھ میں خوشبو بھی پھولوں جیسی تھی۔ یہ دراصل سینٹ کی خوشبو تھی۔

میرین غڑاپ سے کمرے کے اندر غائب ہو گئی تو محمد علی نے میز پر رکھے ہوئے میگزین الٹ پلٹ کرنے شروع کر دیئے۔ ہم نے بھی عادت سے مجبور ہو کر ہاتھ بڑھایا مگر ٹھٹھک کر رہ گئے۔ میز پر ایسے میگزین بھی رکھے ہوئے تھے جن کا داخلہ ہمارے ملک میں ممنوع ہے اور جنہیں لوگ چھپا چھپا کر رکھتے ہیں اور یہاں وہ بے ہودہ قسم کے میگزین کھلے عام ایک وکیل کے دفتر میں رکھے ہوئے تھے۔ لوگوں کی وقت گزاری کے لئے ہم نے کن انکھیوں سے محمد علی کی طرف دیکھا مگر وہ صاحب ان میگزینوں کی موجودگی سے قطعی بے نیاز تھے اور ایک تجارتی میگزین کی ورق گردانی کرنے میں مصروف تھے۔

چند منٹ بعد ایک انتہائی موٹی تازی کالی خاتون مسٹر پشکی کے کمرے سے باہر نکلیں۔ وہ ہانپ رہی تھیں۔ خدا جانے زیادہ بولنے کی وجہ سے یا کوئی بری خبر سن کر ان کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ یا پھر وزن کی زیادتی کے باعث چند قدم چل کر بھی وہ ہانپ جاتی تھیں۔ انہوں نے ہانپتی کانپتی آواز میں اپنے ساتھ اندر سے نمودار ہونے والی میرین کا شکریہ ادا کیا۔ اور رخصت ہو گئیں۔ ہر قدم پر یوں لگتا تھا جیسے اب زمین پر گر جائیں گی مگر شکر ہے کہ خیر خیریت سے دروازے کے باہر چلی گئیں۔ ہم کافی دیر تک ان کے دھڑام سے گرنے کی آواز سننے کے منتظر رہے مگر بے سود۔

اب میرین ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہوئیں "آیئے۔ مسٹر پشکی آپ کے منتظر ہیں۔"

آگے آگے محمد علی اور ان کے پیچھے ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ سجاوٹ اور شان و شوکت میں یہ بھی کچھ کم نہ تھا مگر دیواروں پر موٹی موٹی کتابوں والی الماریاں نظر نہیں آئیں جو کہ ہمارے ہاں وکیلوں کے کمروں میں کباڑ کی طرح بھری رہتی ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہم اکثر سوچا کرتے ہیں کہ اگر بے چارے وکیل واقعی ان سب کتابوں کو پڑھتے ہیں تو پھر وکالت کس وقت کرتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ قانون کی کتابیں ایک الگ لائبریری میں رکھی ہوئی تھیں۔ مسٹر پشکی کا کمرا ایک خوش حال بزنس مین کے دفتر جیسا نظر آ رہا تھا۔

"ہائی علی" انہوں نے گھومنے والی کرسی سے اٹھ کر محمد علی سے ہاتھ ملایا اور پھر ہماری باری بھی آ گئی۔

"اچھا۔ تو یہ ہیں وہ؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں۔ یہ ہیں وہ!" محمد علی نے جواب دیا۔

مسٹر پشکی ایک دراز قد اور چست و چالاک گورے چٹے آدمی تھے۔ بزرگ تو کسی طور بھی نظر نہیں آ رہے تھے حالانکہ جج رہ کر ریٹائر بھی ہو چکے تھے۔ دیکھنے میں پچاس باون سال کے لگ رہے تھے۔ خاصے ہنس مکھ اور خوش اخلاق تھے۔ چند لمحوں میں ہی وہ ہم سے بے تکلف ہو گئے۔ محمد علی نے انہیں ہمارے باہمی معاہدے کا خلاصہ بیان کیا اور کسی اور مصروفیت کا عذر کر کے رخصت ہو گیا۔ مسٹر پشکی نے میز پر رکھا ہوا ایک خوب صورت سا آلہ اٹھا کر منہ سے لگایا اور اپنی سیکرٹری کو معاہدے کی عبارت ڈکٹیٹ کرانی شروع کر دی۔ یہ بھی ہمارے لئے بالکل نیا تجربہ تھا۔ چند منٹ تک بولنے کے بعد انہوں نے ہم سے پوچھا "کیوں۔ سب باتیں درست ہیں نا؟"

ہم نے کہا "تقریباً"

وہ ہنسنے لگے اور "بس شکریہ" کہہ کر انٹرکام بند کر دیا۔

ان کے دفتر کی ایک پوری دیوار شیشے کی تھی جس میں سے باہر کا خوب صورت منظر دکھائی دے رہا تھا۔

"علی کو آپ کب سے جانتے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"چند دن سے۔ دراصل ہم ان کے ذریعے ریستوران خرید رہے ہیں۔"

"بہت ہوشیار آدمی ہے۔ دوستوں کے علاوہ ہر ایک کو اس سے ہوشیار رہنا چاہئے۔ آپ کا یہ ریستوران کب تک تیار ہو جائے گا؟"

"دو ہفتے کے اندر انشاء اللہ" ہم نے بڑے خلوص سے کہا۔

"اوہ مسٹر آفاقی" انہوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا "آئندہ خدا کے لئے کبھی انشاء اللہ نہ کہنا۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ جو لوگ انشاء اللہ کہتے ہیں وہ کام پورا نہیں کرتے۔ میرے بہت سے عرب کلائنٹس ہیں اور میرا یہی تجربہ ہے۔"

ہم قدرے شرمندہ ہو گئے۔

"آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا" وہ بولے "دراصل آپ ابھی نئے نئے آئے ہیں۔ میں

نہیں چاہتا کہ دوسرے امریکن آپ کے بارے میں غلط رائے قائم کریں۔ انشاء اللہ کہنے والوں کا تجربہ کچھ خوش گوار نہیں ہے۔"

اتنی دیر میں اسمارٹ مس میرین ٹائپ کئے ہوئے کاغذ لے کر خوشبو پھیلاتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ کاغذ مسٹر پشکی کی میز پر رکھنے کے بعد وہ دوبارہ باہر چلی گئیں۔ اب جو اندر آئیں تو ان کے ہاتھ میں کافی کی دو پیالیاں تھیں۔ بھئی واہ۔ ہمیں تو لیڈی منشی کا لطف آ گیا۔ اس قدر برق رفتار، خوش شکل اور کارگزار۔۔۔۔! مسٹر پشکی نے ایک نظر ان کاغذات پر ڈالی اور پھر ہمارے حوالے کر دیئے۔ ہم نے بھی دیکھا تو وہی ضرورت کی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔

"اگر درست ہیں تو دستخط کر دیجئے" انہوں نے کہا اور ہم نے جھٹ سے دستخط کر دیئے "علی کے دستخط بعد میں ہو جائیں گے" انہوں نے میرین کو مخاطب کیا پھر ہم سے بولے "آپ کا کام ختم ہو گیا۔ چاہیں تو جا سکتے ہیں۔"

ہم نے اجازت طلب کی۔ دروازے تک نہیں پہنچے تھے کہ میرین نے مسٹر پشکی سے کہا "سر، مسٹر آفاقی بھی پاکستانی ہیں۔ اس معاملے میں کیوں نہ ان سے مشورہ لے لیا جائے؟"

"ہاں۔ ٹھیک تو ہے۔ بشرطیکہ انہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔"

ہم نے سوالیہ نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا۔

"مسٹر آفاقی۔ بات یہ ہے کہ میرے ایک کلائنٹ سے ایک پاکستانی نے مکان خریدا ہے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو یہ بتا سکتے ہیں کہ ان کا چیک کتنی دیر میں کیش ہو کر پاکستان سے واپس یہاں پہنچ جائے گا کیونکہ پاکستانی صاحب نے مکان کا قبضہ لے لیا ہے۔ بس اب ان کی رقم آنے کا انتظار ہے۔"

ہم نے کہا "پاکستان سے تو یہاں ڈاک بھی سولہ سترہ دن میں پہنچتی ہے۔ چیک میں تو زیادہ دیر لگ جائے گی۔"

"ٹھہریں، میں آپ کو چیک دکھاتا ہوں۔" انہوں نے میرین کو اشارہ کیا جو تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی اور پھر ایک چیک لا کر ہمارے حوالے کر دیا۔ ہماری نظر چیک پر پڑی تو ہم ساکت رہ گئے۔ یہ فیصل آباد کے حبیب بینک کا عام چیک تھا۔ چیک کاٹنے والے

نے قلم سے روپے کاٹ کر ڈالرز لکھ دیا تھا۔ چیک کی مالیت ساڑھے چار لاکھ ڈالر تھی۔ ہم حیران ہو کر چیک کو دیکھتے رہ گئے۔

"کیا بات ہے" مسٹر پشکی نے پوچھا "چیک درست تو ہے نا؟"

ہم نے چند لمحے سوچا پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ مسٹر پشکی کو حقیقت بتا دی جائے۔

"مسٹر پشکی۔ یہ چیک ردی کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ کبھی بھی کیش نہیں ہو گا۔"

مسٹر پشکی گھومنے والی کرسی پر ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کیا اس چیک میں کوئی غلطی رہ گئی ہے؟"

ہم نے کہا "پاکستان میں فارن ایکس چینج کا لین دین اسٹیٹ بینک کے سوا کوئی اور بینک نہیں کرتا۔ وہاں کا کوئی بینک نہ تو ڈالرز وصول کر سکتا ہے اور نہ ڈالر ادا کر سکتا ہے۔ یہ چیک بالکل جعلی اور بے کار ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ "روپے" کاٹ کر یہاں قلم سے "ڈالرز" لکھ دیا گیا ہے، کیونکہ پاکستان کے تمام بینک محض روپے میں لین دین کرتے ہیں۔"

مسٹر پشکی ایک دم کھڑے ہو گئے "آپ کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیک ایک ماہ بعد بھی کیش نہیں ہو گا؟"

"ایک ماہ کیا یہ تو ایک سال بلکہ ایک صدی بعد بھی کیش نہیں ہو گا۔"

"مگر اس نے تو کہا تھا کہ انشاء اللہ بیس دن کے اندر رقم یہاں پہنچ جائے گی۔"

پاکستانی صاحب کی اسکیم بالکل واضح تھی۔ انہوں نے یکمشت مکان کی قیمت ادا کر کے امریکی دستور کے مطابق مکان کا قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ ان کا منصوبہ یہ ہو گا کہ ایک دو ہفتے کے اندر وہ مکان اونے پونے کسی کے ہاتھ نقد فروخت کر کے ڈالرز کھرے کریں اور غائب ہو جائیں۔ بے چارے پشکی نے ان کی باتوں پر اور چیک پر بھروسا کر لیا تھا۔ امریکی مالک مکان نے بھی ان پر شک نہیں کیا تھا۔ ہماری بات سن کر مسٹر پشکی کو پسینے چھوٹ گئے۔ انہوں نے فوراً جائے وقوعہ پر پہنچنے کی ہدایت کی۔

"شکریہ مسٹر آفاقی۔ آپ نے مجھے برباد ہونے سے بروقت بچا لیا۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ میری بدقسمتی دیکھئے کہ اس کے انشاء اللہ کہنے کے باوجود اس کی بات پر یقین کر لیا۔"

ہم نے نادم ہو کر سر جھکا لیا کہ دیار غیر میں ہم لوگوں نے اپنا کیسا امیج قائم کیا ہے؟ مسٹر ... کا وہ مسئلہ تو خوش اسلوبی سے حل ہو گیا مگر وہ ہمیشہ کے لئے ہمارے مرید ہو گئے۔

دوسرے دن ہم ریستوران پہنچے تو بڑا ہال کمرا لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ گورے، کالے، سانولے ہر رنگ کے لوگ موجود تھے۔ عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ ہم تو ... شاید ریستوران محمد علی نے کسی اور کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے مگر کچن کے حصے ... محمد علی آواز آئی۔

"مسٹر اوفوقی۔ میں ادھر ہوں۔"

"بھئی یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"یہ سب انٹرویو کے لئے آئے ہیں۔ آخر آپ کے ریستوران کے لئے اسٹاف بھی تو ... لانا ہے۔" دراصل ہم نے محمد علی سے یہ کہا تھا کہ ریستوران کے بارے میں ہمارا تجربہ ... بس اتنا ہے کہ ہم ریستورانوں میں جا کر کھاتے پیتے رہے ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں ... ۔ اب یہ ریستوران بنانے کے بعد اسے چلانے کا فرض بھی خود محمد علی کو ہی ادا کرنا ہو ... محمد علی کو اس بزنس میں کافی تجربہ تھا۔ وہ خود فلسطینی تھا اور بے شمار فلسطینیوں کو جانتا ... ہماری تسلی کے لئے اس نے انٹرویو کے لئے اور بھی کئی خواتین اور مردوں کو بلا لیا ...

"دیکھو مسٹر اوفوقی! یہ تمہارا بزنس ہے۔ ہر کام تمہاری مرضی اور ضرورت کے مطابق ہونا چاہئے۔" اس نے کہا۔

"مگر ہمیں تو اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ ہم تو ریستوران میں اتنی بہت ... مشینیں دیکھ کر حیران ہو گئے ہیں۔ ان سب کا مصرف کیا ہے؟"

"یہ سب کھانا پکانے اور کھانے کا سامان تازہ رکھنے کا انتظام ہے۔ ان چیزوں کے بغیر ریستوران نہیں چلتا اور پھر ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ والے بھی چھان بین کے بعد ہی سرٹیفکیٹ ... دیا کرتے ہیں جس کے بغیر کوئی شخص ریستوران نہیں چلا سکتا۔"

ہم نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے مگر ابھی تو ریستوران چالو ہونے میں دیر ہے۔ ابھی سے ... انٹرویو لینے کا فائدہ؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "برادر۔ اسٹاف کوئی ایک دن میں تو مل نہیں جاتا۔ پہلے انتخاب تو کر لیں۔

بعد میں انہیں بوقت ضرورت بلا لیا جائے گا۔ اب آپ میرے پاس آ کر بیٹھ جائیں
مناسب سمجھیں تو خود بھی انٹرویو میں حصہ لیں ورنہ مجھے بولنے دیں۔"

لیجئے۔ اب انٹرویو شروع ہوا۔

پہلے دو گورے اور ایک کالے صاحب تشریف لائے۔ انہیں ریستوران میں کام کر
کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ان کے بعد ایک اطالوی نوجوان سامنے آئے۔

"ہائی سینور۔ آئی کک پزا وَیری گد۔"

محمد علی نے ان سے سوالات کئے تو معلوم ہوا کہ انہیں پزا پکانا وکانا نہیں آتا۔
دراصل گھر پر بھی ان کی مسز پکاتی ہیں' بولے "میری وائف بہت غضب کا پزا پکاتی ہے
کہئے تو کل نمونہ لے آؤں۔"

"پزا کا یا مسز کا؟"

"کیا مطلب؟"

"نوکری تم کرو گے یا تمہاری مسز؟"

"نوکری تو میں کروں گا مگر میری مسز سپروائز کریں گی۔ تھوڑے فاصلے پر ایک بیوٹی
پارلر میں وہ کام کرتی ہیں۔ لنچ کے وقت ادھر آ جایا کریں گی۔"

محمد علی نے کہا "اس صورت میں آپ کی مسز سے بھی انٹرویو کرنا ہو گا۔ کل انہیں لے
آئیں۔"

"کل کیوں۔ آج کیوں نہیں۔ وہ میرے ساتھ آئی ہیں۔"

انہوں نے باہر جا کر پکارا اور ان کی مسز اندر داخل ہو گئیں۔ قد و قامت میں وہ اپنے
شوہر سے بڑی نہیں تو برابر ضرور ہوں گی۔ صورت شکل بھی مناسب تھی۔

"آپ ان کی مسز ہیں؟"

"سب یہی کہتے ہیں" انہوں نے بے زاری سے کہا۔

"یہ ریستوران میں کام کریں گے مگر پزا آپ پکائیں گی؟"

"کتنی بے وقوفی کی بات ہے؟" انہوں نے منہ بنایا۔

محمد علی نے کہا "مگر یہ تجویز تمہارے شوہر کی ہے۔"

"وہ تو ہے ہی بے وقوف مگر آپ لوگ تو سمجھ دار لگتے ہیں میں بیوٹی پارلر میں کام کرتی

پزا پکانے یہاں کیسے آ سکتی ہوں۔ اور پھر چہرہ سنوارنے اور پزا پکانے میں کوئی چیز بھی
نہیں ہے۔"

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے اطالوی شوہر بڑے اطمینان سے کھڑے
سن رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ انگریزی کے چند الفاظ ہی سمجھ سکتے تھے اس
اری گفتگو ان کی سمجھ سے بالا تھی۔

"اور پھر انہیں انگریزی میں کون سمجھائے گا' انہیں تو انگریزی آتی ہی نہیں ہے۔"

"مگر ابھی تو یہ ہم سے انگریزی بول رہے تھے۔"

"بس انہوں نے دو چار فقرے ہی رٹ لئے ہیں۔ مطلب ان کا بھی معلوم نہیں

"بہت بہت شکریہ کہ آپ ان کے ساتھ آ گئیں اور ہمارا مسئلہ حل کر دیا۔"

"اگر آج نہ آتی تو کل آنا پڑتا اس لئے کہ یہ آپ کی بات سمجھتے' نہ آپ ان کی۔"

"شکریہ۔"

ز نے اپنے شوہر سے اطالوی زبان میں کچھ کہا اور ان دونوں کے درمیان اطالوی
دریا بہنے لگا۔ مشین گن کی گولیوں کی رفتار سے ان کے مابین الفاظ کا تبادلہ ہوتا رہا۔
پنے شانے' بازو' ہاتھ اور گردن ہلا ہلا کر بہت تیزی سے بولتے رہے اور ہم دونوں
دیکھنے میں مصروف رہے۔ چند منٹ بعد وہ آپس میں بحث کرتے ہوئے ہال کمرے
چلے گئے تو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

نے محمد علی کی طرف دیکھا' وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

ہوں مسٹر اوفوقی۔ کیا خیال ہے؟"

نے کہا "بلاوجہ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی کام کا آدمی
"

بار جو شخص اندر آیا وہ ایک سیاہ فام تھا۔ خاصا لمبا قد تھا۔ ان صاحب کو ریستوران
نے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ گیس اسٹیشن اور چند دکانوں میں البتہ کام کر چکے تھے۔

ہا "مگر آپ کو ریستوران میں کام کرنے کا تجربہ تو ہے نہیں؟"

"تو پھر کیا ہوا۔ وہ بھی ہو جائے گا۔ کوئی شخص ماں کے پیٹ سے تو تجربہ سیکھ کر پیدا

نہیں ہوتا۔"

محمد علی نے کہا "رکھ لیتے ہیں۔ تھوڑے دن میں کچھ سیکھ لے گا" پھر ان سے پوچھا "تنخواہ کیا لو گے؟"

بولے "تنخواہ میں کم نہیں لیتا۔ پانچ سو ڈالر فی ہفتہ مناسب رہے گا۔"

محمد علی نے کہا "ابھی ہمارا ریستوران نیا بنا ہے اس لئے اتنا زیادہ معاوضہ نہیں دے سکیں گے۔"

بولے "تو کیا ہوا۔ آخر ایک نہ ایک دن یہ پرانا بھی تو ہو جائے گا۔"

"تو پھر ایک نہ ایک دن ہم آپ کو اتنا معاوضہ بھی ادا کر دیں گے۔ شکریہ۔"

انہوں نے ایک لمحہ ہم دونوں کو دیکھا پھر کہا "مجھے تم لوگوں پر ترس آ رہا ہے۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ تم اپنا کتنا نقصان کر رہے ہو" یہ کہہ کر وہ ہمیں غصے سے گھورتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

اب ایک خاتون کی باری تھی۔ گوری تھیں مگر انگریزی کالوں کے لب و لہجے میں بولتی تھیں۔ وجہ یہ بتائی کہ ساری زندگی کالوں کے علاقوں میں گزری ہے۔ محمد علی نے انہیں رخصت کر دیا۔

"آخر کیوں۔ اچھی خاصی تو تھی۔" ہم نے کہا۔

"مسٹر اوفوقی۔ آدمی کالا ہو یا گورا ہو۔ درمیان والا کسی کام کا نہیں ہوتا۔ اس عورت کی تمام عادتیں کالوں جیسی ہوں گی پھر اسے رکھنے سے فائدہ۔ اول نمبر کی کام چور اور جھوٹی ہو گی۔ سامان کی چوری بھی کرے گی۔ لب و لہجہ اس کا کالوں جیسا ہے۔ صورت گوروں جیسی ہے۔ یوں سمجھئے کہ ان دونوں نسلوں کی خرابیاں اس میں موجود ہوں گی۔ ایسے لوگوں سے دور ہی رہنا چاہئے۔"

اگلی امیدوارہ بھی کالی تھیں مگر خالص کالی' سیاہ فام رنگت مگر ناک نقشہ نہایت دلکش اور پرکشش۔ قد و قامت' چہرہ مہرہ' جسم کی ساخت سبھی کچھ مناسب۔ دہانہ اس لڑکی کا دیکھنے میں ٹھیک ہی لگتا تھا مگر جب بولتی تھی یا ہنستی تھی تو بہت بڑا نظر آتا تھا۔

بولیں "میرا نام کیرن ہے۔ کیرن گرے۔ ریستورانوں میں کام کرنے کا تجربہ بھی ہے۔ کھانا پکانا نہیں جانتی۔ صرف ویٹریس بن سکتی ہوں اور بس اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔"

کیرن کی عمر بمشکل اٹھارہ یا انیس سال ہو گی۔ تعلیم اس کی ہائی اسکول تک تھی۔ اس کے پانچ بہن بھائی ایک ماں اور تین باپ تھے۔

"تین باپ!" ہم نے حیران ہو کر پوچھا "یہ کیسے ممکن ہے؟"

بولی "میرا ایک باپ تو وہ ہے جس کی میں اولاد ہوں۔ وہ ہمیں چھوڑ کر غائب ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ طلاق ہو گئی تمہاری ماں سے؟"

"شادی ہی نہیں ہوئی تھی تو طلاق کیسے ہوتی۔ بس جیسے آیا تھا ویسے ہی ایک دن چلا گیا۔ اس وقت ہم تین بہن بھائی تھے۔ وہ کبھی کبھی نظر آ جاتا ہے۔ میرا دوسرا باپ ایک مکینک تھا۔ جنرل موٹرز میں کام کرتا تھا مگر پھر نشہ کرنے لگا اور کام چھوڑ دیا۔ سارا کام میری ماں کو کرنا پڑتا تھا۔ دو تین سال تو برداشت کیا پھر ماں نے اسے رخصت کر دیا۔ وہ ہم بہن بھائیوں میں دو کا اضافہ کر کے چلا گیا مگر اب بھی کبھی کبھی آ جاتا ہے۔"

کیرن صاف گو اور سادہ دل لڑکی تھی۔ رنگ اس کا بے حد سیاہ تھا لیکن آنکھیں بہت بڑی اور چمکدار تھیں۔ ناک نقشہ بھی دلکش تھا۔ محمد علی کا خیال تھا کہ اگر وہ خاموش رہے تو باقاعدہ حسین نظر آتی تھی مگر بولے بغیر بھی چارہ نہ تھا۔

محمد علی نے کہا "اس حساب سے تو تمہارے دو باپ اور پانچ بہن بھائی ہوئے۔"

کہنے لگی "صبر کریں۔ باقی حساب بھی بتا دوں گی۔ میرا تیسرا باپ ایک معمار ہے۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ ماں سے بالکل نہیں لڑتا۔ ہم لوگوں کو بھی کچھ نہیں کہتا' بس ایک خرابی یہ ہے کہ کبھی کبھی گھر سے غائب ہو جاتا ہے اور دو تین مہینے تک واپس نہیں آتا۔ ماں کا خیال ہے کہ اس نے دوسرے شہر میں بھی شادی کر رکھی ہے۔ اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔"

"تو پھر تمہارے گھر کا خرچہ کون چلاتا ہے؟"

"ماں چلاتی ہے۔ یا پھر ہم بہن بھائی کام کرتے ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں اس لئے سب سے زیادہ کام کرتی ہوں۔ مجھ سے چھوٹا دنگا فساد کرتا ہے۔ پڑیا بھی بیچتا ہے۔ جو پیسے کماتا ہے خود ہی خرچ کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی ماں کو بھی لا دیتا ہے۔ دو چھوٹے بھائی بھی ایک ریستوران میں کام کرتے ہیں۔ مجھ سے چھوٹی بہن کو میوزک کا شوق ہے۔ وہ گلوکارہ بنے گی۔"

"کیسے؟"

"بس ایسے ہی گاتی رہے گی۔ کوئی ایجنٹ سن کر آواز پسند کر لے گا تو اسے چانس مل جائے گا۔ اس سے چھوٹا لڑائی جھگڑا کرتا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ ایک نہ ایک دن ضرور باکسر بنے گا یا پھر جیل جائے گا۔"

کیرن گرے کو محمد علی نے فوراً ملازم رکھ لیا اور کہا کہ وہ ہفتے بعد اسی جگہ پہنچ جائے۔

"اچھا" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی "اور دو ہفتے تک کیا کروں؟"

"بھئی کوئی اچھا کام مل جائے تو کر لینا۔ کوئی پابندی نہیں ہے۔ جی چاہے تو یہاں چلی آنا۔"

"میں یہاں کام کرنا پسند کروں گی کیونکہ یہ گوروں کا علاقہ ہے اور تم مشرقی لوگ بھی اچھے مالک ہوتے ہو۔"

وہ رخصت ہو گئی مگر جاتے جاتے زور و شور سے مسکرائی جس کی وجہ سے اس کے حلق کا تالو تک نظر آ گیا۔

ایک صاحب پاکستانی بھی تھے۔ ان کا نام مشتاق یا بشیر تھا۔ اس وقت یاد نہیں رہا۔ انگریزی بس واجبی ہی بولتے تھے۔ کھانا پکانا جانتے تھے مگر یوروپین کھانا پکانے میں اناڑی تھے۔ پہلے تو وہ محمد علی کو بھی پاکستانی سمجھے اور السلام علیکم کہہ کر پنجابی میں باتیں شروع کر دیں۔ جب اس نے انگریزی بولنے کو کہا تو انگریزی میں بار بار فیل ہونے لگے اور گھبراہٹ میں ہمیں بھی کوئی غیر ملکی سمجھے۔ ان کی داستان یہ تھی کہ وہ پاکستانی سفارت خانے میں کسی سفارش کے ذریعے ملازم ہو کر آئے تھے اور اس کے بعد سفارت خانے میں ہر ماہ تنخواہ وصول کرنے کے سوا ان کا کوئی کام نہ تھا۔ سفارت خانے کے افسروں کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتے تھے اور سارا دن ادھر ادھر نوکریاں کرتے تھے۔ جب ہم نے ان سے اردو میں بات کی تو وہ ایک دم بے تکلف ہو گئے اور بولے "آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا سر جی۔"

ہم نے کہا "شکایت کا موقع تو تم ایک ہی جگہ دے سکتے ہو اور وہ جگہ ہے سفارت خانہ۔"

بولے "وہ تو شکایت کرتے ہے نہیں ہی سر جی۔ بڑا سیٹ کام ہے اپنا۔ بس سب لوگ

اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ بہت سے بابو لوگ تو بس صبح آ کر وہاں کوٹ ٹانگ کر اپنے باہر کے کاموں پر چلے جاتے ہیں۔ بڑے آرام کی نوکری ہے سر جی۔ عیش ہی عیش ہے۔"

"تم رہتے کہاں ہو اور واپس پاکستان کیوں نہیں جاتے؟"

"اپنے ایک پاکستانی دوست کے ساتھ رہتا ہوں۔ پاکستان جا کر کیا کروں گا سر جی۔ اب کام کرنے کی عادت ہی نہیں رہی۔ ہڈ حرام ہو گیا ہوں اور وہاں اتنی آمدنی بھی نہیں ہو گی" پھر سوچ کر بولے "یہاں ایک اور فائدہ بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"شراب عام کھلی مل جاتی ہے اور کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔ بس اسی لئے یہاں دل لگ گیا ہے۔"

ہمیں تو وہ بالکل پسند نہیں آئے مگر محمد علی نے مشورہ دیا کہ اگر ایک ہم وطن بھی اسٹاف میں ہو گا تو بہت اچھا ہو گا۔ وفادار رہے گا اور ہر وقت مالک کا بھلا سوچے گا مگر جب ریستوران شروع ہوا تو یہ سب توقعات الٹی ہو گئیں۔ وہ اول درجے کے غیر ذمے دار، نکھٹو اور کام چور ثابت ہوئے۔ دوسرے تیسرے دن ان کے دوست کا فون آ جاتا تھا کہ ان کی طبیعت خراب ہے حالانکہ وہ ساری رات شراب پینے کے بعد صبح بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں ہوتے تھے۔ ہر کام وہ خراب کر دیا کرتے تھے۔ برتن توڑ دیتے تھے۔ کھانا جلا دیا کرتے تھے۔ گاہکوں سے جھگڑتے تھے۔ ساتھیوں کی ہر وقت موقع پا کر چغلیاں لگاتے رہتے تھے۔ ایک دن معلوم ہوا کہ کچھ دور پر واقع ایک دوسرے ریستوران میں بھی پارٹ ٹائم کام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم نے ان سے معذرت کر لی۔

قصہ مختصر یہ کہ محمد علی نے سارا اسٹاف رکھ لیا جن میں کیرن کو چھوڑ کر سبھی عرب اور فلسطینی تھے۔ یہ سب لوگ محمد علی کے آزمائے ہوئے تھے اور ان میں سے بہت سے اس کے رشتے دار بھی تھے۔ یہ سب کے سب نہایت محنتی، وفادار اور ایماندار ثابت ہوئے۔ ہشام کو منیجر اور چیف باورچی کا عہدہ دیا گیا۔ یہ تیس پینتیس سال کی عمر کا صحت مند فلسطینی تھا۔ انگریزی خوب روانی سے امریکنوں کی طرح بولتا تھا۔ سب اسے سام کہتے تھے۔ نہایت سمجھدار، ایماندار اور محنتی شخص تھا۔ ریستورانوں کا اسے کافی تجربہ تھا۔ اس کے علاوہ واشنگٹن میں کافی عرصے تک ٹیکسی بھی چلاتا رہا تھا۔ جب ریستوران چلتے ہوئے چند

ہفتے گزر گئے تو ایک دن بہت جوش میں بھرا ہوا آیا اور کہا "مسٹر آفاقی' کیا آپ فلمیں بھی بناتے رہے ہیں؟"

"ہاں۔ مگر تمہیں کس نے بتایا؟"

"میرے کئی پاکستانی دوست بھی ہیں جو ٹیکسی چلاتے ہیں۔ وہ آپ کو جانتے ہیں۔ پاکستان کے دوسرے فلم سازوں کو بھی وہ جانتے ہیں" یہ کہہ کر اس نے کچھ اور نام بھی گنوا دیئے۔

"فلم چھوڑ کر آپ یہاں ہوٹل چلانے کیوں آ گئے۔ آپ کے پاس تو وہاں بہت دولت ہو گی۔"

اب ہم اسے کیا سمجھاتے۔ مختصراً یہ بتایا کہ ہم کچھ عرصے امریکا میں رہنا چاہتے ہیں۔

"سمجھ گیا" وہ مسکرایا "شاید واپس جا کر آپ امریکا کے بارے میں مووی بنائیں گے۔ اسی لئے یہاں سروے کرنے آئے ہیں۔"

چلو بھئی۔ اگر وہ ایسا سمجھتا ہے تو سمجھتا رہے مگر اس کے بعد سے اس کی نگاہوں میں ہمارا احترام کچھ اور زیادہ ہو گیا۔ ریستوران میں جو لوگ آتے تھے موقع پا کر وہ انہیں یہ ضرور بتاتا تھا کہ مسٹر آفاقی پاکستان سے آئے ہیں اور وہاں فلم سازی کرتے ہیں۔ ہمارے گاہک یہ سن کر بہت متاثر اور خوش ہوتے تھے۔

امریکا میں ہم نے ایک رواج یہ دیکھا کہ امریکی اپنے ملک کے دوسرے حصوں کی سیاحت بھی کرتے رہتے ہیں اور اسی ذوق و شوق سے سب مقامات دیکھتے ہیں جس طرح غیر ملکی سیاح دیکھتے ہیں۔ لڑکوں' لڑکیوں' بوڑھوں اور بچوں کے بہت بڑے بڑے گروپ واشنگٹن دیکھنے آتے تھے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

☆ ☆ ☆

ریستوران تو ہمیں مل گیا تھا اور تیزی سے زیر تعمیر تھا۔ اس اثناء میں محمد علی نے ہمیں تمام متعلقہ محکمے بھی دکھا دیئے۔ یہ سب محکمے ایک ہی آٹھ منزلہ عمارت میں تھے۔ مقصد یہ تھا کہ کسی کو جگہ جگہ مارا مارا نہ پھرنا پڑے۔ سارے کام ایک ہی چھت تلے ہو جائیں۔ محمد علی نے ہمیں ہر ایک سے متعارف بھی کرایا اور بتایا کہ یہ "نیڈوز" کے مالک ہیں۔ ریستوران کے آلات کے بارے میں تو ہم کچھ بھی نہ جان سکے مگر دوسرے قواعد و ضوابط کے بارے میں محمد علی نے ہمیں تمام معلومات ازبریاد کرا دیں۔ وہاں دستور یہ ہے کہ ہر ریستوران کے داخلے پر ایک چارٹ سا لگا ہوتا ہے۔ ہیلتھ انسپکٹر ہر دوسرے تیسرے ہفتے آتا ہے اور تمام چیزوں کا معائنہ کرنے کے بعد اس چارٹ پر مختلف شعبوں میں نمبر دے دیتا ہے۔ گاہک ریستوران میں داخل ہوتے ہی اس چارٹ کو دیکھتا ہے اور اگر صفائی' کھانے کے معیار' سروس کے معیار یا کسی اور معاملے میں کم نمبر دیکھتا ہے تو الٹے قدموں لوٹ جاتا ہے۔ ہمارے ریستوران میں چالیس پینتالیس افراد کے بیٹھنے کا بندوبست تھا۔ باقی "ٹیک اوے" تھا یعنی فون کر کے آرڈر لکھوا دیں اور خود آ کر لے جائیں۔ محمد علی نے جگہ کی کمی کے پیش نظر ریستوران میں ایک ہی ٹوائلٹ بنایا مگر جب ہیلتھ انسپکٹر معائنہ کرنے آیا تو اس نے اصرار کیا کہ خواتین کے لئے ایک علیحدہ ٹوائلٹ ہونا چاہئے۔ پھر ٹوائلٹ کا سائز بھی مقررہ ہونا چاہئے ورنہ سرٹیفکیٹ جاری نہیں ہوتا اور اس کی غیر موجودگی میں ریستوران چلایا ہی نہیں جا سکتا۔

ابھی ریستوران چالو نہیں ہوا تھا کہ محمد علی نے ہم سے کہا "مسٹر اوفوقی۔ اب آپ کو ایک اچھے سے انشورنس ایجنٹ کی ضرورت ہو گی۔"

"وہ کیوں؟"

"ریستوران کی انشورنس کرانے کے لئے۔"

ہم سمجھے ایک ہی انشورنس سے کام چل جائے گا مگر وہاں تو ایک طویل فہرست تھی۔ بلڈنگ کی انشورنس۔ آتش زدگی سے انشورنس۔ فساد کی صورت میں کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ جائیں تو اس کی انشورنس۔ ریستوران میں ڈاکہ پڑ جائے تو اس کی انشورنس۔ سامان ٹوٹ جائے تو اس کی انشورنس۔ ریستوران کے اندر دو گاہکوں کے جھگڑے میں کسی ایک کو زخم آجائے یا ہلاک ہو جائے تو اس کی انشورنس اور سب سے بڑھ کر گاہک کی انشورنس۔

"گاہک کی انشورنس ہم کیوں کرائیں؟"

"دیکھئے۔ کوئی گاہک آپ کے ریستوران میں کھانا کھا کر بیمار ہو جاتا ہے تو اس کے علاج کے اخراجات آپ کہاں سے ادا کریں گے۔ یہ تو انشورنس ہی کرے گی۔"

آخر میں ایک انشورنس اور باقی رہ گئی تھی۔ وہ ملازموں کی انشورنس تھی۔ لیجئے۔ اپنے ریستوران میں کام کرنے والوں کی بھی انشورنس کرائیں۔ اگر کام کرتے ہوئے وہ بیمار ہو جائیں، زخمی ہو جائیں یا کوئی نقصان اٹھا بیٹھیں تو اس کے اخراجات بھی ریستوران کے مالک کو دینے پڑتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اتنے بھاری اخراجات کوئی اپنی جیب سے تو دے نہیں سکتا۔

ہم نے کہا "بھائی یہ بتائیں کہ ابھی تو ہماری کمائی بھی شروع نہیں ہوئی۔ اگر ہو بھی گئی تو اتنی بہت سی انشورنس کرانے کے بعد ہمارے پاس باقی کیا رہ جائے گا؟"

"اللہ مالک ہے۔" وہ ہنسنے لگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتنی بہت سی انشورنس پالیسیاں لئے بغیر آپ ہمیشہ خطرے میں رہتے ہیں اور اگر انشورنس کرائیں تو ہر ماہ ایک خطیر رقم انشورنس کے حوالے کرنے کے بعد آپ کے پاس کچھ باقی نہیں رہتا۔ ایک مصیبت سوشل سیکورٹی کی بھی ہے۔ قاعدے قانون کے مطابق آپ اپنے ہر ملازم کی تنخواہ میں سے تنخواہ کی مناسبت سے سوشل سیکورٹی کی رقم ہر ہفتے کاٹ لیتے اور پھر اپنی طرف سے اتنی ہی رقم اس میں شامل کر کے سوشل سیکورٹی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ گویا مصیبت پر مصیبت ہے' ہم نے ریستوران لاہور اور کراچی میں بھی دیکھے تھے اور مالکوں کو عیش کرتے ہوئے بھی پایا تھا مگر ان مصائب سے انہیں آزاد ہی دیکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم تو ریستوران خرید کر پچھتانے لگے مگر بعد میں پتا چلا کہ امریکا میں دوسرے تمام کاروباروں کے سلسلے میں بھی اسی قسم کی پابندیاں ہیں۔ کاروبار کرنے کا مقصد محض دولت سمیٹنا ہی نہیں ہے۔ انکم ٹیکس کا

طریقہ یہ دیکھا کہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو آپ مہینے کی انکم کا خود ہی گوشوارہ بنائیں گے اور اتنی رقم کا چیک متعلقہ محکمے کو ارسال کر دیں گے۔ کوئی آپ سے پوچھ گچھ کرنے نہیں آئے گا لیکن کسی مرحلے پر اگر یہ معلوم ہوا کہ آپ غلط رقم جمع کراتے اور ٹیکس بچاتے رہے ہیں تو پھر آپ کا اللہ حافظ ہے۔ مالکوں کے لئے تو مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ مثلاً آپ کے ریستوران میں کسی نے کھانا کھایا۔ رات کو اس کی طبیعت خراب ہو گئی تو اس نے فوراً ریستوران پر مقدمہ ٹھوک دیا۔ اب یہ ثابت کرنا ریستوران کا فرض ہے کہ کھانے والے کو یہ بیماری اس ریستوران کے کھانے سے نہیں ہوئی بلکہ اس کا سبب کچھ اور ہے۔

ریستوران شروع ہونے کے چند دن بعد ایک شام سام بھاگا بھاگا ہمارے پاس آیا۔

"مسٹر آفاقی۔ بڑی گڑ بڑ ہو گئی۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"ڈینیئل کی انگلی میں چوٹ لگ گئی ہے۔"

ڈینیئل ہمارے اسٹاف میں شامل تھا اور کچن میں کام کرنے کے علاوہ ویٹر بھی تھا۔ وہ بلیک تھا۔

ہم نے پوچھا "کیسے چوٹ لگ گئی اور کتنی چوٹ لگی ہے؟"

کہا "ٹماٹر کاٹتے ہوئے انگلی تھوڑی سی کچل گئی ہے۔ اب وہ کہتا ہے کہ مجھے اسپتال لے جاؤ۔"

"تو پھر لے جاؤ۔"

"مسٹر آفاقی۔ اگر اسے اسپتال لے گئے تو سارا خرچا آپ کو اپنی انشورنس سے ادا کرنا ہو گا اور اسپتال بہت مہنگا ہوتا ہے۔"

ہم اٹھ کر ڈینیئل کے پاس گئے۔ وہ ایک طرف کرسی پر بہت سنجیدہ صورت بنائے ہوئے بیٹھا تھا۔ چہرے سے تکلیف کا کوئی اظہار نہیں ہو رہا تھا پھر بھی وہ اپنی انگلی پکڑے بیٹھا تھا۔ ہم نے دیکھا تو معمولی سی چوٹ تھی۔ ہمارے ہاں تو اتنی سی چوٹ پر کوئی ڈیٹول تک نہیں لگاتا مگر اس کا اصرار تھا کہ اسے اسپتال لے جائیں اور پھر ایک دو دن کی چھٹی بھی دی جائے۔

ہم نے کہا "ڈینیئل۔ تم بہادر آدمی ہو۔ اتنی سی چوٹ تو بچوں کو بھی لگ جاتی ہے تو

وہ کھیلتے پھرتے ہیں۔"

بولا "سر میں بچہ نہیں ہوں' آپ کا اسٹاف ممبر ہوں اور اگر یہ چوٹ بڑھ گئی اور مجھے کوئی سیریس بیماری ہو گئی تو کون ذمے دار ہو گا؟"

ہم نے امداد کے لئے سام کی طرف دیکھا مگر وہ بھی بے بس تھا۔ مجبوراً اسے سام ایک قریبی کلینک میں لے گیا جہاں واکٹر نے چالیس ڈالر فیس وصول کر لی اور دو چار دوائیں بھی لکھ دیں۔ ڈینیئل بہتیرا کہتا رہا کہ ڈاکٹر' مجھے آرام کی بھی ضرورت ہے مگر ڈاکٹر نے اسے آرام کرنے کی اجازت نہیں دی ورنہ وہ ہمارے خرچے پر ایک دو دن آرام بھی کرتا۔ سام نے واپس آکر ہمیں مبارک باد پیش کی کہ چوٹ بہت معمولی تھی ورنہ اگر اسے اسپتال لے جانا پڑتا تو کافی خرچہ ہو جاتا او. ہو سکتا ہے کہ اسپتال والے اسے چیک اپ کے لئے اسپتال میں داخل بھی کر لیتے۔ اس کے بعد ہم اللہ کے حضور دعا کرتے رہتے تھے کہ ہمارے اسٹاف کے کسی آدمی کو چوٹ نہ لگے اور نہ ہی کوئی گاہک ہمارے ریستوران میں کھانا کھا کر بیمار ہو ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

ایک روز ہمارے پڑوس میں اونچی آواز میں بولنے کا شور سنائی دیا۔ دو لڑکوں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ ایک لڑکے نے کوک کا ڈبا اٹھا کر مارا' دشمن تو صاف بچ گیا مگر ڈبا ہمارے ریستوران کی کھڑکی پر لگا اور شیشہ ٹوٹ گیا۔ سام نے فوراً ہمیں آکر اطلاع دی۔

"تو پھر کیا ہوا۔ انشورنس والوں کو فون کر دو۔ وہ آکر لگا دیں گے۔"

"مسٹر آفاقی۔ ہم نے شیشے توڑنے کے خلاف انشورنس نہیں کرائی ہے۔ یہ خرچہ تو آپ ہی کو برداشت کرنا پڑے گا۔"

اور ہم صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

ریستوران چلنے لگا تھا اور خاصا مقبول ہو رہا تھا۔ خصوصاً لنچ کے وقت ایک اژدہام ہوتا تھا۔ ریستوران والے دراصل ساری تیاری لنچ کے لئے کرتے ہیں کیونکہ لنچ امریکا میں ریستوران کے لئے قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ لنچ کا وقفہ عموماً ایک گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اس عرصے میں ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ وقت مقررہ کے اندر لنچ سے فارغ ہو جائے کیونکہ وقت کی پابندی وہاں نہایت لازمی ہے۔ ریستوران کا عملہ صبح سویرے سے کھانے پینے کا تمام سامان تیار کر کے رکھتا ہے۔ جوں ہی لنچ کا مرحلہ شروع ہوتا ہے ریستورانوں

میں گاہکوں کی قطاریں لگ جاتی ہیں۔ سب لوگ بڑے صبر و سکون سے اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں مگر وہ سستی اور کاہلی برداشت نہیں کرتے۔ نہ ہی انہیں یہ گوارا ہے کہ جو شخص قطار میں پیچھے کھڑا ہوا ہے اسے پہلے فارغ کر دیا جائے۔ اس کا تجربہ ایک بار ہمیں بھی ہوا۔ لنچ کا وقت تھا اور لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ ہم اناڑی پن کی وجہ سے مجبور تھے اور ہم نے اپنے ذمے آئس کریم اور یوگرٹ پیش کرنے کا فرض لے رکھا تھا۔ یہ سب سے آسان کام تھا۔ جس کسی نے یوگرٹ یا آئس کریم کی فرمائش کی آپ نے اس کی پسندیدہ مشین کا بٹن دبایا اور کاغذ کے گلاس میں آئس کریم نکال کر دے دی اور پیسے وصول کر لئے۔ اب ہماری مشکل یہ تھی کہ ہمیں صحیح طریقے سے بٹن دبانا نہیں آتا تھا۔ کبھی آئس کریم کی مقدار زیادہ ہو جاتی تھی اور کبھی کم۔ دونوں صورتوں میں گاہک ہمیں گھور کر دیکھتا تھا۔ خواتین خاص طور پر منہ بناتی تھیں اور کہتی تھیں۔ "ہانی۔ آپ میرا وزن کیوں بڑھانا چاہ رہے ہیں۔"

ہم نے ایک دن دیکھا کہ قطار میں پچھلی جانب ایک بڑی فیشن ایبل بڑی بی کھڑی تھیں۔ فیشن میں وہ جوانوں سے کم نہ تھیں مگر عمر ستر سال سے بھی زیادہ ہو گی۔ یہاں تک کہ کمر تک جھک گئی تھی۔ ہمیں ان پر بہت ترس آیا اور ہم نے انہیں مخاطب کر کے پوچھا کہ آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے۔

بولیں "ینگ مین' میں تو لنچ میں صرف یوگرٹ لیتی ہوں کیونکہ یہ وزن نہیں بڑھاتا اور اسمارٹ رکھتا ہے۔"

ہم نے انہیں سر سے پیر تک دیکھا۔ ان کے جسم میں بے شمار چیزیں مصنوعی تھیں۔ مثلاً دانت' بال وغیرہ۔ ہاتھوں میں رعشہ تھا مگر فیشن کے مطابق لباس پہنے ہوئے تھیں اور میک اپ بھی مکمل تھا۔ خیر پھر بھی بزرگ تھیں اور ہم مشرق والے بزرگوں کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں۔

اس لئے ہم نے فوراً ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک گلاس میں یوگرٹ نکالا اور ان کی طرف بڑھایا مگر شکر گزار ہونے کے بجائے وہ کچھ پریشان سی ہو گئیں۔ ان سے زیادہ پریشانی ان کے آس پاس کھڑے ہونے والوں کے چہروں سے ہویدا تھی۔ ابھی ہم نے یوگرٹ کا گلاس ان کے حوالے نہیں کیا تھا کہ ایک طرف سے سام آفت ناگہانی کی طرح

نازل ہوا اور اس نے ہمارے ہاتھ سے یوگرٹ کا گلاس لیتے ہوئے دبی زبان سے کہا "مسٹر آفاقی۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

ہم نے کہا "اولڈ لیڈی کی مدد کر رہے ہیں۔"

وہ بازو پکڑ کر ہمیں ایک طرف لے گیا اور بولا "خدا کے لئے آئندہ ایسی ہمدردی کا مظاہرہ نہ کیجئے گا ورنہ ہمارے ریستوران میں گاہک آنا چھوڑ دیں گے۔"

"مگر ہوا کیا۔ کچھ بتاؤ بھی؟"

"باری کے بغیر کسی کو بھی اٹینڈ نہ کریں۔ یہ لوگ اسے برداشت نہیں کرتے۔"

"مگر تم نے دیکھا نہیں وہ کتنی ضعیفہ ہیں؟"

بولا "ضعیفہ تو کیا اگر قبر میں سے مردہ بھی نکل کر آ جائے تو یہ اصول نہیں توڑا جا سکتا۔ آئندہ یاد رکھیئے گا۔"

اس طرح ایک شدید بحران پیدا ہوتے ہوتے رہ گیا۔

ایک دن ہیلتھ انسپکٹر صاحب لنچ کے وقت اپنی شامت اعمال سے چلے آئے۔ انہیں ہم جانتے تھے۔ سام بھی ان سے واقف تھا۔ ادھر لنچ کا وقت تھا اور گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ ہر شخص دیوانہ وار کام میں مصروف تھا۔ ہیلتھ انسپکٹر صاحب کی بدقسمتی کہ وہ سیدھے ہمارے پاس آ گئے۔ جیب سے اپنا کارڈ نکال کر دکھایا اور پھر بولے "اجازت دیں تو میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

ہمارے پاس تو ہر مرض کی دوا سام تھا۔ چنانچہ ہم نے سام کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس سے بات کریں۔ وہ سام کے پاس پہنچا تو وہ کام کی زیادتی سے بوکھلایا ہوا تھا۔

"ہائی؟" انسپکٹر نے کہا۔

"ہائی" سام نے اس کی جانب توجہ دیئے بغیر کہا۔

"میں ہیلتھ انسپکٹر ہوں۔ کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

عام حالات میں سام ایک خوش اخلاق آدمی تھا مگر ان کی زبان سے یہ فقرہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا۔ "اے مسٹر! کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ یہ لنچ ٹائم ہے۔ تمہیں معلومات حاصل کرنے کے لئے کوئی اور وقت نہیں مل سکتا؟"

"معافی چاہتا ہوں، میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔"

"ظاہر ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے مگر ہماری مصروفیت کا وقت دیکھ کر آیا کرو۔ یہ نہیں کہ جب چاہا منہ اٹھا کر چلے آئے۔"

"سوری بڈی، مگر یہ میری ڈیوٹی ہے۔"

"اور لوگوں کو بروقت لنچ دینا میری ڈیوٹی ہے۔ آپ کی ڈیوٹی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسروں کا حرج کریں۔"

سام کی بداخلاقی دیکھ کر ہم شرمندہ ہوئے جا رہے تھے اور اس سے بڑھ کر یہ فکر تھی کہ وہ ہیلتھ انسپکٹر کے ساتھ یہ بدتمیزی کر رہا تھا جس کی معمولی سی رپورٹ بھی ہمارے ریستوران کو بند کرا سکتی تھی۔

"تو پھر مجھے کوئی فرصت کا وقت بتا دیجئے۔"

"ٹھیک ہے۔ چار بجے آ جانا۔ اب اپنی شکل گم کریں۔ میں بہت مصروف ہوں۔"

انسپکٹر شکریہ ادا کر کے چلا گیا مگر ہم فکر مند ہو گئے کہ سام کی یہ بداخلاقی ضرور رنگ لائے گی اور بہت جلد وہ وقت بھی آ گیا۔

چار بجے ہیلتھ انسپکٹر پھر مسکراتا ہوا نمودار ہو گیا۔ اس نے پہلے تو اس وقت کی تکلیف دہی کی معافی چاہی پھر کہا کہ وہ ہمارا سرٹیفکیٹ اور بعض دوسرے کاغذات چیک کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے فوراً اپنا بریف کیس کھول کر تمام کاغذات اس کے سامنے رکھ دیئے۔ اس نے بڑے غور سے کاغذات کا معائنہ کیا اور پھر کہا "تمام کاغذات مکمل ہیں مگر سرٹیفکیٹ کہاں ہے؟"

ہم نے دوبارہ سارے کاغذ اس کو دکھا دیئے۔ وہ مسکراتا رہا۔ "سوری سر۔ ان کاغذات میں سرٹیفکیٹ موجود نہیں ہے۔ سرٹیفکیٹ کے بغیر تو ریستوران میں کام شروع نہیں ہو سکتا۔ کسی نے آپ کو بتایا ہو گا کہ سرٹیفکیٹ کے بغیر ریستوران چلانا جرم ہے۔ ریستوران بند بھی کیا جا سکتا ہے اور تین سو ڈالر روزانہ جرمانہ بھی کیا جا سکتا ہے۔"

ہمیں تو پسینے آ گئے۔ لیں بھئی، یہ انسپکٹر ضرور ہم سے بدلہ لے گا۔ سرٹیفکیٹ بھلا کہاں جا سکتا ہے؟ ہم نے فوراً کاؤنٹر پر جا کر محمد علی کو فون کیا۔

"علی۔ ریستوران کا سرٹیفکیٹ کہاں ہے۔ تمہارے پاس تو نہیں ہے؟"

"مسٹر آفاقی۔ آپ کو یاد نہیں کہ میں نے وکیل کے کاغذات آپ کو دے کر کہا تھا کہ

انہیں لے کر دفتر جانا ہے جہاں ۵۶ ڈالر فیس ادا کر کے آپ کو سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔"

ہم سر تھام کر رہ گئے۔ یہ بات ہمارے دماغ سے نکل گئی تھی اور ہم سرٹیفکیٹ کے بغیر ہی تین مہینے سے ریستوران چلا رہے تھے۔

"تو اب کیا کریں؟" ہم نے محمد علی سے پوچھا۔

"اس دفتر میں جا کر کاغذات داخل کریں اور وہاں سے سرٹیفکیٹ حاصل کریں۔"

ہم نے دبی زبان میں کہا "مگر علی۔ یہاں ہیلتھ انسپکٹر آیا ہوا ہے۔ وہ سرٹیفکیٹ دیکھنے پر اصرار کر رہا ہے۔"

"تو پھر کیا ہو گیا۔ دو تین بعد پھر آ جائے گا۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

ہم دوبارہ ہیلتھ انسپکٹر کے پاس پہنچ گئے۔ سام نے اسے کافی کی پیش کش کی تھی مگر اس نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔

"سرٹیفکیٹ نہیں ملا؟" اس نے پوچھا۔

ہم نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ کہنے لگا "میرا خیال ہے کہ آپ کہیں کاغذات میں رکھ کر بھول گئے ہیں یا ہو سکتا ہے کہ آپ نے دفتر سے وصول ہی نہ کیا ہو۔ آپ اطمینان سے معلوم کر لیں۔ میں تین چار دن بعد پھر آ جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا بریف کیس سمیٹا اور رخصت ہو گیا۔ ہم سوچتے رہ گئے کہ اگر یہ سب کچھ پاکستان میں پیش آیا ہوتا تو ہیلتھ انسپکٹر ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتا؟

اسی روز ہم رجسٹریشن آفس پہنچ گئے جہاں ہمارے معاہدے کی رجسٹریشن ہوئی تھی۔ یہ رجسٹریشن لے کر ہمیں ہیلتھ آفس جانا تھا جہاں سے ہمیں سرٹیفکیٹ ملنا تھا۔

رجسٹریشن کی عمارت سات منزلہ اونچی تھی۔ نیچے سیکورٹی پر ایک بہت تندرست اور باکسر قسم کا سیاہ فام تعینات تھا۔ محمد علی نے ہمیں بتا دیا کہ پانچویں منزل پر ہمیں جن صاحب سے ملاقات کرنی ہے ان کا نام مسٹر ڈیوٹی ہے۔

ہم نے سیکورٹی افسر سے پوچھا "مسٹر ڈیوٹی سے مل سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں جناب۔ وہ ڈیوٹی پر موجود ہیں" پھر اس نے ہمیں پانچویں منزل پر ان کے کمرے کا نمبر بتا کر روانہ کر دیا۔

مسٹر ڈیوٹی اپنے کمرے میں موجود تھے مگر اندر ان کے پاس ایک سیاہ فام بہت موٹی

ڑی خاتون تشریف فرما تھیں اور انہیں مستقل ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھیں۔ وہ جواب میں گیاتے ہوئے صفائیاں پیش کر رہے تھے۔ چند منٹ بعد وہ خاتون باہر نکلیں تو ہمیں حیرت ئی کہ وہ ایک لفٹ کے ذریعے کیسے اوپر آئی ہوں گی اور مسٹر ڈیوٹی نے انہیں بیٹھنے کے لئے کون سی کرسی پیش کی ہو گی جس میں ان کا بھاری بھر کم وجود سمایا ہو گا۔ وہ اندر سے راضگی کا اظہار کرتی ہوئی باہر نکلیں اور غصے سے زور زور سے قدم مارتی ہوئی باہر چلی ئیں مگر ہم سے پہلے ایک اور ملاقاتی بھی مسٹر ڈیوٹی سے ملنے کا منتظر تھا۔ چنانچہ ہم اپنی ری کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ کمرے کے اندر سے کچھ سریلی سی سرگوشیوں کی آوازیں ائی دے رہی تھیں۔ ہمیں بہت جلدی تھی مگر مسٹر ڈیوٹی کے فارغ ہونے تک انتظار کرنا زم تھا اس لئے بے چینی سے ٹہلنے لگے۔

چند منٹ بعد اندر سے ایک خوشبو کا جھونکا برآمد ہوا اور اس کے بعد ایک سراپا بہار ین کمرے سے کمر لچکاتی ہوئی باہر نکلیں۔ وہ اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس تھیں۔ سر سے تک سنہری تھیں۔ یہاں تک کہ ان کی بھویں بھی سنہری تھیں جس کی وجہ سے آنکھوں ی رنگت بھی سنہری نظر آ رہی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکلی تھیں، ہمیں دیکھا تو کراہٹ اور زیادہ گہرائی ہو گئی۔

"ہائی۔ میں نے آپ کو منتظر رکھا۔"

"کوئی بات نہیں" ہم نے کہا۔

"آپ بھی ریستوران چلا رہے ہیں؟"

"کوشش کر رہے ہیں" ہم نے کہا "مگر ایک مشکل میں پڑ گئے ہیں۔"

وہ فوراً ہمارے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں "کیا پرابلم ہے؟"

ہم نے پوچھا "آپ کوئی محکمے سے تعلق رکھنے والی خاتون ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں بھی ایک ریستوران چلا رہی ہوں۔ رجسٹریشن کرانا اور سرٹیفکیٹ لینا ول گئی ہوں۔ یہ کوئی جرم تو نہیں ہے۔ آخر انسان ہوں، بھول بھی جاتی ہوں۔ ایسی کون آفت آ گئی ہے؟"

"بالکل معمولی بات ہے" ہم نے کہا اور یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ ہماری طرح کی ل اور خاتون بھی موجود ہیں۔

"مگر یہ بیوروکریٹس اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتے ہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ یہ ہماری خدمت کے لئے رکھے گئے ہیں یا ہمیں پریشان کرنے کے لئے؟"

"ظاہر ہے خدمت کرنا ہی ان کا مقصد ہے۔"

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔ آپ کی کیا پرابلم ہے۔؟"

"وہی جو آپ کی ہے۔ ہمارا حافظہ بھی کچھ کمزور ہے۔ آپ کی طرح۔"

"ریستوران چلانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ لوگ تو بس دفتر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ انہیں کیا پتا کہ ہم پر کیا گزرتی ہے۔ ہر مہینے ٹیکس ادا کرنے والوں کی رقم سے تنخواہ لینا اور بات ہے اور کاروبار کر کے پیسے کمانا بات دوسری ہے۔"

"یہ تو ہے" ہم نے کہا۔ وہ خاصی باتونی تھیں اور مزید بات چیت کرنا چاہتی تھیں مگر ہم جلدی میں تھے۔ ہمیں سرٹیفکیٹ جلد سے جلد حاصل کرنے کی فکر پڑی ہوئی تھی۔ وہ ایک امریکن تھیں۔ ان کے سوچنے کا انداز مختلف تھا۔ ہم ایک نووارد تھے اور پاکستان جیسے ملک سے آئے تھے جہاں شرفا اور بڑے بڑے لوگ کلرک اور چپراسی تک سے ڈرتے ہیں' بس یہی فرق تھا۔

ہم نے کہا "اجازت ہو تو ہم بھی مسٹر ڈیوٹی سے مل لیں۔"

"بڑی خوشی سے" وہ کھٹ کھٹ کرتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔ ہم ان سے یہ پوچھنا تو بھول گئے کہ ان کا ریستوران کہاں واقع ہے ورنہ کم از کم وہاں جا کر ایک پیزا ہی چکھ لیتے۔

مسٹر ڈیوٹی ایک مختصر سے نہایت شریف النفس آدمی تھے۔ بڑی سی میز کے پیچھے وہ اس طرح بیٹھے تھے کہ صرف ان کی گنجی چندیا چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک خوش مزاج اور ہنس مکھ آدمی تھے۔ ان دونوں خواتین کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود کافی تروتازہ نظر آ رہے تھے۔ ہمارے جانے سے پہلے محمد علی نے انہیں فون کر کے ملاقات کا وقت مقرر کر دیا تھا۔ جب ہم نے اپنا اور ریستوران کا کارڈ انہیں دیا تو وہ یہی سمجھے کہ ہم ہی نے انہیں فون کیا تھا۔ بولے "فون پر آپ کی آواز بہت بھاری اور رعب داری تھی۔ میں تو سمجھا تھا کہ کوئی باڈی بلڈر قسم کے آدمی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے مذاق پر خود ہی ہنسے۔

ہم نے انہیں مسئلہ بتایا۔ رجسٹریشن کے لئے کاغذات ان کے حوالے کئے اور فرمائش کی کہ یہ ہمیں دو دن کے اندر واپس مل جانے چاہئیں مگر ہم نے انہیں وجہ نہیں بتائی۔ ڈر

یہ سن کر وہ کہیں مزید تاخیر نہ کر دیں یا جلدی کام کرانے کے عوض رشوت نہ مانگ ں

انہوں نے کہا۔ "علی۔ اس کام کے لئے آٹھ دن کا وقت مقرر ہوتا ہے مگر میں ایک دو ہلے کرا دوں گا۔"

ہم نے پریشان ہو کر کہا "مگر ہمیں تو دو دن کے اندر کاغذات درکار ہیں۔"

"ناممکن ہے علی" انہوں نے بڑی ہمدردی سے کہا۔ اب تو ہم واقعی پریشان ہو گئے۔ یقین تھا کہ اگر اس بار ہم نے سرٹیفکیٹ پیش نہ کیا تو ہیلتھ انسپکٹر ہمارا بہت برا حشر ے گا۔ مجبوراً ہم نے اپنے "عقل کل" یعنی محمد علی کو فون کرنے کی خواہش ظاہر کی اور تمام معاملہ ان کے گوش گزار کر دیا۔ محمد علی نے کہا "تم مسٹر ڈیوٹی سے کہو کہ وہ فون ےاور تم خود بھی لائن پر موجود رہو۔"

پھر اس نے مسٹر ڈیوٹی کو لتاڑنا شروع کر دیا "مسٹر ڈیوٹی' مجھے افسوس ہے کہ تم اپنی ٹھیک سے نہیں دے رہے۔"

"کیوں۔ کوئی شکایت پیش آ گئی؟" وہ مسکرائے۔

"تم رجسٹریشن میں ایک ہفتہ لگاؤ گے تو یہ سرٹیفکیٹ کے بغیر ریستوران کیسے چلائیں ر اتنے دن تک ریستوران بند رہے گا تو اس کا ذمے دار کون ہو گا۔ یہ نقصان کون گا؟"

"مگر میری بات تو سنو۔ دو دن تو ہفتہ اتوار کی چھٹی ہے پھر ایک اور دن کی تعطیل جلدی سے جلدی بھی یہ کام سات دن میں ہو گا۔ کئی دفتروں میں کاغذات جانے

"میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے چوتھے دن رجسٹریشن چاہئے ورنہ مجھے ریستوران بند کرنا گا اور سارے نقصان کے ذمے دار تم ہو گے۔"

ہمارا کوئی افسر ہوتا تو الٹا ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتا کہ تم نے سرٹیفکیٹ کے بغیر ران کیوں اور کیسے چلایا ہے مگر وہ امریکی تھا اس لئے بے چارہ منت سماجت کرنے لگا۔ فیصلہ ہوا کہ پانچویں روز صبح بارہ بجے رجسٹریشن کے کاغذات ہمیں مل جائیں گے۔ ت ہونے لگے تو ایک لمبے اور موٹے سے سفید فام اپنے گیلس پھڑکاتے ہوئے

کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

"میں پوچھتا ہوں یہ کیا حرکت ہے۔ آخر تم لوگ انسانوں کو زندہ رہنے دو گے یا نہیں؟ میں ایک آزاد شہری ہوں۔ ٹیکس ادا کرتا ہوں۔ شریف آدمی ہوں کاروبار کر کے درجنوں لوگوں کو روزگار فراہم کرتا ہوں۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انتظامیہ کے لوگ میری راہ میں رکاوٹیں پیدا کریں۔"

مسٹر ڈیوٹی نے انہیں بھی بہلا پھسلا کر بٹھالیا اور ہمیں آنکھ کے اشارے سے خدا حافظ کہا۔ امریکا میں سرکاری افسروں کی یہ درگت دیکھ کر ہمارا دل بھر آیا۔ شام کو محمد علی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا "دیکھا۔ ان لوگوں سے کس طرح بات کرتے ہیں؟"

ہم نے کہا "ہاں دیکھا۔"

بولے "کیا تم لوگ بھی اپنے ملک میں ایسا ہی کرتے ہو؟"

اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہمارے ملک میں عام شہریوں پر کیا گزرتی ہے مگر ہم نے اپنے ملک کی عزت رکھنے کی خاطر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

☆ ☆ ☆

ہمارا ریسٹوران "چالو" ہو گیا تھا مگر اس سے پہلے بھی چند مراحل گزرے تھے۔ مثلاً سب سے پہلے تو اسٹاف کا مسئلہ تھا۔ محمد علی نے امریکی دستور کے مطابق مختلف لوگوں سے ہماری ملاقات تو کرا دی تھی مگر اصرار یہ تھا کہ فیصلہ خود آپ کریں کیونکہ آپ مالک ہیں۔

ہم نے کہا "سنو بھائی۔ ہم مالک ضرور ہیں مگر اس بارے میں ہماری معلومات اور تجربہ صفر ہے۔ جہاں ریسٹوران بنا کر دیا ہے وہیں ہماری یہ مشکل بھی آسان کر دیں۔"

محمد علی نے ہمارے لئے جو عملہ منتخب کیا اس میں اکثریت فلسطینیوں کی تھی۔ یہ سب کے سب نوجوان، جوشیلے اور محنتی لوگ تھے۔ ان میں سے اکثر محمد علی کے رشتے دار تھے یا پھر بہت پرانے واقف تھے اس لئے ہمیں یہ آسانی تھی کہ ان کی جانب سے کسی گڑبڑ کا اندیشہ نہیں تھا۔ جس شخص کو محمد علی صاحب منتخب کرتے انہیں ہمارے سامنے انٹرویو کے لئے پیش کیا جاتا۔

"مسٹر اوفوقی۔ یہ طارق خبیر ہے۔ مصر سے نیا نیا آیا ہے۔ بے چارے کو کام کی

ضرورت ہے۔ بیک ہوم اس کا بہت بڑا خاندان ہے۔ اسے ان کے لئے بھی کمائی کرنی ہو گی۔" سام نے کہا۔

ہم نے طارق خبیر کو دیکھا۔ بائیس چوبیس سالہ نوجوان تھا۔ بھاری بھر کم جسم، گندمی رنگ، بول چال میں خاصی آہستگی پائی جاتی تھی۔ یعنی قدرے سست تھا۔ ریستوران میں یورپین کھانا پکانے کا تجربہ تھا۔ بلکہ پزا بھی بنالیتا تھا۔

"سر۔ یہ پزا بنا کر اتنا اونچا اچھالتا ہے کہ کئی بار تو وہ چھت پر جا کر چپک جاتا ہے۔"

"تو پھر کیا کرتے ہیں؟"

"تو پھر یہ دوسرا پزا بنا کر اچھال دیتا ہے۔ پہلے والا تو کافی دیر تک چھت میں ہی چپکا رہتا ہے۔"

"بھئی تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ رکھ لو اس کو بھی۔"

"مگر مسٹر اوفوقی۔ اس کا ایک مسئلہ بھی ہے۔ یہ ناجائز طریقے پر امریکا آیا ہے۔ اسے یہاں رکھنے کے لئے ریذیڈنٹ پرمٹ یا گرین کارڈ دلوانا پڑے گا۔"

ہم نے کہا "یہ کام تو ہمارے بس کا نہیں ہے۔"

بولے "آپ ذرا سی مدد کریں تو اس کا بھلا ہو جائے گا۔"

"وہ کس طرح؟"

"یہ مس کیرن ہے نا۔ اگر یہ طارق کے ساتھ کاغذی شادی کر لے تو ایک سال کے اندر اسے گرین کارڈ مل جائے گا۔"

"مگر وہ اس سے شادی کیوں کرے گی۔ اسے کیا فائدہ ہے؟"

"اسے ہم کچھ رقم دے دیا کریں گے۔ آپ اگر کیرن سے بات کر لیں تو وہ انکار نہیں کرے گی۔"

ہم نے خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر کیرن کو طلب کیا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ کیرن میں رنگت کے سوا ہر چیز مکمل حسن کا نمونہ تھی۔ البتہ منہ پھاڑ کر ہنستے ہوئے اس کا دہانہ بہت زیادہ کھل جاتا تھا۔ اس کے سوا اس میں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں۔

ہم نے کیرن کو بلایا تو وہ اپنی پتلی کمر کو لچکاتی ہوئی آ گئی۔ حیران تھی کہ اسے طلب کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔

"یس مسٹر آفاقی۔ کوئی مسئلہ؟"

"ہاں کیرن۔ یہ ایک انسانی مسئلہ ہے۔"

بولی "پھر تو آپ کو ہیومن رائٹس والوں سے بات کرنی چاہئے۔"

"ایسی بات نہیں ہے کیرن۔ یہ ہمارے ایک رفیق کا مسئلہ ہے۔ اس کی ایک پرابلم ہے جسے تم ہی حل کر سکتی ہو۔"

"بولیے۔"

ہم نے مختصراً تمام مسئلہ سمجھایا اور کہا کہ اگر وہ طارق سے کاغذی شادی کر لے تو اس غریب کی زندگی سنور جائے گی۔"

کیرن نے ناک سکیڑ کر دور کھڑے طارق کو دیکھا پھر کہا "ناممکن۔"

"مگر تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

"مجھے کیا اعتراض ہے؟" اس نے کہا۔ دراصل وہ ہر بات کو دہرانے کی عادی تھی۔ "اعتراض یہ ہے کہ میں اسے پسند نہیں کرتی۔ وہ موٹا ہے۔ کاہل ہے' سست ہے۔ اتنی آہستگی سے بات کرتا ہے کہ سنائی نہیں دیتی۔ اس کی تنخواہ بھی کم ہے۔"

"مگر تمہیں اس سے کیا سروکار۔ یہ تو فرضی شادی ہو گی۔ تمہاری بلا سے تمہیں تو ایک کاغذ پر دستخط کرنے ہوں گے اور اس کے بدلے وہ ہر ہفتے تمہیں پچاس ڈالر ادا کرے گا۔"

"مگر مسٹر آفاقی آج کل ڈیپارٹمنٹ والے بہت چالاک ہو گئے ہیں۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ میاں بیوی ایک ساتھ بھی رہتے ہیں یا نہیں اور پھر ان کی سراغ رساں عورتیں یہ کھوج بھی لگاتی رہتی ہیں کہ وہ دونوں ایک ہی کمرے میں سوتے ہیں یا الگ الگ۔"

یہ صورت حال ہمارے لئے نئی تھی۔ ہم نے فوراً سام کو بلا کر مشورہ لیا۔

"سنو کیرن۔" اس نے کہا "زیادہ پارسا بننے کی کوشش مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کتنے لڑکوں کے ساتھ دوستی کر چکی ہو۔ ایک سال اس کے ساتھ بھی گزار لو۔ سال کے آخر میں تمہیں ۲۴ سو ڈالر ملیں گے۔ اس کے علاوہ دو ہزار ڈالر بونس بھی مل جائے گا۔"

"مگر میں اس کے ساتھ ایک گھر میں اور ایک کمرے میں کیسے رہوں گی؟"

"ارے یہ تو بس دنیا دکھاوا ہے۔ تمہارے کمرے کے اندر تو کوئی جھانک کر نہیں دیکھے

گا۔ تم الگ الگ بستروں پر سو سکتے ہو۔ میں گارنٹی دیتا ہوں کہ طارق بہت شریف لڑکا ہے۔ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی میلی نظر سے نہیں دیکھے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر میری گارنٹی کون دے گا۔ میں تو اتنی شریف نہیں ہوں اور ایک ہی کمرے میں ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ رہنا سہنا تو کسی نن اور پادری کے لئے بھی مشکل ہے۔ نہ بابا' سوری۔ میں اس سودے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ سوری مسٹر آفاقی" وہ کمر لچکاتی ہوئی چلی گئی۔

ہم نے کہا "سام۔ یہ تو راضی نہیں ہوئی۔ تم کوئی اور لڑکی تلاش کرو۔"

بولا "یہ گھر کی بات ہے۔ دوسری لڑکیاں بہت حرافہ ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے پیسے بھی لے لیں اور عین وقت پر مکر بھی جائیں۔ بے چارہ طارق تو بے موت مارا جائے گا۔"

"تو پھر اب کیا کریں؟"

وہ ہنسنے لگا "اب تو جو کچھ کرے گا طارق ہی کرے گا۔ میں اسے سمجھا دیتا ہوں۔ دو چار دن رومانٹک انداز میں بات کرے گا تو کیرن رام ہو جائے گی۔"

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ چوتھے دن کیرن ہمارے پاس آئی اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی "مسٹر آفاقی۔ مجھے وہ تجویز منظور ہے۔"

"کون سی تجویز؟"

"کاغذی شادی والی۔ مگر آپ طارق کو اچھی طرح سمجھا دیں گے وہ جذبات میں آ کر کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا۔"

"اس کی تم فکر مت کرو۔ وہ بہت شریف لڑکا ہے۔"

"مگر مسٹر آفاقی۔ مشکل یہ ہے کہ میں شریف لڑکی نہیں ہوں۔" اس نے کہا اور ہنسنے لگی۔

چار مہینے بعد کیرن نے اطلاع دی کہ اب وہ دونوں سچ مچ کے میاں بیوی ہو گئے ہیں۔ بلکہ ایک بچے کے ماں باپ بھی بننے والے ہیں۔

طارق خاصا کم گو اور کند ذہن آدمی تھا۔ ایک دن سام نے اسے کام کے اوقات میں کیرن سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو بہت ڈانٹا کہ ڈیوٹی کے اوقات میں یہ کیا حرکت ہے؟ وہ دونوں شرمندہ سے ہو کر الگ الگ ہو گئے۔

کچھ دیر بعد ایک دم ریستوران میں بیس بائیس مہمان آ گئے اور ایک آفت سی مچ گئی۔ سب نے بھاگ دوڑ شروع کر دی مگر ہم نے دیکھا کہ طارق خبیر بڑے اطمینان سے ایک طرف میز کرسی پر پیر پسارے بیٹھے ہیں اور ایک اخبار کا مطالعہ فرما رہے ہیں۔ ہمیں بہت غصہ آیا کہ اس وقت ریستوران میں ہنگامی حالات موجود ہیں اور یہ شخص اس قدر بے نیاز بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا ہے۔ پہلے تو سوچا کہ خود ہی بلا کر ڈانٹ ڈپٹ کریں۔ بعد میں خیال آیا کہ کیوں نہ سام کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جائے چنانچہ ہم نے اشارے سے سام کو اپنے پاس بلایا اور اس کی توجہ طارق کی نالائقی کی طرف مبذول کرائی۔

"سام۔ تم اس سے جواب طلب کرو۔ آخر اس بدتمیزی کا مطلب کیا ہے؟"

وہ بولا "مسٹر آفاقی۔ یہ اس کے لنچ کا وقفہ ہے۔ ہم اسے کام کرنے کے لئے نہیں کہہ سکتے۔ اپنے وقت کو وہ اپنی مرضی کے مطابق گزارنے میں آزاد ہے۔"

ہم نے کہا "مگر یار احساس بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ اسے یہ بھی خیال نہیں ہے کہ ہم سب کتنے دباؤ میں ہیں۔"

ہنس کر بولا "مسٹر آفاقی۔ یہ امریکا ہے۔ ہمارے وقت میں وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتا اور اس کے وقت میں ہم مداخلت نہیں کر سکتے۔ یہ تو اصول کی بات ہے۔"

ہم خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

کیرن سے ہماری خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے گھر کی باتیں بھی ہمیں بتا دیا کرتی تھی۔ اسے اپنے تینوں باپوں سے سخت نفرت اور شکایت تھی۔

ہم نے کہا "جو شخص تمہاری ماں کو چھوڑ کر چلا گیا وہ دوبارہ تمہارے گھر آتا کیوں ہے۔ آخر تمہاری ماں اسے منع کیوں نہیں کرتی؟"

"سر' آپ میری ماں کو نہیں جانتے۔ وہ بہت نرم دل عورت ہے۔ وہ کسی کا دل نہیں توڑ سکتی۔ وہ اپنے پرانے تعلق کو کیسے بھلا دے؟"

ہم نے کہا "کیرن۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ان تینوں کا جب جی چاہتا ہے آ جاتے ہیں مگر پھر پلٹ کر خبر نہیں لیتے اور نہ ہی کوئی ذمے داری قبول کرتے ہیں۔ آخر ان کے بچوں کو تمہاری ماں کیوں پالتی ہے؟"

"یہی دستور ہے مسٹر آفاقی۔ میری ماں کوئی انوکھی تو نہیں ہے۔ یہاں تو سبھی کالے ایسا

کرتے ہیں۔ یہ ہمارا کلچر ہے اور میں آپ کو ایک بات بتاؤں؟"

"ہاں بتاؤ!" ہم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کبھی کبھی تو میری ماں کے تینوں شوہر اکٹھے ہی آ جاتے ہیں۔ خوب شرابیں پیتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں اور شور مچاتے ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ" ہم نے کہا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" وہ پوچھنے لگی۔

"نہیں۔ بس ہمیں ذرا اونچی آواز میں سوچنے کی عادت ہے۔"

امریکی کالوں میں ہم نے ایک بات مشترک دیکھی کہ وہ سب کے سب سفید فاموں سے شاکی ہیں بلکہ ان سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ اپنی تمام خرابیوں کا ذمے دار وہ گوروں کو ٹھہراتے ہیں۔

"مگر تم لوگ خود بھی تو کچھ نہیں کرتے" ہم نے کیرن سے کہا۔

"کیوں کریں۔ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ بہت ناانصافیاں کی ہیں۔ اب ہماری باری ہے۔"

جس روز صدر ریگن پر قاتلانہ حملہ ہوا اس دن ہم ریستوران میں ہی موجود تھے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ جس جگہ یہ قاتلانہ حملہ ہوا وہ ہمارے ریستوران سے بمشکل ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر تھی۔ ہم سب اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے کہ اچانک ایک موٹے اور گنجے سے سفید فام بزرگ بوکھلائے ہوئے اندر داخل ہوئے اور بولے "سنا' کیا ہو گیا؟"

ہم سب نے ان کے گھبرائے ہوئے چہرے کو دیکھا "نہیں تو۔ کیا ہوا؟"

"صدر ریگن پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ کسی نے ان پر گولیاں چلائی ہیں۔"

"اوہ" سارے ریستوران میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ یہ قطعی غیر متوقع خبر تھی۔ پھر ایک طرف سے کیرن گرے کی آواز سنائی دی "تو کیا وہ بچ گیا؟"

وہ صاحب بولے "بچ تو گیا مگر ابھی اس کی زندگی خطرے میں ہے۔"

کچھ گورے گاہکوں نے یہ سن کر اطمینان کی سانس لی مگر کیرن نے بڑے واضح الفاظ میں کہا "کاش وہ مر گیا ہوتا!"

ہم سب اس کی شکل دیکھنے لگے۔ ایک گورے نے کہا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ وہ ایک نیک دل اور اچھا آدمی ہے۔"

"خاک اچھا آدمی ہے۔ وہ گوری نسل کا ہے۔ اس نے کبھی کالوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اللہ کرے مرجائے۔"

امریکی دارالحکومت کے ایک ریستوران میں امریکی صدر کے بارے میں اس قسم کی گفتگو امریکی ماحول میں ہی کی جا سکتی ہے۔ ہمارا ملک ہوتا تو وہاں فوراً گوروں اور کالوں میں فساد شروع ہو جاتا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ سب خاموش بیٹھے رہے پھر ایک کالے نے کیرن کو مخاطب کیا "مس۔ تمہاری خواہش بالکل بے معنی اور بے فائدہ ہے۔ اگر وہ مر بھی گیا تو کیا ہو گا؟ اس کی جگہ ایک اور گورا صدر بن جائے گا۔ ہماری حالت تو وہی رہے گی نا۔"

ایک گورا گاہک جذباتی ہو گیا۔ "تم لوگ کم فہم ہو۔ ناشکرے ہو۔ ریگن ہمارے لئے بہترین صدر ثابت ہو رہا ہے اور تم اس کی موت کے خواہش مند ہو۔ آخر کیوں؟"

"اس لئے کہ اس کا رنگ گورا ہے۔" ایک کالے نے کہا۔

"یہ نہ بھولو کہ یہ ایک آزاد اور جمہوری معاشرہ ہے۔ یہاں سب کے حقوق برابر ہیں۔"

"یہ محض فریب ہے۔ چال ہے۔ تم بتاؤ کیا کبھی امریکا میں کوئی کالا آدمی صدر ہو سکتا ہے؟"

سب چپ رہ گئے۔

کالے نے کہا "نہیں ہو سکتا، کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ تم سب منافق ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔ تم نے کالوں کے ساتھ ہمیشہ ظلم کئے ہیں۔ ناانصافیاں کی ہیں۔ پہلے انہیں غلام بنا کر ظلم کرتے تھے۔ اب انہیں جمہوریت اور مساوات کے نام پر بے وقوف بنا رہے ہو۔"

سام کافی دیر سے چپ چاپ یہ بحث سن رہا تھا۔ اس کے فلسطینی ساتھی بھی اب تک خاموش تھے۔ اچانک سام نے آگے بڑھ کر کہا۔ "یہ لوگ کسی کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔ فلسطینیوں کے ساتھ انہوں نے کون سا انصاف کیا ہے۔ تین فیصد یہودیوں نے سارے امریکیوں کو زر خرید غلام بنا رکھا ہے۔ یہ سب ان کے اشاروں پر رقص کرتے ہیں

اور خود کو آزاد، خودمختار اور سپرپاور کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ احمق قوم تو روئے زمین پر نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" ہم نے کہا "سیاست بہت ہو گئی۔ اب سب کام کرو۔"

دیکھتے ہی دیکھتے سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ نہ کوئی تذکرہ رہا نہ تبصرہ۔ نہ تلخی، نہ دشمنی۔ امریکی معاشرے کی یہ تصویر بھی خاصی متاثر کن ہے۔

☆ ☆ ☆

جن دنوں ہمارا ریستوران زیر تعمیر تھا اور محمد علی لوگوں سے انٹرویوز کر رہا تھا ایک دن اس نے ہمیں مطلع کیا کہ قانون کے مطابق ہر ریستوران میں ایک سپروائزر کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ جتنی دیر بھی ریستوران کھلا رہے گا اس کے اندر ایک سپروائزر ہمہ وقت موجود رہنا چاہیئے ورنہ جرمانہ عائد ہو جائے گا۔

"تو پھر ٹھیک ہے" ہم نے کہا "ایک سپروائزر بھی رکھ لو۔"

محمد علی نے کہا "مسٹر اوفوقی۔ سپروائزر بہت مہنگا پڑتا ہے۔ آپ کو ہر ہفتے کم از کم ہزار بارہ سو ڈالر سپروائزر کو دینے ہوں گے۔"

ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اتنا مہنگا سپروائزر

ہم نے پوچھا "سپروائزر کرتا کیا ہے؟"

کہا "وہ ایک سند یافتہ شخص ہوتا ہے جو یہ دیکھتا ہے کہ ریستوران میں ہر کام حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق کیا جا رہا ہے اور کوئی خراب غذا گاہکوں کو فراہم نہیں کی جا رہی۔"

"مگر بھئی اس کا معاوضہ تو بہت زیادہ ہے۔"

محمد علی نے مشورہ دیا۔ "مسٹر اوفوقی۔ تم سپروائزر کا امتحان دے دو۔ پندرہ دن کا کورس ہوتا ہے۔ زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ جب تک ریستوران تیار ہو گا۔ تم سپروائزر بن جاؤ گے اور ہزار بارہ سو ڈالر فی ہفتے کی بچت بھی ہو جائے گی۔"

یہ مفت مشورہ تو ہمیں پسند آیا مگر سوچا کہ سپروائزر کا امتحان پاس کرنا بھی کوئی آسان کام تو نہ ہو گا، محمد علی نے ہمیں بتایا کہ ۹ ویں اسٹریٹ پر جارج ٹاؤن یونیورسٹی کی ایک

عمارت میں سپروائزر کی کلاسیں ہوتی ہیں۔ تم وہاں چلے جاؤ۔ ساری تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔ ہزار بارہ سو ڈالر فی ہفتے کا سوال تھا اس لئے ہم فوراً نکل کھڑے ہوئے۔

ہم نے ڈوپونٹ سرکل کے ٹیوب اسٹیشن پر پہنچ کر ایک خاتون سے پوچھا کہ ۹ ویں اسٹریٹ جانے کا کیا طریقہ ہے؟ وہ خاصی طرح دار خاتون تھیں۔ ہماری بات سن کر معنی خیز انداز میں مسکرائیں اور پھر ہمیں بتا دیا کہ کون سے اسٹیشن پر ہمیں ٹیوب سے اترنا چاہئے۔ بلکہ وہ ہمارے ساتھ ہی ٹرین پر سوار ہو گئیں۔ خوش لباس تو وہ تھیں ہی، خوشبو میں بھی مہک رہی تھیں۔ جب ہم دونوں ایک سیٹ پر آمنے سامنے بیٹھ گئے تو انہوں نے ہم سے پوچھا۔ "یہاں اجنبی ہو؟"

ہم نے سر ہلا دیا۔

"تب ہی دن کے وقت ۹ ویں اسٹریٹ جا رہے ہو۔"

ہم نے کہا "کیا وہاں دن کے وقت میں جانا منع ہے؟"

وہ ہنسنے لگیں، بولیں "وہ ریڈ لائٹ ایریا ہے۔ نائٹ کلب، عریاں سینما گھر، پیشہ ور کال گرلز، شراب خانے، جوا خانے، یہ سب کچھ وہاں پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دن کے وقت بہت کم لوگ ان چیزوں سے شغل فرماتے ہیں۔"

ہمیں تو پسینہ آ گیا۔ سوچا شاید محمد علی نے ہمیں غلط پتا بتا دیا ہے یا پھر ہم خود ہی بھول گئے ہیں۔

وہ بولیں۔ "ویسے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں وہاں جائیں۔"

ہم نے کہا "دیکھئے مس۔ بات یہ ہے کہ ہمیں تو جارج ٹاؤن یونیورسٹی جانا ہے جہاں ہوٹلنگ کی کلاسیں ہوتی ہیں۔"

"اوہ" انہوں نے لمبا سانس لیا "تو پھر آپ کو ایک اسٹیشن پہلے اترنا ہو گا۔ وہاں کسی سے بھی پوچھ لیجئے گا۔ آپ کو عمارت کی تیسری منزل پر جانا ہو گا۔"

ہمارے دل پر سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا کہ چلو کم از کم اس خاتون کی نظروں میں تو ہماری شرافت کا سکہ جم گیا۔ وہ ہم سے کچھ دیر پہلے ہی اتر گئیں۔ ہم اپنے اسٹیشن پر اتر کر باہر نکلے تو ۹ ویں اسٹریٹ کی دکانیں ہمارے سامنے تھیں۔ یہی سڑک آگے چل کر عشرت گاہ کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔

ایک بوڑھے سے ہم نے جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے بارے میں پوچھا۔

انہوں نے ایک آہ بھری "کہاں کی یونیورسٹی۔ کیسی یونیورسٹی۔ ارے اب تو وہ معیار ہی نہیں رہا۔ ایک زمانے میں اسے امریکا کی ناک کہا جاتا تھا۔ بہرحال، وہ سامنے بلڈنگ دیکھ رہے ہو نا، اس کی تیسری منزل پر چلے جانا۔ تمہیں منزل مل جائے گی۔"

لفٹ کے ذریعے ہم تیسری منزل پر پہنچے۔ زیادہ چہل پہل نہیں تھی۔ ایک کمرے میں چند کرسیاں اور میزیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک دو سیاہ فام اور دو تین سفید فام خواتین وہاں موجود تھیں۔ ہم نے مقصد بیان کیا۔

"اوکے" ایک خاتون نے کہا "۳۰ ڈالر فیس عنایت کر دیں۔"

ہم نے تیس ڈالر ان کے حوالے کئے۔ انہوں نے ایک عدد رسید ہمارے حوالے کی اور پھر ایک چھوٹا سا کتابچہ بھی ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ آپ کے نصاب کی کتاب ہے۔ اس کو یاد کر لیں۔ وہ سامنے والے کمرے میں ایک گھنٹے تک ہر روز دو سے تین بجے تک کلاس ہوتی ہے، پندرہ دن کے بعد امتحان ہو گا۔ باقی باتیں وہیں آپ کو معلوم ہو جائیں گی۔"

ہم نے اس کمرے میں جھانک کر دیکھا تو خالی پڑا ہوا تھا۔ دیکھنے میں کلاس روم لگتا تھا۔ کمرے کے باہر ایک مختصر سے ہال میں مختلف مشینیں رکھی ہوئی تھیں جن میں سکے ڈال کر کھانے پینے کی اشیاء نکالی جا سکتی تھیں۔ ہمیں بھوک لگ رہی تھی اس لئے فوراً ایک چپس کا پیکٹ نکالا اور کھانا شروع کر دیا۔

"اخاہ" برابر سے ایک آواز آئی "واہ بھئی واہ۔ اپنی طرف کے لگتے ہو؟"

پلٹ کر دیکھا تو ایک ایشیائی ادھیڑ عمر کے شخص پر نظر پڑی۔ خاصے اسمارٹ نظر آ رہے تھے۔ ان کے سر پر گنتی کے ساٹھ ستر بال ہوں گے مگر انہیں بھی نہایت اہتمام کے ساتھ تیل ڈال کر اور جیل لگا کر سر کے دونوں جانب دھاریوں کی صورت میں چپکا دیا گیا تھا۔ اس قدر اہتمام تو گھنے اور خوبصورت بالوں والے بھی نہ کرتے ہوں گے۔

"میرا نام قدوس ہے۔ محمد قدوس، کانپور سے تعلق ہے میرا۔ مگر اب کہاں کا کان پور اور ناگ پور۔ اب تو ہم امریکی ہو گئے ہیں۔ ہم تو آدھے ہوئے ہیں اولادیں پوری پوری ہو جائیں گی۔ اللہ بچائے۔" انہوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا مگر پھر کچھ سوچ کر

ہمارے گلے لگ گئے۔

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

ہم نے کہا "وڈ برج میں رہتے ہیں۔"

"ارے میاں لعنت بھجو وڈ برج پر۔ پیچھے کہاں کے ہو؟"

ہم نے مختصراً اپنا پتا نشان بتایا۔

"یہاں کیسے گھوم رہے ہو؟ اچھا اچھا۔ امتحان دینے آئے ہو گے۔ لگتا ہے تم نے بھی کوئی ریسٹوران خرید لیا ہے۔"

ہم نے اقرار میں سر ہلایا۔

"دیکھو بھائی۔ پڑھائی تو یہ زیادہ مشکل نہیں ہوتی۔ ایک پتلی سی‘ چھوٹی سی کتاب ہے مگر مشکل یہ ہے کہ عجیب عجیب باتیں یاد کرنی پڑتی ہیں۔ مثلاً فلاں چیز کتنی گرمی میں خراب ہو جاتی ہے۔ فلاں چیز کو جمانے کے لئے کتنی حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سبزیاں‘ دودھ‘ گوشت مچھلی‘ سور‘ گائے‘ بکری‘ مرغی ان سب کا گوشت کتنے درجہ حرارت پر درست رہتا ہے۔ حفظان صحت کے اصول کیا ہیں۔ ریسٹوران میں بیماریوں کو روکنے کے لئے کیا ترکیب کرنی چاہئے۔ وہ کون سی چیزیں ہیں جن سے ریسٹوران میں بیماریاں پھیلتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اب بتاؤ‘ یہ سب لغویات کوئی کیسے یاد کرے۔ اسی لئے بندہ چار بار فیل ہو چکا ہے۔"

"تو پھر آپ کا ریسٹوران کون چلا رہا ہے؟"

"وہ میری بیوی چلاتی ہے۔ بہت ہوشیار عورت ہے۔ پہلی بار میں ہی امتحان پاس کر لیا تھا اس نے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے عورتوں کے ساتھ یہ لوگ خاص رعایت کرتے ہیں ورنہ ہم اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ چار بار میں بھی پاس نہ ہوں۔"

"واقعی۔ چار بار فیل ہونا تو زیادتی ہے۔" ہم نے کہا۔

سرگوشی میں بولے "اس میں زیادہ قصور خود ہمارا ہے۔ بھائی صاحب اس جگہ کے آس پاس گناہوں کی بستی ہے۔ ہم ایک کمزور انسان ہیں۔ بس کلاس چھوڑ کر ۹ ویں اسٹریٹ پر پہنچ جاتے ہیں۔ اطمینان یہ ہے کہ ریسٹوران تو بیوی چلا ہی رہی ہے۔ ادھر بار بار فیس دینے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ چاہے جتنی بار فیل ہو جاؤ۔ ایک بار جو فیس دے دی ہے بس وہی زندگی بھر کے لئے کافی ہے۔ یہ امریکن فیس لینے کے معاملے میں بہت معقول لوگ

ہوتے ہیں۔ آج فیل ہوئے۔ کل پھر کلاس میں آ جائیے۔ کوئی پوچھتا بھی نہیں ہے‘ نہ ہی ازسرنو فیس طلب کرتا ہے۔ کیوں‘ کیسی رہی؟" انہوں نے ہمیں کہنی ماری۔

"ٹھیک ہے۔ مگر ماحول کیسا ہے؟"

"ماحول!" انہوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر آنکھیں گھمائیں "بس کچھ نہ پوچھو۔ تھوڑے سے بور لوگ ہوتے ہیں۔ باقی حوریں اور پریاں ہیں۔ جو پڑھانے والی ہے وہ بھی مس امریکا سے کم نہیں ہے۔ ہے تو کالی مگر حسینہ عالم ہے۔ کمبخت اور اخلاق اتنا اچھا ہے کہ کیا بتاؤں۔ بڑے پیار سے پڑھاتی ہے مگر عشق وشق بالکل نہیں بگھارتی۔ حالانکہ بہت سے لوگ کوشش کر چکے ہیں۔ کم بخت برف کی بنی ہوئی ہے۔ بہرحال‘ بہت اچھا وقت گزرتا ہے۔ بس تھوڑی دیر میں کلاس شروع ہونے والی ہے۔ خود ہی سب کچھ دیکھ لینا۔ لو چیونگم کھاؤ۔"

جب تک کلاس کا وقت شروع نہ ہوا قدوس صاحب خود بھی چیونگم کھاتے رہے اور ہمیں بھی کھلاتے رہے "دانتوں کی بہت اچھی ورزش ہو جاتی ہے اس سے۔ دراصل باقی جسم کی ورزش کرنے کی تو ہمیں توفیق ہی نہیں ہے۔ بس سارا زور دانتوں کی ورزش پر ڈال دیا ہے۔ ویسے بھی ڈینٹسٹ کہتے ہیں کہ دانت صحت مند ہوں تو سارا جسم صحت مند رہتا ہے۔"

کچھ دیر بعد کلاس میں "طالب علم" آنے شروع ہو گئے۔ زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی۔ ایشیائی‘ کوریائی‘ چینی‘ یونانی‘ لاطینی‘ فلپینی۔ ایک انڈین مسٹر قدوس تھے اور ایک پاکستانی ہم تھے۔ دراصل باہر سے آنے والے عموماً امریکا میں ریسٹوران کے کاروبار کو آسان اور فائدہ بخش سمجھتے ہیں اس لئے اسی کاروبار پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ عموماً خود ہی ریسٹوران چلاتے ہیں اور کم سے کم اسٹاف رکھتے ہیں اس لئے سپروائزر اور باورچی بھی خود ہی بن جاتے ہیں۔ کلاس میں جو بھی آتا وہ بلند آواز میں "ہائی" کہتا جو اسلام علیکم کا نعم البدل سمجھ لیجئے اور اس کے بعد ایک کرسی اور میز پر بیٹھ جاتا۔ بعد میں وہی اس کی مخصوص جگہ بن جاتی تھی۔ ہم نے بغور جائزہ لیا تو طلبا میں مردوں سے زیادہ عورتوں کی تعداد تھی اور قریب قریب سبھی اسمارٹ اور خوش شکل تھیں۔ قدوس صاحب نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ ممتحن کافی نمبر تو ان خواتین کو خوبصورتی کے دے دیا کرتے ہوں گے۔ خوش خطی یا

بد خطی کا امریکا میں کوئی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ عام طور پر جوابات لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ہر موضوع پر پرچے میں تین چار سوالات لکھے ہوتے ہیں۔ جواب دینے والے کو کسی ایک پر نشان لگانا ہوتا ہے۔ اگر جواب صحیح ہے تو نمبر مل جاتے ہیں اگر غلط ہے تو نمبر کٹ جاتے ہیں۔ ان حالات میں لکھنے کی تو ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ یہی وجہ ہ کہ امریکیوں کو عموماً لکھنے کی عادت نہیں ہوتی۔ عام زندگی میں بھی خط و کتابت کی جگہ فیکس یا ٹیلی فون سے کام چلاتے ہیں۔ جہاں تک ہینڈ رائٹنگ کا سوال ہے اگر ہم یہ کہیں کہ مجموعی طور پر امریکی دنیا کی بد خط ترین قوم ہے تو اسے مبالغہ نہ سمجھئے گا۔ ایک سے بڑھ کر ایک بدخط آپ کو اس قوم میں مل جائے گا۔ بلکہ اکثر کا خط تو ایسا ہے کہ لکھے موسیٰ پڑھے عیسیٰ والی ضرب المثل بھی صادق نہیں آتی۔ ہم نے اکثر لوگوں کو دیکھا کہ اپنا لکھا ہوا خود بھی صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتے۔ بس اٹکل سے کام نکالتے ہیں۔ البتہ یہ دیکھا کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی ہینڈ رائٹنگ بہتر ہوتی ہے۔ ہماری سمجھ میں یہ راز نہیں آ رہا تھا۔ قدوس صاحب نے سنا تو کہا "عورتیں رومانی خط و کتابت زیادہ کرتی ہیں۔ اس لئے ان کا خط بھی اچھا ہوتا ہے۔"

قدوس صاحب کے بارے میں ہم کیا عرض کریں۔ اگر انہیں خان صاحب کا نعم البدل کہا جائے تو بہت حد تک درست ہو گا۔ وہی حاضر جوابی۔ وہی بے فکری، وہی رنگین مزاجی، بہت دلچسپ باتیں اور بات کرنے کا انداز بھی دلکش۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جو منہ میں آئی بلا جھجک کہہ ڈالی اور اس پر شرمندگی یا ندامت کا اظہار بھی کبھی نہیں کرتے۔

وہ ہمارے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئے اور ہر آنے والے کے بارے میں ہمیں معلومات فراہم کرتے رہے۔

"فلاں شادی شدہ ہے۔ فلاں فلرٹ ہے۔ فلاں آوارہ ہے۔ فلاں شریف ہے۔ فلاں کی یہ عادت ہے۔ فلاں اول نمبر کی دل پھینک اور عشق باز ہے۔"

ہم نے کہا "قدوس صاحب۔ آپ نے ان سب کے بارے میں اتنی ریسرچ کب اور کیسے کر لی؟"

بولے "بندہ نواز۔ آپ شاید بھول گئے کہ میں چار بار اس کلاس میں فیل ہو چکا ہوں۔ ان سب کے بارے میں معلومات مجھے ازبر ہیں۔ ان میں سے کئی کے ساتھ تو عشق کی

ہیں بھی بڑھا چکا ہوں۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "مگر آپ نے تو کہا تھا کہ آپ شادی شدہ ہیں؟"

"وہ تو ہیں مگر شادی عشق سے تو نہیں روکتی۔ دراصل میری بیوی مصروف بہت رہتی ہے۔ اسے میرے اسکینڈلز وغیرہ کے بارے میں چھان بین کرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ سات بجے سے ہمارے ریستوران کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور لوگ ناشتہ کرنے کے لیے آ جاتے ہیں اس کے بعد رات کو گیارہ بجے تک ریستوران کھلا رہتا ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ اس قدر مصروف اکلوتی بیوی کا شوہر فلرٹ وغیرہ نہ کرے تو کیا کرے؟"

"بچے وچے بھی ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ ان سے محروم ہوں ورنہ یہ آزادی کہاں ملتی۔ بندہ پرور۔ اگر کوئی ن صرف ایک بیوی کے ساتھ ہی انصاف کر لے تو بہت ہے۔ بچوں کے ساتھ انصاف نا تو پیغمبروں کی صفات ہیں۔"

"مگر آپ تو ایک بیوی کے ساتھ بھی انصاف نہیں کرتے۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا؟ اسے کھانا پکانے کا شوق ہے بلکہ دیوانگی ہے اور کاروبار کرنا کی ہابی ہے۔ میں نے یہ دونوں سہولتیں اسے فراہم کر دی ہیں۔ ایمان سے کہتا ہوں کہ ٹوں غیر حاضر رہنے کے بعد بھی جب ریستوران میں جاتا ہوں تو وہ اللہ کی بندی میری ف ذرا بھی توجہ نہیں دیتی۔ اسے تو کھانے پکانے اور حساب کتاب سے ہی فرصت نہیں ۔ بہت بدسلوکی کرتی ہے میرے ساتھ۔ میں پھر بھی شکوہ نہیں کرتا۔ صبر کر لیتا ہوں۔ ذرا باہر وقت گزارتا ہوں۔"

اتنی دیر میں کلاس بھرنی شروع ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تیس پینتیس کے قریب طلباء" اور "طالبات" نے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ کلاس کا ماحول بھی عجیب تھا۔ کوئی ریٹ پی رہا تھا۔ کوئی پائپ یا سگار سے شوق فرما رہا تھا۔ بعض خواتین و حضرات کوک یا بیئر نے میں مصروف تھے۔ باقی ماندہ چپس اور چیونگم سے شغل فرما رہے تھے۔ گویا خالی منہ کوئی ل نہیں بیٹھا تھا۔ ہمارے چپس تو ختم ہو چکے تھے مگر قدوس صاحب کے پاس چیونگم کا وافر ٹہ موجود تھا۔ چیونگم کھانا ان کی ہابی تھی۔ اس لئے وہ قسم قسم کے چیونگم اکٹھے کرنے کے قین تھے۔ میٹھا، کھٹا، نمکین، بالکل بے مزہ۔ کسی میں چاکلیٹ کی خوشبو تو کسی میں پیپر

منٹ کا ذائقہ۔ ہر قسم کا چیونگم پیش کرنے کے بعد وہ اس کے بارے میں ہماری رائے
دریافت کرتے تھے۔

"وہ گورے رنگ کی لمبی سی لڑکی دیکھ رہے ہیں آپ۔ ارے وہی جس کے بال پیڑ
پر پڑے ہیں؟" انہوں نے ہم سے سرگوشی کی۔

"ہاں۔"

"وہ یونانی ہے۔ انگریزی کے دو چار لفظوں سے زیادہ نہیں جانتی مگر عشق کرنے
ماہر ہے۔"

"انگریزی کے بغیر کیسے عشق کرلیتی ہے؟"

"بندہ پرور ایک اشاروں کی زبان بھی تو ہوتی ہے۔ جب سے اس نے ریستورا
خریدا ہے، تین بوائے فرینڈز اور دو شوہر بدل چکی ہے۔"

"کبھی آپ کو موقع نہیں ملا؟"

"دیکھئے صاحب۔ ہم زبان کی صحت پر بہت زور دیتے ہیں۔ جو عورت "ٹی" کو "تی
اور "ڈال" کو "دال" کہے وہ ہمارے معیار پر پوری نہیں اترتی۔"

اگلی صف میں دو کورین، ایک جاپانی اور ایک چینی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بار بار اٹھ
ایک دوسرے کی جانب جھک جھک کر تسلیم بجالاتے تھے۔

"بھئی یہ کیا کر رہے ہیں؟"

"یہ جاپانی، چینی لوگ ہیں۔ قدرت نے پیدائشی طور پر ان کے لئے گھر کی ورزش تج
کر دی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ تو سوتے میں بھی اسی طرح رکوع میں جاتے ر
ہیں مگر بہت ہوشیار ہیں۔ ہر سوال کا جواب جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پہلی بار میں
پاس ہو جائیں گے۔"

دو عرب آپس میں بہت گاڑھی عربی بول رہے تھے۔ عربی ایسی زبان ہے کہ اگر
صحیح لب ولہجے اور خوش الحانی سے بولے تو اس پر موسیقی کا گمان گزرتا ہے۔

قدوس صاحب نے کہا "یہ اچھی خاصی انگریزی جانتے ہیں مگر آپس میں ہمیشہ عربی
بولتے ہیں۔" اتنے میں ایک صاحب چھڑی کے سہارے لڑکھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئے
اور سب سے قریبی کرسی پر فروکش ہو گئے۔ دیکھنے میں وہ چینی لگتے تھے۔ عمر ستر

ک ہو گی۔ وہ ہر ایک کی جانب دیکھ کر مسکراتے تھے۔

"یہ مسٹر چوپون ہیں۔ نئے طالب علم ہیں۔ انہوں نے کل ہی سے آنا شروع کیا
"

ہم نے کہا "یہ تو خود ہی قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہیں۔ سپروائزر کا امتحان پاس کر کے کیا
گے؟"

بولے "دوسرے جہاں میں یہ ڈپلوما ان کے کام آئے گا۔ یہ بہت اونچا سنتے ہیں بلکہ
وں کی بات تو سنتے ہی نہیں۔ اپنی ہی ہانکتے رہتے ہیں۔ یہ بھلا کیا ریستوران چلائیں
گاہک سینڈوچ مانگے گا اور یہ پزا سپلائی کر دیں گے۔"

ٹھیک چار بجے باہر سے کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔ سب لوگ مودب ہو گئے۔
دروازے میں سے پہلے خوشبو کا ایک جھونکا اندر آیا اور پھر اس کے جلو میں ایک
صورت، خوش پوش اور خوب رو خاتون کلاس روم میں داخل ہوئیں۔

"ہائی۔ گڈ آفٹرنون" ان کی آواز بھی ان کے سراپا کی طرح دلکش تھی۔

سب نے کورس میں انہیں گڈ آفٹرنون کہا۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! میں نئے آنے والوں کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ کیا نئے لوگ اپنا
کرانا پسند کریں گے؟"

چند لوگوں نے باری باری کھڑے ہو کر اپنا نام اور اپنے ریستوران کا نام بتایا۔

"دیکھئے" انہوں نے مسکراتے ہوئے سب کو مخاطب کیا "یہ پندرہ روزہ کورس ہے اور
آسان ہے۔ اس کا مقصد کسی کو فیل کرنا نہیں بلکہ انہیں آنے والے وقت کے لئے
رنا ہے تاکہ وہ بہتر طریقے سے ریستوران چلا سکیں۔"

قدوس صاحب اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے، بولے "اور میرے بارے میں کیا
ہے؟"

"آپ کو کیا ہوا؟"

"میں چار بار فیل ہو چکا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگی "آپ تو شوقیہ فیل ہوتے ہیں۔ فیل ہونا شاید آپ کی ہابی ہے۔"

سب ہنسنے لگے۔

"ہماری کورس کی کتاب بہت مختصر سی ہے۔ میں ہر روز آپ کو ایک باب پڑھاؤں گی۔ باقی سات دن آپ لوگ خود دہرایا کریں گے۔ پندرہ دن کے بعد امتحان ہو گا' اوکے؟"

"اوکے" سب نے کورس میں کہا۔

چینی بڑے میاں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا "امتحان کتنے دن بعد ہو گا؟"

"پندرہ دن بعد" اس نے ان کے کان کے پاس منہ لے جا کر بلند آواز میں کہا۔

"سمجھ گیا مگر کلاس کتنی دیر تک ہوا کرے گی؟"

"صرف ایک گھنٹے۔" اس نے دوبارہ ان کے کان کے پاس منہ لے جا کر اونچی آواز میں کہا۔

قدوس صاحب کہنے لگے "بڑے میاں کی چالاکی دیکھی آپ نے۔ بس یہ اس طرح سوال کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ مس ڈورا ان کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر جواب دیتی رہیں۔"

"مس ڈورا۔ یہ ان ٹیچر کا نام ہے؟"

"اصولاً تو مس ڈوری ہونا چاہئے تھا مگر انگریزی میں مذکر اور مونث پر اتنا زور نہیں دیتے۔"

مس ڈورا کی عمر تیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ خاصی طرح دار اور دلکش خاتون تھیں۔

"کمال ہے" ہم نے کہا "یہ ابھی تک مس ہیں؟"

"مگر غیر شادی شدہ نہیں ہیں۔ دو بار شادی کر چکی ہیں۔ تیسری شادی کے انتظار میں ہیں۔"

اس اثناء میں مس ڈورا نے لیکچر شروع کر دیا تھا۔ مضمون تو نہایت خشک اور بدمزہ تھا مگر مس ڈورا کی رسیلی آواز' شائستہ لب و لہجہ اور دلنشین انداز بیاں نے سماں باندھ دیا۔ ان کی انگریزی بہت خوب صورت تھی اور لب و لہجہ خالص امریکی۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سب ان کی آواز کے سحر میں گرفتار ہو گئے ہیں۔

یکایک برابر سے قدوس صاحب نے ہمارے کان میں کہا "کلاس ختم ہونے کے بعد آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

ہم نے کہا "کچھ نہیں۔ واپس ریستوران جائیں گے۔"

"ارے بندہ پرور۔ گولی ماریئے ریستوران کو۔ ہم آپ کو ۹ ویں اسٹریٹ کی دنیا ائیں گے۔ ورنہ آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ کنوئیں کے پاس جا کر پیاسے ہی لوٹ ے۔"

مس ڈورا کی آواز سنائی دی۔ "اگر کوئی سوال دریافت کرنا چاہے تو بڑی خوشی سے کر ہے۔"

قدوس صاحب ایک بار پھر کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ "مس۔ ہماری کلاس صرف گھنٹے کیوں جاری رہتی ہے۔ دو گھنٹے تک کیوں نہیں چلتی؟"

مس ڈورا نے بڑی سنجیدگی سے کہا "اس لئے کہ اس کے بعد مجھے کہیں اور جانا پڑتا اور کوئی سوال؟"

سب خاموش رہے۔ مس ڈورا نے بڑے دلکش انداز میں مسکرا کر شکریہ ادا کیا' کلاس ہونے کا اعلان کیا اور کھٹ کھٹ کرتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔

اور کمرے کی آدھی رونق غائب ہو گئی۔

قدوس صاحب نے اپنی بھاری بھرکم کہنی ہماری پسلیوں میں ماری اور کہا "چلئے بندہ ۔ اب ہماری اور آپ کی کلاس کا وقت شروع ہوتا ہے۔"

ہم دونوں تیسری منزل سے اتر کر باہر ۹ ویں اسٹریٹ پر پہنچ گئے۔

☆ ☆ ☆

لفٹ سے باہر نکلتے ہوئے قدوس صاحب نے ہم سے کہا۔ "بندہ نواز' یہ ۹ کا ہندسہ میرے لئے ہمیشہ منحوس رہا ہے۔ میرا بس چلے تو اسے گنتی سے ہی خارج کر دوں مگر مجبور ہوں' کیا کروں' اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا حاصل کروں؟"

ہم نے انہیں ہمدردی سے دیکھا۔ تیرہ کا ہندسہ تو اکثر لوگ منحوس سمجھتے ہیں اور یورپ و امریکا میں تو بہت سے ہوٹلوں میں تیرہ نمبر کا کمرا ہی نہیں ہوتا مگر نو نمبر کے ساتھ وابستہ یہ روایت ہم نے پہلی بار ہی سنی تھی۔

ہم عمارت سے باہر نکل کر فٹ پاتھ پر آئے تو دور تک پھیلی ہوئی ۹ ویں اسٹریٹ ہمارے سامنے رواں دواں تھی۔ ۹ ویں اسٹریٹ کا معاملہ یہ ہے کہ اس کا کچھ حصہ کاروباری مقاصد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کچھ حصہ معقول قسم کے کاموں میں استعمال ہوتا ہے جیسے کہ جارج ٹاؤن یونیورسٹی کا ایک حصہ بھی اس سڑک پر موجود تھا۔ لیکن اس سے ذرا آگے چلیں تو ۹ ویں اسٹریٹ کا بدنام حصہ شروع ہو جاتا ہے۔

قدوس صاحب بولے "کیا بتاؤں۔ یہ انتہائی بے ہودہ سڑک ہے۔ دنیا کی کوئی لغو حرکت ایسی نہیں ہے جو یہاں نہ ہوتی ہو اور لطف دیکھئے کہ قانون کی نگاہوں کے سامنے ہوتی ہے۔"

۹ ویں اسٹریٹ کے عقب سے نکلیں تو ۷ ویں اسٹریٹ کا کچھ حصہ بھی بقول قدوس صاحب کے ان ہی "لغویات" کے لئے وقف تھا۔ ۹ ویں اسٹریٹ پر وہ سب لوازمات موجود ہیں جو ایسی جگہوں پر ہوتے ہیں۔ نائٹ کلب' فحاشی کے اڈے۔ جوئے خانہ' شراب خانے' سیکس شاپس' ویڈیو شاپس' پیپ شوز' قحبہ خانے' مساج گھر' فحش فلموں کی نمائش کرنے والے سینما گھر۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے علاقے یورپ اور امریکا کے دوسرے شہروں میں

بھی پائے جاتے ہیں بلکہ ان کا ایک لازمی حصہ سمجھے جاتے ہیں لیکن واشنگٹن ڈی سی کی ۹ ویں اسٹریٹ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کالے کافی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ گورے بھی ہیں اور دوسری نسلوں کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں مگر اکثریت کالوں کی ہے۔ کالوں سے لوگ یوں بھی ذرا خائف رہتے ہیں اس لئے ۹ ویں اسٹریٹ کا بزنس کچھ زیادہ شاندار نہیں ہے۔ جو لوگ یہاں آتے بھی ہیں تو ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے۔ اگر آپ ۹ ویں اسٹریٹ سے اپنے کام کاج کے سلسلے میں گزر جائیں تو کچھ بھی نہ ہو گا لیکن اگر آپ سیاح ہیں' اس علاقے کی رنگینیوں کی تلاش میں گئے ہیں تو تاڑنے والے آپ کو تاڑ لیتے ہیں اور پھر آپ ان کے نرغے میں آ جاتے ہیں۔ پھر آپ ان لوگوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ سادہ لوح اور اناڑی لوگ تو اپنا سب کچھ لٹا بیٹھتے ہیں اور پھر پچھتاتے ہیں کہ یہاں جھک مارنے کیوں آئے تھے مگر اشتیاق کے مارے دوسری بار بھی جاتے ہیں اور دوسرے انداز میں لوٹ لئے جاتے ہیں۔

یہاں اگر کوئی سب سے زیادہ محفوظ جگہ ہے تو وہ ننگی فلمیں دکھانے والے سینما گھر ہیں۔

قدوس صاحب نے کہا۔ "دیکھئے جناب' یہ سینما آپ کا اخلاق خراب کرنے سے زیادہ اور کچھ نہیں کرتے اور اخلاق کے خراب ہونے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک ہی فلم دیکھنے کے بعد آپ اخلاقی خرابی کی آخری حد کو پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے سوا اور کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ بلکہ بہت سے لوگ تو ان مناظر کو دیکھ کر متنفر ہو جاتے ہیں اور ان کا سارا اشتیاق ہی ختم ہو جاتا ہے۔"

"اس کے علاوہ اور کیا نقصان ہوتا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ کوئی آپ کی جیب کاٹ لے یا آپ کسی کال گرل کے ہتھے چڑھ جائیں مگر اس میں کوئی زور یا زبردستی نہیں ہوتی۔ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ مگر دوسری جگہوں پر تو آپ کی الٹے استرے سے کھال اتاری جاتی ہے۔ مثلاً نائٹ کلب۔ یہ تو لوٹ مار کے اڈے ہیں۔ فضول قسم کے ننگے ناچوں اور بے ہودہ مناظر کے سوا یہاں کچھ نہیں ہوتا۔ پتا نہیں لوگ کیوں بار بار ان کلبوں میں جاتے ہیں۔ اندر داخل ہوتے ہی نیم عریاں لڑکیاں گھیر لیتی ہیں اور ایسی پیار بھری باتیں کرتی ہیں

جیسے آج تک وہ آپ ہی کے انتظار میں کلب میں بیٹھی راہ تک رہی تھیں۔ پھر وہ آپ کو گھیر لیتی ہیں اور مہنگی شراب منگواتی ہیں۔ ایک تو شراب مہنگی' اس پر کلب کے اندر اس کی قیمت اور زیادہ ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس میں پانی کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ بندہ پرور' ایک بات اپنے تجربے کی بناء پر بتاتا ہوں۔ امریکا میں کھانے پینے کی کسی چیز میں ملاوٹ کا تصور ہی نہیں ہے۔ اگر ملاوٹ ہوتی ہے تو صرف شراب میں اور وہ بھی گاہک کو سپلائی نہیں کی جاتی بلکہ جو لڑکیاں آپ کو گھیر کر بیٹھی ہوتی ہیں انہیں خوب ملاوٹ زدہ شراب فراہم کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ مچھلی کی طرح پیتی رہتی ہیں اور نشہ خاک بھی نہیں ہوتا۔ آپ کا بل البتہ بڑھتا رہتا ہے۔"

ہم نے پوچھا۔ "قدوس صاحب' آپ بھی شراب سے شوق فرماتے ہیں؟"

بولے۔ "شوق تو نہیں ہے۔ کبھی کبھی کلب میں پھنس جاتا ہوں تو اخلاقاً" دوسری لڑکیوں کے لئے منگانی پڑتی ہے۔ اجی کیا عرض کروں۔ بس گناہ بے لذت ہے۔ یہ سامنے والا کیسینو آپ دیکھ رہے ہیں جہاں روشنیاں جگمگا رہی ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی بالکل دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ جواریوں کی قتل گاہ ہے۔ یہاں کئی قسم کا جوا ہوتا ہے مگر چالاکی یہ ہے کہ کبھی گاہک نہیں جیتتا۔ ہارتا ہی رہتا ہے۔ اگر کوئی قسمت کا دھنی کبھی کبھار جیت جائے تو اسے رقم لے کر باہر نکلنے کی مہلت نہیں ملتی' باہر گلی میں ہی لوگ اسے پستول دکھا کر لوٹ لیتے ہیں اور زدوکوب بھی کرتے ہیں۔ غضب خدا کا' یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

قدوس صاحب نے ہمیں ۹ ویں اسٹریٹ کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ چند سڑکیں کراس کرنے کے بعد چودھویں اسٹریٹ تھی۔ یہاں بھی قریب قریب یہی حالات ہیں جو ۹ویں اسٹریٹ پر پائے جاتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ سب کچھ وہی ہے صرف نمبر کا فرق ہے۔ آپ فٹ پاتھ سے گزر رہے ہیں کہ سامنے ایک دروازہ کھلتا ہے اور عریاں و نیم عریاں خواتین آپ کو دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگتی ہیں اور اشارے بھی کرتی ہیں۔ آپس میں چہلیں بھی کرتی رہتی ہیں۔ قانون کی رو سے وہ اس حلیے میں سڑک پر نہیں نکل سکتیں۔ مگر دروازہ کھول کر بھی وہی مقصد حاصل کر لیتی ہیں بلکہ اکثر تو ایک دوسرے سے مذاق کرتے ہوئے دھکم پیل کرتی ہیں تو کوئی ننگی دھڑنگی خاتون باہر فٹ پاتھ پر بھی پہنچ جاتی ہے۔ یہ ہم آپ کو

بتا چکے ہیں کہ یہ علاقہ کالوں سے مخصوص ہے۔ کاروبار کے مالک تو گورے بلکہ زیادہ تر یہودی ہیں مگر ان کے کارندے کالے ہیں۔ اس لئے پولیس بھی صرف نظر کرتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہیروئن اور میری جوانا کس جگہ فروخت ہوتی ہے مگر کھلی چھٹی ہے۔ امریکی جرائم پیشہ لوگوں کو بہت حد تک تحفظ قانون نے دیا ہے۔ شخصی حقوق' آئینی حقوق' انسانی حقوق کے نام پر وہ پولیس اور قانون سے بچ نکلتے ہیں۔ ٹھوس ثبوت کے بغیر انہیں پولیس گرفتار نہیں کر سکتی۔ انہیں مار پیٹ کر اقرار جرم نہیں کرا سکتی۔ بلاوجہ انہیں اندر بند نہیں کر سکتی چھوٹے موٹے ثبوت کی بناء پر اگر پکڑے بھی جائیں تو ان کے وکیل موجود ہیں جو انہیں فوراً ضمانت پر رہا کرا لیتے ہیں۔ اس لئے جرائم خوب عروج پر ہیں اور پھر جو سزا پاتے ہیں وہ بھی ہمارے حساب سے خاصے خوش قسمت ہوتے ہیں۔ جیلوں میں بڑے آرام سے رہتے ہیں۔ یوں لگتا ہے تفریحاً" چھٹیاں گزارنے وہاں گئے ہیں۔ بڑے بڑے خطرناک مجرموں کو پیرول پر رہا کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے گھر والوں سے مل آئیں۔ وہ گھر والوں کے پاس جانے کے بجائے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دو چار نئے جرم کر لیتے ہیں پھر' اب تو بعض ریاستوں کی جیلوں میں قیدیوں کے لئے سہولتیں اور بڑھا دی گئیں ہیں۔ وہ اپنی بیگمات اور گرل فرینڈز سے ملاقات کرنے کے لئے بھی آزاد ہیں۔ نوعمر لڑکے اگر جرائم کرتے ہیں تو سنگین ترین جرائم پر بھی انہیں "اصلاحی جیل" میں بھیج دیا جاتا ہے۔ قاتل بچوں کو قانون نے تحفظ دے رکھا ہے۔ انہیں سزائے موت یا عمر قید کی سزا نہیں ہو سکتی۔ دوسرے لفظوں میں یہ ملک مجرموں کی جنت ہے۔ ہمارے ملک میں بعض پولیس والے اور انتظامیہ کے لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ صاحب جرائم تو ساری دنیا میں ہو رہے ہیں۔ یورپ اور امریکا کو دیکھ لیجئے۔ وہاں کتنے قتل' حادثے' لوٹ مار کی وارداتیں اور دوسرے جرائم ہوتے ہیں تو پھر اگر ہمارے ہاں ہو جاتے ہیں تو کیا قیامت ہے؟ مگر وہ لوگ جان بوجھ کر ڈنڈی مارتے ہیں کیونکہ ہماری پولیس کو محض شبہ میں لوگوں اور ان کے گھر والوں کو گرفتار کر کے ان پر تشدد کرنے کی جو آزادی حاصل ہے وہ امریکی پولیس والوں کے نصیب میں کہاں؟ ہماری پولیس کو جو اختیار حاصل ہے اگر ایسے اختیارات امریکی پولیس کو حاصل ہوں تو وہاں کا نقشہ ہی بدل جائے۔ وہاں الٹی گنگا بہتی ہے۔ مجرم کھلے پھرتے ہیں اور پولیس والوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ یعنی بقول فیض

ع که سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

۹ ویں اسٹریٹ اور چودھویں اسٹریٹ پر ہم نے جو کچھ دیکھا اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ البتہ قدوس صاحب نے اپنے چند واقعات سنائے جن میں کچھ نیا پن ضرور تھا۔

ہم نے ان سے پوچھا۔ "جب آپ کو اتنے تلخ تجربات ہو چکے ہیں تو آپ اس طرف آتے کیوں ہیں؟"

بولے۔ "بندہ پرور۔ کون آتا ہے؟ میں تو لعنت بھیجتا ہوں ان پر۔ آج کل تو امتحان کے چکر میں آجاتا ہوں۔ کبھی کبھی زخم تازہ کرنے بھی چلا آتا ہوں۔"

سامنے کے ایک ریستوران میں داخل ہو کر قدوس صاحب نے کافی اور کیک کا آرڈر دیا۔ یوں تو غالباً وہاں کا سارا ہی عملہ ان سے واقف تھا مگر جو البیلی ویٹریس ان سے آرڈر لینے آئی ان سے قدوس صاحب خاصے بے تکلف نظر آتے تھے۔ کہنے کو یہ خاتون ایک ریستوران کی ویٹریس تھیں لیکن لباس اور انداز کے اعتبار سے کسی نائٹ کلب کی رقاصہ نظر آتی تھیں۔ ان کا لباس دیکھ کر وہ شعر یاد آگیا کہ

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قیمت غالب
جس کی قسمت میں ہے عاشق کا گریباں ہونا

اس شعر میں ضرورت کے مطابق تبدیلی کیجئے۔ یہ کپڑا پورا چار گرہ بھی نہیں تھا البتہ اگر تین ڈوریوں اور گلے میں بندھی ہوئی نازک سی بوٹائی کو بے شمار کر لیا جائے تو چار گرہ کی شرط پوری ہو جائے گی۔ صورت شکل کے اعتبار سے بھی وہ نائٹ کلب میں کام کرنے کے لائق ہی تھی مگر نائٹ کلب میں کام کرنا انہیں پسند نہیں تھا کیونکہ بقول ان کے وہ "باعزت" دھندا نہیں تھا۔

ہم نے پوچھا۔ "آپ کے موجودہ کام میں اور نائٹ کلب کی ملازمت میں کیا فرق ہے؟"

بولیں۔ "موجودہ کام میں مجھ سے صرف ویٹریس بننے کی توقع کی جاتی ہے جب کہ نائٹ کلب میں کام کرنے والی عورتوں سے لوگ کوئی بھی فرمائش کر سکتے ہیں۔"

ہمیں ان کی شرافت اور عزت نفس بہت پسند آئی تو قدوس صاحب نے ٹوک دیا۔
کہنے لگے۔ "بلاوجہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ یہ بھی کوئی شرافت کی پیکر نہیں

ہیں۔ صرف اتنا فرق ہے کہ یہ محض پیسے کی خاطر ہر ایک سے دوستی نہیں بڑھاتیں۔ جی میں آئے تو جس پر چاہے مہربان ہو جائیں۔"

ہم نے کہا۔ "کیسی خوش شکل اور خوش ادا خاتون ہیں' اگر شادی کر کے گھر بسا لیتیں تو کتنی اچھی زندگی گزر سکتی تھی۔"

قدوس صاحب ہنسنے لگے۔ "بندہ پرور۔ شادیوں کی نہ پوچھئے۔ شادیاں انہوں نے ان گنت کی ہیں۔ کم از کم ایک درجن تو ضرور کی ہوں گی۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ "اتنی کم عمر میں اتنی زیادہ شادیاں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟"

بولے "ان کی شادیوں کی عمر بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ ایک شادی تو صرف ساڑھے پانچ گھنٹے تک قائم رہی تھی۔ ان کی طویل ترین شادی کا عرصہ آٹھ ماہ تھا۔"

"مگر آپ کو اتنی زیادہ تفصیلات کا علم کیسے ہوا؟"

بولے "بات یہ ہے کہ میرے دو دوستوں نے بھی اس سے شادی کی تھی۔ بلکہ اس کے آخری شوہر بھی میرے ایک جاننے والے تھے۔ جب چھ ماہ کے بعد اس نے طلاق کا مطالبہ کر دیا تو وہ بہت حیران ہوئے اس لئے کہ بظاہر دونوں ہنسی خوشی رہا کرتے تھے اور بیوی کو شوہر سے کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔

انہوں نے پوچھا۔ "آخر تم طلاق کیوں حاصل کرنا چاہتی ہو؟"

جواب دیا۔ "بس دل چاہ رہا ہے۔"

"وہ اسے لے کر ایک ماہر نفسیات کے پاس بھی گئے۔ ماہر نفسیات اس کا علاج تو کیا کرتے' خود شادی کے امیدواروں میں ضرور شامل ہو گئے۔ اس کا نام سوزی ہے اور یہ عجیب و غریب عورت ہے۔ اسے ذلت یا شہرت سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس شوہر تبدیل کرنے کی بیماری ہے۔"

ذرا سوچئے تو۔ اللہ نے دنیا میں کیسی کیسی عجیب بیماریاں بنائی ہیں۔

اتنی دیر میں سوزی ہمارے لئے کافی کیک اور پنیر لے کر آگئی اور جب قدوس صاحب نے تعارف کروایا کہ یہ ہمارے دوست ہیں تو وہ بہت خوش اخلاقی سے پیش آئی۔ بہت معذرت کی کہ آپ سے ملاقات کے وقت مناسب لباس زیب تن نہیں کر سکی ہوں لیکن

مجبوری ہے۔ ریستوران کی یونیفارم ہی یہی ہے۔

ہم نے خوش ہو کر پوچھا۔ "کیا آپ کو اس قسم کا لباس پسند نہیں ہے؟"

کہا۔ "ظاہر ہے جو لباس آپ کو زبردستی پہننا پڑے وہ پسند کیسے آ سکتا ہے۔"

"مطلب یہ ہے کہ آپ عریاں لباس پسند نہیں کرتیں؟"

"عریانی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی لباس تو ایک فالتو چیز ہے۔ پہنا پہنا' نہ پہنا نہ پہنا۔"

لیجئے۔ ہم کیا سمجھ رہے تھے اور وہ کیا نکلیں۔

قدوس صاحب نے کافی پیتے ہوئے ہمیں کچھ اپنے واقعات سنائے اور وارننگ دی کہ آپ اس قسم کے واقعات سے پرہیز کیجئے گا۔

"مثلاً"

"مثلاً یہ کہ آس پاس کی سنسان سڑکوں پر کبھی نہ جائیں۔ میں ایک بار شام کو چھ بجے کے قریب ایک سائیڈ روڈ سے گزر رہا تھا کہ سامنے ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکی نظر آئی۔ وہ لفٹ حاصل کرنے کے لئے اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے کار روک دی۔ وہ لڑکی فوراً دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"سامنے والی سڑک کی طرف چلیں۔ میں آگے جا کر اتر جاؤں گی۔"

میں نے کار آگے بڑھا دی۔ وہ بلاک گزرنے کے بعد لڑکی نے اچانک اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹا سا پستول نکال لیا۔

"گاڑی ایک طرف روک لو۔"

میں سمجھا مذاق کر رہی ہے۔ اتنی چھوٹی سی لڑکی کو بھلا پستول سے کیا کام۔

"میں کہتی ہوں روک دو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں نے سڑک کی ایک جانب کار روک دی۔

"جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ فوراً میرے حوالے کر دو۔"

مجھے یقین نہیں آیا مگر کوئی چارہ بھی نہ تھا' میں نے ساری نقدی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔

"گھڑی اور انگوٹھی بھی دے دو۔" اس نے ڈانٹ کر کہا۔

میں نے گھڑی اور انگوٹھی بھی اتار دی مگر اس کی بے پروائی سے فائدہ اٹھا کر میں نے جھپٹ کر پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ایک لمحہ کے لئے تو وہ حیران ہی رہ گئی۔

"میرے پیسے اور انگوٹھی واپس کر دو۔" میں نے اسے رعب دیا۔

وہ بے تحاشا ہنسنے لگی۔ "کتنے بے وقوف ہو۔ چپ چاپ پستول میرے حوالے کر دو اور مجھے کار سے اتار دو۔ ورنہ میں شور مچا دوں گی کہ تم مجھے بے آبرو کرنا چاہتے ہو۔"

میرا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر وہ شور مچائے گی تو آس پاس اس کے ساتھی بھی ہوں گے جو فوراً اس کی مدد کے لئے آ جائیں گے۔ دوسرے لوگ بھی اس کی حمایت کریں گے اور پولیس بھی میری بات پر دھیان نہیں دے گی۔ ان معاملات میں عورتوں کی زیادہ سنی جاتی ہے۔ مجبوراً میں نے اس کا پستول اس کے حوالے کیا اور اسے چپ چاپ کار سے اتر کر اپنی راہ لی۔ ایسے واقعات یہاں عام طور پر پیش آتے ہیں۔ کبھی مرد لوٹ لیتے ہیں۔ کبھی عورتیں لوٹ لیتی ہیں۔ جو لوگ عیاشی کے ارادے سے یہاں آتے ہیں اور وہ بھی لوٹ لئے جاتے ہیں۔"

"یہ اتنی خطرناک جگہ ہے تو لوگ یہاں آتے کیوں ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"اپنے شوق کی خاطر آتے ہیں اور انہیں ان حقائق کا علم بھی نہیں ہوتا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جو لوگ یہاں سے لٹ کر جاتے ہیں وہ کسی کو بتاتے بھی نہیں ہیں۔ میں نے تو پھر بھی آپ کو کچھ واقعات بتا دیئے ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "شکریہ۔ بہت دیر ہو گئی۔ اب ہمیں اپنے ریستوران واپس بھی جانا ہے۔"

"بڑے شوق سے جائیں۔ میں نے آپ کو ۹ ویں اسٹریٹ کی سیر کرا دی ہے۔ دوبارہ پھر کبھی اس کی سیر کا شوق لے کر اکیلے نہ نکلنا۔"

☆ ☆ ☆

ریستوران پہنچے تو وہاں محمد علی ہمارے منتظر تھے۔ "مسٹر او فوقی آج آپ نے بہت دیر لگا دی۔ کیا کلاس بہت لمبی ہو گئی تھی؟"

"نہیں ہم ذرا ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔"

وہ شوخی سے مسکرائے۔ "ذرا خیال رکھنا۔ وہ اکیلے گھومنے والا علاقہ نہیں ہے۔ خاص طور پر اجنبی لوگوں کے لئے۔"

تیسرے دن ہمیں کورٹ ہاؤس سے رجسٹری مل گئی جسے لے کر ہم فوراً دفتر پہنچ گئے۔ یہ دفتر پانچویں منزل پر تھا۔ ایک سیاہ فام خوبصورت خاتون اس کی انچارج تھیں۔ ہم نے کاغذات ان کے سامنے رکھ دیئے اور کہا کہ فوراً سرٹیفکیٹ بنا دیجئے۔

وہ مسکرانے لگیں۔ "اتنی جلدی بھی کیا ہے؟"

ہم نے بتایا کہ ہم نے تین مہینے سے سرٹیفکیٹ نہیں لیا ہے اگر ہیلتھ انسپکٹر کو کل تک نہ دکھایا تو ہمیں جرمانہ ہو جائے گا۔

"ان باتوں پر جرمانہ نہیں ہوتا۔ غلطیاں انسانوں ہی سے تو ہوتی ہیں بلکہ دیر سے سرٹیفکیٹ بنوانے کا ہمیں فائدہ یہ ہو گا کہ آپ سے جرمانہ بھی وصول کیا جائے گا۔"

انہوں نے ہماری رجسٹری اور دیگر کاغذات پر نظر ڈالی پھر بولیں۔ "۵۳ ڈالر برابر والے کمرے میں کیشیئر کے پاس جمع کرا دیں۔"

ہم کیشیئر کے پاس پہنچے۔ وہ بھی ایک خاتون تھیں مگر معمر اور سفید فام۔ ہم سے پہلے ایک چینی صاحب ان کے پاس موجود تھے اور اپنی قومی زبان میں بہت طولانی تقریر کر رہے تھے۔ بے چاری خاتون ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی سمجھنے سے قاصر تھیں۔ آخر انہوں نے بڑی مشکل سے ایک ایسی چینی خاتون کو تلاش کیا جو انگریزی بھی جانتی تھیں۔

"مادام' یہ صاحب پچھلے پندرہ منٹ سے بولے جا رہے ہیں مگر میں ایک لفظ بھی نہیں سمجھی۔ کیا آپ ان سے دریافت کر کے مجھے بتا سکتی ہیں۔ کہ یہ اتنی دیر سے کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

چینی خاتون نے پہلے تو سر جھکا کر انہیں تعظیم دی جس کے جواب میں انہوں نے بھی کمر تک جھک کر تعظیم دی اور سر جھکانے کا یہ سلسلہ دو تین منٹ تک جاری رہا۔ اس کے بعد مادام نے چینی زبان میں ایک فقرے میں ان کا مسئلہ دریافت کیا۔ چینی بزرگ نے بھی صرف ایک ہی فقرے میں انہیں جواب دیا تھا۔ انگریزی ترجمہ انہوں نے کیشیئر کو سنا دیا۔
اتنی دیر سے وہ ان سے یہ کہے جا رہے تھے کہ مجھے جلدی ہے۔ مجھے جلدی فارغ کر دیجئے۔

حالانکہ اس فرمائش کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس وقت کیشیئر کے پاس ان کے سوا کوئی اور شخص موجود نہ تھا اور اگر وہ اپنی بے معنی گفتگو کا سلسلہ شروع نہ کرتے تو کب کے فارغ ہو چکے ہوتے۔ انہیں فراغت پانے میں صرف ایک منٹ صرف ہوا۔ اس کے بعد ہماری باری آئی۔ ہم نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے کاغذات اور ۵۳ ڈالر کا چیک ان کے سامنے رکھ دیا جو انہوں نے شکریے کے ساتھ قبول کرنے کے بعد ہمارے کاغذات ہمارے حوالے کر دیے۔ وہ تو رخصت ہو گئیں اور ہم انتظار میں کھڑے رہے کہ وہ ہمیں رسید دیں تو ہم رخصت ہوں۔ ہمیں بدستور منتظر دیکھ کر وہ پھر ہمارے پاس آئیں۔

"میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں سر؟"

"ہم نے کہا۔ "آپ نے ہمیں رسید نہیں دی۔"

وہ مسکرانے لگیں۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ جا کر اپنا سرٹیفکیٹ وصول کر لیجئے۔"

ہمیں مزید حیرانی اس وقت ہوئی جب سیاہ فام خاتون نے رسید دیکھے کے بغیر سرٹیفکیٹ ہمارے حوالے کر دیا۔ خدا جانے انہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہم واقعی فیس جمع کرا آئے ہیں۔ سرٹیفکیٹ ہمارے حوالے کرتے ہوئے وہ بولی۔ "اس کی میعار ایک ماہ بعد ختم ہو جائے گی۔"

"تو پھر اس کی تجدید کیسے ہو گی۔ کیا کوئی درخواست دینی ہو گی اور ہمیں خود یہاں آنا پڑے گا؟"

"بالکل نہیں۔" انہوں نے کہا۔ "اپنا یہ سرٹیفکیٹ اور ایک عدد چیک ڈاک کے ذریعے بھیج دیجئے گا تیسرے دن آپ کو نیا سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔"

اتنا مشکل کام اور اس قدر آسان ہم تو حیران ہی رہ گئے۔

دراصل دفتری کام امریکا میں زیادہ نہیں ہوتے۔ بہت کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے حکومت سے رجوع کرنا پڑتا ہے اور وہ بھی منٹوں میں ہو جاتے ہیں کیونکہ سرکاری اہلکار انتہائی فدویانہ انداز میں پیش آتے ہیں اور خود کو صحیح معنوں میں "پبلک سرونٹ" ہی سمجھتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں کوئی سرکاری ملازم صاحب بہادر سے کم نہیں ہوتا۔

اگلے پندرہ روز تک ہم "سپروائزر" کی کلاس میں شریک ہوتے رہے۔ اس دوران

میں ہمیں ریستوران کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ البتہ امریکا میں باہر سے آنے والے لوگوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ یورپ کے مقابلے میں امریکا ایک بالکل مختلف ملک ہے۔ وہاں تو اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ وہاں جو بھی جا کر آباد ہو وہ مقامی زبان ضرور سیکھے۔ اس کے بغیر گزارا ممکن نہیں ہے۔ یہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ فرانس میں فرانسیسی' اٹلی میں اطالوی' جرمنی میں جرمن اور ہالینڈ میں ڈچ زبان جانے بغیر آباد ہو جائیں اور روزمرہ کے کام بھی چلائیں۔ ان ملکوں میں عام زندگی میں قومی زبان بولی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ باہر سے آنے والے سیاحوں سے بھی اسی زبان میں بات چیت کی جاتی ہے۔ یہ ہم آپ کو بتا ہی چکے ہیں کہ یورپ والے اس معاملے میں بہت متعصب ہیں۔ جان بوجھ کر انگریزی جاننے والوں کو بھی باقاعدہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے تو ہم نے یہ محسوس کیا کہ یورپ کے دوسرے تمام ملک اس زبان کو پسند نہیں کرتے۔ فرانس والے خاص طور پر بہت انتہا پسند ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ قومی زبان کے سوا کوئی دوسری زبان سائن بورڈ میں بھی نہ لکھی جائے۔ فرانس میں اب یہ قانون بن چکا ہے کہ کوئی بھی غیر ملکی فلم مقامی زبان میں ڈب کیے بغیر سینما میں نہیں چل سکتی۔ یہ احتیاط اور تعصب ایک ترقی یافتہ ملک میں برتا جا رہا ہے اور دنیا کا کوئی ملک انہیں اس بات پر الزام نہیں دیتا۔ ایک صرف ہم ہی ایسی قوم ہیں جو اپنی قومی اور سرکاری زبان کو چھوڑ کر دوسری زبانوں کو ترجیح دیتے ہیں اور اس بات پر فخر کرتے ہیں۔ اردو میں چاہے کوئی کتنا ہی عالم فاضل کیوں نہ ہو اسے جاہل ہی سمجھا جاتا ہے جب تک وہ انگریزی زبان سے آشنا نہ ہو۔

امریکا کا معاملہ یورپ کے برعکس ہے۔ یہاں دنیا بھر کے ملکوں سے لوگ کشاں کشاں آتے ہیں اور اپنے ساتھ اپنی زبانیں اور اپنا کلچر بھی لاتے ہیں۔ کہنے کو امریکا کی زبان انگریزی ہے اور سبھی امریکی ایک جیسے تلفظ اور لب و لہجہ میں انگریزی بولتے ہیں۔ سوائے کالوں کے جن کا تلفظ اور لب و لہجہ گوروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ امریکا میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد ہر شخص کا ایک ہی جیسا تلفظ ہو جاتا ہے مگر آفرین ہے کالوں پر کہ وہ اس سے بالکل متاثر نہیں ہوتے۔ ان کی زبان' طریقہ اظہار' انداز گفتگو' لب و لہجہ سبھی کچھ گوروں سے مختلف ہے۔ یہاں تک کہ وہ امریکی کلچر سے بھی بہت حد تک دور ہیں۔ یہ بات ان کے حق

میں جاتی ہے کہ امریکی کلچر جو دنیا بھر کے ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے یہاں تک کہ اب تو روس اور مشرقی یورپ بھی اس کی گرفت میں ہے' اس کلچر سے کالے محفوظ ہیں۔ ان کا کلچر' لباس' رہن سہن' بول چال' طور طریقے سبھی مختلف ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امریکی اپنی زبان یا کلچر کے معاملے میں متعصب اور کٹرپن کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ کوئی اپنے لہجے میں انگریزی بولتا ہے تو وہ برا نہیں مانتے' کوئی اپنے قومی اور نسلی کلچر کو اپناتا ہے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ہم نے امریکا میں ایسے لوگ بھی دیکھے جو بیسیوں سال سے وہاں رہتے ہیں مگر انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔ ہسپانوی' میکسیکن' مشرقی یورپ کے لوگ' عرب' اطالوی' چینی' جاپانی' کوریائی ہر نسل کے لوگوں میں انگریزی سے نابلد لوگ کافی تعداد میں مل جائیں گے۔ نئی پود البتہ امریکی تہذیب اور زبان سے بہرہ ور ہو گئی ہے اور امریکیوں کو یہی اطمینان ہے کہ جو شخص ایک بار امریکا میں آ کر آباد ہو گیا ہے آخر وہ کب تک امریکی تہذیب اور زبان سے دامن بچائے گا۔ اس رواداری اور کشادہ خیالی کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ امریکا تو باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی آبادی ہے۔ یہاں کے مقامی باشندے تو ریڈ انڈین تھے جو بے چارے ٹھکانے لگائے جا چکے ہیں۔ باقی سب لوگ مختلف ملکوں سے آئے اور اپنی قومی و نسلی عادات و اطوار بھی اپنے ساتھ لائے۔ عام بول چال کی زبان انگریزی ضرور ہے مگر دوسری زبانیں بھی یہاں بولی جاتی ہیں۔ خاص طور پر ہسپانوی۔ لاطینی امریکا سے آنے والوں کی یہی زبان ہے اور بعض امریکی ریاستوں میں ہسپانوی کو بھی باقاعدہ قومی اور سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

امریکی قوم کا تجزیہ کریں تو معلوم ہو گا کہ اس کی پندرہ فیصد آبادی کالوں پر مشتمل ہے۔ ان کے بارے میں آپ کو کافی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ دوسرے نمبر پر ہسپانوی ہیں۔ لاطینی امریکا سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں نے اپنی نسلی عادات کو نہیں چھوڑا ہے۔ اٹلی' چینی اور دوسرے ملکوں سے آنے والوں کا بھی یہی حال ہے کہ یوں تو امریکی ہیں مگر ذرا کھرچ کر دیکھیے تو اندر سے اپنی قوم کے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب گزشتہ دس بارہ سال سے تو امریکا جانے والوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو چکا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق قریب قریب دس لاکھ افراد ہر ماہ قانونی یا غیر قانونی طریقوں سے امریکا میں داخل ہوتے ہیں اور پھر وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پہلے لاطینی امریکا اور یورپ والوں

کی تعداد زیادہ تھی۔ اب مشرق کے ملکوں کی یلغار ہے۔ چینی، کوریائی، جاپانی، فلپائنی، ایشیائی جسے دیکھیے امریکا میں جا کر امریکی بن گیا ہے۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہودی جو ساری آبادی کا قریباً تین یا چار فیصد ہیں اس قوم پر چھائے ہوئے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ امریکیوں کی تقدیر ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہودیوں کی مرضی کے بغیر وہاں پتا تک نہیں ہلتا۔ اقتصادیات، بزنس اور کاروبار کے علاوہ تہذیبی مراکز میں بھی ان کا سکہ چلتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پریس اور ٹیلی ویژن پر یہودیوں کا تسلط ہے۔ آج کے زمانہ ابلاغ میں قوتوں کو غیر محسوس طریقے پر اپنا ہم خیال بنا لینا کون سا مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں نے ساری امریکی قوم کی برین واشنگ کر دی ہے اور اگر کبھی کوئی دل جلا ان کے تسلط کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو اسے مختلف طریقوں سے خاموش کر دیا جاتا ہے۔ مستقبل قریب میں ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ امریکیوں کو یہودیوں کے پنجے سے چھٹکارا حاصل ہو سکے۔ انہوں نے غیر محسوس طریقے پر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے اور اب اس بارے میں زیادہ تردد بھی نہیں کرتے۔ امریکی بزنس سے لے کر خارجہ پالیسی تک سبھی کچھ یہودیوں کے قبضہ قدرت میں ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ قریب قریب دو صدیاں گزر جانے کے باوجود کوئی دوسری قوم ابھی تک یہودیوں کی اس برتری کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ تعلیم، علم و سائنس، ٹیکنالوجی، سوشیالوجی، بینکنگ، صنعت کاری، فنون لطیفہ اور سب سے بڑھ کر میڈیا پر ان کا مکمل کنٹرول ہے اور اس حوالے سے وہ امریکا کی تقدیر کے مالک بنے ہوئے ہیں۔

ہماری کلاس میں دس بارہ مختلف قوموں کے نمائندے موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ انگریزی سے نابلد تھے۔ دراصل یہ لوگ حال ہی میں امریکا پہنچے تھے اور وہاں قدم جمانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ مس ڈورا کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ انتہائی آسان اور عام فہم انگریزی میں سب سے بات کرتی تھیں اور انہیں سمجھانے کی کوشش کرتی تھیں۔ انہوں نے سب کو بتا دیا تھا کہ دیکھو بھئی یہ کورس وغیرہ تو رسمی سی چیز ہے۔ اس کا مقصد تو صرف آپ لوگوں کو اصولی اور بنیادی معلومات فراہم کرنا ہے۔ اصل تجربہ تو اس وقت ہو گا جب آپ لوگ بذات خود ریستوران چلائیں گے تو بہت سے اصول جو ہم آج آپ کو پڑھا رہے ہیں آپ کو خود بخود معلوم ہو جائیں گے۔ ہمارے کورس کی صرف

ی کتاب تھی۔ بلکہ اسے بھی کتابچہ کہنا چاہیئے۔ یہ سستی سی کتاب اسی جگہ سے مل تھی۔ آٹھ دس دن کے اندر مس ڈورا نے وہ کتاب ختم کرا دی اور پھر سب کو ہدایت ہ اپنے طور پر پڑھتے رہیں اور اگر ضرورت محسوس کریں تو مس ڈورا سے بھی معلوم کر یں۔

مس ڈورا ایک دلکش اور پرکشش خاتون تھیں۔ انداز گفتگو بہت دلنشین تھا۔ آٹھ دن میں کورس کی کتاب پڑھانے کے بعد وہ عموماً" ادھر ادھر کی باتوں میں لگی رہتی اور سب کے سوالوں کے جواب بھی دیتی رہتی تھیں جو لوگ نئے نئے امریکا آئے تھے کے ذہنوں میں بے شمار سوالات کلبلاتے رہتے تھے اور مس ڈورا کے پاس ہر ایک کا موجود تھا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ جو شخص ایک بار امریکا کی سرزمین پر آباد ہو جاتا ہے وہ عرصے بعد خود بخود امریکی بن جاتا ہے اور اس کی اگلی نسل تو خالص امریکی ہو جاتی ہے۔ یہ تاثر غلط بھی نہ تھا اور شاید اس کا سبب بھی وہ جانتی تھیں۔ پہلی بات تو یہ کہ جو امریکا آتے ہیں ان کے ملکی حالات امریکا کے مقابلے میں کہیں پست اور بدتر ہوتے امریکا انہیں ہر قسم کی آزادیوں کی سرزمین نظر آتی ہے اور دوسری بات وہ یہ محسوس تے ہیں کہ ان کے ساتھ کسی طرح کا تعصب نہیں برتا جاتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ور حقیقت لامتناہی امکانات رکھنے والا ملک ہے۔ اگر کسی میں صلاحیت موجود ہے تو وہ شعبے میں یقیناً ترقی کرتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ترقی کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔ باہر سے والوں کے لئے امریکی زندگی کا یہ پہلو انتہائی قابل تعریف ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ی اور نسلی فرق کو شدت سے محسوس کرنے کے باوجود وہ دوبارہ امریکا چھوڑ کر اپنے یں واپس جانے کا تصور نہیں کرتے۔ تیسری دنیا کے ملکوں کی تو بات ہی چھوڑیئے۔ کے ترقی یافتہ ملکوں سے آئے ہوئے لوگ بھی امریکا کو چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔ اپنے ملک اور تہذیب کے ساتھ رابطہ ضرور قائم رکھتے ہیں۔ ہماری کلاس میں بھی یہ بت نمایاں تھا۔ آٹھ دس دن کی سنجیدہ تعلیم کے بعد سب لوگ زیادہ وقت مس ڈورا سین و دلنشین شخصیت کو دیکھنے میں گزارنے لگے تھے۔ وہ خود بھی بہت دلچسپ ت تھیں اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ ہمیں وہ کوئی ایک طرح جا کر پڑھنے کی ہدایت کرنے کے بعد بلیک بورڈ پر اس کے بارے میں چند شکلیں بنا

کر دکھاتیں اور پھر پڑھائی ختم۔ اس کے بعد دوسرے معاملات پر بات چیت شروع ہو جاتی تھی۔ اس کے لئے کوئی خاص موضوع نہیں تھا۔ بس باتوں باتوں میں کوئی تذکرہ چھڑ جاتا اور پھر مس ڈورا اس بارے میں امریکی نقطہ نظر بیان کرنا شروع کر دیتیں۔

ایک دن ایک کوریائی خاتون نے شکایت کی کہ اس کی آٹھ سالہ بچی اور دس سالہ بچے کو اسکول میں جنسی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ کیا بے ہودگی ہے۔

مس چن کیان نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ ”یہ فضول باتیں ہیں۔ ان سے نقصان کے سوا فائدہ کیا ہے؟ جن ملکوں میں اسکول کے بچوں کو جنسی تعلیم نہیں دی جاتی انہیں کون سی مشکل پیش آ جاتی ہے۔“

ایک یونانی صاحب کھڑے ہوئے۔ ان کے بال لمبے لمبے، ناک اس سے بھی زیادہ لمبی اور کان بڑے بڑے تھے۔ ان کی داڑھی لمبی، خاصی لمبی تھی۔ غرضیکہ عجیب حلیہ تھا۔

پہلے تو انہوں نے اس موضوع پر مختصر سی تقریر کی کہ امریکا والے خود کو ساری دنیا سے برتر اور عقل مند تر سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان کی ساری ترقی خوشحالی اور برتری باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی بدولت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ جنس کے بغیر کسی چیز کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ اب یہ کس قدر بے ہودہ بات ہے کہ جو باتیں ہم کسی زمانے میں بچوں سے چھپایا کرتے تھے۔ اب اسکولوں میں انہیں اس کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے اور اس سے بھی زیادہ شرم کی بات یہ ہے کہ عورتیں بھری جماعت میں یہ بے ہودہ باتیں بڑی تفصیل کے ساتھ بچوں کو بتاتی ہیں اور ان سے کہتی ہیں کہ وہ بے جھجک ہو کر سوال کریں۔ آخر اس بدتمیزی کا فائدہ کیا ہے؟

مس ڈورا بڑے دلنواز انداز میں یہ تقریر سن کر مسکراتی رہیں پھر کہا۔ ”دیکھئے آج کا بچہ گزشتہ کل کے بچے کے مقابلے میں کہیں زیادہ سمجھ دار ہے۔ وہ ہر بات جاننا چاہتا ہے۔“

”گزشتہ کل کا بچہ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ بھی ہر بات جاننا چاہتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ قبل از مسیح کے زمانے کا بچہ بھی ہر بات جاننے کا خواہش مند تھا مگر وہ سمجھ دار لوگوں کا عہد تھا۔ وہ بچوں کو صرف اتنی ہی باتیں بتایا کرتے تھے جتنی انہیں بتانے کی ضرورت تھی۔“

”آپ یہ تو دیکھئے کہ جنسی تعلیم کے باعث بچے کتنے باشعور ہو گئے ہیں۔“ مس ڈورا نے کہا۔

یونانی بزرگ بولے۔ ”اسی لئے بارہ بارہ سال کی عمر میں ناجائز بچوں کے ماں باپ بن تے ہیں۔ غیر شادی شدہ ماؤں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ شادی کے رشتے کی اہمیت اور زس بالکل ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ آخر اس تعلیم کا فائدہ کیا ہے، آپ یہ تو بتائیں۔ مجھے تو ت شرم آتی ہے جب میری بچی اسکول میں پڑھائے ہوئے سبق کے بارے میں مجھ سے الات کرتی ہے۔“

کلاس کی اکثریت کا خیال تھا کہ بچوں کو جنسی تعلیم دینا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔

مس ڈورا بولیں۔ ”آپ لوگ بھول رہے ہیں کہ امریکی سوسائٹی ایک اوپن سوسائٹی ہے۔ یہاں جاننے اور سکھانے پر بہت زور دیا جاتا ہے۔“

”معاف کیجئے میڈم، اس جاننے اور سکھانے کی بدولت یہ معاشرہ ایک بیمار اور جرائم ہ معاشرہ بن گیا ہے۔ ٹی وی دن رات بچوں کو بہتر سے بہتر طریقے سے جرائم کرنے کے لے میں معلومات فراہم کر رہا ہے۔ اسکولوں میں ننھے معصوم بچوں کے ذہنوں میں بدمعاشی باتیں ڈالی جاتی ہیں۔ نوعمروں اور نوجوانوں کو سوسائٹی نے کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ وہ ر پدر آزاد ہیں۔ ماں باپ انہیں کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتے ورنہ پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ یہ کیسا معاشرہ ہے جو مجرموں اور برے کام کرنے والوں کو پکڑنے کے بجائے برائی روکنے ٹوکنے والوں کو پکڑتا ہے۔“

مس ڈورا پہلے تو مسکراتی رہیں پھر انہوں نے ان تمام اعتراضات کے جواب میں کہا۔ یکھئے آج کل تعلیم بچوں کو ہوشیار ہونے کا سبق دیتی ہے۔ اگر اسکولوں میں جنسی تعلیم ی جائے تو ذرا سوچئے کہ کتنی بڑی تعداد میں بچیاں مائیں بن جائیں۔ یہ تعلیم انہیں ار رہنے کی عقل دیتی ہے۔“

”لیکن اگر یہ تعلیم نہ دی جائے تو انہیں شادی سے پہلے مائیں بننے کی ضرورت ہی انہ آئے۔ اور مائیں تو وہ اب بھی بن رہی ہیں۔“

اس قسم کی بحثیں اکثر کلاس میں جاری رہتی تھیں۔ ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ امریکا میں قریباً پچاس فیصد آبادی مذہب پرست ہے اور نت نئی آزادیوں کو پسند نہیں کرتی مگر یت کے سامنے لاچار ہے کیونکہ جمہوریت ایک ایسا طرز حکومت ہے کہ جس میں بندوں نا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔

یعنی جس بات کے حق میں زیادہ ووٹ ہوں بس وہی درست ہے۔

ان ہی دنوں ورجینیا کے اسکولوں میں یہ بحث چل رہی تھی کہ پہلے زمانے میں جو طالبہ شادی کے بغیر ماں بن جاتی تھی اسے اسکول سے خارج کر دیا جاتا تھا مگر اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ یہ بن بیاہی مائیں اپنے بن مانگے بچوں کو بھی اپنے ساتھ اسکول میں لے آتی ہیں اور اسکول کی انتظامیہ سے توقع رکھتی ہیں کہ وہ ان بچوں کی دیکھ بھال کا مناسب انتظام کرے گی۔ بہت سے والدین کا خیال تھا کہ ایسے بچوں کو اسکول لانے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ اس موضوع پر کئی دن تک اخباروں اور ٹیلی ویژن میں بحث ہوتی رہی مگر جب رائے شماری ہوئی تو آزادی پسند جیت گئے۔ اب ایسے بچوں کے لئے اسکول میں نرسری ادارے قائم کئے جا رہے ہیں تاکہ مائیں بچوں کو وہاں چھوڑ کر خود پڑھائی کی طرف توجہ دے سکیں۔

ایک اطالوی موٹی سے عورت نے کہا۔ "مس ڈورا۔ خدا کے لئے سب کچھ بچپن ہی میں ان معصوم بچوں کو گھول کر نہ پلایئے۔ انہیں بڑے ہونے کے بعد بھی کچھ جاننے کا موقع دیجئے۔"

☆ ☆ ☆

پندرہ دن کے بعد ہمارا امتحان تھا۔ امتحان سے ایک دن پہلے مس ڈورا نے ایک مختصر سی تقریر کی اور پھر سب کو بتایا کہ آپ کل فلاں فلاں باب ضرور پڑھ کر آئیں۔ دوسرے دن پرچہ سامنے آیا تو ان ہی ابواب میں سے تمام سوالات دریافت کئے گئے تھے۔ مس ڈورا نے یہ بھی اعلان کیا کہ اگر کوئی سوال کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو وہ ان سے پوچھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک رومانی ناول لے کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ کچھ لوگوں نے ان سے بعض سوالوں کے بارے میں وضاحت چاہی جو انہوں نے بتا دی۔ ہم بھی سوالوں کے جواب میں نشان لگا کر چلے آئے۔ مس ڈورا نے سب کو مطلع کیا کہ امتحان کے نتائج ہر ایک کو اس کے گھر پہنچ جائیں گے۔ قدوس صاحب بار بار دریافت کرنے کے لئے مس ڈورا کے پاس جاتے رہے۔

تیسرے دن ہمیں نتیجہ ڈاک کے ذریعے موصول ہو گیا۔ ہمیں امتحان میں پاس ہونے

کے لئے ۶۵ نمبر درکار تھے مگر ہم نے صرف ۶۲ نمبر حاصل کئے تھے۔ ہم نے ریستوران جا کر محمد علی کو یہ خبر سنائی تو وہ ہنسنے لگا۔ "مسٹر اوفوقی' پریشانی کی بات نہیں ہے۔ آپ کل سے پھر چلے جایئے اگلی بار ضرور پاس ہو جائیں گے۔ اس وقت تک ریستوران بھی تیار ہو کر چالو ہو جائے گا۔"

جی تو نہیں چاہتا تھا مگر پھر یہ خیال آیا کہ اگر سپروائزر کا ڈپلوما لے لیا تو کافی رقم بچ جائے گی اس لئے ٹیوب میں بیٹھ کر پھر یونیورسٹی پہنچ گئے۔ استقبالیہ پر موجود خاتون نے یوں مسکرا کر خوش آمدید کہا جیسے ہم کوئی کارنامہ سرانجام دے کر آ رہے ہیں پھر تسلی دیتے ہوئے کہا کہ فکر نہ کرو' اس بار تم ضرور پاس ہو جاؤ گے۔ اچھے طالب علم کے لئے کم از کم ایک بار فیل ہونا ضروری ہے تاکہ ہر بات ذہن نشین ہو جائے۔

مس ڈورا حسب معمول کلاس میں بالکل ترو تازہ مسکراتی ہوئی داخل ہوئیں مگر جب ہم پر نظر پڑی تو حیران رہ گئیں۔

"ارے علی۔ تم؟"

"ہاں۔ ہم فیل ہو گئے ہیں۔"

"حیرت ہے۔ کتنے نمبروں سے؟"

"صرف تین نمبروں سے۔"

مس ڈورا کو ہم نے پہلے کبھی غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ اس روز وہ پہلی بار غصے میں نظر آئیں۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ ممتحن پر سخت برہم تھیں۔

"بھلا تین نمبروں سے فیل کرنے کی کیا تک ہے۔ تین نمبر تو وہ اپنے پاس سے دے کر بھی تمہیں پاس کر سکتے تھے۔ آخر یہ لوگ سمجھتے کیوں نہیں' دوسروں کا وقت اس قدر بے دردی سے ضائع کرتے ہیں۔ ان عقل کے اندھوں کو یہ بھی علم نہیں ہے کہ ریستوران کا کام پڑھانے سے نہیں آتا۔ جب کوئی بذات خود ریستوران چلاتا ہے تو دو چار دن کے اندر ہی سب کچھ ازبر ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب تو ہم صرف راہنمائی کے لئے پڑھاتے ہیں۔"

اتنی دیر میں قدوس صاحب بھی کلاس میں داخل ہوئے اور بڑے زور و شور سے "ہائی" کہا۔

"کوڈوس تم بھی؟ ایک بار پھر؟"

"ہاں مس ڈورا۔" انہوں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"تم کتنے نمبروں سے فیل ہوئے ہو؟"

بولے۔ "کچھ نہ پوچھو۔ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

بہرحال۔ مس ڈورا نے کلاس میں لیکچر شروع کر دیا اور اپنے مخصوص دلکش انداز میں ٹہلتے ہوئے پڑھانے لگیں۔

قدوس صاحب نے ہمارے کان میں کہا۔ "میں صرف تمہاری ہمدردی میں فیل ہوا ہوں۔"

ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا مگر بعد میں پتا چلا کہ ہمدردی وہمدردی کا تو محض بہانہ تھا۔ وہ دراصل مس ڈورا کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے۔ ہم نے انہیں اس ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ثابت قدم رہے۔ ان کی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی بالآخر رنگ لے آئی اور جب ہم نے دوبارہ امتحان دیا تو اس وقت تک قدوس صاحب اپنی طویل تپسیا میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ان کا مس ڈورا کے ساتھ باقاعدہ رومانس شروع ہو چکا تھا اور ادھر ادھر ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

ایک دن بہت سنجیدگی سے بولے۔ "یہ لڑکی کالے رنگ کی ضرور ہے مگر کس قدر خوبصورت ہے!"

"تو پھر؟"

"کیا خیال ہے، اگر میں اس سے شادی کر لوں؟"

ہم نے حیران ہو کر دیکھا۔ "مگر تم تو پہلے ہی شادی شدہ ہو۔ کیا بیوی کو طلاق دے دو گے؟"

"نہیں۔"

"یہاں دوسری شادی کرنا جرم ہے۔"

"مگر ہم یہ جرم کریں گے ہی نہیں۔ ڈورا شادی کے نام پر بگڑ جاتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر شادی کا انجام بالآخر طلاق ہوتا ہے تو پھر شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"مطلب یہ کہ وہ شادی کے بغیر ہی؟"

"اور کیا بندہ نواز۔ یہ لوگ شادی وادی کے چکر میں نہیں پڑتے۔ کہتے ہیں کہ بلاوجہ کی پابندی ہے۔ بغیر شادی کے نہ کوئی ذمہ داری ہوتی ہے، نہ قانونی پابندی، نہ وراثت کا جھگڑا۔ نہ بیوی کو طلاق کے وقت حرجہ خرچہ۔ کوئی بھی پابندی نہیں ہوتی۔ جب تک جی چاہے ساتھ رہو جب جی چاہے سوٹ کیس اٹھاؤ اور نکل جاؤ۔"

"کیا تم نے اسے بتایا ہے کہ تم شادی شدہ ہو؟"

"بالکل۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم کوئی شادی تو نہیں کر رہے۔ میری بیوی اپنے کاموں میں مصروف رہتی ہے۔ اسے تو میری پروا ہی نہیں ہے۔"

ہم نے کہا۔ "مگر قدوس صاحب، یہ تو گناہ ہے۔"

"یہاں کا دستور ہی یہ ہے بندہ پرور، جیسا دیس ویسا بھیس۔ جب یہاں شادی بیاہ کا رواج ہی نہیں ہے تو پھر ہمیں بلاوجہ ضد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تو پھر؟"

"آج کل میرا سوٹ کیس ڈورا کے اپارٹمنٹ میں ہی رکھا ہوا ہے۔ ہم دونوں اس کا آدھا آدھا کرایہ دیتے ہیں۔ دوسرے اخراجات بھی ففٹی ففٹی کر لیتے ہیں۔ دونوں کا فائدہ ہے۔"

"مگر بچوں کا کیا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"بندہ پرور۔ وہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ جب بچہ ہو گا تو دیکھا جائے گا۔ آپ نے غور کیا ہو گا کہ یہ امریکی بلاوجہ پیشگی پریشان ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ یہ آج کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ کل جو ہو گا وہ کل دیکھا جائے گا۔ بقول غالب۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

پندرہ دن کے بعد امتحان ہوا تو ہم دونوں پاس ہو گئے۔ ہم اس لئے کہ پاس ہونا چاہتے تھے کیونکہ چند روز بعد ہمارا ریستوران چالو ہو رہا تھا اور قدوس صاحب اس لئے کہ انہیں گوہر مقصود حاصل ہو چکا تھا اور اب بلاوجہ فیل ہونے کی کیا ضرورت تھی؟

امتحان کا نتیجہ آنے کے دوسرے دن قدوس صاحب نے ہمیں کھانے پر مدعو کیا۔

"کہاں؟" ہم نے پوچھا۔

انہوں نے مس ڈورا کے اپارٹمنٹ کا پتا بتا دیا۔ ظاہر ہے اب وہی ان کا گھر تھا۔

مس ڈورا کا اپارٹمنٹ دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم پر مشتمل تھا۔ خاصی نفاست سے سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر جدید آرٹ کی تصویریں لگی ہوئی تھیں جو انہوں نے خود ہی بنائی تھیں۔ زمین پر کتھئی رنگ کا قالین تھا۔ صوفے وغیرہ بھی اس رنگ کے تھے۔

"اس نے اپنے رنگ سے میچ کیا ہے۔" قدوس صاحب نے ہمارے کان میں سرگوشی کی۔ کھانے کی دعوت تھی۔ مس ڈورا نے اپنے لئے "سلامی" تیار کی۔ قدوس صاحب نے اپنے اور ہمارے لئے انڈوں کا آملیٹ اور ڈبے کی مچھلی بنائی تھی۔ ہم نے اس سے پہلے مس ڈورا کو کلاس روم میں ہی دیکھا تھا۔ وہاں بھی وہ کافی خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتی تھیں مگر گھر میں تو وہ بالکل ہی مختلف ہستی نظر آئیں۔ بے تکلف' بے باک اور ہنس مکھ۔ بات بات پر قہقہے لگاتی ہوئی۔ ہمیں پہلی بار پتا چلا کہ انہیں بے شمار لطیفے بھی ازبر تھے۔ جن میں ہر طرح کے لطیفے شامل تھے۔ یعنی قابل سنسر لطیفے بھی وہ بڑی روانی سے سنا دیا کرتی تھیں۔

ان کے والدین فلوریڈا میں رہتے تھے۔ جن سے ان کی آخری ملاقات تین برس قبل ہوئی تھی۔ ایک درجن کے قریب بہن بھائی تھے۔ دو بھائی باکسر تھے یعنی باکسر بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ دو بھائی گلوکاری کے چکر میں تھے۔ یعنی آوارہ گردی کرتے تھے۔ پانچ بہنیں جوان تھیں اور سب کی سب غیر شادی شدہ تھیں لیکن خیر سے سبھی صاحب اولاد تھیں۔ باقی دو بہنیں چھوٹی تھیں مگر اس کے باوجود کئی بار گھر سے بھاگ چکی تھیں۔ مس ڈورا سارے خاندان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھیں۔ گھر کے تمام اخراجات کی ذمے داری ان کی والدہ محترمہ پر تھی جو کسی شاپنگ سینٹر میں کام کرتی تھیں اور باقی وقت میں بے بی سٹنگ کر کے پیسے کماتی تھیں۔ مس ڈورا کے والد ان کے سوتیلے باپ تھے۔

"آپ کے حقیقی والد کہاں رہتے ہیں؟"

"اللہ جانے۔ وہ میری پیدائش سے پہلے ہی ہم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔"

"موجودہ سوتیلے باپ مس ڈورا کے چوتھے باپ تھے۔ اگر چودھویں بھی ہوتے تو کیا فرق پڑتا۔ حاصل ضرب تو وہی نکلتا جو کہ اب نکلا تھا۔ اس اعتبار سے اپنے گھرانے میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ' ذہین' شائستہ اور معقول خاتون مس ڈورا ہی تھیں۔ انہیں اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے بہت محبت تھی۔ اس محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ کرسمس

اور نئے سال پر انہیں کارڈ ارسال کرنا نہیں بھولتی تھیں۔ وہ شادی وادی کی قائل نہیں تھیں مگر ایک اچھے شوہر کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔

"آپ کے نزدیک اچھے شوہر کا کیا معیار ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"بلیک نہ ہو۔ وھائٹ نہ ہو۔ ایشین ہو تو بہتر ہے کیونکہ وہ اچھے گھریلو مرد ثابت ہوتے ہیں۔"

"قدوس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"یہ سنجیدہ نہیں ہے۔ محض وقت گزاری کر رہا ہے۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ قدوس اس وقت کافی بنانے کے لئے کچن میں گیا ہوا تھا۔

"تمہیں احساس ہے کہ یہ محض وقت گزاری کر رہا ہے؟"

"اور کیا؟"

"تو پھر؟"

"فرق کیا پڑتا ہے۔ میں بھی تو وقت گزاری کر رہی ہوں۔ دیکھو علی۔ امریکا میں سب سے بڑا مسئلہ تنہائی کا ہے۔ زیادہ تر لوگ عمر کا بیشتر حصہ تنہا گزار دیتے ہیں۔ خاص طور پر جوانی اور بڑھاپا۔ اس درمیان میں اگر رفاقت کے کچھ لمحات مل جائیں تو ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ کل کیا ہو گا' کوئی نہیں جانتا۔ جو لوگ شادی کرتے ہیں۔ گھر بناتے ہیں۔ فیملی بناتے ہیں وہ بھی تو ایک دن سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں۔"

اتنی دیر میں قدوس صاحب کافی کے دو کپ اور ایک وھسکی کا ڈبل پیگ لے کر آ گئے۔ ظاہر ہے کہ وھسکی مس ڈورا کے لئے تھی اور کافی ہم دونوں کے لئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر قدوس نے برتن دھو دیئے تھے۔ کچن صاف کر دیا تھا اور اب کافی اور وھسکی پیش کر رہے تھے۔ سامنے ٹیلی ویژن پر ایک مزاحیہ ٹاک شو چل رہا تھا۔ ہم تینوں ایک خوش باش فیملی کی طرح بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ یہ مثالی امریکی گھرانے کا نمونہ تھا۔ کل یہ سب لوگ کہاں ہوں گے اور کس حال میں ہوں گے؟ اللہ جانے!

قدوس کے لئے یہ ایک بہترین بندوبست تھا۔ ایک خوش ادا اور خوش گفتار خاتون کی رفاقت۔ رہنے کے لئے اپارٹمنٹ' ہر قسم کی دلچسپی کا سامان مہیا تھا مگر کسی قسم کی پابندی

نہیں تھی۔ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو بس سوٹ کیس اٹھاؤ جدھر منہ اٹھے نکل جاؤ اور اللہ توفیق دے تو ایسا ہی کوئی گھر اور فیملی اور بنا لو۔

قدوس بار بار کہہ رہا تھا۔ "بندہ نواز۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں ڈورا کے ساتھ سیریس ہونے لگا ہوں۔"

ہم نے کہا۔ "کوئی پروا نہیں۔ وہ تمہارے ساتھ کبھی سیریس نہیں ہو گی۔"

ایک آنکھ میچ کر بولے۔ "بندہ پرور۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

یہ ہے ایک ماڈرن امریکی لو اسٹوری۔

ہم نے سپروائزر کا امتحان پاس کر لیا تھا اور ہمیں ڈپلوما بھی مل گیا تھا جو ہم نے اپنے ریستوران کے دروازے کے پاس نمایاں طور پر آویزاں کر دیا تھا۔ دو دن بعد ہیلتھ انسپکٹر آئے۔ اب وہ عموماً فرصت کے اوقات میں آتے تھے اور کافی ڈرتے ڈرتے ریستوران میں داخل ہوتے تھے۔ جب سے سام نے انہیں ڈانٹا تھا وہ اس سے خائف رہنے لگے تھے۔ سپروائزر کا ڈپلوما دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور ہمیں تہہ دل سے مبارک باد دی۔ پھر بولے۔ "اب آپ لگے ہاتھوں باورچی کا کورس بھی کر لیجئے۔ اس طرح کافی بچت ہو جائے گی۔ اپنے مینجر اور چیف باورچی کو آپ جو پیسے دیتے ہیں وہ بھی بچ جائیں گے۔"

ہم نے کہا۔ "لیکن دوسرے لوگوں کا کیا کریں گے۔ انہیں بھی تو تنخواہیں دینی پڑتی ہیں۔"

بولے۔ "اپنی مسز کو اپنے ساتھ لگا لیں۔"

ہم نے کہا۔ "یہ کام ان کے بس کا نہیں ہے۔"

ادھر ادھر دیکھا اور کیرن کی طرف دیکھ کر بولے۔ "اس لڑکی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

ہم نے کہا۔ "یہ کام کرتی ہے اور پیسے لیتی ہے۔"

بولے۔ "ایسی ترکیب نکالیں کہ یہ کام تو کرے مگر پیسے نہ لے۔"

"مثلاً؟" ہم نے پوچھا۔

"مثلاً اسے گرل فرینڈ بنا لیں۔ ففٹی ففٹی خرچہ بچ سکتا ہے۔"

ہمیں فوراً قدوس صاحب اور مس ڈورا کا خیال آ گیا لیکن اس ترکیب پر عمل کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

"نیڈوز۔" ریستوران اب چل پڑا تھا۔ ہمارے عین پیچھے انڈونیشیا کا سفارت خانہ تھا۔ جب انہیں پتا چلا کہ یہ ریستوران مسلمانوں کا ہے تو وہ بھی ہمارے ہاں آنے لگے۔ ہمارے عقب میں میساچوسٹس ایونیو تھا۔ یہ وہ سڑک ہے جس پر بہت زیادہ سفارت خانے قائم ہیں۔ ہمارا پاکستانی سفارت خانہ بھی اسی سڑک پر ہے اور ہمارے ریستوران سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ کار کے ذریعے وہاں دو تین منٹ میں اور پیدل چل کر دس بارہ منٹ میں پہنچا جا سکتا تھا۔ ایک سال خوردہ پاکستان کا جھنڈا اس بات کا گواہ تھا کہ یہ پاکستانی سفارت خانہ ہے۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ اتنے بڑے اور اہم ملک کے سفارت خانے کے لئے ایک خوبصورت اور بڑھیا جھنڈا تک دستیاب نہ ہوا۔ حالانکہ جب ہمارا وہاں آنا جانا ہوا تو بتایا گیا کہ واشنگٹن ڈی سی میں روسی سفارت خانے کے بعد عملے کی تعداد کے اعتبار سے پاکستان کا سفارت خانہ سب سے بڑا ہے لیکن سفارت خانے کے یہ ارکان رہتے کہاں تھے؟ یہ ہمیں پتا نہ چل سکا۔ ان میں سے بیشتر تو محض حاضری لگانے کی غرض سے وہاں جاتے تھے اور اپنا کوٹ ہینگر پر لٹکا کر اپنے دوسرے کاموں پر نکل جاتے تھے یا پھر ویسے ہی سیر و تفریح کرتے پھرتے تھے۔ سفارت خانے کی ٹپ ٹاپ بھی کوئی خاص نہ تھی۔ گھسے ہوئے پرانے قالین۔ بوسیدہ سا فرنیچر' عجیب سا اکتا دینے والا ماحول۔ سب سے نمایاں بات یہ تھی کہ وہاں جائیں تو بہت سے پاکستانیوں سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ پاکستانی شہریوں سے نہیں' عملے کے ارکان سے کیونکہ جہاں تک پاکستانی شہریوں کا تعلق ہے وہ عموماً" سفارت خانے کا رخ کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہاں ان کے ساتھ بے نیازی اور بے حسی کا سلوک روا رکھا جاتا ہے اور ان کے کسی مسئلے پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی جاتی۔ اس کے باوجود مجبوری کی صورت میں پاکستانیوں کو کبھی نہ کبھی سفارت خانے میں جانا ضرور پڑتا تھا کہ اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ سفارت خانے کے بعض اراکین ذاتی طور پر بہت ہمدرد' دلچسپ اور باعمل

تھے۔ شاید ان ہی کے دم سے اس کی رونق قائم تھی۔ عید' بقرعید کے موقعے پر سفارت خانے میں کوئی تقریب بھی منا لی جاتی تھی جس میں شریک ہونے والے بڑے جوش و خروش سے گلے ملتے تھے مگر زیادہ تر وقت شکوے شکایت میں ہی صرف ہو جاتا تھا یا پھر اپنے مسئلے مسائل کا رونا روتے تھے۔ ہم جب واپس پاکستان آئے تو ہم نے اپنے "جنگ" کے کالم میں سفارت خانے کا یہ احوال لکھا اور دریافت کیا کہ آخر پانچ سو سے زائد افراد پر مشتمل عملہ وہاں کس مرض کی دوا ہے؟ اس کے جواب میں سفیر محترم کا ایک جوابی خط شائع ہوا جس میں انہوں نے اس بات کی تردید کی تھی کہ عملے کی تعداد بہت زیادہ ہے البتہ یہ وضاحت فرمائی تھی کہ عملے کے بیشتر ملازم پارٹ ٹائم ملازم ہیں۔ بہرحال' پاکستانی سفارت خانے کے بارے میں یہ شکوہ شکایت لاحاصل ہے اس لئے کہ ہم نے کم و بیش ہر جگہ پاکستانی سفارت خانے کے رویے سے پاکستانیوں کو نالاں ہی پایا۔ کیا بتایا جائے' یہ بھی اپنا اپنا نصیب ہے۔

ابھی بہار کا موسم تھا یعنی سردیوں کا موسم کچھ عرصے بعد آنے والا تھا۔ دھوپ خوب چمکتی تھی۔ ہم نے بہار کا موسم یا تو اردو شاعروں کو مناتے ہوئے دیکھا ہے یا پھر اہل مغرب کو۔ شاعر بے چارے اس موسم میں گریباں چاک کر لیتے ہیں' دامن کی دھجیاں اڑاتے ہیں' سروں پر خاک ڈالتے ہیں اور ان پر عجیب دیوانگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں اور اہل خرد انہیں مجنوں یا باؤلے کہتے ہیں اور محلے کے بچے دیوانہ جان کر پتھر مارتے ہیں۔ مغرب والوں پر بھی موسم بہار کچھ ایسی ہی کیفیت طاری کر دیتا ہے یعنی گریبانوں کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں بلکہ گریبان سرے سے غائب ہی ہو جاتے ہیں۔ کہاں کا دامن اور کہاں کا گریبان' ارے صاحب انہیں تو لباس ہی کا ہوش نہیں رہتا۔ موسم بہار کا مطلب ان کی لغت میں یہ ہے کہ ملبوسات سے بے نیاز ہو جائیں اور پھر جو جی میں آئے کرتے پھریں۔ انہیں باقی چیزوں کا تو بخوبی ہوش رہتا ہے اگر ہوش نہیں رہتا تو لباس کا۔ مختصر یہ کہ موسم بہار یا موسم گرما (سمر) ان کے لئے بے لباس ہونے کا بہانہ ہے۔ اتنا کم لباس پہنتے ہیں کہ کمی اور بے لباسی کے درمیان نہایت نازک سا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ مردوں کو دیکھیے تو محض جانگیا پہنے یا زیادہ سے زیادہ چھوٹا سا بنیان نما ٹکڑا گلے میں ڈالے سڑکوں' بازاروں میں پھرتے ہیں۔ خواتین ہیں تو وہ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ بلکہ ان سے کچھ

بڑھ کر ہی ہیں۔ مرد بے چارہ تو مجبوراً جانگئے کے سوا کوئی دوسرا لباس پہن ہی نہیں سکتا۔ اگر اسے مزید مختصر کیا جائے تو لنگوٹی بن جائے گی جس کا مغرب میں فیشن نہیں ہے۔ مشکل یہ ہے کہ گاندھی جی کی لنگوٹی یورپ اور امریکا میں زیادہ مقبول نہ ہو سکی۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ اگر کوئی ڈیزائنر موسم گرما کے ملبوسات کے سلسلے میں لنگوٹی کو بھی متعارف کرا دے تو بہت سوں کا بھلا ہو جائے۔ بہرحال فی الحال تو مردوں کا جانگئے پر ہی گزارا ہے۔ عورتوں کے پاس البتہ بہت زیادہ ورائٹی ہے۔ لباس ان کا بعض حالات میں مردوں سے بھی زیادہ مختصر ہوتا ہے بلکہ اکثر حالات میں وہ اس معاملے میں مردوں پر بازی لے چکی ہیں ورنہ یہ لباس محض نام کا لباس ہے۔ بقول شاعر ؎

ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے

یعنی بڑے غور سے ڈھونڈنا پڑتا ہے کہ لباس کہاں ہے۔ خاتون کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پیش آتی کیونکہ وہ تو سرتاپا موجود ہوتی ہیں۔ ہم نے تو یہ دیکھا کہ مغرب میں خواتین کے لباس کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ نظر نہ آئے۔ ساحلوں پر' پارکوں میں اور اس قسم کی تفریح گاہوں میں تو وہ غسل یا پیراکی کا لباس پہن کر اپنا دل خوش کر لیتی ہیں مگر بے لباسی کے لئے حدود کی پابندی نہیں ہے۔ سڑکوں' بازاروں' ریستورانوں' شاپنگ سینٹرز اور دیگر مقامات پر بھی وہ اسی قسم کے ملبوسات میں بے تکلفی سے گھومتی ہوئی نظر آتی ہیں مگر یہ ٹیکنیکل فرق ضرور ملحوظ رکھتی ہیں کہ یہ لباس مختصر بے شک ہو مگر ڈیزائن میں غسل یا پیراکی کے لباس سے مختلف نظر آئے۔ یوں سمجھئے کہ موسم بہار میں عریانی کا ایک سیلاب سا اُمڈ آتا ہے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ قانونی طور پر ان ملکوں میں پبلک مقامات پر عریاں ہونا جرم ہے جس کی سزا بھی مقرر ہے لیکن شاید "عریانی" سے مراد بالکل ہی عریانی ہے ورنہ یہ معما ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے نزدیک لباس کہاں ختم ہوتا ہے اور بے لباسی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔

خان صاحب نے اس بارے میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ان لوگوں کے نزدیک عریانی سے مراد صرف عریانی ہوتی ہے یعنی سرتاپا عریانی۔ جب جسم پر ایک ڈوری یا دھجی بھی موجود نہ ہو۔ ورنہ اگر چند ڈوریاں اور کپڑے کی دھجیاں بھی جسم پر موجود ہوں تو آپ اسے عریانی نہیں کہہ سکتے۔

ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ ننگ دھڑنگ دنیا بھر میں گھومتے پھرتے ہیں اور دوسری رف تہذیب و تمدن کے بھی پابند ہیں اور ان اصولوں کا بڑی سختی سے خیال رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر ان ہی دنوں محمد علی نے ہمیں بتایا کہ انین ڈیل کے خوبصورت ترین قے میں ایک ٹاؤن ہاؤس خالی ہونے والا ہے جس کا مالک ایک فلسطینی ہے۔ حالیہ کرایہ ر ایک خاتون ہیں جو عنقریب رخصت ہو جائیں گی اس لئے کیوں نہ وہ گھر دیکھ لیا جائے۔ علی نے اس گھر کی اتنی زیادہ تعریفیں کیں کہ ہم بھی مائل ہو گئے۔ ہمارے بزنس کا روبست تو ہو چکا تھا' اب رہنے کے لئے گھر کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ایک شام سات بجے کا ت مقرر کر لیا گیا۔ اتفاق سے ہم ریستوران میں بعض مصروفیات کے باعث لیٹ ہو گئے ر جب وہاں پہنچے تو رات کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔

ہم نے کہا۔ "بہت دیر ہو گئی ہے' بہتر ہے کہ ہم پھر کوئی وقت مقرر کر لیں؟"

محمد علی نے کہا۔ "سامنے تو گھر ہے' ان ہی سے کیوں نہ دریافت کر لیں۔ زیادہ سے یادہ ٹال ہی تو دیں گی نا؟ ورنہ پھر دوبارہ اتنی دور آنا پڑے گا۔"

ہمیں بھی یہ مشورہ پسند آیا۔ انین ڈیل کا علاقہ واقعی بہت خوشنما اور پرسکون تھا۔ آس ں کئی شاپنگ سینٹر بھی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس علاقے میں اکا دکا تعلیم یافتہ اوں کے علاوہ باقی آبادی گوروں کی تھی۔ واقعی یہ ورجینیا کا بہت اچھا علاقہ تھا۔

محمد علی نے اپنی پک اپ پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر دی اور ہم دونوں چند سیڑھیاں ھ کر ٹاؤن ہاؤس کے دروازے پر پہنچ گئے۔ محمد علی نے کال بیل بجائی۔ دروازے کا ایک مہ شیشے کا تھا جس پر باریک سا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ گھنٹی کے جواب میں سامنے لی سیڑھیوں سے ایک گداز جسم پختہ عمر کی سیاہ فام خاتون اتر کر آئیں اور دروازے کی رف بڑھیں۔

محمد علی نے ہمیں سرگوشی میں بتایا کہ کسی کالج میں پڑھاتی ہیں اور بہت پڑھی لکھی تون ہیں۔

خاتون نے دروازے کے پاس آ کر جھانکا اور پوچھا۔ "کون ہے؟"

محمد علی نے اپنا تعارف کرایا اور تاخیر کی معذرت چاہی اور کہا۔ "میں ان صاحب کو گھر کھانے کے لئے لایا تھا۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو اس وقت دکھا دوں ورنہ پھر سہی۔"

خاتون نے ایک لمحہ سوچا۔ وہ محمد علی سے بخوبی واقف تھیں مگر مزید تصدیق کی خاطر انہوں نے ایک بار پھر باریک پردہ ہٹا کر بغور دیکھا پھر بولیں۔ "ٹھیک ہے مگر آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ میں اس وقت مناسب لباس میں نہیں ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ سیڑھیوں کی جانب چلی گئیں۔

ہم نے محمد علی سے کہا۔ "اچھا خاصا لباس تو پہنے ہوئے ہیں۔ قیمتی سلیپنگ سوٹ ہے' اس پر مخمل کا گون ہے اور کیا چاہئے؟"

اس نے کہا۔ "مسٹر آفاقی۔ یہ مغربی تہذیب ہے کہ شب خوابی کے لباس میں کسی ملاقاتی کے سامنے نہیں آتے۔ یہ ان کا کلچر ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ دوبارہ نمودار ہوئیں۔ اس بار وہ اسکرٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے تھیں۔ اسکرٹ مختصر سا تھا یعنی گھٹنوں سے اونچا اور بلاؤز میں آستینیں نہیں تھیں اور ویسے بھی پیٹ اور جسم کا بیشتر حصہ نظر آ رہا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے والے لباس میں وہ سرتاپا ڈھکی چھپی تھیں۔ ہمارے خیال میں تو ان کا پہلا لباس موزوں تھا مگر ان کی رائے مختلف تھی۔

دروازے کے پاس آ کر انہوں نے مزید تصدیق کرنے کے لئے جھانکا۔ پھر دروازے کا ایک تالا کھولا۔ اس کے بعد دوسرا تالا اور پھر حفاظتی زنجیر ہٹائی۔ ان مراحل کے بعد دروازہ کھلا۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ امریکی اپنی حفاظت کا کس قدر اہتمام کرتے ہیں' پھر بھی بے چارے لٹنے سے محفوظ نہیں رہتے۔

"آیئے۔" انہوں نے ہمیں مدعو کیا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کی دعوت دی۔

محمد علی نے ایک بار پھر معذرت پیش کی۔

"کوئی بات نہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے لیکن میں اس معاملے میں زیادہ اصول پرست ہوں۔ دیکھو نا۔ اکیلی عورت ہوں۔ شام کے بعد گھر کے اندر کسی کو بلانا پسند نہیں کرتی اور پھر مجھے اپنی ریپوٹیشن کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

"جی بالکل درست فرماتی ہیں۔"

"آپ کیا پسند کریں گے۔ میں آپ کے ساتھ چل کر گھر دکھاؤں یا آپ خود ہی دیکھ لیں گے؟"

"نہیں شکریہ۔" محمد علی نے کہا۔ "میں اس گھر سے واقف ہوں۔ آپ کو تکلف

رنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تو پھر میں یہاں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتی ہوں۔" وہ ایک صوفے پر تشریف فرما ہو گئیں۔

محمد علی نے ہمیں گھر دکھانا شروع کر دیا۔ ہم جس منزل پر تھے وہ درمیانی منزل تھی۔ ل پر ڈرائنگ روم' ڈائننگ روم اور کچن تھا۔ ہر طرف سلیٹی رنگ کا نرم قالین بچھا ہوا ا۔

محمد علی ہمیں خوبصورت سی لکڑیوں کی سیڑھیوں سے نیچے لے گئے۔ "اور یہ ہے تہ یعنی بیس منٹ۔ امریکی گھروں میں تہ خانہ ضرور ہوتا ہے۔"

تہ خانہ کافی کشادہ تھا اور اس میں ایک بیڈ روم اور باتھ روم بھی تھا۔

"بچوں کے کھیلنے کے لئے بہت اچھا رہے گا۔ کوئی مہمان آ جائے تو اس بیڈ روم کو تعمال کیا جا سکتا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ اچھا ہے۔"

تہ خانے سے نکل کر ہم دوبارہ پہلی منزل پر پہنچے۔ "یہ کچن ہے۔ بہت اچھا ہے۔ رورت کی ہر چیز موجود ہے۔ اس کی پچھلی دیوار شیشے کی ہے جس میں باہر کا خوبصورت منظر ر آتا ہے۔ یعنی کھانا پکانے کے ساتھ ساتھ تفریح بھی ہو گی۔"

"ہاں۔ بہت اچھا ہے۔"

وہ ہمیں لے کر دوسری منزل کی طرف بڑھے۔ "ان سیڑھیوں کے ساتھ آپ آرٹ لری بھی بنا سکتے ہیں۔ میں آپ کو خوبصورت تصاویر بہت سستی دلا دوں گا۔"

اب ہم دوسری منزل پر پہنچ گئے تھے۔

"یہاں تین بیڈ رومز ہیں۔ ہر ایک کے ساتھ باتھ روم موجود ہے۔ ان بیڈ رومز کی ایک دیوار بھی شیشے کی ہے۔ یعنی آپ جب چاہیں کمرے میں بیٹھے بیٹھے باہر کا نظارہ سکتے ہیں۔ ویسے تمام بیڈ رومز بہت اچھے ہیں۔ یہ دیکھئے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے سامنے والے بیڈ روم کا دروازہ کھول دیا مگر ہم دونوں ٹھٹک کر رہ ئے۔ ہم دونوں نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر سامنے نظر ڈالی۔ کمرے میں بڑے سے صوفے پر ایک موٹے تازے سیاہ فام صاحب نیم دراز تھے۔ سامنے میز پر اب کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔

انہوں نے ہمیں دیکھ کر اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں اور خالص کالوں کے لہجے میں پوچھا۔

"کیا یہ کوئی ہولڈ اپ ہے؟" مراد یہ کہ ڈاکا واکا تو نہیں ہے۔

محمد علی نے کہا۔ "معاف کیجئے۔ دراصل میں ریالٹر ہوں اور ان صاحب کو گھر دکھانے کے لئے لایا ہوں۔"

"اوہ!" انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔ "مکان دکھانے کا یہ کون سا وقت ہے؟ بہرحال یہ ڈور تھی کا فیصلہ ہے۔ آپ بڑے شوق سے دیکھئے۔"

"شکریہ۔ بس بہت کافی ہے۔"

"ارے نہیں۔ کلوزٹ اور باتھ روم تو دیکھ لیجئے ویسے ایک بات بتا دوں۔ ڈور تھی اپنے باتھ روم کو زیادہ صاف نہیں رکھتی۔"

محمد علی نے کہا۔ "مداخلت کی معافی چاہتا ہوں۔ اب اجازت دیجئے۔"

وہ خاصے موڈ میں نظر آ رہے تھے۔ "ارے نہیں۔ کم از کم کچھ دیر تو ساتھ دیجئے۔ ون فار دی روڈ۔"

بڑی مشکل سے معذرت کر کے ہم نے ان سے رخصت کی اجازت لی۔ وہ خاصے ہنس مکھ آدمی نظر آ رہے تھے۔ سیڑھیوں تک ہمیں ان کے ہنسنے کی آواز آتی رہی۔

ہم نے محمد علی سے کہا۔ "تم نے تو کہا تھا کہ یہ تنہا ہیں؟"

"مطلب یہ ہے کہ شادی شدہ نہیں ہیں۔"

ہم دوبارہ ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے جہاں مس ڈور تھی ٹیلی ویژن دیکھنے میں مصروف تھیں۔ ہمیں دیکھا تو مسکرائیں اور بڑے اخلاق سے پوچھا۔ "کام ختم ہو گیا آپ کا؟"

"جی بالکل۔ شکریہ۔ تکلیف دینے کی معذرت۔"

"علی۔ تم تو ریالٹر ہو نا؟"

"جی ہاں۔"

"یہاں تو میرا معاہدہ ختم ہو گیا ہے مگر مجھے کسی اچھے وھائٹ علاقے میں ایک کرائے کے گھر کی ضرورت ہے۔ ہمسائے اچھے ہونے چاہئیں۔ تم تو جانتے ہو کہ میں تنہا عورت ہوں۔ بہت شریفانہ زندگی بسر کرتی ہوں۔ میرے پڑوسی اس کی گواہی دے سکتے ہیں۔"

محمد علی نے مناسب الفاظ میں انہیں تسلی دے کر اجازت طلب کی۔

کیوں۔ کیا خیال ہے؟" محمد علی نے پک اپ میں سوار ہونے کے بعد پوچھا۔

"کس بارے میں؟"

"ارے بھئی گھر کے بارے میں۔ میری مانو تو لے لو۔ ہر لحاظ سے بہت اچھا ہے۔"

ان کا خیال درست تھا۔ کچھ دن بعد ہم نے وہ گھر محمد علی کے دوست سے حاصل کر لیا۔

☆ ☆ ☆

دوسرے دن لنچ کے بعد ہم اپنے ریستوران میں کھڑے ہوئے پائپ پی رہے تھے کہ مس مارتھا تشریف لے آئیں۔ مس مارتھا ایک ماہر نفسیات تھیں۔ ان کا کلینک ہمارے ریستوران سے زیادہ دور نہیں تھا۔ فرصت کے اوقات میں وہ اکثر کافی پینے ہمارے ریستوران میں آ جاتی تھیں اور ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت تک امریکا کے تمام ریستورانوں اور دکانوں میں تمباکو نوشی کی "قانوناً" ممانعت نہیں ہوئی تھی مگر ہم "احتیاطاً" اپنے گاہکوں سے یہ ضرور دریافت کر لیا کرتے تھے کہ انہیں تمباکو نوشی پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ مس مارتھا تمباکو نوشی سے پرہیز کرتی تھیں مگر دوسروں کی اسموکنگ پر انہیں زیادہ اعتراض بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔

انہیں دیکھتے ہی ہم نے اپنا پائپ بجھانے کا ارادہ کیا مگر انہوں نے فوراً روک دیا۔

"رہنے دیں۔ کیوں اپنا تمباکو ضائع کرتے ہیں۔"

مس مارتھا درمیانی عمر کی سفید فام خاتون تھیں اور جب ان کی آمدورفت زیادہ ہو گئی تو اکثر اپنے مریضوں کے بارے میں بھی ہم سے باتیں کر لیا کرتی تھیں۔ ہم بھی ان سے سوالات دریافت کر لیتے تھے مگر عام قسم کے۔ اس لئے کہ کسی نفسیاتی مسئلے پر سوال دریافت کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں فیس ادا کرنی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہر سوال دریافت کرنے سے پہلے یہ پوچھ لیا کرتے تھے کہ یہ فیس والا سوال تو نہیں ہے۔

وہ اپنی پسندیدہ میز پر بیٹھ گئیں اور کیرن نے ان کی دل پسند کافی ان کے سامنے لا کر رکھ دیا۔

"پتا نہیں ان مردوں کو عورتوں کی نفسیات کی سمجھ کب آئے گی؟" انہوں نے کہا۔

ہم نے کہا۔ ''جب عورتیں مردوں کی نفسیات کو سمجھ جائیں گی۔''

وہ ہنسنے لگیں۔ پھر کہا۔ ''نفسیات کا کلچر' مذہب اور ماحول سے بھی گہرا تعلق ہوتا ہے۔''

یکایک دھپ دھپ کی آواز آئی اور تین نوجوان لڑکیاں بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئیں مگر اس حلئے میں کہ مختصر سے جانگیے اور اس سے بھی مختصر تر بلاؤز کے سوا جسم پر اور کچھ نہ تھا۔ اپنے جوتے انہوں نے بڑی بے تکلفی سے اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے اور آپس میں یوں ہنس بول رہی تھیں جیسے اپنے بیڈروم میں چہلیں کر رہی ہوں۔ اندر داخل ہو کر انہوں نے اپنے جوتے میز پر رکھ دیئے اور خود کرسیوں پر تشریف فرما ہو گئیں۔ ہم حیران ہو کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ خاصی خوش شکل اور سمجھ دار لڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ ظاہر ہے تعلیم یافتہ بھی ہوں گی مگر امریکی دارالحکومت کے بازاروں میں یوں گھومنے پھرنے کا انداز واقعی حیران کن تھا۔ کیرن فوراً ان کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے بھی ان کے' میز پر رکھے ہوئے جوتوں اور برائے نام ملبوسات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اہل مغرب کا یہ دستور ہم نے ہر ملک میں دیکھا کہ کوئی بھی کسی پر معترض نہیں ہوتا نہ کسی سے سروکار رکھتا ہے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے چاہے کچھ بھی ہو جائے ان کی بلا سے۔ شہروں کی بارونق سڑکوں پر قاتل بندوقیں اور پستول ہاتھوں میں تھامے ہوئے کسی کے پیچھے بھاگتے نظر آتے ہیں مگر نہ کوئی قاتل کو روکتا ہے اور نہ مقتول کی حفاظت کا بندوبست کرتا ہے۔ یہ کام انہوں نے پولیس کے سپرد کر رکھے ہیں۔

لڑکیوں نے کیرن کو کافی اور یوگرٹ کا آرڈر دیا اور خود خوش گپیوں میں مصروف ہو گئیں۔ ہمیں اچانک کچھ سوچ کر ہنسی آ گئی۔ مس مارتھا نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا۔ پھر آس پاس نظر ڈالی مگر ہنسنے کا سبب نظر نہ آیا۔

ہم نے کہا۔ ''معاف کیجئے مس مارتھا۔ ہم دراصل آپ امریکیوں کی نفسیات اور انداز معاشرت نہیں سمجھ سکے۔''

''تمہارا اشارہ ان لڑکیوں کی طرف ہے شاید۔'' انہوں نے کہا۔ ''علی۔ اس عمر میں سبھی ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔''

ہم نے کہا۔ ''مس مارتھا۔ یہ بچیاں تو نہیں ہیں۔ اچھی خاصی جوان لڑکیاں ہیں مگر بے

تکلفی سے واشنگٹن کے بازاروں میں لباس کے بغیر ہی گھوم رہی ہیں۔''

''اوہ۔ میرے خدا۔ یہ تم نے کیا کہہ دیا۔ تمہیں پتا ہے کہ سڑکوں پر بے لباس ہونا جرم ہے؟''

ہم نے کہا۔ ''مگر لباس لباس میں بھی تو فرق ہوتا ہے۔ آخر آپ نے بھی تو ایک لباس پہن رکھا ہے۔''

بولیں۔ ''یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔ ہر ایک کو اپنی پسند کا لباس پہننے کی آزادی ہے۔ یہ ایک آزاد ملک ہے۔''

اتنی دیر میں کیرن بھی انہیں یوگرٹ دینے کے بعد ہماری میز کے پاس ہی آن کھڑی ہوئی تھی۔

ہم نے کہا۔ ''مس مارتھا۔ بچوں کو تو ہم نے جوتیاں ہاتھ میں اٹھا کر گھومتے ہوئے دیکھا ہے مگر یہاں تو اچھی خاصی لڑکیاں جوتے ہاتھ میں لئے پھر رہی ہیں اور اب انہوں نے جوتے میز پر رکھ دیئے ہیں۔''

''ہاں۔ یہ اعتراض مناسب ہے۔'' انہوں نے اعتراف کیا۔ ''اسے آپ بدتہذیبی کہہ سکتے ہیں۔''

ہم نے کہا۔ ''جب ہم چھوٹے تھے تو انگریزوں کی تہذیب کے بارے میں بہت مرعوب تھے۔''

''ارے وہ انگلستان کے انگریز تھے۔ انگلش مین۔ ہم امریکی ہیں۔ یہ تمام اقوام کی کاک ٹیل ہے۔ ہمارے طور طریقے ان سے بہت مختلف ہیں۔ وہ بناوٹ اور تکلف کے قائل ہیں مگر ہم ان چیزوں کو بے کار سمجھتے ہیں۔''

''مگر کل رات ہمارے ساتھ جو تجربہ پیش آیا وہ کچھ مختلف تھا۔''

''وہ کیا تھا؟'' انہوں نے دلچسپی سے ہماری کرسی کے نزدیک اپنی کرسی کھینچ لی۔

''ہم ایک مکان دیکھنے گئے تھے۔ خاتون خانہ سلیپنگ سوٹ اور گون پہنے ہوئے تھیں مگر انہوں نے کہا کہ ان کا لباس مناسب نہیں ہے۔ کچھ دیر انتظار کریں۔''

''بالکل ٹھیک کہا انہوں نے۔'' وہ بڑے جوش سے بولیں۔ ''ایسا مناسب لباس پہن کر کسی کے سامنے آ جانا تو بڑی بے شرمی کی بات ہے۔''

"اور اس لباس میں سڑکوں پر گھومنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

وہ کچھ لاجواب سی ہو گئیں۔ کیرن نے بھی اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر ہماری طرف دیکھا۔

"مسٹر آفاقی۔ یہ بات تو میں نے پہلے کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔ واقعی کتنی عجیب بات ہے۔"

ادھر ان لڑکیوں نے پہلے تو ریستوران میں بجنے والی ہلکی ہلکی موسیقی پر جھومنا اور ہلکورے کھانا شروع کر دیا اور پھر باقاعدہ ڈانس کرنے لگیں۔ ایک صاحبزادی تو چھلانگ لگا کر میز پر ہی چڑھ گئیں اور ہسپانوی انداز میں میز پر ایڑیاں بجا بجا کر رقص شروع کر دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ ریستوران میں موجود دوسرے لوگ اس حرکت پر ناک بھوں چڑھائیں گے مگر انہوں نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کے خیال سے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ کیرن دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی اور کیونکہ اسٹاف کی رکن تھی اس لئے ان کا ساتھ دینے سے معذور تھی۔ مس مارتھا البتہ اپنے پیروں سے فرش پر ردھم دینے لگیں۔ ریستوران کی دو جانب کی دیواریں شیشے کی تھیں۔ سامنے سے گزرنے والوں نے یہ تماشا دیکھا تو وہ بھی جوق در جوق اندر چلے آئے اور تھوڑی ہی دیر میں ریستوران بھر گیا۔ عملے کے لوگ ایک دم سرگرم ہو گئے اور مہمانوں کی فرمائشیں پوری کرنے میں لگ گئے۔ پندرہ بیس منٹ تک یہ دھما چوکڑی جاری رہی جس کے بعد وہ لڑکیاں اپنے جوتے ہاتھوں میں اٹھا کر رخصت ہو گئیں۔

سام کے خیال میں یہ تجربہ ہمارے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔

ہم نے کہا۔ "کیا خیال ہے۔ ہر روز کچھ دیر کے لئے چند ایسی لڑکیوں کا بندوبست نہ کر لیا جائے؟"

"نہیں مسٹر آفاقی۔ یہ کوئی رقص گاہ تو نہیں ہے البتہ آنے والے مہمان خود ہی موج میں آ جائیں تو اس کی بات الگ ہے۔"

ہم نے کہا۔ "سام۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہمارے ریستوران میں آنے والے معقول لباس پہن کر آیا کریں۔"

سام نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا۔ "موسم کے لحاظ سے اس سے اچھا لباس اور کیا ہو

گا۔ آپ نے شاید غور نہیں کیا۔ یہ لڑکیاں جو لباس پہن کر آتی ہیں وہ موسم گرما کے تازہ ترین فیشن ہیں۔ ویسے بھی یہاں رسمی لباس کا مطلب بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔"

ہمیں نغمی صاحب نے یہ لطیفہ سنایا تھا کہ ایک قدامت پسند سے ریستوران کے مالک نے تنگ آ کر اپنے ریستوران کے باہر یہ لکھ کر لگا دیا کہ کھانے کے اوقات میں براہ کرام معقول اور رسمی لباس پہن کر اندر تشریف لائیں۔ لباس کے ساتھ کم از کم ٹائی کا ہونا لازمی ہے۔

دوسرے دن سب سے پہلے ایک ننگ دھڑنگ صاحب اندر تشریف لائے۔ مطلب یہ کہ وہ حسب دستور جانگیا اور بنیان پہنے ہوئے تھے۔ پیروں میں ہوائی چپل تھی مگر گلے میں ٹائی بندھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اندر آ کر مینجر سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

"جی فرمایئے۔" مینجر نے کہا۔

انہوں نے کہا۔ "دیکھئے۔ یہ ریستوران میرا پسندیدہ ہے۔ یہاں کا کھانا مجھے بہت پسند ہے۔ آپ نے جو نئی شرط لگائی ہے وہ بھی مجھے منظور ہے مگر یہ بتایئے کہ جانگئے اور بنیان کے ساتھ ٹائی لگانا کچھ عجیب سا نہیں لگتا؟"

مینجر بے چارہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

محمد علی کا بتایا ہوا ٹاؤن ہاؤس ہمیں بہت پسند آیا تھا یہاں تک کہ چند روز کے بعد ہم نے اسے حاصل کر لیا۔ سامان تو ہمارے پاس کچھ تھا نہیں۔ خالی ہاتھ گھر میں داخل ہو گئے۔ وہاں ضرورت کی اشیاء مہیا کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ رنگ و روغن کیا جائے۔ محمد علی نے حساب لگا کر بتایا کہ اگر رنگ و روغن کرانے والوں کی خدمات حاصل کی گئیں تو خود آپ کے چہرے کا رنگ اتر جائے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ خود ہی یہ کام کر لو۔

"کیا مطلب، یعنی ہم سارے گھر پر خود ہی رنگ و روغن کریں؟ ہمیں یہ کام نہیں آتا۔"

"دیکھئے۔ یہاں ہر چیز مل جاتی ہے۔ روغن کے لئے یہاں رولر استعمال ہوتے ہیں۔ رنگ بنا بنایا مل جاتا ہے۔ بس اللہ کا نام لے کر کھڑے ہو جائیں اور سارے گھر پر رولر پھیر دیں۔"

"مگر اس میں تو بہت زیادہ وقت لگ جائے گا۔"

"وقت کیوں لگے گا۔ کام سے فارغ ہو کر رات کے وقت یہ کام کر لیا کرنا۔"

ہمیں یہ مشورہ پسند نہیں آیا۔ ویسے بھی گھر میں یہاں وہاں تھوڑا بہت سا کام تھا۔ کوئی ٹائل خراب ہو گیا تھا۔ اسے بدلنا تھا۔ کہیں سیڑھی کی لکڑی ٹوٹ گئی تھی۔

"ارے بھئی یہ سب چیزیں بازار میں مل جاتی ہیں۔ یہاں سارے گھر چند مخصوص انداز کے ہوتے ہیں۔ اس لئے اسپیئر پارٹس بھی آسانی سے مل جاتے ہیں۔"

وہ دن تو ہم نے نئے گھر میں ملیمی صاحب کے گھر سے لائے ہوئے گدوں پر گزارا لیکن دوسرے دن اخبار میں اشتہار دیکھنے شروع کر دیئے۔ چھوٹے موٹے کام کرنے والوں کے بے شمار اشتہار تھے۔ ہم نے ایک نمبر پر فون کیا۔ نہایت سلیس انگریزی میں کسی نے ہم سے بات چیت کی۔ ہمارا پتا اور فون نمبر معلوم کیا اور بتایا کہ دو گھنٹے بعد "بندہ" پہنچ جائے گا۔ مزدوری بھی انہوں نے خاصی معقول بتائی۔ ہمارے تو خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ امریکا میں بھی بیٹھے بٹھائے سارے کام یوں ہو جائیں تو پھر اور کیا چاہیے؟

پورے دو گھنٹے بعد کال بیل کی آواز پر ہم نے دروازے پر جا کر دیکھا تو ایک خاصے بزرگ صاحب کوٹ پتلون پہنے ہوئے کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے اور ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک کاغذ ہماری طرف بڑھا دیا۔ جس پر ہمارا نام۔ پتا اور فون نمبر لکھا ہوا تھا۔

ہم نے کہا۔ "آپ اندر آ کر دیکھ لیجئے کہ کام کیا کرنا ہے؟"

وہ چپ چاپ ہمارے پیچھے چل پڑے۔ ہم نے انہیں سارا گھر دکھایا۔ پھر ضروری ہدایات بھی دیں۔ وہ خاموشی سے مفکرانہ انداز میں سرہلاتے اور مسکراتے رہے۔ جب سارا گھر دیکھ چکے تو ہم ڈرائنگ روم کے قالین پر جا کر بیٹھ گئے۔ یہ واحد فرنیچر تھا جو سارے گھر میں موجود تھا۔ باقی سب کچھ وہ سیاہ فام کرایہ دار اٹھا کر لے گئے تھیں۔

"اب بتایئے آپ کی فیس کتنی ہو گی اور کام کتنے وقت میں ختم ہو گا؟" ہم نے پوچھا۔

وہ مسکرائے تو ان کے پوپلے منہ کا نظارہ بھی ہمیں نظر آ گیا۔ یہ مانا کہ منہ میں دانت نہ تھے مگر پیٹ میں آنتیں ضرورت سے زیادہ تھیں۔ عمر کے اعتبار سے خاصے صحت مند نظر آ رہے تھے۔

انہوں نے پہلے تو انگلیوں پر کچھ حساب لگایا اور سارے گھر کا دوبارہ چکر لگانے کے بعد پھر ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ پھر پوچھا۔ "کچن؟"

ہم انہیں کچن دکھا چکے تھے۔ عرض کیا کہ کچن میں بھی رنگ کرنا ہو گا۔

بولے۔ "ہاٹ کافی۔"

کافی غور کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ کافی کی فرمائش کر رہے تھے۔ گھر میں سامان وغیرہ تو تھا نہیں مگر کچن میں کھانا پکانے کے سامان کے علاوہ کافی اور چینی بھی موجود تھی۔ لبنیٰ اس وقت موجود نہیں تھیں اس لئے ہم نے انہیں دعوت دی کہ وہ خود ہی کافی بنا لیں۔ انہوں نے خوشی خوشی بلیک کافی بنائی پھر ہمارے لئے بھی ایک مگ تیار کیا۔ انہوں نے کافی نوش کی اور ہم نے زہر مار کی۔ چینی اور دودھ کے بغیر گاڑھی سی کافی کا حلق سے اتارنا ہی ہمارے لئے بہت بڑا مسئلہ تھا۔

کافی پی کر انہوں نے قمیص کی جیب سے ایک پوٹلی نما چیز نکالی۔ اس میں سگریٹ بنانے کا کاغذ اور تمباکو لپٹا ہوا تھا۔ انہوں نے خاصے غور و خوض کے بعد ایک نہایت پتلی سی ہینڈ میڈ سگریٹ بنائی اور دوسری جیب سے لائٹر نکال کر اسے سلگایا۔ کافی اور سگریٹ کے نشے نے انہیں مسرور کر دیا مگر ہم ان کے جواب کے منتظر رہے۔

"آپ نے ہمیں بجٹ نہیں بتایا۔ آخر کل خرچہ کتنا ہو گا؟"

جواب میں انہوں نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بار بار گھڑی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ابھی تک انہوں نے گفتگو کے نام پر ہم سے ایک لفظ تک نہیں بولا تھا۔ حرکتیں البتہ عجیب و غریب کر رہے تھے۔ مثلاً انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چھیتچر سے چمڑے کے بیگ میں سے ایک واک مین نکال کر اپنے کانوں پر لگا لیا اور جھومنا شروع کر دیا۔ ہمیں تو فکر پیدا ہو گئی کہ کہیں یہ دماغی امراض کا کوئی مریض تو نہیں ہے جو کسی سے ہمارا پتا لے کر آ گیا ہے۔ گھر میں ابھی فون بھی نصب نہیں ہوا تھا اور اگر ہوتا بھی تو ہم کسے کرتے۔ کسی کا پتا نشان یا فون نمبر ہمیں معلوم نہ تھا۔ سوچا پڑوسیوں کے پاس جا کر امداد کی درخواست کریں۔ یہ سوچ کر ان کی نظر بچا کر باہر نکلے۔ ہمارے برابر والے گھر میں ایک امریکی رہتے تھے۔ دونوں میاں بیوی غائب تھے۔ بظاہر تو یوں لگتا تھا جیسے سبھی گھر خالی ہیں اور پھر یہ بھی کچھ عجیب سا لگا کہ گھنٹی بجا کر کسی انجان شخص کو گھر کے اندر سے طلب کریں اور پھر اسے بتائیں کہ ہمارے گھر میں ایک پاگل نے بسیرا کر لیا ہے۔ مجبوراً دوبارہ صبر و شکر کیا اور گھر میں چلے گئے۔ وہاں موصوف بدستور موسیقی کی دنیا میں کھوئے

ہوئے تھے۔ ہم نے چند بار انہیں "ایکسکیوزمی۔" کہہ کر مخاطب کیا مگر توبہ کیجئے۔ وہ تو جیسے ہوش و خرو سے بے گانہ ہو گئے تھے۔

چند منٹ بعد کسی نے کال بیل بجائی تو ہم اچھل پڑے۔ بھاگے بھاگے دروازے پر گئے تو وہاں ایک سراپا بہار خاتون جینز اور قمیص میں ملبوس کمر پر ہاتھ ٹکائے کھڑی تھیں۔ سیاہ بال۔ سیاہ آنکھیں مگر رنگت گوری۔ بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ ہمیں دیکھا تو مسکرائیں، گھر کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔ "آپ یہاں رہتے ہیں۔ نئے آئے ہیں؟"

ہم نے سر ہلایا۔

انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک پرچی کو دیکھا اور پوچھا۔ "آپ کا نام علی ہے۔ آپ نے رنگ و روغن کرانے کے سلسلے میں فون کیا تھا؟"

"بالکل بالکل۔" ہم نے کہا اور سوچا اب صحیح بندہ دستیاب ہوا ہے۔

وہ بولیں۔ "میرے گرینڈ فادر آپ کے گھر میں ہیں؟"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ "آپ کے گرینڈ فادر؟"

"وہ رنگ و روغن کے ایکسپرٹ ہیں۔ اندر میوزک سن رہے ہوں گے؟"

اب ہمیں احساس ہوا کہ یہ حسینہ ان بزرگ کی پوتی یا نواسی ہیں جنہیں ہم پاگل سمجھ رہے تھے۔

"مگر وہ تو کچھ بولتے ہی نہیں۔ آپ نے انہیں کیوں بھیج دیا؟"

"وہ بولتے نہیں ہیں۔ صرف کام کرتے ہیں۔"

"چپکے چپکے؟"

"آپ مجھے ان کے پاس لے چلیں۔"

ہم انہیں اندر لے گئے جہاں بزرگوار بدستور موسیقی سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ نواسی کی آمد کا بھی انہیں علم نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ لڑکی نے ان کے کان سے "واک مین" نکال لیا اور وہ چونک پڑے۔ لڑکی کی طرف دیکھا تو دانتوں کے بغیر ایک شاندار مسکراہٹ پیش کی اور اس کے بعد ان دونوں کے درمیان باتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں کسی فیصلے پر پہنچے اور اب صاحب زادی ہم سے مخاطب ہوئیں۔ "دیکھو علی۔ گرینڈ پا کہتے ہیں کہ کام بہت زیادہ ہے۔ کم سے کم دو دن لگیں گے۔" پھر انہوں نے خرچہ بھی بیان کر دیا۔ "سامان تم خود لا کر دو گے؟"

ہم نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ سامان گرینڈ پا لے کر آئیں گے۔"

"اوکے اوکے۔ مگر گرینڈ پا کہتے ہیں کہ باقی کاموں میں بھی پورا ایک دن لگ جائے گا۔"

ہم نے کہا۔ "کیا تمہارے گرینڈ پا ہم سے شرماتے ہیں؟ وہ خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتے؟"

"نو انگلش۔ اونلی اسپینش۔" یعنی وہ انگریزی سے نابلد ہیں صرف ہسپانوی جانتے ہیں۔

ہم نے حیران ہو کر گرینڈ پا کو دیکھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ گزشتہ ۴۵ سال سے امریکا میں مقیم ہیں۔ رنگ و روغن اور چھوٹی موٹی مرمتوں کا کام کرتے ہیں مگر اس کے باوجود انہوں نے دو کام کرنے کی قسم کھائی ہے۔

"وہ کیا؟"

"ایک تو یہ کہ انگریزی نہیں سیکھیں گے اور دوسری یہ کہ گرین کارڈ حاصل نہیں کریں گے۔"

"تو پھر یہ کام کیسے کرتے ہیں؟"

"وہ آپ خود ہی دیکھ لیں گے۔"

اور دوسرے دن ہم نے دیکھ بھی لیا۔ گرینڈپا اپنے مددگار کے طور پر اپنا کوئی بیٹا، پوتا یا نواسا ضرور ساتھ رکھتے تھے۔ وہی ان کا اسسٹنٹ ہوتا تھا اور وہی ان کے مترجم کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ جیسے کراچی میں ہر گدھا گاڑی کے ساتھ ایک "پخ" ہوتی ہے۔ امریکا میں گرینڈپا کے ساتھ بھی ایک "پخ" ہوا کرتی تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی "پخ" سے زیادہ کام بھی نہیں لیا کرتے تھے۔

دوسرے دن سے ان کی نواسی ان کا سایہ بن کر ساتھ لگ گئیں۔ ان کا نام ہمیں یاد نہیں رہا مگر بہت خوش شکل اور باتونی لڑکی تھی۔

ہم نے پوچھا۔ "تم جو گرینڈپا کے ساتھ چلی آتی ہو تو تمہارا نقصان نہیں ہوتا؟"

بولی۔ "نہیں۔ میں رات کے وقت ایک کمرے میں کام کرتے ہوں اور پھر گرینڈپا بھی مجھے معقول رقم ادا کر دیتے ہیں۔"

کیونکہ گرینڈپا امریکی شہری نہیں تھے اس لئے بہت سی سہولتوں سے محروم تھے۔ سب سے بڑھ کر تو یہ کہ انہیں امریکیوں کے مقابلے میں فی گھنٹا اجرت بہت کم ملتی تھی۔ مگر گرینڈپا کو یہ نقصان گوارا تھا۔ امریکی شہری کہلوانا گوارا نہیں تھا' ان کا خاندان میکسیکو سے امریکا آیا تھا۔ باقی لوگ تو امریکی بن گئے تھے مگر گرینڈپا اپنی ضد پر قائم تھے۔ وہ اپنے خاندان کے سربراہ بھی تھے اس لئے ان کی بات سبھی مانتے تھے۔ انہوں نے ایک اصول یہ بھی بنا رکھا تھا کہ ان کی اولاد میں سے کوئی کسی غیر ہسپانوی سے شادی نہیں کرے گا۔ شروع شروع میں تو ان بے چاروں کو شادی کے لئے میکسیکو جانا پڑتا تھا مگر جب وقت کے ساتھ ساتھ امریکا میں ہسپانویوں کی آبادی بڑھ گئی تو پھر امریکا ہی میں شادی بیاہ ہونے لگے۔ "خاندانی نظام" کا یہ نمونہ آج کل پاکستان میں بھی نظر نہیں آتا ہے۔

تیسرے دن گرینڈپا نے سارا کام ختم کر دیا۔ اب گھر کو دھونے کی ذمہ داری تھی۔ ہم تو ریستوران چلے گئے مگر لبنیٰ نے دو قسطوں میں سارے گھر کے قالین دھو کر خشک بھی کر دیئے۔ اسی اثنا میں ہم ضروری فرنیچر بھی تلاش کرتے رہے۔ لغی صاحب نے مشورہ دیا کہ بازار سے خریدنے کے بجائے۔ "ہارڈ سیل" سے لیں تو بہت سستا پڑے گا۔ مگر لبنیٰ کو یہ آئیڈیا پسند نہیں آیا۔ بولیں "یہ تو اسی طرح ہے جیسے لنڈا بازار سے سامان خرید لیا۔"

☆ ☆ ☆

پڑوس میں ایک مس جم رہا کرتی تھیں۔ چند روز کے بعد وہ رخصت ہونے والی تھیں۔ انہوں نے کچھ فرنیچر اور لیمپ ہمیں دکھائے اور ساتھ ہی ان کی رسیدیں بھی دکھائیں۔ مطلب یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ سامان زیادہ استعمال نہیں ہوا ہے۔ قریب قریب نیا ہے۔ قیمت بھی اتنی کم تھی کہ ہمیں تو یقین نہیں آیا مگر لبنیٰ نے دیسی دستور کے مطابق مول تول شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ اسی قیمت پر سامان فروخت کرنے پر رضامند ہو گئیں۔ دراصل مشکل یہ ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سامان لے جانے کے اخراجات کے مقابلے میں نیا سامان خرید لینا زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ اسی لئے امریکی اپنا فالتو سامان "ہارڈ سیل" کے ذریعے فروخت کر دیتے ہیں۔ یعنی کسی گھر کے لان یا کھلی جگہ پر آس پاس کے لوگ فالتو سامان لا کر رکھ دیتے ہیں جو اونے پونے فروخت ہوتا ہے۔ زیادہ سامان رکھنے

کی ان کے گھروں میں گنجائش بھی نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ لوگ کاٹھ کباڑ اکٹھا کرنے کے عادی ہیں کیونکہ آئے دن گھر بدلتے رہتے ہیں۔ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے جو گھر سے رخصت ہوتے وقت بہت سا سامان نیچے فٹ پاتھ پر چھوڑ جاتے ہیں اور تجربہ کار ضرورت مند فوراً اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

اب ہمیں امریکا میں بزنس بھی مل گیا تھا اور گھر بھی۔ گھریلو ضرورت کی چیزیں بھی اکٹھی ہو گئی تھیں سوچا کہ باقی کے متعلق بعد میں سوچیں گے۔

چنانچہ جس روز ہم اپنے گھر میں ذاتی بستروں پر سوئے تو اس کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ کافی عرصے کے بعد ہمیں "اپنا گھر" میسر آیا تھا اور وہ بھی امریکا میں۔ رات کو بارہ ایک بجے تک ٹی وی پروگرام دیکھتے رہے اور چائے پیتے رہے کیونکہ چائے کا لطف امریکا میں صرف اپنے گھر میں آتا ہے یا دوسرے پاکستانیوں کے گھر میں۔

رات کو ڈھائی بجے کے قریب اچانک بے ہنگم شور کی وجہ سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ معاملہ کیا ہے پھر احساس ہوا کہ شور کی آواز نیچے مین دروازے سے آ رہی ہے۔ روشنیاں ہم نے بجھا رکھی تھیں۔ ہتھیار نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی اور اگر ہوتی بھی تو ہم کیا کر لیتے؟ ڈرتے ڈرتے ہم نے سیڑھیوں سے جھانک کر دیکھا تو دروازے کے باہر ایک ہیولا نظر آیا۔ وہ شخص گھر کے دونوں تالے کھول چکا تھا اور اب اس زنجیر سے نبرد آزما تھا جو احتیاط کے طور پر ہر امریکی اپنے دروازے میں لگانا فرض سمجھتا ہے۔ کچھ نہ پوچھئے کہ ڈر کے مارے ہمارا کیا حال ہوا۔ بچیاں اپنے کمرے میں بے خبر سو رہی تھیں۔ صرف ہم دونوں جاگ رہے تھے اور یہ دعا کر رہے تھے کہ کاش کوئی پڑوسی یہ شور و غل سن کر مدد کے لئے آ جائے۔ پر ہمیں معلوم تھا کہ امریکی عموماً اپنے پاس اسلحہ رکھتے ہیں اور ایسے موقعوں پر قانون نے انہیں اسلحہ استعمال کرنے کی اجازت بھی دے رکھی ہے۔ کافی دیر گزر گئی مگر نہ تو کوئی پڑوسی جاگا اور نہ ہی دروازے کی زنجیر نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ ڈر کے مارے ہمارا برا حال تھا مگر سوائے دعا کے کیا کر سکتے تھے؟ لبنیٰ نے مشورہ دیا کہ گھر کی روشنیاں جلا دو۔ چور یا ڈاکو سمجھے گا کہ گھر والے جاگ گئے ہیں اور بھاگ جائے گا۔ مگر ہم انہیں کیا بتاتے کہ امریکی چور ڈاکو اتنے معصوم اور سادہ دل نہیں ہوتے۔ وہ بے جھجک گولی چلانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

قریباً ایک گھنٹے کے بعد یہ ہنگامہ ختم ہو گیا اور جو کوئی بھی دروازے پر موجود تھا وہ بڑبڑاتا ہوا رخصت ہو گیا۔ مگر ہمیں ساری رات نیند نہیں آئی۔ دو دن پہلے ہمارے گھر میں فون نصب ہو چکا تھا۔ چنانچہ صبح ہوتے ہی ہم نے سب سے پہلے تو علیمی صاحب کو اس حادثے سے آگاہ کیا اور ان کا مشورہ طلب کیا۔

"فوراً پولیس کو فون کریں۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں پولیس کا نمبر موجود ہے۔"

ایک مہذب آواز نے ہمارا ٹیلی فون سنا۔ روداد سنی اور پوچھا۔ "اس وقت آپ کہاں ہیں؟"

ہم نے بتایا کہ ابھی تک گھر کے اندر بند بیٹھے ہیں۔ پولیس افسر نے ہمارا پتا دریافت کیا اور دو تین منٹ بعد ہی پولیس کی کار سائرن بجاتی ہوئی ہمارے سامنے والی پارکنگ میں پہنچ گئی۔ ہم نے دروازے کی زنجیر کھولی اور پولیس افسر کو دروازہ دکھایا۔ دروازے کے دونوں قفل کھولے جا چکے تھے' صرف لوہے کی زنجیر نے ہماری حفاظت کی تھی۔

پولیس افسر آس پاس گھوم کر دیکھتا اور معلومات حاصل کرتا رہا پھر وہ ہمارے پاس آیا۔ ہم نے کہا۔ "آفیسر یہ تو بہت اچھا علاقہ ہے' اگر یہاں بھی کوئی محفوظ نہیں ہے تو پھر جگہ بدل لینی چاہئے۔"

پولیس والا خاصا فلسفی تھا۔ بولا۔ "محفوظ تو کوئی سی جگہ بھی نہیں ہے۔ بس قسمت کو دعائیں دیں۔"

"مگر ہم کیا کریں؟"

اس نے جیب سے کاپی نکال کر رپورٹ لکھی اور اس پر ہمارے دستخط کرائے۔

پھر کہا۔ "مسٹر آفاقی۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل یہ حرکت یہاں آپ سے پہلے رہنے والی خاتون کے کسی بوائے فرینڈ کی ہے۔ کیونکہ اس شخص کے پاس دونوں تالوں کی چابیاں تھیں۔ وہ نشے میں مدہوش تھا اس لئے اپنی دوست کو آوازیں دیتا رہا اور زنجیر ہٹانے کی جدوجہد میں بھی مصروف رہا۔ کوئی اناڑی سے اناڑی چور ڈاکو بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔"

"تو پھر ہمارے لئے کیا مشورہ ہے؟"

"میں نے آپ کی رپورٹ لکھ لی ہے۔ آس پاس والوں نے یہی بتایا ہے کہ اس گھر

میں مختلف لوگوں کی آمدورفت تھی۔ آپ پہلا کام تو یہ کریں کہ دروازے کے دونوں قفل بدل دیں تاکہ اگر کسی کے پاس چابی ہو بھی تو وہ ناکارہ ہو جائے۔"

"مگر آنے والوں کو ہم کیا کہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ وہ خود بخود آنا چھوڑ دیں گے۔ ایک دو روز کے اندر سبھی کو اس خاتون کے یہاں سے رخصت ہو جانے کی خبر ہو جائے گی۔ ظاہر ہے پھر کوئی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔"

مشورہ معقول تھا اس لئے ہم نے مان لیا۔ سب سے پہلے تو ان ہی ہسپانوی صاحب کو فون کیا جو اتفاق سے خود بزرگوار نے ہی اٹھایا۔ چند منٹ تک لاحاصل گفتگو جاری رہی یہاں تک کہ انہوں نے جھنجھلا کر فون اپنی نواسی کے حوالے کر دیا جو ہمیں فوراً پہچان گئیں اور وعدہ کیا کہ وہ بلا تاخیر گرینڈپا اور دو عدد تالے لے کر ہمارے گھر پہنچ جائیں گی۔ خیر تالے تو ہمارے بدل گئے مگر ہم بہت دن تک ان خاتون کے بارے میں سوچتے رہے جن سے ہماری اسی گھر میں ملاقات ہوئی تھی اور جو بزعم خود بہت باعزت اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔

گھر کے سامان کی خریداری کے سلسلے میں بھی ہمیں بہت سے دلچسپ انکشافات ہوئے۔

خیر مغربی ملکوں میں یہ رواج تو عام ہے کہ وہ اپنی مصنوعات کو مقبول بنانے کے لئے مفت تقسیم کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ دکانوں میں خوشبو اور میک اپ کے سامان کی دکانیں اس سلسلے میں بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے کا مقابلہ کرتی ہیں۔ انہیں "ٹیسٹر" کہا جاتا ہے۔ یعنی آزمائشی اشیاء۔ اب آزمائشی اشیاء کا یہ حال ہے کہ دکانوں میں ہر قسم کی خوشبو کی شیشیاں سجی ہوئی ہیں۔ خواتین جوق در جوق آتی ہیں اور آزمائش کے طور پر تھوڑی سی خوشبو استعمال کر لیتی ہیں مگر ایسی عورتوں کی بھی کمی نہیں ہے جو بڑی فراخدلی سے اپنے ملبوسات پر خوشبو چھڑکتی ہیں اور پھر رات تک اس خوشبو سے مہکتی رہتی ہیں۔ لپ اسٹک اور نیل پالش کے سلسلے میں بھی یہی طریقہ آزمایا جاتا ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس قسم کی حرکتیں عام طور پر ایشیائی خواتین کرتی ہیں۔

جب سے ہم نے فوڈ سپروائزر کا ڈپلوما حاصل کیا تھا' قدوس صاحب سے ملاقاتیں بہت

کم ہو گئی تھیں۔ ویسے بھی وہ مس ڈورا کے پیار کی ڈور میں بندھ چکے تھے اس لئے بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ ہمیں تو اپنے ریستوران سے فرصت نہیں ملتی تھی اور انہیں سیرو تفریح اور دیگر دلچسپیوں سے۔ پھر بھی وہ گاہے گاہے آجاتے تھے اور تمام خبریں سنا کر چلے جاتے تھے۔ مثلاً اپنی بیوی کے متعلق انہوں نے یہ بتایا کہ وہ موجودہ ریستوران فروخت کر کے ایک بڑا سا ریستوران خریدنے کی فکر میں ہے۔

ہم نے کہا۔ ”بھئی منع کرو اس کو۔ اتنا زیادہ کام وہ کیسے کرے گی؟“

بولا۔ ”اس کی صحت کا راز ہی کام میں ہے بندہ نواز۔ جس روز اسے فرصت مل گئی وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا اور میں اتنی اچھی بیوی سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔“

ان کی بیگم کو ابھی تک ان کے اور مس ڈورا کے تعلقات کا علم نہیں ہوا تھا۔ اگر ہوتا بھی تو کیسے اور ہو بھی جاتا تو کون سی قیامت آجاتی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آفاقی صاحب، یقین کریں میری بیوی جنتی عورت ہے۔ فوراً بخشی جائے گی اور جنت میں بھیج دی جائے گی۔ اس کے طفیل ہو سکتا ہے کہ مجھے بھی بخشش مل جائے۔ مس ڈورا کے ساتھ ان کے شب و روز بہت آرام اور سکون سے گزر رہے تھے۔ ان کے خیال میں فی الحال دو چار ماہ تک کسی قسم کے جھگڑے کا امکان نہ تھا، بس یہ ڈر تھا کہ کہیں مس ڈورا اچانک کسی اور کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔ جس کے امکانات بہت روشن تھے۔

قدوس صاحب نے جب سنا کہ ہم اپنے گھر کے لئے فرنیچر وغیرہ خریدنے کے لئے فکر مند ہو رہے ہیں تو وہ سخت فکر مند ہو گئے۔ ایک روز خاص طور پر ہمیں سمجھانے کے لئے ریستوران آئے اور بہت کار آمد مشورے دیئے۔ سب سے پہلے تو یہ کہا کہ فرنیچر وغیرہ خریدنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“

”تو کیا کرائے پر لے آئیں؟“ ہم نے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگے۔ ”بندہ نواز، کرائے پر فرنیچر لینے والے بے وقوف ہوتے ہیں اور خریدنے والے احمق۔“

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ ”تو پھر عقلمند کون ہوتے ہیں؟“

”وہ ہم جیسے لوگ ہوتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ میں کب سے امریکا میں رہتا ہوں مگر آج تک نہ تو فرنیچر خریدا اور نہ ہی ٹیلی ویژن۔“

”ان چیزوں کے بغیر آپ کا گزارا کیسے ہو جاتا ہے؟“ ہم نے دریافت کیا۔

”بندہ نواز، اگر تھوڑی سی عقل پاس ہو تو ان امریکیوں کو بے وقوف بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مثلاً یہاں اکثر بڑے اسٹوروں پر یہ دستور ہے کہ گاہک کوئی بھی چیز خریدنے کے بعد ۲۵ یا ۳۰ دن کے اندر واپس کر سکتا ہے۔“

”کس بنیاد پر؟“

”کسی بھی بنیاد پر۔ بس کہہ دے کہ مجھے پسند نہیں ہے۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ اسٹور لا قانون کے تحت مجبور ہے کہ وہ سامان واپس کرے۔ چنانچہ میں ہر مہینے اپنا سامان بدلتا ہتا ہوں۔ اس طرح میرے گھر کا فرنیچر اور ٹیلی ویژن ہمیشہ برانڈ نیو رہتا ہے۔“

ہم اس قانون سے واقف تو تھے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ یار لوگ اس سے کیوں کر ندہ اٹھاتے ہیں۔ وہاں تو یہ بھی ہوتا ہے کہ سالگرہ کے لئے کیک خرید لائے اور دوسرے ں واپس کر دیا۔ اب یہ بھی ضروری نہیں کہ اس سامان کے عوض کوئی دوسرا سامان خریدا ئے۔ قدوس صاحب نے اپنے طور پر اپنے دوستوں کے ایسے کئی قصے سنائے جنہیں سن کر ہیں امریکا سے ہمدردی پیدا ہو گئی کہ ہمارے بھائی بند بالآخر اس ملک کا کیا حال کریں گے؟ ونکہ ہمارے دکانداروں نے تو پہلے ہی مطلع کر دیا ہوتا ہے کہ خریدی ہوئی اشیاء کسی ت پر واپس نہیں ہوں گی۔

☆ ☆ ☆

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ امریکا میں سب سے زیادہ آمدنی ڈاکٹروں اور وکیلوں کی ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر کے مشورے اور نسخے کے بغیر کوئی دوائی نہیں خریدی جاسکتی اور پھر ڈاکٹروں کی فیس بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ڈاکٹروں کی بھی بے شمار قسمیں ہیں جن میں ماہرین سب سے بالاتر سمجھے جاتے ہیں اور ان کی فیس خدا کی پناہ۔ خواہ ادارہ دے، خواہ انشورنس کمپنی دے یا مریض خود ہی ادا کرے۔ اس میں کسی صورت بھی ایک پیسے تک کی رعایت نہیں ہوتی۔ ویسے بھی وہاں رعایت کرنے کا دستور نہیں ہے اور کم از کم ڈاکٹر کی حد تک تو ہمارے ملک میں بھی ایسا نہیں دیکھا کہ ڈاکٹر نے فیس کی رقم بتائی ہو اور مریض کہے کہ اس میں کچھ رعایت نہیں ہو سکتی؟ شاید اس لئے کہ مریض بھی جانتا ہے کہ یہ معمولی سی رعایت اسے بہت مہنگی بھی پڑ سکتی ہے!

ڈاکٹر کے بعد خوشحالی میں وکیل کا نمبر آتا ہے۔ یہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ اس ملک میں کوئی بھی کام وکیل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ہمارے ملک میں قاضی صاحب کے بغیر شادی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح امریکا میں وکیل کے بغیر زندہ رہنے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں وکیل کی ٹانگ نہ اڑی ہوئی ہو۔

ایک دن ہمیں نغمی صاحب کا فون آیا بولے۔ "آفاقی صاحب۔ آپ امریکا میں سیٹ ہو گئے ہیں۔ کاروبار بھی ماشاء اللہ خوب چل رہا ہے لیکن آپ ایک ضروری کام بھول بیٹھے ہیں۔"

وہ کیا؟" ہم نے پوچھا۔

بولے۔ "وصیت!"

"وصیت؟" ہم نے پریشان ہو کر کہا۔ "وصیت کیسی اور کس کے لئے؟"

بولے۔ "امریکا میں ہر بالغ شخص کو وصیت ضرور لکھوانی پڑتی ہے۔ بلکہ یہ لازمی امر

ہے۔"

ہم نے کہا۔ "بھائی ہمارے ملک میں تو عام طور پر لوگ مرتے وقت وصیت کرتے ں۔ زیادہ دولت مند لوگ اپنی زندگی میں ہی اپنے وارثوں کے لئے وصیت کردیا کرتے ہیں ر ایک عام پاکستانی نے تو کبھی وصیت لکھوانے کے بارے میں سوچا تک نہیں پھر آپ ہم ے وصیت کیوں لکھوانا چاہتے ہیں۔؟"

انہوں نے کہا۔ "میں نے ایک وکیل سے آپ کے لئے بہت مشکل سے ٹائم لیا ہے۔ ں ابھی آپ کو لینے آرہا ہوں۔ باقی باتیں وکیل کی زبانی معلوم ہو جائیں گی۔"

کچھ دیر بعد ہم وکیل صاحب کی عمارت کے سامنے تھے۔ یہ اسپرنگ فیلڈ کے علاقے ں ایک خوبصورت سڑک پر بہت شاندار پانچ منزلہ عمارت تھی۔ لاؤنج میں سنگ مرمر لگے ئے تھے۔ دوسری آرائش بھی کم نہ تھی۔ ہم ایک شاندار اور تیز رفتار لفٹ کے ذریعے تھی منزل پر پہنچ گئے۔ کمرا نمبر ۴۰۸ میں وکیل صاحب کا دفتر تھا۔ نغمی صاحب نے ہمیں استے میں سمجھا دیا کہ بڑی مشکل سے ان سے صرف پندرہ منٹ کا وقت ملا ہے ورنہ دو ن ماہ تک ملاقات کا کوئی امکان نہیں تھا۔

دفتر ان کا بھی مسٹر پشکی کے دفتر کی طرح شاندار اور باوقار تھا۔ فرق صرف یہ تھا ۔ یہ بذات خود عمر میں مسٹر پشکی سے آدھے تھے اور ان کی سیکرٹری مسٹر پشکی کی رٹری کے مقابلے میں سو فیصد بڑھ چڑھ کر تھیں۔ پہلے ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہم براہ ست مسٹر پشکی کے پاس ہی کیوں نہ چلے گئے؟ وجہ یہ تھی کہ مسٹر پشکی کو نزلہ ہو یا تھا۔ وہ دفتر سے غیر حاضر تھے اور ان کی سیکرٹری نے بتایا کہ وہ مزید ایک ہفتے تک گھر ے باہر نہیں نکلیں گے۔ ہم تو گھبرا گئے کہ انہیں نزلہ ہوا ہے یا کہ گھر میں نظر بند رہنے کی ا ملی ہے۔ مگر محمد علی نے بتایا کہ نزلہ، زکام امریکیوں کے لئے انتہائی جان لیوا مرض ہیں ں کو نزلہ ہوتا ہے وہ فوراً گھر کے اندر بند ہو کر بیٹھ جاتا ہے تاکہ جراثیم دوسروں تک نہ سکیں۔ نزلہ زکام کی شدت سے بہت سے لوگ مر بھی جاتے ہیں۔ ہم تو یہ سن کر بہت ے کہ بقول غالب ؎

دھمکی سے مر گیا جو نہ باب نبرد تھا

بھلا نزلہ اور زکام سے مرنے کی کیا تک ہے۔ یہ وہ بیماریاں ہیں جو بارہ مہینے ہمارے

ملک میں عام رہتی ہیں اور لوگ بڑی فراخ دلی سے ان کے جراثیم دوسروں کو تقسیم کرتے پھرتے ہیں۔ بہرحال ہم نے اپنے ملک میں کبھی کسی کو نزلہ زکام سے ہلاک ہوتے ہوئے نہ دیکھا' نہ سنا۔ ادھر مسٹر پشکی تھے جنہوں نے دنیا سے کنارہ کرلیا تھا اور وصیت بھی اپ ٹو ڈیٹ کردی تھی۔

امریکا میں آپ کی پہلی ملاقات سیکرٹری سے ہوتی ہے۔ براہ راست کسی سے ملنا ممکن نہیں ہے۔

یہاں بھی ایک خوش جمال سیکرٹری جو نہایت معقول لباس کے باوجود بے حد اچھی لگ رہی تھیں ہماری پذیرائی کے لئے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی آگئیں۔ نغمی صاحب سے وہ بخوبی واقف تھیں اس لئے ضرورت سے زیادہ مسکرا کر ملیں۔ پھر ہماری جانب بھی ایک نگاہ غلط انداز ڈال لی۔ مزید توجہ کی ضرورت نہ تھی کیونکہ جانتی تھیں کہ وکیل سے بچ کر کہاں جائے گا۔

''میرا نام جونز ہے اور آپ کا؟''

ہم نے اپنا نام بتایا۔ بولیں۔ ''اوہ یاد آیا۔ آپ ہی اپنی وصیت لکھوانے کے لئے آئے ہیں؟''

ہمیں یوں لگا جیسے وہ ہم سے اظہار ہمدردی کر رہی ہیں۔ ہمارے ملک میں تو وصیت لکھوانا زندگی کا سب سے آخری فرض ہوتا ہے اور یہ فرض بھی ہر کوئی ادا نہیں کرتا۔ ایک ان جانے سے خوف نے ہمیں گھیر لیا۔ لاحول ولا قوۃ ۔ یہ کیا بات ہوئی کہ اچھا بھلا' تندرست آدمی' اپنی وصیت لکھوانے پر تل جائے' یوں تو انسان کی نفسیاتی موت واقع ہو جاتی ہے مگر امریکا میں لوگ ہنس کھیل کر وصیت لکھواتے ہیں۔ مس جونز نے قدرے گہری نگاہوں سے ہمارا جائزہ لیا جیسے خاموشی کی زبان سے کہہ رہی ہوں کہ ابھی آپ کی وصیت لکھوانے کی عمر تو نہیں ہے۔

ہم نے اپنا ڈر دور کرنے کے لئے نغمی صاحب سے اردو میں کہا ''ان کی شکل ہالی ووڈ کی اداکارہ ڈیبی رینالڈز سے ملتی ہے۔ حیرت ہے کہ یہ اداکارہ کیوں نہ بن گئیں؟''

نغمی صاحب نے کہا ''حضور والا۔ اداکارہ بننا یہاں ہر لڑکی کا خواب ہے مگر تعبیر ہر ایک کو نہیں ملتی۔ اگر خوب صورتی ہی معیار ٹھہرے تو پھر امریکا میں تو ہیروئنوں کی تعداد لاکھوں

تک پہنچ جائے۔''

پھر انہوں نے مس جونز کو ہماری رائے سے آگاہ کیا۔ وہ صوفے کے نزدیک ہی کھڑی ہوئی تھیں' یہ سن کر ایک دم بیٹھ گئیں اور عقیدت بھری نگاہوں سے ہمیں دیکھنے لگیں۔ کچھ دیر آنکھیں جھپکاتی رہیں پھر بولیں۔ ''کاش اللہ نے آپ کو فلم پروڈیوسر بنایا ہوتا تو میری تقدیر سنور جاتی۔''

نغمی صاحب نے فوراً انہیں مطلع کیا کہ یہ اپنے ملک میں فلم پروڈیوسر ہی ہیں۔ یہ سن کر تو وہ بالکل ہی اٹین شن ہو گئیں' بولیں۔ ''مسٹر اسکاٹ تو ابھی ایک انڈین کے ساتھ مصروف ہیں۔ اتنی دیر میں ہی آپ سے باتیں کیوں نہ کرلوں۔''

ہم نے بڑے اطمینان سے کہا ''کوئی مضائقہ نہیں ہے۔''

اب انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ پاکستان سے کب آئے ہیں۔ کیوں آئے ہیں؟ کیا یہاں بھی فلم بنانے آئے ہیں۔ فلم بنائیں گے تو کہاں بنائیں گے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے مناسب الفاظ میں ان کے سوالات کا جواب دیا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ہمیں مارے خوشی کے اپنی گود میں بٹھالیں۔ بار بار ہمارے گرد گھوم رہی تھیں اور قریب قریب ویسے ہی حرکتیں کر رہی تھیں جنہیں ہم واری صدقے جانا کہتے ہیں۔ شکر ہے کہ مسٹر اسکاٹ کو فرصت مل گئی اور انہوں نے انٹرکام پر مس جونز سے کہا کہ وہ اگلے موکل کو ان کے کمرے میں بھیج دیں۔ مس جونز نے بڑی حسرت سے ہمیں دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ ابھی توکچھ بات ہی نہ ہو پائی تھی کہ فلک نے چھین لیا ہے۔ بہرحال ہم مسٹر اسکاٹ کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ کافی کشادہ اور روشن کمرا تھا اور نہایت شاندار۔ نغمی صاحب سے وہ بہت گرم جوشی سے ملے۔ انہوں نے ہمارا تعارف کرایا تو مس جونز سے رہا نہ گیا اور وہ بے اختیار بول پڑیں۔ ''سر۔ مسٹر آفاقی فلم پروڈیوسر ہیں۔ پاکستان میں فلمیں بناتے ہیں۔''

یہ سن کر مسٹر اسکاٹ بھی قدرے ملتفت ہوئے۔ بولے ''پہلے تو ہم بزنس کی بات کر لیں۔ آپ اپنی وصیت لکھوانا چاہتے ہیں؟''

ہم نے کہا ''ہم تو نہیں چاہتے مگر نغمی صاحب کا اصرار ہے کہ یہ ضروری ہے۔''

مسٹر اسکاٹ نے ہمیں سمجھایا کہ یہ واقعی ضروری ہے۔ امریکا میں ہر شخص کو اپنی وصیت لکھوائی پڑتی ہے کہ اچانک حادثے کی صورت میں اس کے لین دین' کاروبار' جائیداد

اور دولت کا کون ذمے دار ہو گا۔"

"مگر اس کی ضرورت کیا ہے؟" ہم نے کہا۔

"دیکھئے نا۔ فرض کیجئے کہ آپ کو اچانک کچھ ہو جاتا ہے تو پھر آپ کے کاروبار کا کون ذمے دار ہو گا اور حکومت کے واجبات کون ادا کرے گا۔"

ہم نے کہا "ہماری مسز موجود ہیں۔"

بولے "مگر ایسا حادثہ تو ان کے ساتھ بھی پیش آ سکتا ہے تو پھر آپ کی بچیوں کا کیا ہو گا؟ انہیں کس کے سپرد کیا جائے؟ کون ان کی دیکھ بھال کرے گا؟"

ہمارا تو دل کانپ کر رہ گیا۔

"اپنے دو قریبی عزیزوں کا نام اور پتا بتایئے۔"

ہم نے دماغ پر بہت زور ڈالا مگر سارے امریکا میں ایک بھی قریبی عزیز نظر نہ آیا۔ قریب ترین عزیز ہمارا بھانجا تھا جو لندن میں تھا۔ چنانچہ ہم نے اس کا نام اور پتا بتا دیا۔ فون نمبر بھی لکھوا دیا۔

"اب دوسرے عزیز کا نام بتایئے؟"

دوسرا قریبی عزیز ہمیں پاکستان کے علاوہ کہیں نظر نہیں آیا چنانچہ ہم نے اپنے چھوٹے بھائی کا نام اور اسلام آباد کا پتا اور فون نمبر بتا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے چند سوالات اور دریافت کئے اور کہا "یہ تو میں نے نوٹس بنائے ہیں۔ اگلی بار آپ کو مسز کے ساتھ آنا ہو گا۔ اس وقت میں آپ کو وصیت کا ڈرافٹ بھی دکھا دوں گا۔"

اس کے بعد معاوضے کی بات شروع ہوئی' بولے "آپ فکسڈ فیس ادا کرنا پسند کریں گے یا فی گھنٹا کے حساب سے؟"

ہم بہت حیران ہوئے۔ وکیل کی فیس اور فی گھنٹا؟

"دیکھئے میری فیس ۷۵ ڈالر فی گھنٹا ہے۔"

ہم نے کہا "مگر یہ کیسے پتا چلے گا کہ آپ واقعی اتنے گھنٹے میرا ہی کام کریں گے؟"

وہ ہنسنے لگا "اچھا مذاق ہے۔ ارے بھئی ظاہر ہے کہ جب تک آپ کے کام میں مصروف رہیں گے آپ کا میٹر چلتا رہے گا۔ جب آپ کا کام ختم ہو جائے گا تو کسی اور کا میٹر چلنا شروع ہو جائے گا۔ بس یہ ٹیکسی کے میٹر والا معاملہ ہے۔"

یہ حساب ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' وہ بولے "دیکھئے آپ سے میں نے ابھی پانچ ہزار ڈالر فیس طے کر لی مگر بعد میں کام کی نوعیت مختلف ہو گئی تو اس میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔"

ہمارے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ یا الٰہی' وصیت لکھوانے کی اتنی بھاری فیس!

نغمی صاحب نے ہمیں مشورہ دیا کہ فی گھنٹے کا حساب صحیح رہے گا۔ عقلمند لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم رضامند ہو گئے۔ ڈاؤن پے منٹ کے طور پر انہیں پچاس ڈالر کا چیک بھی پیش کر دیا۔ اتنی دیر میں مس جونز مسٹر اسکاٹ کے کہے بغیر دو بار کافی اور بسکٹ لے کر آ چکی تھیں۔

مسٹر اسکاٹ نے کہا "چلئے یہ بات تو ختم ہوئی۔ اب ذرا فلموں کی بات ہو جائے۔ مجھے بھی فلمیں بہت پسند ہیں۔"

اس کے بعد تو اتنی لمبی گفتگو شروع ہو گئی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ ہالی ووڈ' فرانس' انگلستان' جرمنی اور انڈیا سے لے کر پاکستان تک ہر جگہ کی فلمیں' فلمساز اور اداکار زیر بحث آ گئے۔ یہ محفل ایک گھنٹے سے بھی زیادہ دیر تک جمی رہی۔ مسٹر اسکاٹ نے رخصت ہوتے ہوئے ہم سے کہا کہ کبھی وقت نکال کر ضرور ادھر آ جایا کیجئے۔ میں بہت ممنون ہوں گا۔ مسٹر اسکاٹ کافی دلچسپ آدمی تھے۔ صورت شکل بھی اچھی تھی۔ جب ہم نے انہیں بتایا کہ ان کی صورت اداکار "کلین فورڈ" سے ملتی ہے تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے' کہنے لگے "مجھے کچھ اور لوگوں نے بھی یہ بتایا ہے" پھر اپنی سیکرٹری سے مخاطب ہو کر کہا "جونز۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

جونز نے انہیں بغور دیکھا پھر کہا "مسٹر اسکاٹ۔ آپ کی شکل میں کئی اداکاروں کی شباہت آتی ہے۔ میں کسی ایک کے بارے میں نہیں کہہ سکتی۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ دیکھنے میں اداکار لگتے ہیں۔"

انہوں نے کہا "جونز۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہ بات تم نے مجھے پہلے کبھی نہیں بتائی اور مسٹر آفاقی نے پہلی ملاقات میں اندازہ لگا لیا۔"

وہ بولیں "سر۔ مسٹر آفاقی تو پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ہیں۔ ان کی نگاہ میں اور دوسروں کی نگاہوں میں بہت فرق ہے۔"

اگلی ملاقات کا وعدہ کر کے ہم لوگوں نے اجازت طلب کی۔ نغمی صاحب بہت خوش تھے کہ ایک بہت اچھے وکیل کے ساتھ ہمارے گہرے مراسم قائم ہو گئے ہیں۔ اب یہ وصیت خوب دل لگا کر لکھے گا۔

ہم نے کہا "مگر بھائی نغمی! اس وصیت کی ضرورت کیا ہے آخر؟"

بولے "یہ ضروری بلکہ لازمی چیز ہے۔ ہر بالغ شخص اپنی وصیت لکھواتا ہے۔ میں نے اور آپ کی بھابی نے بھی وصیت لکھوا رکھی ہے۔ دراصل یہاں مرنے کے بعد بہت جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلے تو قرض خواہوں کو ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔ پھر حکومت کے ٹیکس ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے واجبات ہیں۔"

ہم نے کہا "گویا وصیت کا فائدہ تو لین داروں کو ہوتا ہے۔ وصیت لکھوانے والا غریب تو مصیبت میں پھنس جاتا ہے۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔ بعض اوقات تو حساب کتاب کے بعد جو بقایا نکلتا ہے وہ زندہ رہ جانے والے کو ادا کرنا پڑتا ہے۔"

ہم تو بہت پریشان ہو گئے۔ عجیب ملک ہے جہاں زندہ رہنے کے مسائل الگ ہیں مگر مرنا بھی کچھ آسان نہیں ہے۔ یعنی مرنے والے کو بعد از مرگ بھی معاف نہیں کرتے۔ ایک ہم لوگ ہیں کہ کسی کی آنکھ بند ہوتے ہی نہ صرف اس کا کہا سنا اور غلطیاں معاف کر دیتے ہیں بلکہ بہت سے لوگ تو اپنے قرضے بھی معاف کر دیتے ہیں تاکہ مرنے والے کی روح کو سکون اور ثواب ملے۔

مس جونز کی دلچسپی کا ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں۔ انہوں نے ایک دن ہمیں رات کے کھانے کی دعوت دی تو ہم نے جواب میں انہیں اپنے ریستوران "نادوز" میں مدعو کر لیا۔

بولیں "دراصل یہ ڈنر میری جانب سے ہو گا اور پھر اپنے ریستوران میں آپ فراغت اور سکون سے بات بھی نہ کر سکیں گے۔"

چنانچہ ہمارے ریستوران کے نزدیک ہی فیر فیکس ہوٹل میں کھانے کا وقت مقرر ہو گیا۔ ہم نے سام کو بتا دیا کہ رات کے کھانے پر ہم کہیں اور جائیں گے۔ کاروبار کا دھیان رکھنا۔

وہ مسکرایا' بولا "ڈیٹ ہے؟"

ہم نے کہا "بس یہی سمجھ لو۔"

بولا "مسٹر آفاقی۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ بھی اب امریکی بنتے جا رہے ہیں۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔"

ہم نے کہا "بھائی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس ایک ملاقات ہے۔"

فیر فیکس ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا۔ پیدل ہی پہنچ گئے۔ مس جونز وہاں ہم سے پہلے موجود تھیں یا یوں کہئے کہ گھومنے والے دروازے سے جب ہم اندر داخل ہوئے' اسی وقت وہ بھی اندر داخل ہوئیں۔ ان کی خوبصورتی میں تو کوئی کلام نہیں تھا مگر اس وقت کچھ زیادہ ہی جاذب نظر لگ رہی تھیں۔ شاید اس لئے کہ انہیں غور سے دیکھنے کی فرصت تھی۔

مس جونز نے کاک ٹیل کا آرڈر دیا اور ہم نے کوک کی فرمائش کی۔ وہ بھویں چڑھا کر رہ گئیں۔ پھر کاندھے اچکائے۔ کھانے کے لئے ہم نے "فنگر فش" طلب کی۔ انہیں حلال و حرام کا فلسفہ سمجھانے کا نہ وقت تھا اور نہ ہی ضرورت۔

کچھ دیر تو موسم اور ماحول کی باتیں ہوتی رہیں پھر مس جونز نے فلموں کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ ان کی عمر اس وقت ستائیس اٹھائیس سال ہو گی مگر انہوں نے بتایا کہ چودہ سال کی عمر سے وہ اداکارہ بننے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہ غنیمت ہے کہ انہوں نے ہالی ووڈ کے شراب خانوں اور نائٹ کلبوں کے چکر لگانے کے بجائے تعلیم بھی جاری رکھی۔ والدین نے بھی مالی مدد کی۔ دراصل وہ ایک اچھے متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ مگر جب بھی موقع ملتا تھا وہ ہالی ووڈ اور لاس اینجلس کا پھیرا ضرور لگا لیا کرتی تھیں۔ انہوں نے بہت سی دکانوں' ریستورانوں اور ایجنٹوں کے دفاتر میں کام کیا۔ نہایت چست لباس پہن کر گھومتی رہیں۔ کم سے کم لباس والا نسخہ بھی استعمال کیا۔ لوگ ان کی طرف مائل تو ہوئے مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔ کئی فوٹوگرافرز نے انہیں فریب دیئے۔ فلموں سے تعلق رکھنے والے کئی افراد نے انہیں جھوٹے لارے دیئے۔ انہوں نے ہالی ووڈ کے دستور کے مطابق ایجنٹوں اور فوٹوگرافروں سے دوستیاں بھی کیں اور ان کے ساتھ بھی رہیں۔ نیم عریاں تصاویر بھی بنوائیں مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ یہ سلسلہ مختلف وقفوں سے آٹھ دس سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ چودہ سال سے چوبیس سال کی ہو گئیں۔ ان دس سالوں میں درجنوں لوگوں

سے مراسم رہے۔ دو شادیاں بھی کیں اور تین طلاقیں بھی ہوئیں۔

"وہ کس طرح؟" ہم نے پوچھا۔

بولیں "تیسری شادی عدالت میں ہوئی تھی۔ جج نے میرے ہونے والے شوہر کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ شادی تو ہو چکی تھی مگر اس نے رسمی کارروائی کے بعد مجھے پاس بلایا اور کہا کہ دیکھو لڑکی' یہ شخص اس عدالت کے علاوہ دوسری عدالتوں میں بھی درجنوں شادیاں کر چکا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ ایک دو بار کا سزا یافتہ بھی ہے۔ میں نے ایک جج کی حیثیت میں تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ آگے تم مالک و مختار ہو۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ یہ تمہیں اداکارہ بنا دے گا تو یہ تمہارا خیال خام ہے۔ یہ شخص تمہیں ایکسٹرا تک نہیں بنا سکتا۔ بلکہ یہ تو تم جیسی لڑکیوں کے سہارے بذات خود کچھ بننے کی فکر میں ہے۔"

یہ کتھا سننے کے بعد جب جونز نے اپنے نئے نویلے شوہر سے تصدیق کی تو وہ مسکرایا اور کہا "جونز۔ یہ سب سچ ہے لیکن انسان اور وقت کے بدلنے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے ایک موقع ضرور دو گی۔"

جونز نے کہا "انسان تو بدل سکتا ہے مگر شاید تم بدلنے کے قابل نہیں ہو' اس لئے بہتر ہے کہ اسی وقت مجھے طلاق دے دو۔"

جج تو پہلے ہی اس شادی کے حق میں نہ تھا چنانچہ کھڑے کھڑے طلاق ہو گئی۔

اس اثنا میں کھانا آ گیا مگر بات چیت جاری رہی۔ جونز کو دس سال کے بعد یہ صبر آ گیا تھا کہ اداکارہ بننا اس کی قسمت میں نہیں ہے چنانچہ اس نے دوسرے کاموں کی طرف توجہ دی اور اب گزشتہ تین سال سے مسٹر اسکاٹ کے ساتھ کام کر رہی تھی۔

"کیا اب تم مطمئن ہو؟" ہم نے پوچھا۔

"مسٹر آفاقی۔ جس شخص کے دل میں کوئی لگن ہو وہ اسے پوری کئے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتا' یہی میرا بھی حال ہے۔ ویسے سب ٹھیک ہے مگر دل میں خلش سی رہتی ہے۔ میرے لئے نہ کام کی کمی ہے اور نہ شوہروں کی۔ خود مسٹر اسکاٹ دو بار شادی کی پیش کش کر چکے ہیں۔"

"کیا وہ کنوارے ہیں؟"

"بالکل نہیں۔ مگر بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ ہیں۔ لیکن مجھے موجودہ انتظام زیادہ پسند

ہے۔ میں ان کی آدھی بیوی ہوں مگر ان کی پابند نہیں ہوں' آزاد اور خود مختار ہوں۔"

ہم نے اسے مشورہ دیا کہ اب وہ صبر کرے اور اداکاری کا خیال دل سے نکال کر گھر بسا لے۔

وہ ہنسنے لگی "مسٹر آفاقی۔ میرا اکثر ایشیائیوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ آپ لوگ جس طرح گھر بساتے ہیں اس کا یہاں کوئی تصور نہیں ہے۔ یہاں تو بس کچھ عرصے کا ساتھ ہوتا ہے۔ بہت سے خوش قسمت ایک ساتھ پوری زندگی بھی گزار دیتے ہیں۔ مگر جیسے گزارتے ہیں اس سے نہ گزارنا بہتر ہے۔ بہرحال آپ سے مل کر میرے دل میں دبی ہوئی چنگاری پھر چمک اٹھی ہے۔ آپ مجھے اچھے اور شریف آدمی لگتے ہیں۔ مجھ سے وعدہ کریں کہ اگر یہاں آپ نے کوئی فلم بنائی یا کسی مقامی فلم ساز سے آپ کا واسطہ پڑا تو مجھے ضرور یاد رکھیں گے۔"

ہم نے فوراً وعدہ کر لیا۔ جونز جیسی لڑکیوں کی یورپ اور امریکا میں کمی نہیں ہے۔ انہیں دیکھ کر ہم خود بھی اکثر سوچا کرتے ہیں کہ ہماری خوب صورت ترین ہیروئنیں ان کے مقابلے میں خاک پا بھی نہیں ہیں۔ رہی اداکاری کی صلاحیت تو وہ ہماری بیشتر ہیروئنوں میں ناپید ہے۔ بلکہ مغرب کے لوگ قدرتی اور فطری طور پر اداکار ہوتے ہیں۔ وہ روزمرہ کی زندگی میں بھی اداکاری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر یہ ہزاروں لاکھوں حسینائیں آخر اداکارہ کیوں نہیں بن سکتیں؟ یہ معما آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

جونز ایک پڑھی لکھی اور شائستہ لڑکی تھی۔ باتیں بھی اچھی کرتی تھی۔ اگر اداکاری کا کیڑا نکال دیا جائے تو وہ ایک مثالی امریکی لڑکی تھی بہرحال وقت بہت اچھا گزر گیا۔ زیادہ تر فلموں کے حوالے سے ہی باتیں ہوتی رہیں۔

تیسرے دن ہماری مسٹر اسکاٹ سے پھر ملاقات تھی۔ اس بار لبنیٰ بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ انہوں نے بھی جب سے وصیت کے بارے میں سنا تھا بہت پریشان تھیں۔

"کیسی منحوس باتیں کرتے ہیں آپ۔ اللہ نہ کرے' وصیت لکھوانے کی کیا ضرورت ہے؟"

ہم نے اور نغمی صاحب نے انہیں امریکی قاعدے قانون کے بارے میں بتایا تو وہ ہمارے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گئیں۔

مسٹر اسکاٹ نے ایک ڈرافٹ بنا کر رکھا تھا جس میں خاصی تفصیل سے لکھا تھا کہ حادثے کی صورت میں کیا ہو گا۔ اگر پارٹنر نہ رہا تو کیا ہو گا؟ اگر دونوں نہ رہے تو کیا ہو گا وغیرہ وغیرہ۔ گویا زیادہ زور "اگر نہ رہے" پر تھا۔ لنی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہمیں اشارہ کیا کہ اس پر ہرگز دستخط نہ کرنا۔ دستخط کرنے کی تو ابھی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ یہ تو محض ڈرافٹ تھا جسے بعد میں مکمل کر کے قانونی دستاویز کی حیثیت دینی تھی۔

اس کے بعد پھر فلموں کی باتیں شروع ہو گئیں۔ مسٹر اسکاٹ نے اپنی پسندیدہ فلموں کے بارے میں بتایا۔ دل پسند ہیرو' ہیروئنوں کے قصے سنائے پھر ہم سے پاکستانی فلموں کے بارے میں پوچھتے رہے اور اتنے سوالات کئے کہ ہم تنگ آ گئے۔ یہ گپ شپ بھی کافی دیر تک رہی۔ اس کے بعد ایک دن نغی صاحب کے ساتھ ہم کہیں جا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کیوں نہ مسٹر اسکاٹ کے پاس سے ہوتے چلیں؟ چنانچہ وہاں پہنچ گئے۔ ایک موکلہ کو وہ طلاق کے بارے میں ضروری مشورے دینے سے فارغ ہوئے تو ہمارے ساتھ پھر گفتگو شروع ہو گئی۔ مس جونز نے دو تین بار کافی سے تواضع بھی کی۔ مسٹر اسکاٹ انڈین فلمیں بھی دیکھ چکے تھے اور ان کے ناچ گانوں کے بہت رسیا تھے' بولے "مہاتما بدھ کے ملک کی فلمیں ایسی ہی ہونی چاہئیں۔"

پوچھا "کیسی؟"

"پیار و محبت سے بھرپور۔ میرا خیال ہے کہ انڈیا کے لوگ بہت رومانٹک ہوتے ہیں اور ناچ گانا تو ان کی رگ رگ میں بھرا ہوا ہے۔ جسے دیکھئے وہ ناچ اور گانے میں ماہر ہے۔ کیا یہ لوگ اس کی تربیت حاصل کرتے ہیں یا ان کے اندر قدرتی صلاحیتیں موجود ہیں؟"

ہم کیا عرض کر سکتے تھے۔ ہم نے بھی اپنی رائے ظاہر کر دی۔ کافی دیر گپ شپ کرتے رہے۔ اتنی دیر میں ایک اور موکل آ گئے تو ہم نے معذرت طلب کر لی۔ مسٹر اسکاٹ حسب معمول ہمیں کمرے کے دروازے تک چھوڑنے آئے اور مس جونز نے لفٹ تک پہنچا کر دم لیا۔

اس رات ہم ذرا جلدی ریستوران سے آ گئے تھے اور اپنے ساتھ ایک بہت بڑا فرمائشی پزا بھی بنوا کر لائے تھے۔ کھانے کے بعد بچیاں سونے کے لئے چلی گئیں اور ہم ٹیلی ویژن دیکھتے رہے مگر ہمارا دھیان کہیں اور تھا۔ سوچتے رہے کہ اس ملک میں ہم کیسے رہیں گے

اور کب تک رہیں گے؟ ہمارا پروگرام چند سال قیام کرنے کا تھا مگر بچیاں جس تیزی سے امریکن ہو رہی تھیں وہ پریشان کن تھا۔ امریکی لب و لہجہ' امریکی لباس' امریکی انداز فکر انہوں نے اتنی جلدی اپنا لیا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے وہیں پیدا ہوئی ہوں۔ ادھر وہاں کا ماحول ہمیں ذاتی طور پر راس نہیں آ رہا تھا اور بڑی شدت سے پاکستان یاد آنے لگا تھا۔ امریکیوں کی خوبیاں اپنی جگہ مگر ان کی بہت سی خوبیاں ہمارے معاشرے اور رسم و رواج کے حساب سے خرابیاں تھیں۔ عیش و آرام اور آسائشیں اپنی جگہ مگر وہاں کی زندگی کے عذاب بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ہم سے وصیت لکھنے کی فرمائش کی جا رہی تھی۔ ہم نے سوچا کہ آخر چند سال بعد تو ہمیں واپس جانا ہی ہے لیکن اگر اس مختصر عرصے میں ہماری بچیاں مکمل امریکی بن گئیں یا پھر خود ہمیں کچھ ہو گیا تو سب کچھ ٹھپ ہو کر رہ جائے گا اور ہمیں بے سروسامانی کے عالم میں بالآخر اپنے وطن ہی جانا ہو گا تو پھر کیوں نہ پہلے ہی آرام سے واپس لوٹ چلیں؟ یہ خیال ہمارے ذہن میں جاگزیں ہو گیا اور روز بروز اس کی شدت میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ ایک دن ہم نے سوچا کہ بس بہت ہو گئی۔ پہلی تاریخ کو ہم نے پاکستان واپسی کا فیصلہ کیا اور ایک مہینے کے اندر سب کچھ بیچ باچ کر پہلے کینیڈا اور پھر پاکستان آ گئے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ذکر مسٹر اسکاٹ کا ہو رہا تھا جو ہمارے بے تکلف دوست بن چکے تھے۔

چند دن بعد ہمیں ان کے دفتر سے ایک بل موصول ہوا۔ یہ قریباً سترہ اٹھارہ سو ڈالر کا تھا۔ ہم حیران رہ گئے کہ اتنے سے کام کا اتنا بڑا بل کیسے ہو سکتا ہے؟ نغی صاحب کو فون کیا تو وہ بھی حیران ہوئے پھر کہا کہ آپ مسٹر اسکاٹ سے خود ہی بات کر لیں۔

مسٹر اسکاٹ فون پر بے حد خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ ہمارے استفسار پر بتایا کہ یہ بل بالکل درست ہے۔

"مگر یہ کس طرح ہو سکتا ہے مسٹر اسکاٹ؟"

"مسٹر آفاقی! آپ چاہیں گے تو میں اس کی تفصیل بھی آپ کو ارسال کر دوں گا۔"

دوسرے دن تفصیل بھی موصول ہو گئی جسے پڑھ کر ہم غصے سے آگ بگولا ہو گئے۔

مسٹر اسکاٹ نے ہماری ہر ملاقات کا وقت نوٹ کیا تھا اور ۷۵ ڈالر فی گھنٹے کے حساب

سے اس کا بل بنایا تھا۔ ہم نے نغمی صاحب سے شکایت کی تو بولے کہ 'آفاقی صاحب' یہاں
وکیل اس طرح کرتے ہیں۔ لوگ مجبوراً ان کی بات مانتے ہیں ورنہ وہ قانونی ہتھکنڈے
استعمال کرتے ہیں۔

ہم نے کہا "نغمی صاحب' یہ تو کھلی لوٹ ہے۔ ہم تو یہ بل کبھی نہیں ادا کریں گے۔"

دوسرے دن وہ ہمارے ساتھ مسٹر اسکاٹ کے دفتر گئے تو وہ سراپا مسکراہٹ بنے ہوئے
تھے۔ ہم نے شکایت کی تو معصومیت سے پوچھنے لگے "مسٹر آفاقی۔ کیا بل میں کوئی غلطی رہ
گئی ہے؟"

ہم نے کہا "مسٹر اسکاٹ۔ ہم آپ کے پاس جس کام کے لئے آئے تھے۔ اس میں
زیادہ سے زیادہ دس پندرہ منٹ صرف ہوتے ہیں مگر آپ نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر
دیں اور اس وقت کو بھی بل میں شامل کر لیا۔"

بولے "دیکھیں مسٹر آفاقی۔ جو وقت میں نے آپ کے ساتھ گزارا ہے۔ وہ آپ ہی
کے حساب میں تو جائے گا۔"

"مگر آپ اگر گپ شپ شروع کر دیں تو ہم کیا کریں؟"

"آپ کو چاہئے تھا کہ معذرت طلب کر کے چلے جاتے۔ آپ دو تین بار میرے پاس
تشریف لائے۔ میں نے آپ کی خاطر تواضع بھی کی۔ پورا وقت بھی دیا۔ آپ پھر بھی ناراض
ہیں۔"

ہم نے کہا "سنئے مسٹر اسکاٹ۔ ہم اس قسم کی حرکتوں کے عادی نہیں ہیں اور نہ ہی
بے وقوف بننے کو تیار ہیں' آپ اپنے بل پر نظر ثانی کریں۔ ہم آپ کو ایک گھنٹے سے زائد
وقت کا بل ہرگز ادا نہیں کریں گے۔"

"وہ تو آپ کو ادا کرنا ہو گا" انہوں نے مسکرا کر کہا "آخر ہر بات کا ایک اصول ہو
ہے۔ قاعدہ قانون ہوتا ہے اور میں نے تو آپ کی وصیت بھی تیار کر لی ہے۔"

ہم نے کہا "وصیت کو آپ رہنے دیجئے۔ ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ۷۵ ڈالر کا بل
ارسال کر دیجئے۔ میں چیک بھیج دوں گا۔"

انہوں نے نغمی صاحب سے اپیل کی "مسٹر ناگی۔ آپ ہی انہیں سمجھائیے۔"

مسٹر ناگی بے چارے کیا سمجھاتے۔ ہم لوگ خاموشی سے چلے آئے۔ ہم نے نغ

احب سے پوچھا کہ اس زیادتی کا علاج کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یہاں ایک ادارہ موجود
ہے۔ جہاں وکیلوں کی بدسلوکی یا خلاف قاعدہ حرکتوں کے خلاف شکایات کی جا سکتی ہیں اور
یح ثابت ہونے پر وکیل کا لائسنس بھی معطل کر دیا جاتا ہے۔ ہم نے ان سے اس ادارے
اپتا اور فون نمبر پوچھا اور گھر جاتے ہی سب سے پہلے تو مسٹر اسکاٹ کو ایک مفصل خط لکھا
ر انہیں مطلع کیا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ بددیانتی اور غیر پیشہ ورانہ سلوک کیا ہے۔ اگر
نہوں نے اپنا بل درست نہ کیا تو ہم متعلقہ ادارے سے شکایت کرنے پر مجبور ہوں گے۔
ط موصول ہوتے ہی مسٹر اسکاٹ نے نغمی صاحب کو تلاش کرنا شروع کر دیا اور ہماری
کایت کرنے کے بعد مصالحت کی بات چیت شروع کر دی' ہم اکڑ گئے کہ اب تو ہم شکایت
ضرور کریں گے۔ مگر پھر نغمی صاحب کے سمجھانے بجھانے پر ڈیڑھ سو ڈالر ادا کر کے تصفیہ کر
یا۔ ہماری وصیت شاید اب تک ان کے پاس پڑی ہو گی۔

یہ داستان بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ امریکا میں بھی ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔
وکیل تو وہاں دولت میں کھیلتے ہیں۔ لوگ ان سے ڈرتے بھی ہیں اور ان کے بغیر گزارا بھی
نہیں ہے۔ لوگوں کی مجبوریوں سے وہ پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کئی وکیل لوگوں کے مقدمات
کے سلسلے میں یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وکالت کے لئے کچھ وصول نہیں کریں گے لیکن فیصلہ
ان کے حق میں ہوا تو پچاس فیصد رقم وصول کر لیں گے۔ وکیلوں کی فیسیں بھی بہت زیادہ
ہوتی ہے۔ خاص کر پیسے والوں سے تو وہ لاکھوں کروڑوں بھی فیس کے طور پر وصول کر لیتے
ہیں۔ موکل کے لئے ان کا مشورہ یہی ہوتا ہے کہ آپ کے کیس میں بہت جان ہے۔ فیصلہ
آپ ہی کے حق میں ہو گا۔ اس کشمکش میں بے چارے موکل کی جان ہی نکل جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

اب ذرا ڈاکٹروں کی بھی سن لیجئے۔ جسمانی عوارض سے لے کر نفسیاتی اور ذہنی
عارضوں تک ہر قسم کے علاج کے لئے ڈاکٹر موجود ہیں۔ انسانوں کی تو بات ہی کیا ہے۔
جانوروں کے ڈاکٹر بھی لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔ جانوروں کو وہاں انسانوں سے کم اہمیت نہیں
دی جاتی۔ ان کی خوراک ڈبوں میں بند ہوتی ہے اور مہنگی ہوتی ہے۔ علاج بھی بہت مہنگا
ہوتا ہے۔ فیس خوب دبا کر لیتے ہیں۔ امریکا میں ڈاکٹری نسخے کے بغیر کیمسٹ سے دوائی تک

نہیں خریدی جاسکتی اس لئے ان کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ اگر انجکشن بھی لگوانا ہو تو پہلے ڈاکٹر صاحب سے ملئے۔ انہیں مطمئن کیجئے۔ ان کی فیس ادا کیجئے تب کہیں جاکر وہ خود انجکشن لگاتے ہیں یا انہیں نرس سے لگوا دیتے ہیں مگر ذاتی نگرانی میں۔

ہمیں پارو کو بیماریوں سے بچاؤ کے انجکشن لگوانے تھے۔ ایک ڈاکٹر صاحب سے بڑی مشکل سے وقت لیا اور ان کے پاس گئے۔ وہاں مریضوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ زیادہ تعداد موٹی عورتوں اور مردوں کی تھی جو وزن کم کرانے کا علاج کرانے آئے تھے۔

ان کی سیکرٹری نے ہمیں انتظار گاہ میں بٹھایا اور معلومات حاصل کیں۔ ہم نے بتایا کہ بچی کو ایک انجکشن کا کورس تو پاکستان میں لگ چکا ہے اور دوسرا لگنا ہے۔ انہوں نے باقاعدہ جرح شروع کر دی۔ انجکشن کب لگے تھے، کس نے لگائے تھے۔ سرٹیفکیٹ کہاں ہے؟ ڈاکٹر کا نسخہ کہاں ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے آنکھیں گھمائیں، کندھے اچکائے اور آسمان کی طرف دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ تمہارا تو اللہ ہی مالک ہے۔ اتنی دیر میں ایک سولہ سترہ سال کی دوشیزہ اندر سے برآمد ہوئیں۔ ان کی عمر ہمیں بعد میں بتائی گئی تھی۔ پہلے تو انہیں دیکھ کر ہم چالیس پچاس سالہ پہلوان ہی سمجھے تھے۔ ان کے موٹاپے کا یہ عالم تھا کہ کوئی لباس بھی ان کا جسم ڈھانپنے کے لئے کافی نہ تھا۔ خدا جانے کیا جتن کرتی ہوں گی۔ ان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اندر سے انجکشن لگوا کر آئی تھیں۔ کمرے میں آتے ہی بے دم ہو کر صوفے پر گر گئیں مگر اس حال میں بھی چاکلیٹ کھانے سے باز نہیں رہی تھیں۔ دو تین قسطوں میں اٹھنے کے بعد وہ رخصت ہو گئیں۔

سیکرٹری نے کہا "یہ لوگ بھی خوب ہیں کہ اس کے باوجود کھانے سے باز نہیں رہتے۔"

ڈاکٹر صاحب سے ہماری ملاقات ہوئی تو بے حد شفیق اور خوش اخلاق نظر آئے۔ خاصے اسمارٹ آدمی تھے یا شاید گرد و پیش بکھری ہوئی موٹی موٹی خواتین کے جھرمٹ میں اسمارٹ لگ رہے تھے۔

بڑی مشکل سے ہم نے انہیں اپنی بات کا یقین دلایا اور کہا کہ اب بچی کو دوسرا کورس لگنا ہے۔ پاکستان میں یہ کام انتہائی آسان ہے۔ کوئی بھی پرائیویٹ ڈاکٹر منٹوں میں ٹیکا لگا دیتا ہے۔ اسپتالوں میں بھی دیر نہیں لگتی۔ مگر وہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔

فرمایا "آپ کو پہلے تو بچی کے بلڈ ٹیسٹ کرانے ہوں گے۔"

"وہ کون کرے گا؟"

"میں آپ کو ایک لیبارٹری کا پتا بتا دوں گا۔ ٹیسٹ کی رپورٹ براہ راست مجھے پہنچ ے گی۔"

ہم نے کہا "مگر ڈاکٹر۔ اس بارے میں بلڈ ٹیسٹ۔"

وہ مسکرائے "یہ ضروری ہے مسٹر آفاقی۔ انجکشن کا معاملہ ہے کوئی کھیل تو نہیں ے۔"

ان کے بتائے ہوئے پتے پر ہم لیبارٹری میں پہنچے جہاں پارو نے ٹیسٹ دینے سے انکار کر دیا مگر لیب میں موجود چند نرسوں نے اسے ٹافیاں، آئس کریم اور چاکلیٹ کا لالچ دے کر ایسا بہلایا کہ وہ ہنسی خوشی راضی ہو گئی۔ بلکہ وہاں سے آتے ہوئے نے لگی کہ پاپا۔ اب ہم دوبارہ یہاں کب آئیں گے؟

دوسرے دن ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے تو رپورٹس ان کے پاس موجود تھیں جنہیں ں نے انتہائی احتیاط اور حفظان صحت کے اصولوں کے تحت رکھ چھوڑا تھا۔

"کوئی پرابلم نہیں ہے مسٹر آفاقی۔ شکر ہے ورنہ پیچیدگی ہو جاتی۔ اب آپ بچی کو ے میں لے جائیں۔"

کمرا نہایت خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ اسپتال کا تو گمان ہی نہیں گزرتا تھا۔ کمرے یک خوش شکل اور ہنس مکھ نرس نے پارو کو باتوں میں بہلا کر دو ٹافیاں کھلا دیں۔ پھر کہا پ کو تھوڑی دیر کے لئے یہ لباس اتار کر گون پہننا ہو گا۔ ستاروں والا گون۔

پارو فوراً رضامند ہو گئی۔ یہ ایک کاغذی قسم کا لباس تھا جس پر چمک دار خوب صورت ے بنے ہوئے تھے۔ پارو کو یہ لباس بہت پسند آیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ آپ یہ لباس اپنے لے جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد انجکشن لگوانے میں ذرا بھی دشواری پیش نہ آئی۔

ہم ان دنوں وٹامن بی اور سی کے انجکشن لگوایا کرتے تھے اور پاکستان سے جاتے انجکشن بھی اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔ موقع پا کر ہم نے نرس سے پوچھا "سسٹر۔ وٹامن کے انجکشن لگوانے ہیں۔ کیا آپ لگا سکتی ہیں؟"

وہ بولی "کیوں نہیں لگا سکتی۔ مگر پہلے ڈاکٹر سے پوچھنا ہو گا۔"

ہم ڈاکٹر کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ "بالکل عام سے وٹامنز کے انجکشن ہیں۔ انجکشن لگانا تو آپ کو آتا ہی ہو گا۔ دو منٹ کی بات ہے۔"

ہم نے دیکھا کہ ہمارے اصرار پر وہ کچھ مشکوک سی ہو گئی اور ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئی۔ چند لمحے بعد ڈاکٹر صاحب سارے کام چھوڑ کر اس کے ساتھ ہمارے پاس آ گئے۔

"کیا بات ہے مسٹر آفاقی۔ خیریت تو ہے؟"

"ہاں ہاں بالکل۔"

"میں نے سنا ہے آپ کوئی انجکشن لگوانا چاہتے ہیں؟"

ہم نے فوراً جیب سے انجکشنوں کا پیکٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ انگلستان کے بنے ہوئے تھے مگر پھر بھی وہ بغور الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے پھر فرمایا "اس میں کیا چیزیں موجود ہیں؟"

ہم نے کہا "لکھا ہوا ہے کہ وٹامنز بی اور سی کے انجکشن ہیں۔"

"مگر اس کی تفصیل درج نہیں ہے۔"

ہم نے کہا "ہمارا خیال تھا کہ آپ ڈاکٹر ہیں اس لئے آپ کو علم ہو گا۔"

انہوں نے ہماری بات کو نظر انداز کر دیا' پوچھا "آپ کے پاس ڈاکٹر کا نسخہ موجود ہے؟"

"جی نہیں۔ وہ تو پاکستان میں رہ گیا۔"

"سوری مسٹر آفاقی۔ پھر تو بہت مشکل ہے۔ آپ پہلے کسی ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔ اس سے نسخہ لکھوائیں تب ہی انجکشن لگ سکیں گے۔ یہ بہت ذمے داری کا کام ہے۔"

یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گئے۔

پرابلم یہ تھی کہ ہمارے پاس چھ سات انجکشن بچ گئے تھے اور ہم انہیں ضائع نہیں کر چاہتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب نے بہت طویل اور مہنگا نسخہ بتا دیا تھا۔ اتنی دیر میں وہ گداز جسم نرس پھر ہمارے پاس آ گئی اور بولی "مسٹر آفاقی۔ آپ مانتے کیوں نہیں۔ وہی کیجئے جو ڈاک صاحب نے بتایا ہے۔"

ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرے میں کوئی اور موجود نہ تھا۔ موقع پا کر ہم نے اس سے کہا "سسٹر۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ صبح ڈاکٹر کے آنے سے پہلے تم ہمیں انجکشن لگا دو

نہیں خبر بھی نہ ہو گی۔"

اس نے خوفزدہ ہو کر ہمیں دیکھا "اوہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو ناممکن ہے۔ مجھے بتایئے کہ آخر یہ کس قسم کے انجکشن ہیں جو آپ لگوانے پر اتنا زور دے رہے ہیں۔"

ہمیں اچانک خیال آیا کہ کہیں وہ ہمیں منشیات کا عادی نہ سمجھ رہی ہوں۔

"میری بات مانئے۔ آپ ڈاکٹر کو سب کچھ صاف صاف بتا دیجئے۔ وہ آپ کا مسئلہ حل کر دیں گے۔"

ہم نے ان سے اجازت طلب کرنے میں ہی عافیت جانی۔

بعد میں اپنے پاکستانی دوستوں سے کہا کہ یار کسی پاکستانی ڈاکٹر سے کہہ کر یہ انجکشن لگوا و۔

"لو۔ یہ کون سا مشکل کام ہے" نغمی صاحب نے کہا "اپنا یار ایک ڈاکٹر ہے۔ زیادہ دور یں رہتا۔"

انہوں نے فوراً ڈاکٹر کا نمبر ملایا اور وہ مل بھی گیا۔ ڈاکٹر ہمیں غائبانہ طور پر جانتا تھا۔ ت خلوص اور مداحی کا اظہار کیا۔ خدمت دریافت کی' ہم نے کہا "وٹامنز کے انجکشن لگوانے ہیں۔"

وہ اچانک خاموش ہو گیا "آفاقی صاحب۔ آپ کے پاس ڈاکٹر کا نسخہ ہے؟"

ارے بھائی وٹامنز کے لئے نسخے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے نسخہ تھا تو مگر ہم ساتھ نہیں ئے۔ آپ کے پاس سرنج تو ہو گی۔ بس آ کر انجکشن لگا دو۔ ہر ہفتے لگتا ہے۔"

"آفاقی صاحب۔ میرے پاس سرنج تو ہے مگر میں گھر پر انجکشن نہیں لگاتا۔ میرا کلینک یاست میری لینڈ میں (یعنی ۵۵ میل دور) ہے۔ آپ کل وہاں آ جایئے۔"

"مگر گھر میں کیا حرج ہے؟"

"دیکھئے نا۔ اگر کوئی ری ایکشن ہو گیا تو کیا ہو گا؟ کلینک میں کم از کم حالات کو سنبھال تو کتے ہیں اور یہ کام میں صرف آپ کی خاطر کروں گا۔"

ہم نے تنگ آ کر فون بند کر دیا۔ "بھائی اتنی پریشانی تو ہمارے ملک میں ہارٹ کے آپریشن کے سلسلے میں بھی پیش نہیں آتی۔ تم لوگوں نے تو ایک معمولی بے ضرر سے انجکشن کو تماشا بنا دیا ہے۔"

نغمی صاحب نے ہمیں بڑی تفصیل سے سمجھایا کہ امریکا میں ڈاکٹر خوب کمائی کرتے ہیں مگر ذرا سی بھی کوتاہی پر ان کے خلاف مقدمہ کر دیا جاتا ہے اور انہیں بھاری جرمانے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ہرجانے دینے پڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ جیل کی ہوا تک کھانی پڑتی ہے۔ اس لئے کوئی ڈاکٹر ذرا سا بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوتا۔ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ اگر ڈاکٹر کی غفلت' کوتاہی یا نالائقی ثابت ہو جائے تو جیل جانے کے ساتھ لائسنس بھی ضبط ہو جاتا ہے۔ اسی لئے امریکا میں ڈاکٹر حد سے زیادہ محتاط ہوتے ہیں۔ دوا کی مقدار بھی سوچ سوچ کر اور ناپ تول کر دیتے ہیں ورنہ غلطی کی صورت میں مقدمہ۔ اور پھر سزا۔ غلط آپریشن امریکا میں بھی ہوتے ہیں مگر متعلقہ ڈاکٹروں کو اس کا جرمانہ بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔

ہمیں ایک بار دانت کی تکلیف کے سلسلے میں ایک امریکی ڈاکٹر کے پاس جانا پڑ گیا۔ اس نے ڈیڑھ گھنٹے تک تو ہمارا معائنہ کیا۔ پھر ایکسرے کیا حالانکہ ایک اندھے کو بھی پتا چل سکتا تھا کہ کس دانت میں تکلیف ہے۔ اس کے بعد اس نے بہت سوچ کر ایک نسخہ تحریر کیا اور کہا۔

"دیکھئے مسٹر۔ یہ تین کیپسول ہیں۔ ایک آپ آج لیں گے اور ایک کل رات۔ اس کے بعد ضرورت تو نہیں رہے گی مگر پھر بھی میں نے احتیاطاً" آپ کو ایک اور کیپسول بھی لکھ دیا ہے تاکہ کام آ جائے۔"

وہاں ڈاکٹر نسخے کے ساتھ دوائی کی مقدار اور گولیوں کی تعداد بھی لکھ کر دیتے ہیں اور کیمسٹ بھی یوں ناپ تول کر اور گن کر دوائی دیتا ہے جیسے سنار سونے اور جواہرات کا حساب کرتا ہے۔

آخر انسانی زندگیوں کا معاملہ ہے کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی زندگی کو امریکا میں بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور انسانی زندگی کا مطلب کسی خاص آدمی کی زندگی نہیں ہے بلکہ ہر امریکی شہری ایک اہم شہری ہے اور وی آئی پی سلوک کا مستحق ہے۔ ذرا سی تکلیف پر اسے ہر ممکن امداد فراہم کی جاتی ہے۔ حادثے کی صورت میں فوراً ایمبولینس کاریں دوڑنے لگتی ہیں۔ وائرلیس کھڑکنے لگتے ہیں۔ دو تین منٹ کے اندر ہی جائے حادثہ پر پولیس پہنچ جاتی ہے۔ ایمبولینس کاریں بھی ہمراہ ہوتی ہیں۔ ان ایمبولینس

گاڑیوں میں فوری امداد کے تمام آلات موجود ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ دل کے مریضوں کے لئے آکسیجن اور فوری علاج کی تمام اشیاء موجود ہوتی ہیں۔ تربیت یافتہ وردی پوش نرسیں ہنگامی حالات کے لئے تیار ہوتی ہیں۔ مناسب سمجھا جائے تو فوراً ہیلی کاپٹر طلب کر لیئے جاتے ہیں تاکہ سڑکوں پر ٹریفک کے رش کی وجہ سے مریض کو اسپتال پہنچنے میں دیر نہ ہو جائے۔ امریکی نظام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو بھی قانون ہے وہ سب کے لئے یکساں ہے۔ جزا اور سزا بھی سب کے لئے یکساں ہے۔ کوئی چھوٹا بڑا' امیر غریب' اہم اور غیر اہم نہیں ہے۔ قانون کی پکڑ میں آ جانے کے بعد چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔

ہم نے ایک حادثہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ہوا یہ کہ شام کے وقت ہم ٹہلتے ہوئے گھر سے نکلے اور پھول والی کی دکان پر پہنچ گئے۔ ان خاتون سے ہماری خاصی شناسائی ہو گئی تھی کیونکہ ہم عموماً" ان سے پھولوں کے ریٹ دریافت کرتے رہتے تھے۔ یہ ایک درمیانہ عمر کی خاتون تھیں۔ بہت ہنس مکھ تھیں اور انہوں نے کبھی ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ بھائی' ہر روز پھولوں کے نرخ دریافت کرتے رہتے ہو کبھی خرید بھی لیا کرو۔ ہم نے اپنے دوران قیام میں ان سے صرف ایک بار گلاب کا ایک پھول خریدا تھا۔ بات چیت البتہ ہوتی رہتی تھی۔ اگر گاہکوں کا رش نہ ہو تو وہ ہمیں امریکا کے بارے میں اور ہم انہیں پاکستان کے بارے میں بتاتے رہتے تھے۔ ابھی ہم ان کی پھولوں سے سجی ہوئی مگر خوشبو سے محروم دکان پر پہنچے ہی تھے کہ ایک دھماکا سا ہوا۔ پلٹ کر دیکھا تو چوک پر ایک ویگن اور ایک کار کا تصادم ہو گیا تھا۔ کار کا عام حادثہ امریکا میں معمول کی چیز ہے۔ قانون یہ کہتا ہے کہ حادثے کے بعد آپ اپنی جگہ سے ہرگز حرکت نہ کریں۔ یہ جرم ہے۔ پولیس کے آنے تک وہیں موجود رہیں۔ پولیس والا بڑے اخلاق سے خود آپ کی کار کے پاس آ کر آپ کا لائسنس اور انشورنس کارڈ طلب کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ آپ سے کہے کہ "اوئے' باہر نکلو۔ تمہارا لائسنس کدھر ہے؟؟" دونوں کی انشورنس دیکھنے کے بعد وہ یہ اندازہ لگاتا ہے کہ قصوروار کون ہے۔ عام طور پر تو قصوروار خود ہی اعتراف جرم کر لیتا ہے۔ ورنہ آس پاس کے شاہدوں سے دریافت کرنا پڑتا ہے۔ پولیس والا قصوروار کی انشورنس کمپنی کے لئے اطلاع لکھ دیتا ہے اور دونوں کاروں والے اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ نہ جھگڑا' نہ ہاتھا پائی' نہ جان دینے اور لینے کی دھمکیاں۔ لیکن خطرناک حادثے کی صورت میں پولیس کو زیادہ چھان بین

کرنی پڑتی ہے۔

ہماری آنکھوں کے سامنے جو حادثہ ہوا تھا وہ کافی معمولی سا تھا۔ ویگن کا دروازہ کھل گیا تھا اور ویگن ڈرائیور سڑک پر جاگرا تھا۔ دوسری کار ایک دلربا خاتون چلا رہی تھیں۔ ان کی کار کا اگلا حصہ متاثر ہوا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ خاتون نے حسب قاعدہ اپنی کار وہیں چھوڑ دی اور فوراً زمین پر گرے ہوئے شخص کی طرف بڑھیں جو کہ اب اٹھ کر بیٹھ گئے تھے مگر انہوں نے اپنا سر جھکا رکھا تھا۔ ایک دو اور لوگ بھی امداد کے خیال سے ان کے نزدیک گئے مگر انہوں نے سب کو روک دیا اور کہا کہ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ مجھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ یہ سن کر خاتون کے گلابی چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا۔ حادثے میں فریق مخالف کو چوٹ آجانے کی صورت میں علاج کے اخراجات کے علاوہ بھاری جرمانہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے شاید وہ اسی خیال سے سہم کر رہ گئی تھی۔

چند لمحوں میں پولیس کی دو تین کاریں بھی سائرن بجاتی اور روشنیاں چمکاتی ہوئی آگئیں۔ پولیس والے زمین پر بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف بڑھے جس نے تکلیف سے منہ بگاڑ رکھا تھا۔ اسی لمحے دو ایمبولینس کاریں بھی شور مچاتی ہوئی آگئیں اور ایک جانب کھڑی ہو گئیں۔ اس کے اندر سے ایک نرس اور دو اہلکار نکل کر بھاگے۔ نرس نے ان صاحب کے پاس جا کر دو چار سوالات کئے' جواب میں وہ کراہتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ مجھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ شاید میری گردن میں جھٹکا آگیا ہے۔ ایک پولیس والے نے فوراً وائرلیس پر ہیلی کاپٹر کی فرمائش کی اور چند لمحے بعد ایک ہیلی کاپٹر بھی آکر ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ ہیلی کاپٹر کے اندر سے ایک ڈاکٹر صاحب برآمد ہوئے اور جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔

اتنی دیر میں پولیس سہمی ہوئی حسینہ سے پوچھ گچھ کرتی رہی تھی۔ ان کا بیان تھا کہ ویگن والے صاحب اچانک سامنے سے نمودار ہو گئے اور کاریں ٹکرا گئیں۔ مگر حادثہ زیادہ شدید نہیں تھا اس لئے زیادہ چوٹ آنے کا امکان بھی نہیں ہے۔

"مگر وہ تو گردن ہی نہیں اٹھا رہے" پولیس والے نے کہا۔

"یہی تو مجھے بھی فکر ہے" خاتون نے کہا۔

پولیس والے نے کہا "آپ اپنی مدد کے لئے کسی کو طلب کرنا چاہیں تو ٹیلی فون حاضر ہے۔"

"جی نہیں۔ فی الحال میں ڈاکٹر کی رائے کا انتظار کروں گی۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنی لمبی لمبی مخروطی ٹانگوں کے سہارے بے چینی سے ٹہلنا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر نے فوراً مجروح کو دیکھا۔ چند سوالات کئے اور پھر ان کی گردن کو اپنے ہاتھوں سے ادھر ادھر گھمایا اور پھر مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ صرف صدمہ ہے' بعض اوقات حادثے کی صورت میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔"

پھر ڈاکٹر نے ایمبولینس والوں سے کہا کہ ان صاحب کو لے کر اسپتال پہنچا دیں۔ وہاں مزید چھان بین ہو جائے گی۔ یہ سن کر مجروح نے اچانک ایک انگڑائی لی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ادھر ادھر گھوما اور پھر مسکرا کر بولا "میرا خیال ہے کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

خوف زدہ حسینہ نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور مجروح سے ان کا لائسنس اور انشورنس کارڈ طلب کیا۔ اس بار مجروح کے گھبرانے اور لمبا سانس لینے کی باری تھی۔ بات یہ تھی کہ قصور سراسر ان کا ہی تھا اور یہ سارا ڈراما انہوں نے کچھ رقم اینٹھنے کے لئے رچایا تھا۔ مگر چند ہی منٹ کے اندر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔ پولیس والوں نے خاتون اور مجروح دونوں کا شکریہ ادا کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان صاف ہو گیا۔ ہیلی کاپٹر بھی اڑ گیا۔ گل فروش خاتون نے ایک لمبا سانس لیا اور آسمان کی طرف دیکھا۔

ہم نے پوچھا "میڈم۔ اگر اس شخص کو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی تو وہ اتنی دیر تک سڑک پر کیوں بیٹھا رہا؟"

میڈم مسکرائیں اور بولیں "یہ بھی شطرنج کا گیم ہوتا ہے۔ حادثہ ہو جائے تو دونوں پارٹیاں اپنی اپنی چالیں چلنی شروع کر دیتی ہیں۔ اگر اس شخص کی گردن میں واقعی معمولی سا جھٹکا بھی آیا ہوتا تو وہ خاصا امیر ہو جاتا۔"

نظام کی خوبی اور کارکردگی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

انین ڈیل کے جس محلے میں ہم رہتے تھے اس کا نام "ایلان پیلس" تھا۔ مین سڑک سے اندر ایک سڑک جاتی تھی اور پھر ٹاؤن ہاؤسز کی یہ چھوٹی سی خوب صورت بستی نگاہوں کے سامنے آجاتی تھی۔ سامنے ایک بہت وسیع لان تھا جس میں شام کے وقت بچے اور

بڑے کھیلا کرتے تھے۔ بہت وسیع پارکنگ لاٹ تھا اور اس کے ساتھ ساتھ پتلا سافٹ پاتھ تھا جس پر چھوٹے بچے سائیکلیں اور موٹریں چلاتے پھرتے تھے اور ذرا بڑی عمر کے لڑکے اور لڑکیاں اسکیٹنگ کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ رنگ برنگے لباسوں میں جب یہ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوتے تو یوں لگتا جیسے تتلیاں اسی فضا میں اڑتی پھر رہی ہیں۔

ہمارے نزدیک والے مکان میں ایک عراقی خاندان تھا جن کی دو چھوٹی بچیاں تھیں۔ ان کے برابر ایک اور ٹاؤن ہاؤس تھا اس میں چار کرائے دار بیک وقت رہا کرتے تھے۔ ان میں ایک پاکستانی عارف لطیف تھے۔ دوسرے انڈین اروند تھے اور دو امریکن لڑکیاں تھیں۔ ایسے گھروں میں ہر ایک کرائے دار کو ایک علیحدہ بیڈ روم اور باتھ روم دے دیا جاتا ہے۔ ڈرائنگ روم' ڈائننگ روم اور کچن مشترکہ ہوتا ہے جسے سب ضرورت کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ ایک کوریائی خاندان بھی تھا جس میں گیارہ سال سے لے کر تین سال کی عمر کی پانچ لڑکیاں تھیں اور یہ عموماً ہمارے گھر میں ہی رہا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی اپنے گھر واپس نہ جاتیں۔ بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ ہماری بچیوں سے مختلف قسم کے کھانوں' آئس کریم اور چاکلیٹ کی فرمائشیں کیا کرتی تھیں اور کبھی ان کے والدین نے ہم سے آکر یہ نہیں پوچھا تھا کہ ہماری بچیاں آپ ہی کے گھر میں موجود ہیں یا کہیں اور چلی گئی ہیں۔ اس کے مقابلے میں کچھ فاصلے پر مس سینڈرا برٹن رہا کرتی تھیں۔ جن کا ایک چار سالہ بیٹا جان تھا۔ حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ امریکا میں مس ہونے کے باوجود خواتین مائیں بن جاتی ہیں اور مائیں بن جانے کے باوجود مس رہتی ہیں۔ مس سینڈرا آس پاس والوں سے زیادہ میل ملاپ پسند نہیں کرتی تھیں۔ خدا جانے وہ کیا کام کرتی تھیں کہ مختلف اوقات میں گھر سے رخصت ہوا کرتی تھیں۔ اکثر ان کا بچہ بھی ان کے ساتھ ہی ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک معصوم' بھولا بھالا اور پیارا سا بچہ تھا مگر نہایت شریف اور فرماں بردار۔ شام کو مقررہ وقت کے علاوہ اسے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ خدا جانے وہ بے چارہ سارا دن گھر کے اندر بیٹھا کیا کرتا رہتا تھا۔ وہ کسی کے گھر میں بھی نہیں جاتا تھا۔ کھیل کے مقررہ اوقات میں گھر سے باہر نکل کر کھیلتا اور پھر مس سینڈرا کے ایک بار پکڑنے پر خاموشی سے اندر چلا جاتا جبکہ دوسرے بچے کافی دیر تک کھیل میں مصروف رہا کرتے تھے۔

کچھ عرصے بعد عراقی خاتون نے لبنیٰ کو بتایا کہ مس سینڈرا نے چند ماہ قبل ہی اپنے شوہر سے

طلاق لی ہے جو خاصا خوش حال آدمی ہے چنانچہ اس سے جو رقم وصول ہوئی ہے اس کے بل بوتے پر عیش کر رہی ہیں۔ یہ گھر بھی ان کے سابق شوہر کا ہی تھا جو طلاق کے بعد ان کے حصے میں آگیا۔ خاصی معقول رقم کے علاوہ جان کے اخراجات کے لئے وہ اس سے ہر ماہ خرچہ بھی وصول کرتی تھیں۔

مس سینڈرا قریباً تیس سال عمر کی ایک دلکش خاتون تھیں۔ کشیدہ قامت' متناسب جسم' ان کے بالوں کا رنگ ایسا تھا جسے انگریزی میں "آبرن" کہتے ہیں۔ آنکھیں بھی بھوری تھیں۔ ان کی چال بہت دلکش تھی اور وہ اس انداز سے حرکت کرتی تھیں کہ ان کے خوب صورت ترشے ہوئے بال اور جسم کے مختلف حصے مستقل حرکت میں رہتے تھے۔ ہمیں کافی عرصے تک پتا نہ چل سکا کہ آخر وہ دن اور رات کے مختلف اوقات میں بچے کو لے کر کہاں جاتی ہیں۔ یہ راز بھی عراقی خاتون ہی نے فاش کیا کہ وہ خود تو اپنے مختلف دوستوں کے ساتھ گھومنے کے لئے جاتی ہیں اور بچے کو کسی کے گھر میں چھوڑ جاتی ہیں۔ امریکا میں اسے "بے بی سٹنگ" کہا جاتا ہے۔ مصروف ماں باپ اپنے بچوں کو مختلف لوگوں کے پاس چھوڑ دیتے ہیں اور اس کا معقول معاوضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ بے بی سٹنگ وہاں ایک باقاعدہ کاروبار بن چکا ہے اور بہت سی عورتیں جو کام کاج کے لئے گھروں سے باہر نہیں جاتیں گھر بیٹھے بے بی سٹنگ کے ذریعے اچھی خاصی رقم کما لیتی ہیں۔

لبنیٰ نے پوچھا "یہ دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔ کیا بچے کی وجہ سے نہیں کرتیں؟"

"جی نہیں۔ پیسے کی وجہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جس دن انہوں نے شادی کر لی انہیں سابق شوہر کی طرف سے امدادی رقم ملنی بند ہو جائے گی۔ تو پھر جب یوں ہی سب کام چل رہا ہے تو پھر شادی کا روگ پالنے کی کیا ضرورت ہے؟"

ایک روز دوپہر کے وقت کورین لڑکیوں کی فوج حملہ آور ہوئی تو پارو بہت پریشان ہو گئی۔ وہ مس سینڈرا کے گھر گئی اور کال بیل بجائی۔ اندر سے مس سینڈرا مسکراتی ہوئی باہر نکلیں۔ ان کے گھر میں کوئی مہمان آیا ہوا تھا اس لئے انہوں نے دروازہ فوراً کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی مگر اس کے باوجود پارو نے جان کی ایک جھلک دیکھ لی جو اندر والے کمرے سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔

"مس سینڈرا۔ کیا میں کچھ دیر جان کے ساتھ کھیل سکتی ہوں؟" پارو نے دریافت کیا۔

"نہیں ہنی۔ اس وقت ہمارے گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

"میں اسے اپنے گھر لے جاسکتی ہوں؟"

"سوری ہنی۔ یہ جان کے کھیلنے کا وقت نہیں ہے۔ شام کو وہ باہر آئے گا تو تم اس کے ساتھ کھیل سکتی ہو۔ اوکے؟" یہ کہہ کر انہوں نے دروازہ بند کردیا۔

پارو منہ بناتی ہوئی واپس آگئی "ماما۔ کیا بچوں کے کھیلنے کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے۔ مس سینڈرا تو جان کو کسی وقت کھیلنے ہی نہیں دیتیں۔"

"یہاں کا ایسا ہی دستور ہے بیٹا۔ بچوں کو ہر وقت کھیلنے اور گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

"مگر وہ کورین لڑکیاں بھی تو امریکن ہیں۔ وہ تو سارا دن ہمارے گھر میں کھیلتی رہتی ہیں؟"

اب کوئی پارو کو کیا سمجھاتا کہ گورے امریکنوں اور ایشیائی امریکنوں میں کیا فرق ہوتا ہے!

ایک صبح نو بجے مس سینڈرا نے ہمارے گھر کی کال بیل بجائی۔ ہم نے انہیں دروازے پر خلاف توقع دیکھا تو حیران رہ گئے۔

"میں آپ کی مسز سے بات کرسکتی ہوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"بڑی خوشی سے۔"

انہوں نے لبنیٰ سے کہا "مسز آفاقی۔ مجھے اچانک ایک ضروری کام سے جانا پڑ گیا ہے۔ جان کو اس وقت بے بی سٹر کے پاس نہیں چھوڑا جاسکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں تین چار گھنٹے کے لئے جان کو آپ کے پاس چھوڑ دوں۔ بشرطیکہ آپ کو اعتراض نہ ہو؟"

لبنیٰ کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہم مشرقی لوگوں کے لئے تو بچے ایک کھلونا ہوتے ہیں۔

"میں بارہ بجے جان کو آپ کے پاس پہنچا دوں گی" یہ کہہ کر وہ اپنے بال اچھالتی ہوئی رخصت ہوگئیں۔

بارہ بجے وہ آئیں تو جان بھی ہمراہ تھا۔ اسکے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لنچ باکس تھا۔ دوسرے ہاتھ میں گیند اور بلا تھا۔ بغل میں ایک مصنوعی پستول دبا ہوا تھا۔ گویا وہ کیل کانٹوں سے لیس ہو کر آیا تھا۔ مس سینڈرا نے رخصت ہونے سے پہلے جان کو پیار کیا اور کہا "اچھا دن گزارنا ڈارلنگ۔"

"اوکے ماما۔"

انہوں نے لبنیٰ سے کہا۔ "جان ایک بج کر تیس منٹ پر لنچ لیتا ہے۔ اسے یاد دلا دیجئے گا۔"

اور الوداع کہہ کر چلی گئیں۔

جان کچھ دیر تو تہ خانے میں بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا پھر وہ کچن میں آگیا۔

لبنیٰ نے پوچھا "جان۔ تم لنچ میں کیا کھانا پسند کرو گے؟"

"شکریہ آنٹی! لنچ تو میرے پاس ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کچن میں رکھا ہوا لنچ باکس اٹھایا۔ کھانے کی میز پر رکھا۔ اسے کھول کر اس میں چھری کانٹا اور ایک نیپکن نکلا۔ نیپکن بڑے سلیقے سے میز پر بچھا کر چھری کانٹے کو اس پر رکھا۔ پھر پلاسٹک کی ایک پلیٹ میں رکھا ہوا کھانا نکالا۔ اس کے آس پاس سلاد سجایا اور مزے سے چھری کانٹے کی مدد سے کھانا شروع کردیا۔

لبنیٰ نے تعجب سے دیکھا اور پوچھا "پینے کے لئے تم کیا پسند کرو گے؟"

"شکریہ آنٹی۔ میرے پاس کوک ہے" یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ کے اندر سے کوک کا ایک ڈبا بھی نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا۔ وہ بڑے اطمینان اور غور و فکر کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔

کھانا ختم ہوا تو اس نے چھری کانٹے کو دھویا اور نیپکن سے خشک کیا۔ پلاسٹک کی پلیٹ کو بھی دھو کر صاف کیا اور نیپکن میں لپیٹ کر دوبارہ لنچ باکس میں رکھ دیا۔ لنچ باکس کو بیگ میں رکھنے کے بعد اس نے دوبارہ تہ خانے کا رخ کیا اور کھیلنے میں مصروف ہوگیا۔

شام کو پانچ بجے کے قریب مس سینڈرا کی سلیٹی رنگ کی اسپورٹس کار پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئی۔ انہوں نے سب سے پہلے ہمارے گھر آکر جان کی خیریت دریافت کی اور لبنیٰ کا شکریہ ادا کیا اور پندرہ ڈالرز نکال کر انہیں پیش کردیئے۔

"یہ کس لئے مس سینڈرا؟" لبنیٰ نے پوچھا۔

"بے بی سٹنگ کے لئے۔"

"ارے نہیں۔ وہ تو مزے سے بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ اس نے ہمیں ذرا بھی پریشان نہیں کیا۔ معاوضہ کس بات کا؟"

مس سینڈرا مسکرائیں "مجھے خوشی ہے کہ اس نے آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیا' دراصل یہ ہوبہو اپنے باپ کی تصویر ہے۔ لیکن مسز آفاقی' بے بی سٹنگ کا معاوضہ تو آپ کو ضرور قبول کرنا پڑے گا۔ شکریہ۔"

انہوں نے نوٹ لبنیٰ کے حوالے کئے۔ جان کا ہاتھ تھاما اور بال اچھالتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

بے بی سٹنگ والدین کی محض ضرورت ہی نہیں ہے' ایک قانونی پابندی بھی ہے۔ امریکی قانون کے مطابق کسی بچے کو گھر میں تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ایسا کرنے والے والدین کو سزا ملتی ہے۔ بچے تو بچے' پالتو جانور بھی گھروں میں تنہا اور بے سہارا نہیں چھوڑے جا سکتے۔ ہم نے تو یہ دیکھا کہ وہاں پالتو جانوروں کے نخرے' اخراجات اور مسائل بچوں سے کم نہیں ہیں۔ ان کے لئے رہنے سہنے کا معقول بندوبست کرنا ضروری ہے۔ انہیں بہترین خوراک کھلائی جاتی ہے۔ بیماری میں بہترین ڈاکٹروں سے علاج کرایا جاتا ہے۔ عام بیماریوں کے علاوہ ناک' کان' گلے تک کا علاج ہوتا ہے۔ انسانوں کی طرح بلیوں اور کتوں کی ٹانگوں پر بھی پلاسٹر لگایا جاتا ہے۔ آنکھیں کمزور ہوں تو عینک بھی لگ جاتی ہے اور تو اور نفسیاتی علاج کے لئے بھی ماہرین موجود ہیں۔ گویا جانور پالنا بھی وہاں بچہ پالنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ بچوں کا تو یہ ہے کہ وہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ کھیل سکتے ہیں۔ ٹی وی دیکھ سکتے ہیں۔ پڑھنے کے لئے اسکول بھی جا سکتے ہیں مگر پالتو جانور جسے "پیٹ" کہا جاتا ہے ان تمام سہولتوں سے محروم ہے اس لئے زیادہ تر مالک پر انحصار کرتا ہے۔ لہٰذا مالک ہی اسے زیادہ وقت اور توجہ دیتا ہے۔

امریکی' جانور پالنے کے بہت شوقین ہیں اور جانور بھی قسم قسم کے۔ کتے' بلی' بندر' مگر مچھ' ریچھ' پرندے' مینڈک' کچھوے۔ یہاں تک کہ سانپ بچھو تک پالتے ہیں اور ان کے نخرے بھی اٹھاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امریکا میں ہر شخص تنہا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ شادی شدہ جوڑے بھی اپنی مصروفیات کے باعث زیادہ وقت تنہا گزارتے ہیں۔ جب دوست' احباب' رشتے دار' یہاں تک کہ اولاد تک ساتھ چھوڑ جائے تو پھر یہ پالتو جانور ہی ان کی تنہائی کا ساتھی بنتے ہیں۔ اس لئے ان کی قدر بھی خوب کی جاتی ہے۔ اکثر بوڑھے بوڑھیاں گھروں میں اپنے کتوں یا بلیوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ بازار جائیں تو وہی

ان کے ہمراہی اور رفیق ہوتے ہیں۔

ہمارے بے بی سٹنگ کا چرچا سارے محلے میں ہو گیا تھا۔ یہ ہمیں علم ہی نہ ہو سکا۔ چار دن کے بعد چند گھر چھوڑ کر رہنے والی مس جولی ڈیم نے ہماری کال بیل بجائی تو ہم انہیں دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئے۔ امریکا میں اگر کوئی پڑوسی اچانک آپ کے گھر آ جائے تو بے حد خوشی ہوتی ہے۔ کم از کم ہمیں تو یہ اک اچنبھا سا لگتا تھا۔

مس جولی ڈیم ایک ہنس مکھ اور تندرست خاتون تھیں۔ کسی دفتر میں کام کرتی تھیں اور ہمارے خیال میں گھر میں بالکل تنہا رہا کرتی تھیں۔ ان کے گھر میں زیادہ تر لوگوں کا آنا جانا بھی نہیں تھا۔ ہم نے عموماً انہیں کار میں گزرتے ہوئے ہی دیکھا تھا اور وہ ہمیشہ نہایت خوشی سے مسکرا کر ہاتھ ہلانا اور ہائی کہنا نہیں بھولتی تھیں۔ ہمیں کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ کار میں ان کے ساتھ ایک اور ہستی بھی موجود ہوتی ہے۔

ہم نے فوراً انہیں اندر آنے کی دعوت دی۔ وہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں اور بڑے غور سے ہمارے گھر کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئیں۔ پھر جیسے مطمئن ہو کر انہوں نے ایک لمبی سانس لی۔ ہم ان سے کافی کا پوچھنے ہی والے تھے کہ وہ بول پڑیں "گھر تو آپ کا خاصا آرام دہ ہے۔"

"شکریہ!"

"آپ میری کچھ مدد کر سکیں گے؟"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ یہ خیال بھی نہیں تھا کہ امریکا میں بھی پڑوسی ادھار مانگتے ہوں گے۔"

"فرمایئے!"

بولیں "مجھے اچانک ایک دوست کے پاس جانا پڑ گیا ہے' کیا آپ ڈولی کی بے بی سٹنگ کر لیں گے؟"

"ڈولی؟"

"جی ہاں یہ میری بلی کا نام ہے۔ بے حد تمیزدار اور شریف بلی ہے۔ آپ کو ذرا بھی تکلیف نہیں دے گی' صرف پانچ گھنٹے کی تو بات ہے۔"

ہم سوچ میں پڑ گئے۔ بچوں کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر بلیوں کی بے بی سٹنگ کرنے

کے بارے میں پہلے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ ہمیں خاموش دیکھ کر بولیں "اگر آپ کو اعتراض ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں کوئی دوسرا بندوبست کر لوں گی۔"

"ارے نہیں مس جولی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ بڑے شوق سے ڈولی کو لے آئیں۔"

"شکریہ۔ میں ایک گھنٹے بعد اسے لے کر آؤں گی۔"

ایک گھنٹے بعد وہ ڈولی کو گود میں اٹھائے ہوئے آئیں۔ یہ گلابی اور سفید رنگ کی لمبے بالوں والی بہت خوبصورت بلی تھی۔ جس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ دم بہت موٹی تھی۔ دیکھنے میں وہ بہت متین اور کم گو نظر آ رہی تھی۔

وہ ڈولی کو لے کر اندر آ گئیں اور ایک صوفے پر' اپنے ساتھ لایا ہوا کشن رکھنے کے بعد انہوں نے ڈولی کو اس پر بٹھا دیا۔ "گڈ گرل۔ بس اب تمہیں یہیں بیٹھنا ہے او کے؟"

بلی نے بڑی کاہلی سے آنکھیں جھپکائیں۔

پھر وہ ہم سے مخاطب ہوئیں۔ "اس دوران اس کی پوٹی کا ٹائم تو نہیں ہو گا لیکن اگر ضرورت پڑتی ہے تو یہ باہر والے دروازے کے پاس جا کر میاؤں میاؤں کرتی ہے۔ آپ فوراً اس کے لئے دروازہ کھول دیں۔ کچھ دیر بعد دوبارہ میاؤں میاؤں کی آواز آئے تو اسے اندر بلا لیں۔ یہ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ جائے گی۔"

"او کے۔"

"اس کے کھانے کے اوقات کا چارٹ میں ساتھ لے کر آئی ہوں۔ یہ تین قسم کے کھانے ہیں۔ جنہیں اس چارٹ کے مطابق ڈولی کو کھلانا ہے۔"

"او کے مس جولی۔"

"اگر مناسب سمجھیں تو ہلکی موسیقی بجا دیں۔ موسیقی اسے بہت پسند ہے اور ہاں ایک درخواست اور ہے آپ سے؟"

"وہ کیا؟"

"کوشش کریں کہ اس کمرے میں زیادہ شور نہ ہو۔ ڈولی کو زیادہ شور پسند نہیں ہے۔ البتہ اگر ٹی وی پروگرام لگا دیں تو اس میں دلچسپی لے گی۔"

"او کے مس جولی۔"

مس جولی نے ڈولی کو ایک بار پھر گلے لگایا۔ پیار سے تھپکا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئیں مگر دروازے تک جا کر پھر پلٹ آئیں اور جیب سے ایک گولی نکال کر ہمارے حوالے کی۔

"دیکھئے، پہلے کھانے کے بعد ڈولی کو وٹامن کی یہ گولی بھی دینی نہ بھولیئے گا۔"

"او کے۔"

مس جولی تو رخصت ہو گئیں مگر ہمیں ایک مصیبت میں ڈال گئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بلی ایک انتہائی تمیزدار اور وضع دار بلی تھی۔ انہوں نے اسے جس کشن پر بٹھایا تھا وہ تمام وقت اس پر بیٹھی رہی۔ کبھی ذرا پھیل کر لیٹ جاتی۔ کبھی کروٹ بدل کر بیٹھ جاتی۔ بیشتر وقت اس نے سوتے ہوئے گزارا۔ جاگتے میں بھی وہ خاموش بیٹھی چاروں طرف دیکھتی رہی۔ جان کو تو ہمیں دن میں صرف ایک بار لنچ دینا تھا جو اس بے چارے نے خود ہی کھا لیا تھا اور برتن بھی صاف کر کے رکھ دیئے تھے مگر ڈولی کو تین بار تین مختلف قسم کے کھانے بند ڈبوں سے نکال کر کھلانے پڑے اور ایک بار وٹامن کی گولی بھی اسے کھلائی گئی۔ ہم مس جولی سے یہ پوچھنا بھول گئے تھے کہ ڈولی کو وٹامن کو گولی کس طرح کھلائی جائے گی۔ پہلے تو ہم نے ایک چھوٹی سی پلیٹ میں ڈال کر یہ گولی اس کے سامنے پیش کی مگر اس نے اسے سونگھ کر چھوڑ دیا۔ دوسری بار ہم نے خوراک کے ساتھ ملا کر گولی کھلانے کی کوشش کی۔ اس بار وہ دھوکا کھا گئی اور کھانے کے ساتھ ہی گولی بھی چبا کر کھا گئے۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ مس جولی نے اسے پہلے کھانے کے ساتھ گولی کھلانے کی ہدایت کی تھی مگر ہم نے اسے دوسرے کھانے کے بعد یہ گولی کھلائی تھی۔ بہرحال گولی اس کے پیٹ میں پہنچ گئی تھی اور ظاہر ہے کہ اس وٹامن سے جو بھی فائدہ پہنچنا تھا اسے پہنچ چکا تھا۔ جان نے اگر کھانے کے بعد اپنے تمام برتن دھو کر صاف کئے تھے تو ڈولی بھی کچھ کم مہذب اور تربیت یافتہ نہیں تھی۔ جب بھی ٹین کا ڈبا کھول کر مس جولی کی فراہم کردہ پلیٹ میں اس کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ کھانا ختم کرنے کے بعد پلیٹ کو بھی خوب اچھی طرح چاٹ کر صاف کر دیتی تھی اور اس کے بعد دیر تک خود اپنے ہاتھ اور منہ دھوتی رہتی تھی۔ وہ اتنی زیادہ صفائی پسند تھی کہ غریب کو سونے کے لئے بھی مناسب وقت نہ مل سکا۔

پانچ گھنٹے کے بعد مس جولی تشریف لائیں۔ سب سے پہلے تو انہوں نے ڈولی کا معائنہ کیا اور اسے پیار کیا۔ جواب میں وہ صرف کاہلی سے آنکھیں جھپکا کر رہ گئی۔ پھر انہوں نے ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے اطلاع دی کہ ان کی ہدایات کے مطابق تمام کام ڈولی کے حسب خواہش کر دیئے گئے تھے اور وہ بہت مطمئن اور خوش و خرم ہے۔

"اوہ مسٹر آفاقی، میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے میری اور ڈولی کی خاطر اپنی سنڈے برباد کر لی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے بیس ڈالر کا ایک نوٹ نکال کر ہمیں پیش کیا۔

"نہیں مس جولی، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ڈولی کی وجہ سے ہم سب کا دل بھی بھلا رہا۔"

مگر انہوں نے اصرار کر کے بیس ڈالر کا نوٹ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا اور باہر جا کر خدا جانے کیا صور پھونکا کہ ہمارے گھر کے سامنے پالتو جانوروں کے مالکوں کی قطاریں لگ گئیں۔ کوئی اپنا کتا بے بی سٹنگ کے لئے ہمارے پاس چھوڑنا چاہتا تھا، کوئی اپنا توتا لے کر آیا تھا اور جب ہم نے انکار کیا تو مالک کے ساتھ ساتھ خود توتا بھی بار بار ہم سے "پلیز پلیز" کہہ کر درخواست کرتا رہا۔ اس کی مالک ایک موٹی سی خاتون تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ توتا بالکل باتونی نہیں ہے بشرطیکہ آپ خود ہی اس سے باتیں شروع نہ کر دیں۔ پڑوس کے ایک محلے سے ایک جوڑا اپنا بندر لے کر آ گیا۔ ایک صاحب یہ دریافت کرنے کے لیے آئے کہ کیا ہمارے پاس مگرمچھ کو رکھنے کے لئے کوئی مناسب بندوبست ہے؟ ہم نے تنگ آ کر اگلے دن اپنے دروازے پر بورڈ لگا دیا کہ "بے بی سٹنگ معاف فرمائیں۔" اس طرح خدا خدا کر کے ہماری جان بچی۔

پاکستانی پڑوسی عارف لطیف سے ہماری خوب اچھی دوستی ہو گئی تھی اور فارغ اوقات میں وہ اکثر شام کے وقت چائے پینے ہمارے گھر چلے آتے تھے۔ چند بار انہوں نے بھی ہمیں اپنے گھر مدعو کیا اور خود اپنے ہاتھ سے پاکستانی کھانا پکا کر کھلایا۔ ان کا کہنا تو یہی تھا کہ بھابی کے مقابلے میں تو یہ کھانا محض گھاس پھونس ہی ہے مگر درحقیقت انہوں نے بہت لذیذ کھانا بنایا تھا۔ ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی پروگرام دیکھتے رہے۔ کبھی کبھی عارف لطیف کے چند پاکستانی دوست بھی آ جاتے تھے اور خوب گپ لگتی تھی۔

انڈین نوجوان اروند سے ہماری بہت کم ہی ملاقات ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ صبح سات بجے گھر سے نکلتا تھا۔ نو بجے سے پانچ بجے تک کسی انجینیرنگ ادارے میں کام کرتا تھا۔ پھر ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد کسی اور جگہ کام کرنے پہنچتا تھا اور رات کو ایک دو بجے کے قریب گھر میں داخل ہوتا تھا۔ وہ ہفتہ اور اتوار کو بھی چھٹی نہیں کرتا تھا۔

”بھئی اتنا کام کرکے یہ زندہ کیوں کر رہے گا؟“ ہم نے عارف سے پوچھا۔

”وہ تو بہت خوش و خرم ہے۔ بالکل تندرست ہے۔“

”مگر اتنا زیادہ کام کیوں کرتا ہے؟“

”پیسے جمع کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ پانچ سات سال کے بعد یہاں سے اپنا ساز و سامان خرید کر بنگلور جاکر اپنا ادارہ قائم کرے گا۔“

اروند سے ہماری دو تین بار ہی سرسری ملاقات ہوئی تھی جو کہ بجائے خود ایک حیرت انگیز کارنامہ تھا۔ ورنہ اس غریب کو تو خود اپنے آپ سے ملاقات کرنے کا وقت بھی نہ ملتا تھا۔

امریکن لڑکی مارگریٹ اکثر گھر میں نظر آیا کرتی تھی مگر صرف دو یا تین بار۔ گھر پہنچتے ہی وہ کار پارک کرکے اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ آٹھ بجے کے قریب وہ کمرے سے اتر کر آتی۔ فریج میں سے اپنا سامان نکال کر کھانا بناتی اور پھر کمرے میں غائب ہو جاتی۔ نصف گھنٹے بعد وہ کچن میں برتن وغیرہ دھونے کے لئے نمودار ہوتی اور پھر جو اپنے کمرے میں جاتی تو صبح کام پر جانے کے لئے ہی باہر نکلتی تھی۔ امریکی اور مغربی معیار سے وہ عجیب و غریب لڑکی تھی۔ اس کا کوئی دوست تھا نہ سہیلی۔ نہ کوئی رشتے دار۔ وہ سودا سلف خریدنے کے سوا کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ نہ اس کی کوئی ڈیٹ یا ملاقات ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی اس سے ملنے آتا تھا۔ گھر کے اندر بھی آمنا سامنا ہونے پر وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ”ہائی“ کے سوا کوئی دوسرا لفظ نہیں بولتی تھی۔ اس قدر کم گفتار، محتاط اور شریف لڑکی تو شاید ہمارے ملک میں بھی ڈھونڈنے سے نہ ملے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ چھٹی کے دن بھی تمام وقت اپنے کمرے میں بند رہا کرتی تھی۔

”آخر یہ اپنے کمرے میں کرتی کیا ہے؟ اس کمرے میں کیا سامان ہے جو اسے ہر وقت مصروف رکھتا ہے؟“ ہم نے عارف سے پوچھا۔ خود عارف کو بھی اس بارے میں علم نہ تھا۔

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے ہمارے تجسس اور اشتیاق میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آخر ایک بار ہم نے عارف کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ جب گھر میں کوئی نہ ہو تو وہ ہمیں مارگریٹ کے کمرے کی ایک جھلک ضرور دکھا دیں۔ دو دن بعد عارف جوش میں بھرے ہوئے آئے اور بتایا کہ گھر میں کوئی بھی نہیں ہے اور مارگریٹ بھی اتفاق سے اپنے کمرے کا دروازہ مقفل کرنا بھول گئی ہے۔ چنانچہ ہم لپکی کے ساتھ فوراً ان کے گھر پہنچ گئے۔ اگرچہ ہماری نیت نیک تھی اور اس وقت کسی کے گھر میں داخل ہونے کا اندیشہ بھی نہیں تھا پھر بھی ہمارا دل کانپ رہا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر ہم مارگریٹ کے کمرے تک جا پہنچے۔ دروازہ واقعی مقفل نہ تھا۔ ہم نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ یہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے کہ اس بیڈ روم کا سائز عارف کے کمرے سے نصف بھی نہ تھا۔ ایک سائیڈ میں یہ بیڈ تھا۔ دوسرے جانب دو صوفہ نما کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ تیسرے کونے میں ایک سینٹر ٹیبل تھی۔ اس کے برابر ایک سائیڈ ٹیبل تھی۔ جس پر ایک بہت بڑے سائز کا ٹیلی ویژن رکھا ہوا تھا۔ اس تمام سامان کے بعد کمرے میں محض پھونک پھونک کر چلنے کی جگہ باقی رہ گئی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر چند میگزین بھی پڑے ہوئے تھے۔

”مگر یہ لڑکی اس کمرے میں کرتی کیا رہتی ہے؟“ ہم نے سوچا۔

اس کا جواب خاموش کمرے نے فراہم کر دیا۔ مارگریٹ کے بیڈ پر مختلف سائز اور حلیوں کی ڈھیر ساری گڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سامنے والے دو صوفوں پر بھی بڑی بڑی گڑیاں سجی ہوئی تھیں۔ سینٹر ٹیبل بھی چھوٹے سائز کی گڑیوں سے بھری پڑی تھی۔ یہ حسین و جمیل اور نوعمر لڑکی غالباً اپنی زندگی کا ہر لمحہ اس مختصر سے کمرے میں گڑیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے باتیں کرتے ہوئے یا پھر ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے گزار دیتی تھی۔ یہ تھی ایک تنہا امریکی لڑکی کی تصویر۔ میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ امریکیوں کی سب سے بڑی پرابلم تنہائی ہے۔ ان کی بیشتر برائیوں اور منشیات کے عام ہونے کا سبب بھی یہی تنہائی ہے۔ وہ لاکھوں کی آبادی کے شہروں میں بھی بالکل تنہا زندگی بسر کرتے ہیں۔ جنہیں توفیق ہوتی ہے وہ ہلا گلا کرنے میں کچھ وقت گزار دیتے ہیں اور اس کے بعد پھر وہی تنہائی۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کے باوجود بھی گھر کے افراد ایک دوسرے سے بے تعلق اور تنہا ہیں۔ وہاں ہم نے پاکستانی گھروں میں بھی یہی دستور دیکھا۔ ماں باپ اپنے کاموں پر چلے گئے۔ بہن

بھائی اپنے اپنے کمروں میں ٹی وی یا کتابیں لے کر بند ہو گئے۔ اور تو اور' یہ لوگ کھانے کے وقت بھی یکجا نہیں ہوتے اس لئے کہ ہر ایک کے کھانے کا وقت علیحدہ ہوتا ہے۔ جب بھوک لگی خود ہی کچھ پکا لیا' کھا کر برتن دھو کر صاف کئے اور پھر اپنے کمرے کا رخ کر لیا۔ گھر سے باہر جاتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کو باخبر یا مخاطب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اگر کوئی ضروری پیغام پہنچانا ہو تو کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھ کر کچن میں رکھ دیتے ہیں کیونکہ کچن ہی امریکی کلچر میں سب کے لئے "جائے ملاقات" ہے۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد کوئی کچھ اور کرے یا نہ کرے کچن میں ضرور جاتا ہے اور اس طرح اسے پیغام موصول ہو جاتا ہے۔ تنہائی' لاتعلقی اور ایک دوسرے سے بے گانگی نے جذباتی انجماد کو جنم دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسمی اور ظاہری اخلاق کے علاوہ ان لوگوں میں وہ جذباتی گرمی اور پیار اور نفرت کے احساسات باقی نہیں رہتے جو ہم لوگوں کی زندگی کا ایک ضروری حصہ ہیں۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ نفرت کرتے ہیں' لڑتے جھگڑتے ہیں' شکایت کرتے ہیں اور پھر ان سب چیزوں کو بھلا کر ایک ہو جاتے ہیں۔ ہم سب کو جذباتی رشتوں اور بندھنوں نے بہت مضبوطی سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کر رکھا ہے۔ ہم اپنی ان عادتوں سے نالاں بھی رہتے ہیں مگر ان ہی نے ہماری زندگیوں میں حرارت اور دلکشی پیدا کر رکھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ رفتہ رفتہ ہمارے رشتے بھی کمزور ہوتے جا رہے ہیں اور فاصلے بڑھ رہے ہیں۔ اللہ نہ کرے کہ ایک دن ہم بھی اسی بے گانگی' بے تعلقی اور تنہائی کا شکار ہو جائیں۔ وہاں بوڑھے اور بیمار ماں باپ کی اولاد کو کچھ خبر نہیں ہوتی' اور نہ ہی ماں باپ ان کے سہارے تلاش کرتے ہیں۔ ایک جنگل بیابان کا سماں ہے۔

ہمارے ایلان پیلس کے سامنے ایک وسیع لان تھا جس کے بعد ایک سڑک تھی اور سڑک کی دوسری طرف ایک اور محلہ تھا۔ ایک دن سویرے سویرے پولیس کاریں سائرن بجاتی ہوئی سامنے والے علاقے میں داخل ہوئیں تو سب نے تعجب اور تجسس کے ساتھ دیکھا۔ معلوم ہوا کہ پولیس والے ایک گیارہ سالہ لڑکی کے والدین کو گرفتار کرنے کے لئے آئے ہیں۔

ان کا جرم؟

انہوں نے اپنی بیٹی کو نافرمانی پر سزا کے طور پر ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ اس نے

پولیس کو فون کر دیا اور ماں باپ پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ شام کو بڑی یقین دہانیوں اور معزز دوستوں کی ضمانتوں کے بعد وہ واپس گھر آ گئے۔ آئندہ کے لئے انہیں سرزنش کی گئی کہ وہ اپنی بچی پر بے جا پابندیاں عائد نہ کریں اور اس کے مطالبات ضرور مانیں۔

کچھ دن بعد ہمارے پڑوس میں بھی ایک لطیفہ ہو گیا۔ مسٹر مائیکل ڈفی ایک موٹے تازے تندرست آدمی تھے۔ ان کی چمڑے کے سامان کی دکان تھی۔ اپنے بارہ سالہ بچے ایڈگر کو انہوں نے ایک بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا رکھا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ایڈگر کی ماں کو انہوں نے طلاق دے دی تھی اور بچے کو باری باری دونوں کی تحویل میں رہنا تھا۔ مگر جب ایڈگر اپنے باپ کے گھر آتا تھا تو ایک قیامت برپا ہو جاتی تھی۔ مائیکل ڈفی ایک کنوارے جیسی زندگی بسر کر رہے تھے۔ گرل فرینڈ کی آمد و رفت بھی جاری رہتی تھی اور وہ بھی اکثر ان کے ساتھ گھومنے پھرنے چلے جاتے تھے۔ مگر ایڈگر کے آتے ہی ان کی زندگی میں ایک بھونچال سا آ جاتا تھا۔ وہ اسے تنہا گھر میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے اور جن مقامات پر وہ اپنی گرل فرینڈز کے ہمراہ جایا کرتے تھے وہاں ایڈگر کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ پھر ایڈگر کو ان کی کوئی ایک بھی گرل فرینڈ پسند نہیں تھی۔ نتیجہ یہ کہ سارا وقت بدمزگی میں گزرتا تھا اور مسٹر ڈفی کو مجبوراً گھر میں رہنا پڑتا تھا۔ اگر کبھی وہ ایڈگر کی خواہش نہ مانتے تو وہ انہیں مختلف طریقوں سے تنگ کرتا تھا۔ کبھی فرنیچر خراب کر دیتا تھا' کبھی دیواروں کا رنگ و روغن کھرچ دیتا تھا۔ ایک بار اس نے غسل خانے کا شاور اور باتھ ٹب کے پائپ زور و شور سے کھول دیئے۔ مسٹر ڈفی نزدیک کے شاپنگ سینٹر میں کچھ سامان خریدنے گئے تھے مگر ایڈگر کو شبہ تھا کہ وہ اپنی گرل فرینڈ سے ملنے گئے ہیں۔

جب مسٹر ڈفی واپس گھر پہنچے تو ان کی بالائی منزل کے غسل خانے کا پانی بہتا ہوا' سیڑھیوں سے گزر کر پہلے ڈرائنگ روم میں پہنچا اور پھر گھر کے دروازے سے باہر بہنے لگا تھا۔ مسٹر ڈفی نے اپنے گھر کے اندر سے پانی کا دریا بہتے ہوئے دیکھا تو گھبرا گئے۔ ایڈگر گھر کی چھت پر چڑھا بیٹھا تھا اور اس تمام واقعے سے بے خبر اور بے تعلق نظر آ رہا تھا۔

"ایڈگر۔" وہ چلائے۔ "تمہیں نظر نہیں آ رہا یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"ڈیڈ میں پائپ اور شاور بند کرنا بھول گیا تھا۔ اگر آپ جلد گھر واپس آ جاتے تو اس پر قابو پا لیتے۔"

"مگر تم کیا کر رہے تھے؟"

"آپ کا انتظار۔" اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

مسٹر ڈفی کے پاس زیادہ وقت نہ تھا کیونکہ پڑوسی بھی یہ تماشا دیکھنے کے لئے اکٹھے ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے تو وہ پتلون کے پائنچے چڑھا کر گھر میں داخل ہوئے اور کسی نہ کسی طرح اوپر جا کر پائپ اور شاور بند کیا۔ پھر گھر کا جائزہ لیا تو تمام سامان برباد ہو چکا تھا۔ انہوں نے غصے اور مایوسی میں سر پیٹ لیا اور ایڈگر کو چھت سے نیچے اترنے کے لئے کہا۔ ایڈگر بڑے اطمینان سے چھت سے اتر کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ مسٹر ڈفی غصے میں پاگل ہو رہے تھے اور ایڈگر کی پٹائی کرنا چاہتے تھے مگر سب کے سامنے یہ ممکن نہ تھا اس لئے انہوں نے بڑے پیار سے چمکار کر اسے گھر کے اندر چلنے کے لئے کہا۔ اندر پہنچ کر ابھی انہوں نے ایڈگر کو پٹائی کی دھمکی ہی دی تھی کہ اس نے "پولیس پولیس" کا شور مچانا شروع کر دیا۔ آس پاس کے لوگ یہ شور سن کر دوبارہ اکٹھے ہو گئے یا اپنے گھروں میں سے جھانکنے لگے۔

مسٹر ڈفی نے کمرے کی کھڑکی بند کر دی تو ایڈگر لپک کر دوسرے کمرے میں پہنچ گیا اور وہاں کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر "پولیس پولیس" پکارنے لگا۔ مسٹر ڈفی تو اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے مگر کسی رحم دل پڑوسی نے پولیس کو فون کر دیا اور پولیس مع ایمبولینس موقع پر پہنچ گئی۔ پولیس نے مسٹر ڈفی کے گھر کے اندر جا کر کیا کچھ کیا یہ کوئی نہیں جانتا۔ مگر کچھ دیر بعد وہ پولیس اور ایڈگر کے ہمراہ باہر نکلے اور پولیس کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ وہ رات انہوں نے حوالات میں گزاری اور دوسرے دن نیک چلنی اور خوش اخلاقی کی ضمانت دے کر واپس آئے۔ ایڈگر کو پولیس نے کچھ نہیں کہا اور کہتی بھی کیا۔ اس کے نزدیک قصوروار تو سراسر اس کا باپ تھا جو اسے سزا دینا چاہتا تھا۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر ہم نے کینیڈا میں بننے والی پرویز ملک صاحب کی فلم "کامیابی" میں اداکار ندیم اور ان کے بیٹے کا ایک ایسا ہی سین لکھا تھا جس میں بعد میں کافی تبدیلیاں کر دی گئیں مگر درحقیقت یہ ہمارا ذاتی مشاہدہ تھا۔

☆ ☆ ☆

اردو میں ایک محاورہ ہے کہ مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ خدا جانے یہ کس زمانے کا محاورہ ہے اور اس زمانے میں زندہ ہاتھی کی قیمت کیا ہوا کرتی تھی؟ ہاتھیوں کے

اخراجات کے بارے میں ہم نے البتہ سنا اور پڑھا ہے کہ بادشاہ یا امرا اگر کسی کا بیڑا غرق کرنا چاہتے تھے تو اس کے دروازے کے سامنے تحفے کے طور پر ایک ہاتھی بندھوا دیا کرتے تھے۔ اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ شخص ناشکری کا مرتکب ہو اور ہاتھی کا تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دے۔ اس کے برعکس وہ بے حد شکرگزاری اور ممنونیت کا اظہار کرتا تھا اور اس ہاتھی کے اخراجات کے بوجھ تلے دب کر چند ہی ماہ میں دیوالیہ ہو جاتا تھا۔ ہمیں تو آج کل کے ہاتھیوں کے بھاؤ کا علم نہیں ہے۔ پرانے زمانے کے ہاتھیوں کا نرخ کیسے معلوم کر سکتے ہیں؟ لیکن یہ محاورہ ہمیں امریکا میں بہت یاد آیا۔ اسے ذرا سی تبدیلی کے ساتھ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرا ہوا فن کار لاکھوں کروڑوں کا ہوتا ہے۔ زندگی میں تو یہ لوگ جو کماتے ہیں سو کماتے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان کی اصل کمائی تو ان کے مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر قسم کے فن کاروں کی امریکا میں بہت زیادہ قدر کی جاتی ہے اور شو بزنس سے تعلق رکھنے والے تو سب سے بڑھ کر لاڈلے ہوتے ہیں۔ زندگی میں بھی ان کے ناز و نخرے اٹھائے جاتے ہیں اور ان کے پرستار ان پر جان چھڑکتے رہتے ہیں مگر مرنے کے بعد تو جیسے ان میں نئی روح پھونک دی جاتی ہے۔ ان کی فلمیں' ان کے کیسٹ' ان کے ریکارڈ' ان کے مکانات' ان کے ملبوسات' ان کی یادگاریں انتہائی قیمتی ہو جاتی ہیں۔ گلوکار ایلوس پریسلے صاحب جب مرے تو روبہ زوال تھے۔ اب مرنے کے بعد ان کی آمدنی اربوں ڈالر ہو گئی ہے۔ ان کے مکان لوگوں کے لئے زیارت گاہ بن گئے ہیں۔ مارلین مونرو مقبول اداکارہ تھی مگر یہ کون جانتا تھا کہ مرنے کے بعد وہ ایک غیرفانی ہستی بن جائے گی۔ اداکارہ تو وہ بس یوں ہی تھی۔ اس کی ممتاز خصوصیت اس کا حسن و جمال اور سیکس اپیل تھی۔ اس کی زندگی میں بھی مختلف اداکارائیں اس کی نقل کرتی رہتی تھیں اور اب مرنے کے بعد تو اس کی ہم شکل لڑکیوں کی لاٹری نکل آئی ہے۔ مارلین مونرو کی وفات کو تیس سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے مگر وہ آج پہلے سے زیادہ مقبول اور مشہور ہے۔ اس پر لاتعداد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ فلمیں بنائی گئی ہیں۔ اس سے منسوب چیزیں لاکھوں کے مول بک رہی ہیں۔ یہی حال دوسرے فن کاروں کا بھی ہے۔ امریکا غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جہاں حقیقت اور افسانے کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ امریکی حقیقت پسند ضرور ہیں مگر اپنے خوابوں سے دستبردار ہونے کو بھی تیار نہیں ہیں۔ والٹ ڈزنی مشہور فلم ساز تھا۔ اس کے مرنے کے بعد

پرستاروں نے اس کی لاش کو اس امید پر محفوظ رکھا ہے کہ کسی نہ کسی دن مردہ کو زندہ کرنے والی دوائی ضرور ایجاد ہو گی اور اس وقت والٹ ڈزنی کو دوبارہ زندہ کر لیا جائے گا۔ ذرا سوچئے یہ احمقانہ تصور اور امریکا جیسے ملک میں؟

امریکا میں دانشور اور سیاست داں بھی اپنی قوم کی نفسیات کے مطابق ہمیشہ "امریکی خواب" کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں مگر یہ کوئی نہیں بتاتا کہ یہ امریکی خواب ہے کیا؟ شاید یہی کہ مرنے والے فن کاروں کی یادوں کو زندہ رکھا جائے۔ ان سے منسوب چیزوں سے لاکھوں کروڑوں ڈالرز کمائے جائیں اور پوری قوم کو مستقل طور پر "احمقوں کی جنت" میں رکھا جائے۔ امریکی دنیا کی ترقی یافتہ ترین اور قابل ترین قوم سمجھے جاتے ہیں لیکن اگر آپ ان کے ملک میں جا کر دیکھیں تو اس کے برعکس یوں لگتا ہے جیسے ان سے زیادہ بے وقوف قوم ہی کوئی اور نہیں ہے۔ ایک طرف ترقی اور عقلمندی کی انتہا ہے تو دوسری طرف بے خبری اور حماقت کی کوئی حد نہیں ہے۔

امریکا کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کی ۱۵ فیصد آبادی غربت کے پست ترین درجے سے بھی گری ہوئی ہے۔ ان میں اکثریت کالوں کی ہے۔ غربت مختلف جرائم اور خرابیوں کو جنم دیتی ہے اور اس طرح معاشرے میں افراتفری اور بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ اخلاقی اور معاشرتی خرابیاں بھی عروج پر ہیں۔ کالوں میں دو تہائی سے زائد بچے شادی کے بغیر ہی پیدا ہو رہے ہیں۔ اب دوسری نسل کے لوگوں میں بھی یہ رجحان عام ہو رہا ہے۔ امریکا کی ایک خوبی اس کی خرابی بھی بنتی جا رہی ہے۔ وہ یہ کہ امریکا میں قریباً ۱۵۰ مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے ہیں جن کے مزاج، کلچر، عادات و اطوار اور رسم و رواج بالکل الگ الگ ہیں۔ ان میں ۱۲ فیصد تو سیاہ فام ہیں اور نو فیصد کے قریب ہسپانوی ہیں۔ اب چینی، کوریائی، ایشیائی اور دوسری اقوام کے لوگ بھی بہت بڑی تعداد میں آ رہے ہیں اور ان کے مابین فاصلے اور اختلافات بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ یورپ کے مقابلے میں امریکا میں جرائم کی انتہا ہو چکی ہے۔ قانون شکنی، منشیات فروشی، قتل و غارت، لوٹ مار، عصمت دری اور دوسرے جرائم اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ خود امریکیوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس کا علاج کیا ہے شہریوں کی حفاظت کے لئے کھلے عام اسلحہ کے لائسنس دیئے جاتے ہیں۔ مگر مجرموں کے پاس ان سے زیادہ اسلحہ موجود ہے امریکی نظام حکومت اور

قانون میں کوئی ایسا سقم ضرور ہے جو ان خرابیوں کو بڑھا رہا ہے۔

ایک بوڑھے امریکی نے کہا "اب ہم جرائم پر قابو پانے کے خیال سے نجات حاصل کر چکے ہیں۔ اس لئے مصنوعی اور فرضی چیزوں کے سہارے لے رہے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"آپ نے ہمارے ٹی وی پلے اور فلمیں نہیں دیکھیں ان کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہ عادی مجرموں اور بدمعاشوں کا معاشرہ ہے۔ جن پر قابو پانا ممکن نہیں ہے۔ پولیس اور دوسرے ادارے فیل ہو چکے ہیں اس لئے اب بایونک مین، آٹومین، سپرمین اور ان جیسے دوسرے کردار تخلیق کئے جا رہے ہیں۔ جب قانونی اور آئینی طاقتیں ناکام ہو جاتی ہیں تو یہ لوگ اپنی ماورائی قوتوں کے بل بوتے پر سب کچھ ٹھیک کر دیتے ہیں۔ آپ خود ہی بتایئے کہ کسی نظام کی بے بسی اور احساس شکست کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟"

کالوں کو تحفظ دینے کے لئے بعض ریاستوں میں ان کے لئے کوٹہ سسٹم رائج کیا گیا ہے مگر سیاہ فام امریکی اسے پسند نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ فیصلہ خالص میرٹ پر ہونا چاہئے۔ ایک نالائق کالے کو ایک لائق و فائق سفید فام پر ترجیح دینا کہاں کا انصاف ہے؟ ایک اور مسئلہ جو آئندہ چند سالوں میں بہت بھیانک صورت اختیار کر لے گا یہ ہے کہ ایشیائی ملکوں سے آئے ہوئے لوگ سب سے زیادہ محنتی اور ذہین ہیں۔ یہ ہر شعبے میں دوسروں سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ کیا سفید فاموں کی اکثریت ان کی بالادستی تسلیم کر لے گی؟ ان مسائل نے گھریلو اور ذہنی زندگی کو پراگندہ کر دیا ہے۔ چھوٹی موٹی باتوں پر اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو طلاق دے دیتے ہیں۔ شادی شدہ جوڑے ناخوش نظر آتے ہیں مگر شادی بھی انہیں خوشی، سکون اور اطمینان نہیں بخشتی۔ تو پھر کیا کریں۔ آخر اس کا علاج کیا ہے۔ آپ کو شاید یہ علم نہیں ہے کہ دنیا بھر میں طلاقوں کی شرح سب سے زیادہ امریکا میں ہے اور اب تو رفتہ رفتہ لوگ شادی کو ایک غیر ضروری اور بے کار چیز سمجھنے لگے ہیں۔ کیا یہ انداز فکر کسی معاشرے کو نارمل اور صحت مند بنا سکتا ہے؟

انتہائی ترقی کے باوجود عام امریکی کی زندگی مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک وقت تھا جب امریکیوں کو خوش فہم لوگوں کی قوم کہا جاتا تھا۔ اب یہ مایوسی کا شکار ہونے لگے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جو بھی نیا صدر آئے وہ جادو کی چھڑی استعمال کرے اور ان کے تمام

مسائل حل کر دے مگر یہ ممکن نہیں ہے۔ امریکیوں کا معیار زندگی اب بھی دنیا میں بلند ترین ہے۔ معاشی ترقی بھی جاری ہے۔ سیاسی نظام بھی ٹھیک چل رہا ہے مگر لوگوں کے مسائل ہیں کہ بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم اپنی آبادی سے تنگ ہیں۔ ادھر امریکی بھی پریشان ہیں۔ ۱۹۴۱ء سے لے کر اب تک امریکا کی آبادی دوگنا ہو چکی ہے اور باہر سے بھی کروڑوں غیرملکیوں کی آمد جاری ہے۔ حالانکہ یورپ میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مگر یورپ کے مقابلے میں امریکا نے آج بھی اپنے دروازے غیرملکیوں کے لئے بند نہیں کئے ہیں۔ ایک اور فرق یہ ہے کہ امریکا میں کسی قسم کا تعصب ابھی تک جڑ نہیں پکڑ سکا ہے۔ مساوات پر عمل کیا جاتا ہے۔ سب لوگ قانون کی نظر میں برابر ہیں۔ قانون شکنی کا مرتکب خواہ کتنا ہی دولت مند اور بااثر کیوں نہ ہو، سزا سے نہیں بچ سکتا۔ ہر شخص کو اس کا شہری اور آئینی حق دیا جاتا ہے۔

ایک اور بات جو بہت کم لوگ جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ تمام تر خرافات کے باوجود امریکیوں کی اکثریت مذہب پرست ہے۔ امریکا کی آدھی آبادی باقاعدگی سے ہر ہفتے گرجا گھر جاتی ہے۔ خدا اور بائبل پر بھی ان کا اعتقاد بہت مضبوط ہے یورپ کے مقابلے میں یہ ایک بنیادی فرق ہے جہاں مذہب سے بے گانگی بڑھ گئی ہے۔

امریکا میں زندہ رہنا آسان نہیں ہے۔ معیار زندگی بلند رکھنے اور آسائشیں حاصل کرنے کے لئے عام آدمی کو بہت زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ مگر وہاں مرنا بھی خاصا مشکل کام ہے۔ پہلے تو پاکستانیوں کا سن لیجئے۔ سارے امریکا میں پاکستانیوں کا ایک ہی "فیونرل ہوم" یعنی مردہ گھر ہے۔ باقی سب عیسائیوں کے ہیں اور زیادہ تر یہودیوں کے قبضے میں ہیں۔ مسلمانوں کی میت کو غسل دینا بھی ایک مسئلہ ہے۔ یہاں کی تمام ریاستوں میں یہ قانون ہے کہ اگر کوئی شخص مرجائے تو سب سے پہلے پولیس کو اطلاع دی جاتی ہے اور پولیس اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد لاش کو "فیونرل ہوم" یا مردہ گھر کے حوالے کر دیتی ہے۔ یہ لوگ لاش کے کفن دفن کا انتظام کرتے ہیں جس میں لاش کو غسل دینا، تابوت میں بند کرنا اور دوسرے لوازمات شامل ہیں۔ یہاں لاشوں کا بزنس بھی بہت وسیع اور منافع بخش کاروبار ہے اور یہ لوگ اربوں کھربوں ڈالرز کماتے ہیں۔ کیمیائی عمل صرف ان لاشوں کا ہوتا ہے جو ملک سے باہر بھیجی جاتی ہیں۔ ایشیائی لوگ خاص طور پر اپنے مردوں کو وطن بھیجتے ہیں جس

کی وجہ سے یہودی بزنس مین لاکھوں ڈالرز کماتے ہیں۔ لاشوں پر کیمیائی عمل کرنے والے مرد ہوتے ہیں اور مسلمان خواتین کی لاشوں کو بھی یہی غسل دیتے ہیں۔ ایک مردے کی تکفین و تدوین کا خرچہ تیرہ سو سے دو ہزار ڈالر تک ہوتا ہے۔ یہ تو ہو گیا لاش گھر کا خرچہ۔ اس کے بعد دفنانے کی نوبت آتی ہے۔ امریکا میں دفن کرنے کے لئے ایک قبر کی قیمت عام طور پر تین سو ڈالر ہوتی ہے۔ گورکن یا قبر تیار کرنے والے کی فیس ۶۷۰ ڈالر کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ گویا مجموعی طور پر امریکا میں ایک مردے کے کفن دفن پر ڈھائی ہزار ڈالر خرچ ہو جاتے ہیں۔ قبرستان تو انگریزوں ہی کے ہیں۔ امریکا میں مسلمانوں کا سب سے بڑا قبرستان واشنگٹن ڈی سی میں ہے مگر مزے کی بات یہ ہے کہ یہ بھی ایک یہودی کی ملکیت ہے۔ یہودیوں نے قبرستانوں کے لئے بھی تھوک کے حساب سے زمینیں خرید رکھی ہیں اور خوب کماتے ہیں۔ اب کچھ مسلمانوں نے بھی اس طرف توجہ دی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ایدھی ٹرسٹ نے ۲۸۵ ڈالر فی قبر کے حساب سے قبریں خریدی ہوئی ہیں اور نامساعد حالات میں بعض قبریں مفت بھی دے دی جاتی ہیں۔ جب بھی پاکستانی کسی جگہ اکٹھے ہوتے ہیں تو اس مسئلے پر بحث کرتے ہیں مگر عملی طور پر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

ہمارا خیال ہے کہ امریکا میں ہمارے مقابلے میں الٹا حساب ہے۔ وہاں شادی بیاہ بہت سادگی سے ہوتا ہے اور اس پر بہت کم رقم خرچ کی جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مرنے پر اخراجات زیادہ ہو جاتے ہیں اور شادیاں عموماً چھٹی کے دن ہوتی ہیں۔ شریک ہونے والے نہایت سادے سے تحائف دلہا دلہن کو دیتے ہیں۔ اگر دلہا دلہن کو یہ تحفہ پسند نہ آئے تو وہ تیس دن کے اندر دکان پر جا کر یہ تحفہ بدلوا لیتے ہیں یا اسی قیمت کی کوئی اور چیز خرید لیتے ہیں۔ یہ تو ہم آپ کو بتا ہی چکے ہیں کہ یہاں دکاندار تیس دن کے اندر خریدی ہوئی اشیاء واپس لینے کے پابند ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی شادی کے سلسلے میں یہ سن لیجئے کہ قاضی صاحب نکاح پڑھائیں۔ گواہ موجود ہوں۔ امام صاحب دعا فرمائیں۔ اس کے باوجود مقامی قانون کے مطابق یہ شادی اس وقت تک جائز اور قانونی نہیں تصور کی جاتی جب تک کہ حکومت کے کسی منظور شدہ نمائندے یعنی کسی جج یا گرجا کے پادری سے سرٹیفکیٹ حاصل نہ کیا جائے۔ اس کے بغیر آپ قانونی طور پر میاں بیوی تصور نہیں کئے جا سکتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ پاکستانیوں کو شادی کے بعد بھی اس قسم کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنا چاہئیں

ورنہ ان کی شادی بھی نہیں تسلیم کی جائے گی اور تنازعہ کی صورت میں طلاق بھی نہ ہو گی۔ ظاہر ہے کہ جب شادی ہی نہ ہوئی ہو تو طلاق کیسے ہو گی؟

پاکستانیوں کو بھی یہاں شادی سادگی اور خاموشی سے کرنی پڑتی ہے۔ شور و غل یا ہجوم کی صورت میں پولیس کو اطلاع کر دی جاتی ہے جو بہت ممکن ہے کہ براتیوں سمیت دلہا دلہن کو بھی حوالات میں پہنچا دے۔ یہاں تو کتوں تک کو بلاضرورت بھونکنے کی اجازت نہیں ہے۔ ورنہ پولیس کو اطلاع کر دی جاتی ہے۔ کتا تو ظاہر ہے کہ سزا سے بچ جاتا ہے مگر مالک پھنس جاتا ہے۔

ویسے ہمیں امریکیوں کی ایک بات بہت پسند آئی کہ نہ تو خوشی کے موقعے پر مارے خوشی کے آپے سے باہر ہوتے ہیں اور نہ ہی افسوس کے موقع پر سوگ مناتے ہیں۔ مثال کے طور پر شادی بیاہ کو دیکھ لیجئے۔ شادی کی تیاریاں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ایک مرد اور عورت دفتر جانے کی تیاری کر رہے ہیں البتہ لباس کچھ مختلف ضرور ہوتا ہے۔ نہ دھوم دھام' نہ شادیانے' نہ مبارک بادیاں' نہ زیورات اور حد سے زیادہ سجاوٹ۔ ہمراہی بھی گنتی کے ہوتے ہیں۔ گرجا گھر میں یا عدالت میں گئے اور دو منٹ میں شادی ہو گئی۔ نہ مٹھائی نہ چھوہارے۔ مہندی' مایوں' ڈھولک وغیرہ کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حد تو یہ ہے کہ ولیمہ تک نہیں کرتے۔

ایک بار قدوس صاحب نے ہم سے کہا "بندہ پرور۔ آپ نے کبھی یہ سوچا کہ ان امریکیوں کی تو شادیاں ہی جائز نہیں ہوتیں۔"

پوچھا "کیوں۔ اس لئے کہ قاضی صاحب نکاح نہیں پڑھاتے؟"

"ارے صاحب یہ کم بخت تو ولیمہ تک نہیں کرتے۔ اب آپ خود ہی بتایئے کہ ولیمے کے بغیر بھی کوئی شادی جائز ہو سکتی ہے؟"

ہم نے کہا۔ "قدوس صاحب۔ شادی میں یہ اور جو کچھ کرتے ہیں کیا وہ جائز ہوتا ہے؟" سوچ میں پڑ گئے۔

ہم نے کہا۔ "اور آپ خود مس ڈورا کے ساتھ جو زندگی بسر کر رہے ہیں کیا وہ جائز ہے؟"

کہنے لگے "بندہ نواز۔ وہ تو بات ہی اور ہے۔ میں تو شادی کے ناجائز ہونے کی بات کر

رہا ہوں۔ اگر شادی ہی نہ ہو تو جائز کیا اور ناجائز کیا؟"

ہمارے پڑوس میں' سنا کہ ایک جوڑا طلاق حاصل کر رہا ہے۔ شوہر کا نام کرسٹ شمڈ تھا اور بیوی کو سوزانے کہا جاتا تھا۔ حسب دستور ان سے بھی ہماری دور ہی دور کی صاحب سلامت تھی۔ خاتون بہت طرح دار اور اسمارٹ تھیں۔ شوہر بھی مناسب تھے۔ وہ ایک بار اپنے کتے کو ہمارے پاس بے بی سٹنگ کرانے کے لئے لائی تھیں۔ ہمارے انکار پر بہت حیران ہوئیں۔

انہوں نے اپنی براؤن' بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ "کیا مجھ سے کوئی شکایت ہے؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر ڈوگی کا کیا قصور ہے۔ آخر آپ نے مس جولی کی بلی کو بھی تو رکھ لیا تھا؟"

ہم نے کہا "بلی کی بات اور ہے۔"

وہ ہنسنے لگیں۔ "کیا مطلب۔ آپ کتے اور بلی میں امتیاز کرتے ہیں؟"

ہم نے کہا۔ "یقیناً کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے مذہب میں کتے کو گھر میں رکھنا گناہ ہوتا ہے۔"

وہ اتنی حیران ہوئیں کہ ان کی اندر کی سانس اندر اور باہر کی سانس باہر رہ گئی۔ وہ سہارا لینے کے لئے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ بولیں "مسٹر آفاقی' کیا آپ مذاق کر رہے ہیں؟"

"ہرگز نہیں' حقیقت بیان کر رہے ہیں۔"

نادیہ نے امریکی لب و لہجہ میں انہیں مزید وضاحت کے طور پر بتایا "جس گھر میں کتا ہوتا ہے وہاں فرشتے نہیں آتے۔"

کہنے لگیں۔ "عجیب بات ہے۔ میں تو پہلی بار سن رہی ہوں۔ ویسے یہ بتائیں کہ کیا آپ نے کبھی فرشتوں کو دیکھا ہے؟"

"کبھی اتفاق نہیں ہوا۔"

"حالانکہ آپ کے گھر میں تو کتا بھی نہیں ہے تو پھر آپ کے گھر میں فرشتے کیوں نہیں آتے؟"

ہم تو لاجواب سے ہو گئے مگر نادیہ نے فوراً مدد کی اور کہا "مس سوزانے' فرشتے ہر

ایک کو نظر نہیں آتے مگر ہوتے تو ہیں۔ ہمارے ہاں بھی آتے ہوں گے۔"

"کیسی بچگانہ بات ہے۔" وہ بولیں "جو چیز نظر ہی نہیں آتی اس کا وجود کیسے ہو سکتا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "مس سوزا نے آپ خدا کو مانتی ہیں نا؟ اور حضرت یسوع کو بھی؟"

"بالکل۔"

"کیا وہ آپ کو نظر آتے ہیں؟"

اس بار ان کے لاجواب ہونے کی باری تھی۔ وہ مجبوراً اپنے ڈوگی کو لے کر واپس چلی گئیں۔

اب یہی مس سوزا نے اپنے شوہر سے طلاق حاصل کر رہی تھیں۔ ان کا گھر ہم سے زیادہ دور نہ تھا۔ ہم نے سوچا ذرا دیکھیں کہ حالات کیا ہیں۔ ٹہلتے ہوئے ان کے گھر کی طرف گئے تو وہ دونوں لان میں موجود تھے اور بہت زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ ہم سمجھے کہ کسی نے بلاوجہ افواہ اڑا دی ہے ان کے متعلق۔

ہمیں دیکھا تو "ہائی" کہا اور اٹھ کر باڑھ کے پاس آ گئیں۔

"آپ دونوں کو خوش و خرم دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔" ہم نے کہا "ورنہ ہم نے تو ایک افواہ سنی تھی۔"

"طلاق کے بارے میں؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

ہم نے شرمندگی سے کہا "ہاں۔ پتا نہیں کس نے یہ افواہ اڑا دی ہے۔"

اتنی دیر میں ان کے شوہر بھی مسکراتے ہوئے ہمارے نزدیک آ گئے۔ "ہائی علی!"

"ہائی۔"

"شمڈ۔ یہ بھی وہی بات سن کر آئے ہیں۔"

"اس قسم کی افواہیں پڑوسیوں کو پریشان تو کر ہی دیتی ہیں۔" ہم نے کہا۔

مس سوزا نے بولیں "وہ افواہ نہیں ہے علی، حقیقت ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم دونوں نے طلاق کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اتنی ہنسی خوشی۔" بے اختیار ہمارے منہ سے نکل گیا۔ مگر پھر ہم نے سنبھل کر کہا

"مطلب یہ کہ جب آپ لوگ اتنے خوش و کرم ہیں تو پھر۔۔۔۔"

وہ بولیں "علی، خوشی یا ناخوشی سے طلاق کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میں تو اس بات کی قائل ہوں کہ شادی بھی خوشی خوشی کرنی چاہئے اور طلاق بھی خوشی خوشی ہی لینی چاہئے۔ کیوں کیا خیال ہے آپ کا؟"

ہم لاجواب ہو گئے۔

کہنے لگیں "دراصل مجھے نیویارک میں ماڈلنگ کا بہت اچھا موقع مل رہا ہے۔ شمڈ تو واشنگٹن سے جا نہیں سکتا اور ایسے موقعے بار بار نہیں ملتے ہیں۔ شادی کا کیا ہے وہ تو جب چاہے انسان کر سکتا ہے۔"

"اوہ۔" ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان سے اظہار ہمدردی کریں یا مبارک باد پیش کریں۔

"تو پھر آپ کب تک جائیں گی؟" ہم نے پوچھا۔

"جانے میں تو ابھی دو مہینے پڑے ہیں مگر مجھے دو چار بار نیویارک جانا پڑے گا۔ مگر طلاق تب ہی ہو جائے گی۔ کیونکہ نیویارک میں ابھی کوئی رہنے کا بندوبست نہیں ہو سکا ہے اس لئے میں دو ماہ تک شمڈ کے ساتھ ہی رہوں گی۔"

شمڈ نے کہا۔ "مجھے تو بہت خوشی ہو گی۔ سوزا نے زیادہ عرصے تک بھی میرے ساتھ رہ سکتی ہے مگر مشکل یہ ہے کہ دو ماہ کے بعد میرا شادی کا پروگرام ہے۔ اس لئے سوزا نے کی میں دو ماہ سے زیادہ میزبانی نہیں کر سکوں گا۔"

سوزا نے یکایک گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا "اوہ شمڈ ہمیں تو پارٹی پر بھی جانا ہے۔"

ہم ان سے معذرت کر کے چلے آئے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے؟

☆ ☆ ☆

ہمارا ریستوران ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ کیرن اور طارق باقاعدہ محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ جس کی اطلاع کیرن نے بھی ہمیں دے دی تھی۔ سام نے اپنے پاکستانی دوستوں کو یہ خبر پہنچا دی تھی کہ وہ ایک ایسے ریستوران میں کام کر رہا ہے جس کا مالک ایک پاکستانی

فلم ساز ہے۔ چنانچہ کئی پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور ہمیں دیکھنے کے لئے آتے رہتے تھے اور مختلف پاکستانی فلم سازوں اور اداکاروں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔

ایک دن سام نے ہمیں اطلاع دی کہ تھوڑے فاصلے پر ایک لبنانی ریستوران کھل گیا ہے جس کے مالک نے باہر فٹ پاتھ پر کرسیاں اور میزیں بھی لگائی ہیں۔ کیوں نہ ہم بھی ایسا ہی کریں۔

"مگر کیسے؟" ہم نے پوچھا۔

"بس اجازت لینی ہوگی اور کچھ فیس داخل کرنی ہوگی۔ مناسب سمجھیں تو آپ خود ہی غفرانی سے پوچھ لیں۔"

"غفرانی کون؟"

"وہی لبنانی۔ بہت اچھا آدمی ہے۔ کئی بار آپ کے بارے میں دریافت کرچکا ہے۔"

دو تین روز بعد ہم فٹ پاتھ سے گزر رہے تھے کہ اچانک سامنے لبنانی ریستوران نظر آگیا۔ دروازے پر ایک حسین و جمیل نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ سرخ و سفید رنگ' بھورے بال' دراز قد' مناسب قد و قامت' ہمیں دیکھا تو باہر نکل آیا اور عربی نما انگریزی میں مخاطب کیا۔

"آپ نیڈوز کے پاکستانی مالک ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"میں اس ریستوران کا مالک ہوں۔ غفرانی میرا نام ہے۔ السلام علیکم۔"

وعلیکم السلام کہہ کر ہم دونوں نے ہاتھ ملایا۔

"اب میں آپ کو لبنانی قہوہ پلائے بغیر نہیں جانے دوں گا۔" ہم نے بہت معذرت کی مگر غفرانی ہمیں ہاتھ تھام کر اندر لے گیا۔ ریستوران کو بہت شاندار طریقے پر سجایا گیا تھا۔ ہر چیز سے دولت کا اظہار ہو رہا تھا۔ غفرانی نے عربی میں کسی کو پکارا اور ایک صحت مند خوش شکل خاتون اندر سے برآمد ہوئیں۔

"یہ خاتون مرحبا ہیں۔ میرے اسٹاف میں ہیں۔"

انہوں نے عربی میں علیک سلیک کی۔ انگریزی کا لب و لہجہ بھی اچھا تھا۔

"مرحبا۔ یہ ہمارے پاکستانی دوست ہیں۔ ان کے لئے بہترین لبنانی قہوہ لاؤ۔ اور میرے

لئے بھی۔" وہ خاتون عربی بولتی ہوئی رخصت ہوگئیں۔ غفرانی نے اپنے بارے میں بتایا کہ لبنان میں اس کے والد کا بہت بڑا کاروبار اور جائیداد تھی۔ خانہ جنگی سے تنگ آکر وہ سب لوگ یورپ اور امریکا کا رخ کر رہے ہیں۔ پیسے کی فراوانی ہے۔ وہ تو ہمیں نظر بھی آرہا تھا۔ ریستوران میں ایک بھی گاہک نظر نہیں آرہا تھا لیکن ٹھاٹ باٹ دیکھنے کے قابل تھا۔

اتنی دیر میں ایک اور دلکش خاتون اندر سے تشریف لائیں اور غفرانی کو مخاطب کیا۔

"یہ غزہ ہیں۔ یہ بھی لبنان سے میرے ساتھ آئی ہیں۔ ہوٹل کے اسٹاف میں ہیں۔"

کچھ دیر بعد قیمتی برتنوں میں قہوہ آگیا۔ قہوہ لانے والی ایک اور جاذب نظر خاتون تھیں۔ جن کا نام ہمیں یاد نہیں رہا۔ یہ بھی لبنانی تھیں اور اسٹاف میں شامل تھیں۔

قہوہ غفرانی صاحب نے اپنے دست مبارک سے بنا کر ہمیں پیش کیا۔ قہوہ کیا تھا کوئلے کے رنگ کا نہایت گاڑھا سا لیس دار ملغوبہ تھا۔ غفرانی صاحب کا کہنا تھا کہ دنیا میں اس سے اچھا قہوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ پھر انہوں نے چینی کے بارے میں پوچھا۔ ہم نے دو چمچے کی فرمائش کردی۔

"ارے نہیں مسٹر آفاقی۔ اس کا لطف تو بغیر چینی کے ہی آتا ہے۔"

مگر ہمارے اصرار پر انہوں نے دو چمچے چینی ڈال کر قہوہ ہمیں پیش کردیا۔ ہم نے ایک ہی گھونٹ لیا اور ہماری سانس رک گئی۔ اس قدر بدمزہ اور کڑوا قہوہ ہم نے زندگی میں کبھی نہیں پیا تھا۔ قہوہ کیا' اس قدر بدمزہ کوئی بھی چیز ہم نے پہلے کبھی نہیں چکھی تھی۔ ادھر غفرانی صاحب ہمیں پوری چینک پلانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

"کیوں کیسا ہے۔ لاجواب چیز ہے نا؟"

ہم نے بمشکل سرہلا دیا۔ غفرانی صاحب لبنان کی باتیں سناتے رہے۔ انہوں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی کوئی کام نہیں کیا تھا۔ یہ ان کا پہلا بزنس تھا۔ ان کے والدین فرانس میں تھے اور وہ خود واشنگٹن آگئے تھے۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ان کے ریستوران میں قریب قریب درجن بھر لبنانی خواتین تھیں جنہیں وہ اپنے ساتھ ہی بیروت سے لائے تھے بلکہ ہمیں تو یوں لگا جیسے انہوں نے یہ ریستوران ہی ان خواتین کے لئے کھولا تھا۔ ان سب کے رہنے سہنے کا بندوبست بھی ان ہی کے ذمے تھا۔ مگر وہ اس اسٹاف سے بھی مطمئن نہیں تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ اسٹاف میں چھ سات امریکی لڑکیوں کا بھی اضافہ کیا جائے۔ وہ فون

سننے کے لئے اٹھے تو ہم نے قہوہ کی پیالی برابر والے گملے میں الٹ دی اور چپکے سے اٹھ کر آ گئے۔

"مسٹر آفاقی۔ کیسا ریستوران ہے ان کا؟" سام نے ہم سے پوچھا۔

ہم نے کہا "ریستوران تو اچھا ہے مگر اسٹاف اس سے بھی زیادہ اچھا ہے۔"

دو ماہ بعد غفرانی وہ ریستوران فروخت کر کے رخصت ہو گئے۔

ایک دن سام بہت جوش میں بھرا ہوا آیا اور ہمیں بتایا کہ ایک ٹی وی پروڈیوسر ہم سے ملاقات کرنے کے خواہش مند ہیں۔ تین بجے سہ پہر کو آئیں گے۔

ٹھیک تین بجے مسٹر بونی انجلو ریستوران میں پہنچ گئے۔ وہ درمیانی عمر کے آدمی تھے۔ مگر ان کی بیگم ان سے نصف عمر کی تھیں۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ان کی سیکرٹری تھیں مگر بیگم سے بڑھ کر۔ یعنی ان ہی کے ساتھ ان کے خرچ پر رہتی تھیں اور ان سے تنخواہ بھی وصول کرتی تھیں۔ بیگم کی قسمت میں یہ سب سہولتیں کہاں؟

انہوں نے آتے ہی ہم سے پوچھا۔ "آپ یونانی ہیں؟"

ہم نے کہا "جی نہیں ہم پاکستانی ہیں۔"

"مگر سام نے تو بتایا تھا کہ آپ مشرقی ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "پاکستان بھی مشرق میں ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر اپنی سیکرٹری سے کہا کہ سورج کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو جاؤ اور پھر بتاؤ کہ مشرق' مغرب' شمال اور جنوب کس طرف ہیں۔ وہ فوراً ریستوران سے باہر نکل گئیں۔ کچھ دیر بعد آ کر انہوں نے ہاتھوں کے اشاروں سے مسٹر بونی کو بتایا کہ مشرق مغرب کس طرف ہیں۔ شمال اور جنوب کی سمت کون سی ہے۔ ان کا حساب ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا۔ البتہ مشرق کی حد تک وہ درست تھیں کیونکہ یہ ہمیں بھی معلوم تھا کہ سورج کس طرف سے نکلتا ہے اور وہ جس طرف سے نکلتا ہے وہی مشرق ہوتا ہے۔

"مسٹر آفاقی' مجھے آرلنگٹن سمٹیری کے بارے میں ایک دستاویزی فلم بنانی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ تعاون کریں۔"

ہم نے معذرت پیش کر دی کہ آرلنگٹن کے تاریخی قبرستان کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں جانتے اور نہ ہی قبرستانوں کے بارے میں فلم بنانا چاہتے ہیں۔

وہ بولے "وہ قبرستان تو نہیں ہے۔ تاریخی یادگار ہے۔"

ہم نے کہا۔ "مگر قبروں کی تاریخ ہی تو ہے نا۔ بہرحال ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

ان کی سیکریٹری نے کہا "بونی' کیوں نہ ان سے ڈزنی لینڈ کے بارے میں دستاویزی فلم بنوائی جائے۔"

"فضول۔ مجھے اس قسم کی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے تاریخ سے دلچسپی ہے۔"

"تو پھر وہائٹ ہاؤس بہت مناسب رہے گا۔"

وہ منہ بنا کر رہ گئے۔

"بحر منجمد شمالی کے بارے میں کیا خیال ہے۔" سیکریٹری نے کہا۔

ہم اٹھ کر ایک طرف گئے اور سام کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا مصیبت اٹھا لائے ہو۔ یہ دونوں تو بالکل فاتر العقل لگتے ہیں۔"

وہ بولا "مجھے تو جینئس لگے تھے اور آپ کے بارے میں سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔"

ہم نے کہا "ہم کسی بہانے باہر جا رہے ہیں' تم انہیں ٹال دینا۔"

"مگر مسٹر آفاقی ان کے پراجیکٹ میں پیسہ کافی ملے گا۔"

ہم خاموشی سے باہر کھسک گئے۔ پتا چلا کہ وہ دوباہ آنے کے لئے کہہ گئے ہیں مگر خوش قسمتی سے دوبارہ تشریف نہیں لائے۔ ہم آج تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ وہ دونوں واقعی صاحب دانش تھے یا کسی ذہنی ہسپتال سے چھٹ کر آ گئے تھے؟

ہمارے ریستوران میں مختلف قسم کے لوگ آیا کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو باقاعدگی کے ساتھ آتے تھے۔ باقی کبھی کبھی۔ ان کی عادتیں اور پیشے بھی مختلف ہوا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب آمدورفت زیادہ ہو گی تو ایک دوسرے کے بارے میں معلومات بھی بڑھ جاتی ہیں۔ ایک جوڑے کے بارے میں تو ہم بتا ہی چکے ہیں کہ وہ "مشیر" تھے۔ ہمارے ریستوران سے تھوڑے فاصلے پر ان کا "کلینک" تھا۔ دونوں جوان العمر اور دلکش تھے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک خوبصورت جوڑا تھا۔ شخصیت کے علاوہ بات چیت میں بھی بہت اچھے تھے۔ ہر وقت ہنستے ہی رہتے تھے۔ جب بے تکلفی ہوئی تو ادھر ادھر کی باتیں بھی شروع ہو گئیں۔

ہم نے پوچھا۔ ''آپ کن لوگوں کو مشورے دیتے ہیں اور یہ مشورے کس قسم کے ہوتے ہیں؟''

خاتون نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ہم میاں بیوی کو بہترین انداز میں زندگی گزارنے کے مشورے دیا کرتے ہیں۔ انہیں بتاتے ہیں کہ شادی کتنی بڑی ذمے داری ہے اور اسے پورا کرنے کے لئے دونوں فریقوں کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔''

ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ دونوں ایک نیک کام کرتے ہیں۔ پریکٹس بھی ان کی اچھی چلتی تھی۔ مزے سے زندگی گزرتی تھی مگر چند دن بعد معلوم ہوا کہ وہ ایک دوسرے کو طلاق دے چکے ہیں اور محض ساتھی کے طور پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ چراغ تلے اندھیرا کا محاورہ شاید ایسے ہی مواقع کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

امریکا میں ویسے تو ہماری زندگی پرسکون اور باقاعدہ ہو گئی تھی مگر جیسے جیسے کاروباری طور پر سکون حاصل ہونے لگا ہمارا ذہنی سکون درہم برہم ہونے لگا۔ یہ ہم بتا ہی چکے ہیں کہ امریکی طور طریقے ہمیں ایک آنکھ بھی پسند نہیں آئے۔ وہاں کی زندگی ہمارے نزدیک کیڑے مکوڑوں کی زندگی کے مانند تھی۔ ہمیں یہ ایک مشینی اور غیرانسانی معاشرہ نظر آیا۔ نہ کوئی رشتے دار' نہ دوست احباب سے محفلیں' نہ فرصت کے لمحات میں گپ شپ' یوں لگا جیسے ہم رفتہ رفتہ سب سے الگ اور تنہا ہو کر رہ گئے ہیں۔ پھر ہمیں پاکستان یاد آنے لگا۔ ہر شہر' ہر قصبہ' ہر محلہ یاد آتا تھا۔ فلم اسٹوڈیوز میں گزرے ہوئے ایام' وہ لوگ جن کے ساتھ زندگی کے تیس بتیس سال گزارے تھے۔ ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ چہرے بھی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگے جو کبھی سال دو سال میں ایک بار ہی نظر آیا کرتے تھے۔ لاہور کی سڑکیں' دفاتر' ہوٹل' ریستوران' باغ یہاں تک کہ گندے علاقے بھی راتوں کو ہمیں جگانے لگے۔ بہت سونے کی کوشش کرتے مگر جاگتے میں گزرے ہوئے دن خوابوں کے مانند سامنے سے نہ ہٹتے اور بیتے دنوں کے واقعات مسلسل فلموں کی صورت میں نظر آتے۔ رفتہ رفتہ یہ کیفیت ایک اذیت کی صورت اختیار کر گئی۔ پھر یہ تصور کہ ہم ایک اجنبی ملک میں اجنبیوں کے مانند اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ یہ ریستوران چلانا تو ہمارا کام نہیں ہے۔ کیا قدرت نے اسی مقصد کے لئے ہمیں پیدا کیا تھا۔ لیکن ہم نے جان بوجھ کر للّی کے سامنے کبھی پاکستان کو یاد نہیں کیا۔ یہ سوچا کہ ایسا نہ ہو یہ سنتے ہی بکھر جائے اور

پرانے زخم تازے ہو جائیں۔ عورتیں ان معاملات میں زیادہ جذباتی اور ایک دوسرے سے وابستہ بلکہ پیوستہ ہوتی ہیں۔ امریکا پاکستانی عورتوں کے لئے ایک جہنم سے کم نہیں ہے۔ ان کا ہر تصور وہاں جا کر خاک میں مل جاتا ہے اور ایک عجیب میکانکی سی بے مقصد زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ رسوم' محفلیں' رشتے' ناتے' شادی بیاہ کی خوشیاں' مرنے جینے کی سوگواریاں سبھی ہزاروں لاکھوں میل دور ہو جاتی ہیں۔

ہم تو چند سال رہنے کے ارادے سے گئے تھے کہ پاکستان میں فلموں کے معاملات درست ہونے پر لوٹ آئیں گے۔ اس اثنا میں بچیوں کی تعلیم و تربیت اچھی ہو جائے گی مگر وہاں بچیوں کی تعلیم و تربیت کا رنگ ڈھنگ دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ سوچا کہ یااللہ' یہ بچیاں اس رنگ میں رنگی جائیں گی تو پھر کیا ہو گا۔ یہ تو نہ یہاں کی رہیں گی نہ وہاں کی رہیں گی۔ بچیوں نے بہت تیزی سے امریکی طور طریقے اور لب و لہجہ اپنایا تھا۔ لگتا تھا وہیں پیدا ہوئی ہیں۔ باوجود تاکید کے وہ آپس میں بھی کبھی اردو میں بات چیت نہیں کرتی تھیں۔ تاہم ان سے اردو بولتے رہتے تھے اور وہ ہمارے ساتھ خالص امریکی لب و لہجے میں انگریزی بولا کرتی تھیں۔ شلوار قمیض کو انہوں نے ہاتھ تک لگانا چھوڑ دیا تھا۔ مقامی لباس ہی انہیں پسند آتا تھا۔ اتنی فرصت اور مہلت نہ تھی کہ انہیں اپنے ملک کی باتیں یاد دلاتے اور اس کا فائدہ بھی کیا ہوتا۔ وہ جس ماحول میں رہ رہی تھیں ان کے لئے تو وہی سب کچھ تھا۔ پیچھے وہ کیا چھوڑ کر آئی ہیں اس کا وہ کیا اندازہ لگا سکتی تھیں۔

آخر ایک روز ہم نے پاکستان واپس آنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے اور ہم واپس جانے کے قابل بھی نہ رہیں۔ ایک مہینے کے اندر ہم نے ریستوران فروخت کر دیا۔ گھر بیچ دیا۔ سامان بھی ٹھکانے لگا دیا اور جب کینیڈا سے ہو کر دوبارہ امریکا پہنچے تو رخصت سے ایک دن پہلے کار بھی فروخت کر دی۔ للّی اس فیصلے سے خوش تھیں۔ بچیوں کو اس تبدیلی کا کوئی خاص احساس ہی نہ تھا بلکہ رشتے داروں سے ملنے کے خیال سے وہ بھی خوش تھیں۔ لندن سے ہوتے ہوئے ہم کراچی پہنچے تو بلامبالغہ زمین کے ہر ذرے کو پیار کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ وہ چیزیں جو بری لگا کرتی تھیں اب وہ بھی اچھی لگ رہی تھیں۔

بالآخر ہم امریکا کو الوداع کہہ کر اپنی دنیا میں واپس آ گئے تھے۔

نادیہ نے کراچی پہنچتے ہی ہمارے کہے بغیر ہی نہ صرف شلوار قمیص پہن لی تھی بلکہ دوپٹا

بھی سر پر ڈال لیا تھا۔ امریکا سے ڈھیروں مغربی لباس' جینز اور بلاؤز وغیرہ ساتھ آئے تھے مگر نادیہ نے پاکستان پہنچ کر انہیں کبھی استعمال نہیں کیا۔ ایک بار ہم نے کہا بھی کہ بیٹا کبھی گھر ہی میں جینز پہن لیا کرو۔

نادیہ نے کہا "پاپا اچھا نہیں لگتا اور پھر سب مذاق اڑائیں گے۔"

نادیہ کا یہ جواب ایک فطری اور قدرتی جواب تھا۔ اور اس ایک فقرے میں نادیہ نے نادانستہ اور غیر شعوری طور پر ان دونوں تہذیبوں اور دنیاؤں کا فرق بیان کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆